حجۃ الاسلام

الامام محمد قاسم نانوتویؒ

حیات، افکار، خدمات

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند نئی دہلی ۲۵

نام کتاب	:	حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ حیات افکار خدمات
سنہ اشاعت	:	2005
ایڈیشن	:	پہلا
قیمت	:	-/300 روپے
باہتمام	:	تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند - نئی دہلی
کمپوزنگ	:	نوشاد عالم قاسمی گلوبل کمپیوٹر سینٹر، ذاکر نگر، نئی دہلی - ۲۵

ملنے کے پتے:

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند - نئی دہلی

143/12, II Floor, Zakir Nagar, New Delhi 110025
Tel./Fax. (011) 26987535

کتب خانہ حسینیہ دیوبند

Kutub Khana Husainia, Deoband 247554
Tel. (Off.) 01336 - 223266 (Res.) 222469

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حجۃ الاسلام

الامام محمد قاسم نانوتویؒ

حیات — افکار — خدمات

باہتمام

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

نئی دہلی - ۲۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حجۃ الاسلام

الامام محمد قاسم نانوتویؒ

شافع کون ومکاں کی راہ پر لاتا رہا
گمرہانِ شرک کو توحید سکھلاتا رہا
پرچمِ اسلام ابرِ درخشاں کے رُوپ میں
بتکدوں کی چار دیواری پہ لہراتا رہا
ہمرہانِ دل گرفتہ کو بہ اعلانِ جہاد
تیغِ جوہر دار کا آئینہ دکھلاتا رہا
اس کے سینے میں خدا کا آخری پیغام تھا
وہ خدا کی سرزمیں پر حجۃ الاسلام تھا

شورش کاشمیری (مرحوم)

ترتیب مضامین

دوسرا باب: ——— آراء وافکار

تیسرا باب: ——— علمی خدمات وآثار

چوتھا باب:———— اساتذہ ورفقاء

اختتامیہ:

افتتاحیہ

مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی ٭

الامام محمد قاسم نانوتویؒ

(۱۲۴۸ــــ۱۲۹۷ھ)

آپ کے ہاتھوں میں ایک ایسی ہستی کے اوراق زندگی ہیں جنھیں پڑھ کر علم وآگہی کی روشنی، غیرت ربانی کے جلوے اور عزائم کے نمونے سامنے آتے ہیں۔

امام محمد قاسم نانوتوی برطانوی سامراج کے عہد میں پیدا ہوئے جب وہ اپنی طاقت، تنظیم اور سازش کے ذریعہ نہ صرف اس آزاد ملک کو غلام بنانے کے لیے بنگال سے دہلی تک دوڑ بھاگ کررہے تھے بلکہ اسلام اور مسلمانوں کو اندلس کے تجربہ کی طاقت سے فتح کرنے کی دھن میں تھے۔ چنانچہ ۱۸۵۷ء سے پہلے آگرہ کی راجدھانی میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی سے عیسائیت اور اسلام پر جو مناظرہ ہوا اور اس میں لندن سے ٹریننگ پانے والے پادری، فنڈر کی سربراہی میں شریک کئے گئے تھے اور پورا برطانوی سامراج اس میدان جنگ میں جشن منانے کی تیاری کررہا تھا، مگر مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے انجیل، تثلیث اور تحریف کے موضوعات پر پادری کو چاروں خانے چت کردیا تھا اور اس سے بڑا کام یہ کیا تھا کہ اپنے کو بچا کر آگرہ سے باہر چلے گئے تھے حتی کہ انھیں ہندوستان سے ہجرت کرکے عرب جانا پڑا تھا۔

ایسے سنگین ماحول میں ۱۸۵۷ء کا طوفان اٹھا اور اسے سامراجی طاقت نے اسلام، علما اور مسلمانوں کے خلاف اتنا بھیانک بنادیا کہ علماء نے ہجرت کی اجازت دیدی، چنانچہ حضرت حاجی امداداللہ ایسے سینکڑوں حضرات ہجرت کرکے نیپال اور عرب چلے گئے، مگر جن دو مولویوں نے ہجرت بھی نہیں کی اور اس کی نیت بھی نہیں کی بلکہ جان کی بازی لگا کر ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بقاء کے لیے جدوجہد کرنے کا عزم کرلیا وہ تھے مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا رشید احمد گنگوہی، ان

٭ صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند، نئی دہلی

حضرات نے چند برس بعد ۱۸۶۶ء میں دیو بند کی مسجد چھتہ میں غیر معروف جگہ پر مدرسہ اسلامی کی بنیاد رکھدی۔

اس مدرسہ میں ذریعۂ تعلیم علوم اسلامیہ کو بنا کر نائبین رسول بنانے کی راہ کھول دی اور نصاب کو درجہ وار مرتب کر کے اچھے اساتذہ کو کام سپرد کر دیا جس سے وہاں کے طلبا شیخ محمود حسن اور شیخ فخر الحسن بن کر نکلے۔

پھر مولانا نے دار العلوم کو اپنی تگ ودو کا مرکز بنا دیا اور اسی انگریزی سامراج کے مقابل کام شروع کر دیا جس نے اندلس اور قرطبہ میں مسلمانوں کو عیسائی بنا کر ملک کو عیسائی بنا دیا تھا اور ہندوستان کو غلام بنا کر اسے تباہ کرنا چاہتا تھا۔

حضرت مولانا نے پہلے ان پادریوں سے مقابلے شروع کر دیئے جو مسلمانوں کو کھلے عام چیلنج دیتے تھے اور عیسائیت کی دعوت دینے کے لیے تنخواہ پاتے تھے۔ مولانا نے ان کے بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کی اور وہاں اپنی برجستگی، علمیت اور تقریر کا سکہ بٹھا دیا، اگر دیانند سرسوتی نے شعر پڑھ کر مسلمانوں کو ہراساں کیا اور للکارا کہ:

''ماس ماس برابر جیسی گائے ویسی سور'' تو مولانا نے بھی برجستہ شعر پڑھ کر سرسوتی کو حیران کر دیا۔ فرمایا: ''عورت عورت برابر جیسی بیوی ویسی مادر'' اگر یہی فلسفہ ہے تو گھر کی عورتوں میں ماں، بہن، بیوی کا فرق کیوں ہے جب کہ سب برابر ہیں۔

تو مولانا نے تقریر کا جواب تقریر سے، کتاب کا جواب کتاب سے، شعر کا جواب شعر سے دے کر انجیل کا جواب قرآن سے دے کر اور ہر جگہ خود پہونچ کر پادریوں اور پنڈتوں کو گھر تک پہونچا دیا اور وہ جہاں جہاں سے بھاگ گئے وہاں کئی کئی دن رک کر اسلام کی حقانیت، انجیل کی تحریف اور تثلیث کی تردید فرمائی اور مسلمانوں کو مطمئن کر کے واپس آئے۔

مولانا نے سر سے کفن باندھ کر میرٹھ، مظفر نگر، سہارنپور اور دہلی میں اتنے مناظرے کئے کہ پادری تو پادری حکومت بھی حیران ہوگئی، پنڈت لوگ بھی منہ چھپانے لگے، چنانچہ رڑکی جا کر مولانا نے دیانند کو بہت للکارا مگر وہ نہ ان کے سامنے آیا نہ ان کے شاگردوں کے سامنے۔ اس طرح جلسے کر کے مسلمانوں کو چیلنج دینے کی ہمت ٹوٹ گئی۔

مولانا نے دارالعلوم کو مرکز بنا کر ایک اسلامی چھاؤنی قائم کردی، اسی چھاؤنی کے لیے انھوں نے شیخ الہند محمود حسن علامہ فخر الحسن جیسے شاگرد تیار کردیے جن کے ساتھ مولانا ثناءاللہ امرتسری، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوری، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا ابوالوفا شاہجہاں پوری اور حضرت مولانا انور شاہ کشمیری جیسے یگانۂ روزگار علمانے اسلام اور اتباع سنت کا اور فرق باطلہ کا مقابلے کرکے دیوبندیت کا اسلامی اور دینی اسکول قائم کردیا۔

حضرت مولانا کی اسلامی غیرت نے ایک طرف برطانوی سامراج سے ٹکرا کر عیسائیت پھیلانے کے عزائم کو چکنا چور کردیا دوسری طرف تحریر وتقریر کے ذریعہ اسلام کی حقانیت کا جھنڈا گاڑدیا۔ تیسری طرف جگہ جگہ مدارس قائم کرکے مسلمانوں میں خود اعتمادی کا جوہر پیدا کردیا اور ہزاروں نائبین انبیاء پیدا کردیئے۔ اگر اسی طرح کسی محمد قاسم نے قرطبہ اور اندلس میں عیسائیوں کے مقابلے کئے ہوتے تو وہاں آج بھی اسلام اسی طرح زندہ رہتا جس طرح ہندوستان میں ہے:

چھیڑ دیتا ہے جب ان کو باطل کہیں
دل کے اندر سے کہتا ہے کوئی ''بزن''

☆☆☆

مولانا عمید الزماں کیرانوی*

مقدمہ

برصغیر ہند میں اسلام کے احیا وتجدید کے افق پر ابھر کر آنے والی وہ چند شخصیات جنھوں نے اس دیار میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی اور دین وعقیدے کی پاسبانی کا ناقابل فراموش اور تاریخ ساز کار نامہ انجام دیا، ان میں نابغۂ عصر حجۃ الاسلام حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ کی شخصیتِ گرامی قدر کا نام بھی بہت نمایاں ہے۔ اللہ نے آپ سے وہ کام لیا جو وہ اپنے نہایت چیدہ وبرگزیدہ اور مخصوص بندوں سے لیتا ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں جب بھی حق وباطل کے مابین معرکۂ کارزار گرم ہوا اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب حق کا دم واپسیں ہے تو اللہ تعالی نے اپنی قدرت کاملہ کے تحت ایسے بندوں کو میدان میں لا کھڑا کیا جو دیکھنے والی آنکھوں میں بے سروسامان اور کم مایہ تھے، جن کے بازوؤں میں ظاہری طور پر وہ طاقت بھی نہیں تھی جس کا احساس اور اندازہ اہل باطل کے دلوں میں خلش پیدا کردے، لیکن انھوں نے اپنے سرفروشانہ حوصلے اور عزائم کی قوت سے نہ صرف یہ کہ انہی معرکوں کو سر کیا بلکہ آئندہ کے ایسے بہت سے معرکوں میں حق کی فتح یابی اور باطل کی شکست وپسپائی کا سامان چھوڑ گئے۔

حضرت الامام محمد قاسم نانوتوی کے کارناموں کی عظمت کا ادراک صحیح طور پر اس وقت ہوسکتا ہے جب ہم اس ماحول اور پس منظر پر نظر ڈالیں، ان حالات کا بچشم غور جائزہ لینے کی کوشش کریں جن حالات میں انھوں نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ مسلمانوں کی عظمت وشوکت کی بساط باضابطہ شکل میں لپیٹی جاچکی تھی۔ سوسال (۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی سے انقلاب ۱۸۵۷ء تک) کی پے بہ پے شکست خوردگی اور برطانوی سامراج کے ظلم وجارحیت نے مسلمانوں کو اپنی لاچاری وبے بسی اور حرماں نصیبی پر خون کے آنسو بہانے پر مجبور کردیا تھا۔ ایسے وقت میں ایک سوال تو یہ تھا کہ کس طرح مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کو قائم وبرقرار رکھنے کی سعی کی جائے لیکن اس سے بڑا سوال مسلمانوں کے دینی وتہذیبی سرمائے اور متاع ایمان ویقین کی حفاظت وپاسبانی کا تھا۔ حضرت

* کارگزار صدر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

نانوتوی نے دونوں سوالوں کو اپنے فکر وعمل کا موضوع بنایا۔ چناں چہ شاملی کا جہاد اسی پہلے سوال کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش تھی لیکن آپ کو خدا کی جانب سے عطا کردہ فکر وبصیرت نے دوسرے پہلو کو اصل مرکز توجہ بنانے کی طرف راغب کیا۔ یہ دین وملت کے لحاظ سے عسر میں یسر کی تلاش تھی جس میں وہ پورے طور پر کامیاب رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ احیائے سلطنت اسلامیہ کی جو جنگ شاملی کے میدان میں آپ اور آپ کے رفقا نے ہاری تھی وہ جنگ زیادہ بھرپور اور وسیع طور پر آپ نے احیائے دین وملت کے میدان میں جیت لی۔

مسلمانوں کی ملی زندگی میں دارالعلوم دیوبند اٹھارہ سوستاون کے خسارے کی تلافی کا سب سے بڑا ذریعہ بن کر سامنے آیا۔ وہ محض ایک مدرسہ نہ تھا بلکہ اس کی تاسیس ایک تحریک کا نقطۂ آغاز تھا شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ اسی حیثیت سے اسے اسلامی چھاؤنی قرار دیتے تھے۔ اسے محض ایک درس گاہ کی شکل میں دیکھے جانے کے وہ قائل نہ تھے۔ اگر دارالعلوم دیوبند کی شکل میں مدارس کے قیام کی تحریک کی شروعات بروقت نہ کی گئی ہوتی تو نہیں کہا جاسکتا کہ ہندستان میں مسلمانوں کا کیا حشر ہوتا۔ ان کے اسلام وایمان کی کیا حالت اور درگت بنتی اوران کی تصویر کے کیا خدوخال ہوتے۔

اس تصویر کو اگر مسلمانوں کے فردوس گم شدہ (الفردوس المفقود) اندلس کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے تو ایک حد تک صحیح حقیقت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تحریک دیوبند تحریک ولی اللہی کا ہی امتداد اور پرتو اور اسی ''نظام شمسی'' کا کوکب درخشاں ہے۔ اس لیے اس میں وہی تابانی ودرخشانی اور وہی حرارت پائی جاتی ہے جس نے ایسے وقت اسلام اور مسلمانوں کے تن مردہ میں زندگی کی لہر دوڑادی تھی جب دور دور تک سوائے مہیب سناٹوں یا آہ وفغاں کی صدائے جاں گسل کے، شاید کم ہی کچھ باقی رہ گیا تھا۔

حضرت نانوتوی کی فکری اور عملی جدوجہد کے پیکر مجسم دارالعلوم دیوبند کے قیام پر تقریباً ڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزرنے کو ہے اس طویل مدت میں دین کے تحفظ وبقا کی جدوجہد میں عالمی سطح پر اس کا جو نمایاں کردار ابھر کر سامنے آتا ہے، اس کی حیثیت اس مہر نیم روز کی ہے جس کی روشنی نابیناؤں کو بھی اپنے وجود واہمیت کا احساس دلادیتی۔ حالات میں کافی تبدیلیاں آچکی ہیں، زمانے کا رنگ بدل چکا ہے۔ سیاسی، سماجی، فکری، تہذیبی اور علمی تمام سطحوں پر برصغیر ہند کا نقشہ وہ نہیں ہے جو

دار العلوم دیو بند کے قیام کے وقت تھا لیکن اس عظیم ادارے کی عظمت و معنویت اب بھی نہ صرف باقی ہے بلکہ دن بہ دن اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ دنیا کے کم ہی ایسے خطے ہوں گے جو اس کے آب حیات سے فیض یاب نہ ہوئے ہوں اور اس سے پھوٹنے والی کرنیں وہاں تک نہ پہنچی ہوں۔ یہ دراصل اس کے بانی اور ان کے رفقائے کار کے اخلاص کی برکت کا ہی کرشمہ اور معجزہ ہے۔

حضرت نانوتوی نے اپنے لیے گم نامی کو پسند کیا۔ حسرت کی حد تک ان کی خواہش تھی کہ وہ تو دنیا کو جانیں، زمانے پر نگاہ رکھیں لیکن دنیا انھیں نہ جانے اور زمانے کی ان پر نگاہ نہ ہو۔ حضرت نانوتوی سے متعلق اپنی مختصر تحریر کردہ سوانح میں حضرت مولانا یعقوب نانوتوی لکھتے ہیں کہ:.... اور ''(حضرت نانوتوی) کچھ اپنے لیے صورت تعظیم کی نہیں رکھتے، علما کی وضع، عمامہ یا کرتا کچھ نہ رکھتے۔ ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔'' مزید لکھتے ہیں: ''مسئلہ کبھی نہ بتلاتے، حوالہ کسی پر فرماتے، فتویٰ پر نام لکھنا اور مہر کرنا تو درکنار اول امامت سے بھی گھبراتے آخر کو اتنا ہوا کہ وطن میں نماز پڑھا دیتے تھے۔ وعظ بھی نہ کہتے تھے'' (سوانح قاسمی جلد اول ص: ۳۱) آج ان کے نام اور کام کی عظمت و شہرت چہار دانگ عالم میں پھیلی ہوئی ہے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی ارشادِ گرامی کی سچی تصویر ہے کہ جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے رتبے کو بلند کرتا ہے۔ دین و ملت کے لیے حضرت نانوتوی کے دل میں وہی جذبہ موجزن تھا، وہی سوز اور تڑپ تھی جس کی صورت گری قرآن میں ان لفظوں میں کی گئی: ''شاید منکرین کے ایمان نہ لانے پر آپ اپنی جان کو ہلکان کر لیں گے'' **لعلك باخع نفسك ألاّ يكونوا مؤمنين** (الشعراء آیت: ۳) اور جو بدر کے میدان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر خدا کے حضور اس گریہ و دعا کی صورت میں ڈھل گیا تھا کہ ''اے اللہ اگر یہ چھوٹی سی ملت ہلاک و برباد ہو گئی تو روئے زمین پر تیرا کوئی نام لیوا نہیں رہے گا **اللهم إن تهلك هذه العصابة اليوم لا تعبد** (سیرت ابن ہشام ج:۱ ص: ۵۴۸) حضرت نانوتوی کا یہی وہ سوز دروں تھا، دل دردمند کی یہی وہ کیفیت تھی جو انھیں اپنوں اور غیروں، دونوں کے لیے بے تاب و مضطرب رکھتی تھی۔ انھوں نے اصلاح معاشرہ کی کوششوں کے تحت نکاح بیوگان کا احیا کیا، لڑکیوں کے حق وراثت کی لڑائی لڑی۔ تشیع کے زیر اثر تعزیہ و ماتم کی جڑ پکڑی ہوئی رسم کا اپنے علاقے سے استیصال کیا۔ دوسری طرف اسلام کی

عقائدی بنیادوں پر عقلی اعتراضات وشبہات کے جواب میں آپ نے زبان اور قلم دونوں کی قوت کا استعمال کرتے ہوئے متعدد مناظرے کئے اور پادریوں اور پنڈتوں کو گھر کی راہ دکھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، پھر اس موضوع پر ایسی تحریریں رقم کیں جو شبہات کی دلدل میں پھنسے اور عقلی کج روی کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے لوگوں کی رہنمائی اور تسکین کا سامان بنیں۔

آج ضرورت ہے حضرت نانوتوی کے نام اور پیغام سے دنیا کو متعارف کرانے کی، ان کی فکر کو عملی سانچوں میں ڈھال کر زمانے کے سامنے پیش کرنے کی۔ فطرت کے ازلی قانون: گردش زمانہ (مداولۃ الایام آل عمران:۱۴۰) کے تحت حالات کی کشمکش ایک بار پھر اس تقاضے کو دہرا رہی ہے کہ ہم بالخصوص ابنائے دارالعلوم دیوبند اور قاسمی فکر وحکمت کے خوشہ چیں، حضرت نانوتوی کے نقوش پا کو ڈھونڈ کر سامنے لائیں اور ان پر چل کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ ہم نے اپنے اسلاف کی سیرتوں کو بھلا دیا۔ وہ ہمارے فخر واعزاز کا سرمایہ تو ہیں لیکن ہم ان سے اپنی قوت فکر کی بیداری اور جوش عمل کی بازیابی کا وہ کام نہیں لیتے جس کی آج پہلے کے مقابلے میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

مئی ۲۰۰۰ء میں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند- نئی دہلی کی طرف سے ''الامام محمد قاسم نانوتویؒ سیمینار'' کے انعقاد کی غرض وغایت یہی تھی۔ ہماری کوشش تھی کہ ہم حضرت نانوتوی کی فکر اور کام کو دنیا کے سامنے لائیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ہم اس کوشش میں کامیاب ہوئے یا نہیں یا کس حد تک کامیاب ہوئے لیکن ہمیں اس بات کی خوشی ضرور ہے کہ ہم نے اس کام کا آغاز کیا سیمینار نے لوگوں کی نگاہوں اور دلوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ حضرت نانوتوی پر باضابطہ کام کی ضرورت ہے، ان پر جتنا کام ہونا چاہیے صحیح معنی میں اس کا عشر عشیر بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا ہے۔ حضرت نانوتوی اگر آج کے دور کی شخصیت ہوتے، آج کے انقلابی وسائل ابلاغ کے دور میں ان کی وفات ہوئی ہوتی تو نہ جانے کتنے مظاہر تعظیم وتوقیر دیکھنے کو ملتے، کتنے مجلات ورسائل کے ضخیم ترین نمبر نکلتے اور سیمینار پر سیمینار منعقد کئے جاتے اور اگر وہ اس طائفہ کے سرخیل نہ ہوتے جو سال گرہ منانے کو بجا طور پر ایک عمل عبث سمجھتی ہے تو نہ جانے کتنی دھوم دھام سے برصغیر ہند کے طول وعرض میں ان کا یوم پیدائش منایا جاتا، لیکن اس باب میں ہم لوگوں کی بے التفاتی وبے توجہی بھی سنگین کوتاہی کی حد تک پہنچ چکی ہے اور تمام چیزوں کو تو چھوڑیئے حضرت نانوتوی کی ذہ بیش بہا تصنیفات وتالیفات جو فکر دیوبند کے لیے نشانِ

امتیاز ہیں جن کا لفظ لفظ آب حیات ہے اور جو آج بھی تشنہ لبوں کی سیرابی وآسودگی کا ذریعہ بننے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں، خود دیوبند کے تجارتی مکتبوں میں دستیاب نہیں، جو اسلامی کتابوں کے معاملے میں ہندستان کا بیروت سمجھا جاتا ہے۔ بعض کتابیں پاکستان میں چھپی ہیں اور چھپ رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ حضرت نانوتوی کی کتابوں کو آج کے اسلوب اور زبان میں تسہیل کر کے شائع کیا جائے۔ خاص طور پر حضرت کی وہ کتابیں جو کلامی مباحث وموضوعات پر مشتمل ہیں ان پر مستقل کام کے لیے علمی اکیڈمی یا متعدد ایسی اکیڈمیاں قائم ہونی چاہئیں جن میں باہمی ربط وتنسیق ہو، ایسے افراد کو اس کام پر لگایا جانا چاہیے جو جدید فکری چیلنجوں سے واقف ہوں، آج کی عقلیات پر ان کی نظر ہو۔ اسی کے ساتھ وہ اس بات کے پورے طور پر اہل ہوں کہ کلام کے باب میں حضرت نانوتوی کے استدلالی فکر وفلسفے، دلائل اور تجزیے کو ذہن میں اتار کر قابل فہم انداز میں الفاظ وحروف کا جامہ پہنا سکیں۔

برادرِ گرامی قدر مولانا وحید الزماں کیرانویؒ نے اس جہت میں کام کی ابتدا کی تھی۔ اپنے تلمیذ رشید مولانا خالد القاسمی کو خاص اس کام پر لگایا اور اس طرح ان کی کوششوں کے نتیجہ میں کئی کتابیں: ''صداقت اسلام''، ''عظمت اسلام'' اور ''مجموعۂ افادات قاسمیؒ'' وغیرہ دار المؤلفین سے شائع ہو کر منظر عام پر آئیں۔ اس کام کو مزید وسعت دینے کی ضرورت تھی۔ وہ اگر اور زندہ رہتے اور وسائل کی قلت نہ ہوتی تو شاید علمی حلقوں کو اس تعلق سے وہ شکوہ نہ ہوتا جو آج زبانوں پر ہے۔ بے بضاعتی اور فرومایگی کے احساس کے باوجود تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کی خواہش ہے کہ وہ اس سمت میں قدم اٹھائے اور بساط بھر اپنی کوشش سے دریغ نہ کرے لیکن ظاہر ہے یہ صرف تنظیم کے کرنے کا کام نہیں۔ دیوبند سے نسبت رکھنے والے اصحاب علم وفضل کی بہت بڑی تعداد ہندستان اور ہندستان سے باہر دنیا کے مختلف حصوں میں بکھری ہوئی ہے۔ اصحاب فکر ووسائل میں سے کچھ لوگ بھی اگر اس کام کے لیے کمر ہمت کس لیں تو ایک بہت بڑا ملی فریضہ انجام دیا جا سکتا ہے۔ تاہم جو لوگ بھی اپنے طور پر اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بجا طور پر ہم سب کی ستائش ومبارکباد کے مستحق ہیں۔

اس سلسلے میں پچھلے دنوں نمایاں طور پر جو کام سامنے آیا ہے، وہ محترم مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب کا ہے ''قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی: احوال وآثار وباقیات

ومتعلقات'' کے نام سے پونے آٹھ سو صفحات پر مشتمل کتاب، جسے مجلّہ ''صحیفۂ نور'' کے پہلے شمارے کے طور پر شائع کیا گیا ہے، علوم و معرفت قاسمیہ کا بیش بہا گنجینہ ہے،(۱) جس کی دوسری قسط مرتب ومؤلف کے وعدے کے مطابق، ابھی باقی ہے۔ مولانا راشد صاحب اکابر علمائے دیوبند کی وراثت علمی کے سب سے بڑے امین و پاسباں اور صاحبِ ذوق و دیدہ ور محقق ہیں۔ انھوں نے صحیح معنی میں اس موضوع پر تنہا پوری اکیڈمی کا کام کیا ہے اور کر سکتے ہیں۔ اللہ انھیں مزید اس کی ہمت وصلاحیت عطا کرے اور دست غیب سے اس سلسلے میں ان کی مدد کرے۔

اس کام کا دوسرا حصہ حضرت نانوتوی کے علوم و معارف کی دوسری زبانوں بالخصوص عربی اور انگلش میں اشاعت ہے۔ راقم الحروف کی معلومات کی حد تک، دوسرے مکاتب اور حلقہائے فکر کے لوگ جس طرح اپنی اپنی شخصیات کے تعلق سے اس معاملے میں سرگرم ہیں، ہمارے حلقے میں اس کی قابل التفات کمی نظر آتی ہے۔

ہمارے برادر مکرم مولانا نور عالم خلیل الامینی رئیس التحریر ماہنامہ ''الداعی'' (دارالعلوم دیوبند) نے کسی حد تک اس کمی و کوتاہی کی تلافی کا کام شروع کیا ہے حضرت نانوتوی سمیت دیگر اکابر دیوبند کے علم و حکمت کے شہ پاروں کو، صلے اور ستائش کی خواہش و تمنا کے بغیر، اپنے مؤقر عربی مجلّے کے ذریعہ سلسلہ وار جس طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور کر رہے ہیں وہ انھی کا حصہ ہے۔ پوری قاسمی برادری کو اس کے لیے موصوف کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

یہاں پر اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ راقم الحروف نے بھی دارالعلوم دیوبند سے فراغت کے بعد دارالعلوم ہی میں قائم ''اکیڈمی قرآن عظیم'' (مجلس معارف القرآن) میں کام کے دوران (۱۹۶۴ء-۱۹۶۵ء) الامام محمد قاسم نانوتوی کے معوذتین کے تفسیری رموز و نکات سے متعلق ایک رسالہ کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا تھا۔ یہ مختصر رسالہ ''تفسیر المعوذتین'' کے نام سے شائع کیا گیا۔ حضرت نانوتوی کی مشہور کتاب ''حجۃ الاسلام'' کا بھی میں نے ترجمہ شروع کیا تھا جو ملازمت کی تبدیلی کے باعث دہلی منتقل ہو جانے کی وجہ سے شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکا۔ بعد میں برادر گرامی قدر مولانا

---

(۱) مرتب موصوف کی وضاحت کے مطابق (ص: ۳۸) اس کتاب کی ترتیب کا اصل محرک بھی حضرت نانوتوی پر تنظیم کی طرف سے کیا جانے والا یہ سیمینار ہی ہے۔

وحید الزماں کیرانویؒ نے ترجمہ شدہ حصہ کو الگ الگ عنوانات کے تحت چند کتابچوں کی شکل میں شائع کیا۔ اگر چہ یہ اتنا چھوٹا کام تھا جس کو بلا شبہ لائق ذکر بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن پھر بھی اس تذکرہ سے اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اس جہت میں کچھ کوششیں ایسی بھی ہوئیں جو قبل از وقت ہی دم توڑ گئیں اور ان کے منصوبے تشنۂ تکمیل ہی رہ گئے۔

بہر حال ''الامام محمد قاسم نانوتوی سیمینار'' پر لکھے اور پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس کی اشاعت پر ہم خدام تنظیم کو جہاں ایک طرف بے انتہا خوشی ہو رہی ہے وہیں دوسری طرف اس میں غیر متوقع اور افسوس ناک حد تک تاخیر پر شرمندگی اور ندامت کا احساس بھی دامن گیر ہے۔ اگر چہ اس تاخیر کی بعض وجوہات بیان کی جا سکتی ہیں تاہم اس غیر ضروری عمل کے بجائے ہمارے نزدیک حقیقی معنوں میں اس کے لیے کھلے دل سے معذرت ہی صحیح وطیرہ ہو سکتا ہے۔

زیر نظر مجموعے میں حضرت نانوتوی کی سوانح اور افکار و خدمات کے اکثر پہلوؤں کا احاطہ و جائزہ شامل ہو گیا ہے۔ اگر چہ اس جائزے میں تفصیل اور تعمق کی کمی بہر حال محسوس ہوتی ہے۔ بالخصوص افکار کا گوشہ کسی حد تک تشنہ ہے۔ تنظیم کی طرف سے جو عنوانات مقرر کئے گئے تھے اور اہل علم و قلم سے ان کے مطابق مقالات تحریر کرنے کی دعوت دی گئی تھی اپنے اصل نقشے کے مطابق، اگر تمام یا اکثر عنوانات پر بھی تحریریں موصول ہو گئی ہوتیں تو بلا شبہ صوری اور معنوی دونوں لحاظ سے یہ مجموعہ اس سے بہت حد تک مختلف ہوتا۔ ایک طرف اس کا حجم بھی دو گنا بلکہ سہ گنا ہوتا تو دوسری طرف اس کمی کا بھی کسی کو شکوہ نہ ہوتا جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔

اس کے باوجود بلا خوف تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ زیر نظر مجموعۂ مقالات میں موضوع سے متعلق خاصا مواد جمع ہو گیا ہے جس میں بعض مقالات کو نہایت اہم علمی حیثیت حاصل ہے اور امید ہے کہ یہ مجموعہ، معارف قاسمیہ کے موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے چراغ راہ ثابت ہوگا۔

اخیر میں ہم ان تمام اصحاب قلم اور معاونین کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں جن کی بدولت موجودہ شکل میں یہ مجموعہ منظر عام پر آ سکا۔

☆☆☆

خطبات

مولانا سید نظام الدین*

خطبۂ صدارت

محترم حضرات علماء کرام اور اصحاب علم و دانش!

اللہ کا فضل و کرم ہے کہ آج حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ہمہ گیر جامع شخصیت اور ان کی دینی و ملی خدمات پر تاریخ ساز سہ روزہ سیمینار منعقد ہو رہا ہے، اس کے لئے ہم دل کی گہرائیوں سے تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انہیں ہدیۂ تحسین و تبریک پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ یہ سیمینار بامقصد اور دوررس نتائج کا حامل ہو۔

حضرات! حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جب عقل و شعور اور خرد و آگہی کی وادی میں قدم رکھا اس وقت سلطنت مغلیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے بجھ چکا تھا اور اس طرح مسلمانوں کے ہزار سالہ اقتدار کی بساط لپیٹی جا چکی تھی۔ جس ملک کو مسلم حکمراں، صوفیاء اور مشائخ نے تہذیب و تمدن، اعلیٰ اخلاقی قدروں اور اسلامی مساوات کے ذریعہ سنوارا تھا اور جس گلشن کی اپنے خونِ جگر سے آبیاری کی تھی اس کی بہاریں خزاں رسیدہ ہو چکی تھیں اور انگریز اس ملک کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے تھے، جو ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے اس سونے کی چڑیا کو شکار بنانے کے لئے آئے تھے۔ تجارت کی آڑ میں وہ کلکتہ، مدراس اور رفتہ رفتہ ملک کے دیگر مرکزی شہروں میں اپنے بال و پر پھیلانے لگے اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد پورے ملک کی قسمت کے مالک بن گئے، عیسائی مشنریوں نے عیسائیت کی تبلیغ شروع کر دی اور جبراً مسلمانوں میں ارتداد پھیلانے کی کوشش کی جانے لگی اور مسلمانوں کو مناظرہ کے لئے چیلنج کیا جانے لگا۔ یہ وہ حالات تھے جن میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ذات گرامی برصغیر کی امت مسلمہ کے لئے ''مسیحا'' اور امام بن کر ابھری، ایک طرف انہوں نے حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی قیادت میں انگریزوں کے خلاف تحریک

---

* امیر شریعت بہار اڑیسہ و جھارکھنڈ و رکن مجلس شوریٰ دار العلوم دیوبند

جہاد میں عملی طور پر حصہ لیا اور شاملی کے میدان میں ان کا جرأت ایمانی کے ساتھ مقابلہ کیا تو دوسری طرف عیسائی مشنریوں کی سازشوں اور محاذ آرائیوں کا جم کر مقابلہ کیا، عیسائی مبلغین اور پادریوں سے مختلف مقامات پر مناظرے کئے، اور اسلام کی حقانیت کو ثابت کیا، اسی طرح آریہ سماج کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور کوششوں کو ناکام بنا کر دعوت وتبلیغ کا اہم فریضہ انجام دیا۔

آپ کی زندگی نہایت ہی سادہ تھی، تواضع اور انکساری آپ کا وصف امتیازی تھا، گمنامی اور شہرت سے دوری آپ کا شعار تھی۔ چنانچہ بعض اوقات ملاقات کی غرض سے آنے والے حضرات دریافت کرتے کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کون ہیں؟ ائمہ سلف کے آپ سچے جانشین تھے۔

دارالعلوم دیوبند کا قیام:

حجۃ الاسلام کی زندگی کا سب سے اہم کارنامہ برصغیر میں علوم دینیہ کے احیائے نو کے لئے اسلامی تعلیمی تحریک کا آغاز ہے، انگریزوں کے کورٹ لارڈ میکالے نے یہ اعلان کیا تھا کہ ہم ایک ایسا نظام تعلیم رائج کرنا چاہتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں تیار ہونے والی نسلیں ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں مگر ذہن وفکر کے اعتبار سے عیسائی ہوں۔ حجۃ الاسلام نے میکالے کے اس چیلنج کو سنجیدگی سے لیا اور ایک ایسے نظام تعلیم وتربیت کے قیام کی عملی تحریک چلائی جس کے نتیجہ میں ایسی نسل تیار ہوسکے جو ظاہری شکل وصورت کے اعتبار سے جو بھی ہو مگر فکر ونظر اور شعور کے اعتبار سے مسلمان ہو، چنانچہ آپ نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کی دینی، مذہبی، معاشرتی، سیاسی اور تعلیمی پسماندگی کو دیکھتے ہوئے ۱۸۶۶ء بہ مطابق ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم کے قیام کا فیصلہ فرمایا۔

دارالعلوم صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے جس نے مختلف محاذوں پر امت مسلمہ کی صحیح قیادت ورہنمائی کا فریضہ انجام دیا اور اس کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے منصوبہ بند کوشش کی، دینی تعلیم وتربیت کا یہ ایسا مرکز ثابت ہوئی جس نے ہند وپاک ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کو دعاۃ، مبلغین، مجاہدین، ائمہ اور مختلف محاذ پر کام کرنے والے افراد فراہم کئے۔ حجۃ الاسلام نے مدارس اسلامیہ کے نظام تعلیم کو مفید وبامقصد بنانے کے لئے اصول ہشت گانہ مرتب کئے جو آج بھی ہمارے

لئے مشعل راہ ہیں، جن کا لب لباب یہ ہے کہ اس مدرسہ کی آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، یہ مدرسہ بشرط توجہ الی اللہ ہے ان شاء اللہ اسی طرح چلتا رہے گا اور اگر کوئی ایسی آمدنی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر اور کارخانہ، تجارت یا کسی کا وعدہ تو پھر یہ خوف ورجا جو سرمایۂ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امداد غیبی موقوف ہوجائے گی، کارکنوں میں باہمی نزاع پیدا ہوجائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

حجۃ الاسلام کی زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ انہوں نے قانون شریعت کے تحفظ اور مسلمانوں کے اندر اسلامی تعلیمات کی روح پیدا کرنے اور تنظیم واتحاد کے ساتھ زندگی گزارنے کے لئے دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کی مجلسیں منعقد کیں نیز شعائر اسلام کے تحفظ اور عیسائی پادریوں کی طرف سے اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور حملوں کا مومنانہ فراست کے ساتھ مقابلہ کیا، پادری تاراچند سے مناظرہ ہوا جس میں اسے شکست فاش ہوئی اور وہ راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوا۔ ۱۲۹۳ھ میں چاندا پور ضلع شاہجہانپور میں میلۂ خدا شناسی منعقد ہوا جس میں تمام مذاہب کے علماء اور عوام کے سامنے تثلیث کی تردید اور حقانیت اسلام پر آپ نے پرزور اور لاجواب تقریر کی۔ ۱۲۹۳ھ میں پنڈت دیانند سرسوتی سے مناظرہ ہوا اور اس نے منہ کی کھائی۔ آپ کی دو درجن سے زیادہ تصانیف ہمارے لئے ایک علمی دستاویز ہیں۔ مولانا کی زندگی کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ آپ نے جو کچھ کہا اس پر پہلے خود عمل فرمایا، نکاح بیوگان کی سنت کا احیاء اپنے گھر سے کیا، جنگ بلقان کے موقع پر اپنی اہلیہ کو مالی تعاون کی ترغیب دی، جس پر انہوں نے سارے زیورات آپ کے حوالہ کردیئے، ترکہ کی تقسیم بھی اپنے گھر سے شروع کی۔

میں نے مولانا قاسم نانوتویؒ کی تحریروں سے جو نتائج اخذ کئے ہیں اس کی روشنی میں مولانا کی فکری خصوصیات کے چند پہلو خاص طور پر نمایاں نظر آتے ہیں:

(الف) امت مسلمہ کے مختلف مسالک ومذاہب اور نظریاتی گروہوں کی تکفیر وتفسیق، تحقیر وتنقیص اور توہین وتذلیل کی روش سے اجتناب واحتیاط اور ان کے تئیں توازن واعتدال کا رویہ، نفرت کے بجائے محبت، دوری کے بجائے قربت اور ناانصافی کے بجائے انصاف کی راہ اختیار کرنے کی حکمت۔

(ب) دینی و دنیوی تعلیمات کی افادیت کا اقرار اور اس کی اہمیت کا اعتراف۔
(ج) سماج اور سوسائٹی سے تعلق و ربط، سماجی اصلاحات کی ضرورت پر زور۔
(د) عالمی مسائل اور امت مسلمہ کے حالات پر مسلسل نظر۔
(ہ) توکل علی اللہ اور صدق حالی و مقالی کی زندگی۔

موجودہ حالات میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم حجۃ الاسلام کے علمی و فکری سرمایہ کو نئے انداز و اسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کریں نیز ان کے نقوشِ علمی کی ترویج و اشاعت کے لئے وسیع پیمانے پر کوشش کریں۔

اخیر میں پھر آپ حضرات کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی نیک خواہشات اور تمناؤں کا اظہار کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمدلله رب العالمين.

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ*

کلیدی خطبہ

اسلام کی عمارت جن دو بنیادوں پر قائم ہے، ان میں ایک اللہ تعالیٰ کی توحید ہے اور دوسری جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نبوت، توحید کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ قیامت تک انسانیت کے لیے ہدایت کا سروسامان موجود رہے، یہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا عین تقاضہ ہے، جو رب العالمین انسان کی جسمانی اور مادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ اس کی اخلاقی اور روحانی ضرورتوں پر توجہ نہ دے، دوسری طرف ختم نبوت کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے، پچھلے پیغمبروں کی نبوت ایک مخصوص گروہ کے لیے اور ایک محدود زمانہ کے لیے ہوتی تھی، لیکن آپ کا آفتاب نبوت عالمگیر بھی ہے اور دائمی بھی، اب قیامت تک جو لوگ پیدا ہوں گے، وہ آپ ہی کی امت ہوں گے۔

ایک طرف ہدایت الٰہی کی ضرورت باقی رہنے اور دوسری طرف سلسلۂ نبوت کے تمام ہو جانے کی وجہ سے اب دین کی حفاظت واشاعت کی ذمہ داری امت کے دردمند علما اور خداترس صلحا پر رکھی گئی ہے، اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: میری امت کے علما بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں علماء أمتي كأنبياء بني إسرائيل اور اسی بنیاد پر اس امت کو یہ اعزاز عطا کیا گیا کہ اس میں مجتہدین ومجددین پیدا ہوتے رہیں گے، مجتہدین تحقیق دین کا فریضہ انجام دیں گے اور مجددین حفاظت دین اور احیاء دین کا۔ تجدید واجتہاد کے اس کام میں ان شاء اللہ تسلسل باقی رہے گا۔

جب دین پر انحراف کی گھٹائیں چھا جاتی ہیں اور حق پر باطل کی یلغار ہونے لگتی ہے، تو اللہ تعالیٰ ایسی شخصیتوں کو پیدا فرماتے ہیں، جو تیز وتند ہوا میں بھی اپنا چراغ جلاتے ہیں اور جو طوفان کے

---

* سابق صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

بیچ امت کے سفینہ کو ساحل سے ہم کنار کرتے ہیں، ایسی ہی شخصیتوں میں ایک حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تھے، قدرت کے دست فیاض نے انھیں واقعی قاسم بنایا تھا، وہ علوم ومعارف اور خیرات وحسنات کے قاسم تو تھے ہی، درد دل بھی بانٹتے تھے اور امت کی فکر وغم کے سوداگر بھی تھے، تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند کی طرف سے اپنے مورث اعلیٰ اور اس عظیم ہستی کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے امام نانوتوی سیمینار کا انعقاد یقیناً ایک فرض کفایہ کی ادائیگی ہے اور وفادار اولاد پر اپنے محسن وشفیق باپ کی نسبت سے جو قدر دانی اور احسان شناسی واجب ہے، یہ اس کا ایک معمولی سا حصہ ہے۔

اس موقع پر یہ بات کافی نہیں کہ ہم حضرت نانوتوی کی شخصیت پر چند مقالات سن لیں اور سنالیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ان کی ذات کو اپنے لئے آئینہ بنائیں اور اس آئینہ میں اپنے فکر وعمل کے خط وخال کو درست کریں، پس آیئے! اور اس ارادہ کو دامن دل سے باندھئے کہ حضرت نانوتوی کی خصوصیات اور ان کی عالی صفات ہم اپنے اندر جذب کریں گے اور عملی طور پر ہم اُن سے سچے اور پکے تعلق کا ثبوت دیں گے۔

حضرت نانوتوی کا سب سے اہم امتیازی وصف بے پناہ جذبۂ اخلاص ہے، اس اخلاص نے ان میں فنائیت اور کسرنفسی کو اوج کمال پر پہونچا دیا تھا، ان کے اخلاص کی سب سے بڑی مثال خود ہمارا مادر علمی دار العلوم دیوبند ہے، انھوں نے دار العلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، تعلیم وتربیت کا فریضہ انجام دیا، اسے دین کی مضبوط حفاظت گاہ بنایا اور جہالت کے اندھیرے میں فکر وفن کے چراغ روشن کیے، لیکن اپنے آپ کو ہمیشہ پیچھے رکھنے اور چھپانے کی کوشش کی۔ بنیاد رکھنی تھی تو کسی اور بزرگ سے رکھوائی، اہتمام وانتظام کا شعبہ کسی اور بزرگ کے حوالہ کیا اور خود اس بنیاد کی طرح رہے، جس پر پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے، لیکن وہ نظر نہیں آتی، مگر اللہ کا قانون ہے کہ جو خدا کے لیے اپنے آپ کو بچھاتا ہے اور چھپاتا ہے، اللہ اسے اسی قدر اٹھاتے اور سربلند کرتے ہیں۔ **من تواضع لله رفعه الله** چنانچہ آج دیوبند کی پیشانی پر آپ کا نام کندہ ہے اور یہ اس پوری تحریک کے لیے سرمایۂ اعزاز اور تمغۂ افتخار ہے، حضرت نانوتوی کے بے پایاں اخلاص نے ان کی زندگی کو اخفائے حال اور سادگی کا مرقع بنادیا تھا، جو لوگ ان سے واقف نہیں تھے، وہ جب انھیں دیکھتے، تو انہیں ایسا لگتا کہ جیسے کوئی دہقان

اور گاؤں کا مزدور ان کے سامنے کھڑا ہے — حضرت نانوتوی کا یہ کردار آج ہمارے لئے نمونۂ عبرت ہے، آج ہمارے درمیان عزت وجاہ کی لڑائی، عہدہ واقتدار کی حرص، خودنمائی کا جذبہ عشرت آرائی اور سہولت پسندی کا مزاج اس قدر بڑھ گیا ہے کہ علماء امت میں اپنا وزن کھوتے جارہے ہیں اور جو لوگ قوم کی قیادت وسیادت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور اپنے خلوص ووفا اور جذبۂ للّٰہیت سے صالح انقلاب پیدا کرتے ہیں وہ خود اصلاح کے محتاج ہیں اور ان کے باہمی جھگڑوں اور مقابلہ آرائیوں کی داستانیں عام مسلمانوں کی زبان زد ہیں۔

حضرت نانوتوی کی دوسری میراث ایمانی حمیت اور دینی غیرت ہے، امت کے باہمی اختلاف میں نرم خو اور ابریشم کی طرح نرم اور دین کے خلاف اٹھنے والے فتنوں کے مقابلہ میں آہن وفولاد، یہی حمیت انھیں شاملی کے میدان کارزار میں لے جاتی ہے اور تختۂ دار کے قریب پہونچاتی ہے اور یہی حمیت کبھی انہیں میلۂ خداشناسی کے بزم مباحثہ کو گرماتی ہے اور شاہ جہاں پور اور رڑکی میں آریہ سماجیوں سے مباحثات کرواتی ہے، وہ علم کا سمندر تھے، لیکن انھوں نے قلم بہت کم اٹھایا، اگر وہ چاہتے تو اپنے خامۂ آبدار سے ایک کتب خانہ سجا سکتے تھے، لیکن ان کا اصل مقصد دین کا احیاء اور اس کا دفاع تھا، اسی لیے ان کی زیادہ تر تالیفات اسلام کے عقائد حقہ کی ترجمانی اور اہل باطل کی نفی وتردید پر مشتمل ہیں۔

وہ امت کے درد میں گھلنے والے اور ان کی فکر میں تڑپنے اور بے قرار رہنے والے شخص تھے وہ ہر اس طوفان سے ٹکراتے اور اس کے مقابل کھڑے ہو جاتے تھے، جو مسلمانوں کے ایمان پر حملہ زن ہونا چاہتے تھے، عیسائیت کا فتنہ ہو یا آریہ سماجی یا کوئی اور باطل تحریک۔ اسی لیے انھوں نے فروعی مسائل پر بہت کم قلم اٹھایا اور اہل سنت والجماعت کے باہمی فروعی اختلاف کو کبھی بھی اہمیت نہیں دی، یہی حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی ورثۂ نانوتوی ہے اور ہمیں اس کا حامل ہونا چاہیے، افسوس کہ ہم اس اثاثہ سے محروم ہوتے جارہے ہیں، دفاع عن الاسلام کی طرف ہماری توجہ کم ہوگئی ہے اور باہمی اختلافات کی طرف ہماری توجہ بڑھ گئی ہے ہم اپنی بیش قیمت صلاحتیں جزوی مسائل اور فروعی اختلافات میں کسی کو صواب اور کسی کو خطا ثابت کرنے میں صرف کررہے ہیں اور جس کو ہم نے اپنی زندگی کا مشن بنالیا ہے، اس کے بجائے ہماری کوششوں کی سمت یہ ہونی چاہیے کہ ہم اسلام کے خلاف

اٹھنے والے فتنوں سے برسر پیکار ہوں اور دین مبین کے خلاف ہونے والی یورشوں کا مقابلہ کریں، یہی کام شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے کیا جنھوں نے پوری امت کو جوڑنے کی کوشش کی اور انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کیا، علامہ انور شاہ کشمیریؒ اور ان کے تلامذہ نے فتنۂ قادیانیت کا مقابلہ کیا، میرے استاذ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور ان کے تلامذہ نے انگریزوں سے پنجہ آزمائی کی، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، حضرت مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اور ہمارے کتنے ہی بزرگوں نے فتنۂ انکار حدیث کی سرکوبی کی۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے عقل وحکمت سے ہم آہنگ کر کے شریعت اسلامی کی معقولیت اور اپنے عہد کے تقاضوں کے ساتھ دینے کی صلاحیت اور اس کی عالمگیر افادیت پر عظیم الشان لٹریچر تیار کیا، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے اپنے رفقا کے ساتھ آزاد ہند میں تحریک تحفظ شریعت کی بنیاد رکھی اور اس قافلہ کی سالاری کی، یہی دیوبند کا اصل امتیاز اور اس کی پہچان ہے۔

اس حمیت کا دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ دیوبند کو نہ سونے کی زنجیر خرید سکی اور نہ لوہے کی زنجیر خوف زدہ کر پائی، دیوبند کی تاریخ بہادروں، دلیروں اور فرزانوں کی تاریخ رہی ہے، یہ تاریخ مالٹا کے قید خانوں سے لے کر ہندوستان کے زندانوں تک پھیلی ہوئی ہے، اس کے فرزندوں کے سر کاٹے تو جاسکتے تھے، لیکن جبینِ اقتدار پر جھکائے نہیں جاسکتے تھے، لیکن افسوس کہ آج ہم اس جرأتِ رندانہ اور جذبۂ مجاہدانہ سے بھی خالی ہوتے چلے جارہے ہیں، ہمیں دنیا پر اپنے بزرگوں کی طرح یہ بات واضح کردینی ہے کہ ہم متاع خرید وفروخت نہیں ہیں ہمارے ایمان، ہماری حمیت اور شریعت اسلامی سے ہماری وفاداری کا ہرگز سودا نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت نانوتوی نے وقت کی ضرورت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایک ایسی تعلیمی تحریک چلائی جس کے اثرات آج عالمگیر سطح پر محسوس کئے جاسکتے ہیں، اس تحریک نے مسلمانوں کے دین وایمان کی حفاظت اور تبلیغ واصلاح کا فریضہ اس خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے کہ کم سے کم گزشتہ دو تین صدیوں میں اس کی نظیر ملنی دشوار ہے، ضرورت ہے کہ فرزندان دیوبند موجودہ حالات کے پس منظر میں دینی تعلیم کو گاؤں گاؤں پہونچانے کی کوشش کریں، کیونکہ دور دراز کے دیہات وقریہ جات ارتداد کی سرحد

پر کھڑے ہیں اور مکاتب ہی کے ذریعہ ان کے ایمان کی حفاظت کا سروسامان کیا جاسکتا ہے، اسی طرح عصری تعلیم کی درس گاہوں میں ہماری ملت کے نونہال لاکھوں کی تعداد میں زیر تعلیم ہیں اور یہ بات ضروری بھی ہے کہ مسلمان جدید تعلیم میں آگے بڑھیں، لیکن وہ اعلیٰ ترین تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ شعوری طور پر مسلمان بھی باقی رہیں اور ان کے دل ودماغ کا کعبہ حجاز ہو نہ کہ امریکہ ویورپ، اس کے لیے ضروری ہے کہ دینی تعلیم کی تحریک کو جدید تعلیم گاہوں تک بھی پہونچائیں اور اس بات کی کوشش کریں کہ ہمارا کوئی بچہ مبادیات دین سے بے خبر نہ رہ جائے۔

حضرت نانوتویؒ کی روح آج آپ کی طرف متوجہ ہے کہ آپ کس حد تک اس کی فرزندی کا حق ادا کرتے ہیں آپ کو اعتدال فکر، حمیت ایمانی، اخلاص وتقویٰ، دین کی فکر اور دردمندی اور حق کی راہ میں ضمیر فروشی کے بجائے سرفروشی اور خودغرضی ومصلحت کوشی کے بجائے جوش جنوں اور جذبۂ ایمانی کی میراث دی گئی ہے آپ نے کس حد تک اس امانت کو قبول کیا ہے اور اس کا حق ادا کیا ہے۔
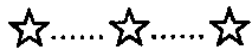
مولانا حکیم محمد عبداللہ مغیثی*

خطبۂ استقبالیہ

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على نبينا محمد وعلى آله وصحبه اجمعين ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين... أما بعد

دور دراز سے آئے ہوئے مہمانانِ کرام، علماء و فضلائے گرامی قدر و محترم حاضرین!

سب سے پہلے میں اپنی طرف سے اور مجلسِ استقبالیہ کے تمام رفقاء اور سیمینار کے منتظمین کی طرف سے آپ تمام حضرات کا نہایت مخلصانہ اور پُر تپاک خیر مقدم کرتے ہوئے تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ آپ نے ہماری دعوت قبول کی اور شدید گرمی کے اس موسم میں سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرتے ہوئے الامام محمد قاسم النانوتوی سیمینار میں تشریف لا کر ہم سب کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

حضرات!

دہلی ہمارے اس عظیم ملک ہندوستان کی راجدھانی اور اس کا دل ہے، اس کے کونے کونے پر بکھرے ہوئے ہماری عظمت دیرینہ کے نقوش زبان حال سے اس ملک اور شہر سے وابستہ ہمارے گذشتہ جاہ و جلال کا افسانہ سنا رہے ہیں۔ اس عظیم اور تاریخی شہر میں، نئی صدی کے پہلے سال میں، بانی تحریک دیوبند اور انیسویں صدی کی یگانہ روزگار علمی، اسلامی اور انقلابی شخصیت حضرت امام نانوتویؒ پر منعقد اس سیمینار کے موقع پر آپ حضرات کا استقبال کرتے ہوئے ہم فخر و مسرت محسوس کرتے ہیں۔

گرامی قدر سامعین!

اس ملک سے اسلام کا تعلق تقریباً تیرہ سو سال پرانا ہے، اس عہد کا بیشتر حصہ ہمارے تابناک ماضی سے تعلق رکھتا ہے جو تاریخ میں درج ہے، انیسویں اور بیسویں صدی میں جو ہوا، اس کی تاریخ بھی تقریباً مرتب ہے۔ یہ وہ صدیاں ہیں جن میں امت مسلمہ مجموعی طور سے زوال پذیر ہوئی اور پوری

* نائب صدر تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند

دنیا میں مسلمانوں کو شدید کرب و بے چینی سے دوچار ہونا پڑا، خاص طور سے انیسویں کے اواخر اور بیسویں صدی اوائل میں مسلمانوں کو اپنی فکری اور عملی آزادی سے نمایاں طور پر محرومی کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۲۴ء میں خلافت عثمانیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہوگیا اور براہِ راست یا بالواسطہ طور پر پورا عالم اسلام مغربی طاقتوں کے زیرنگیں آگیا۔ ادھر ہندوستان میں بھی انگریزوں کے اقتدار کی گرفت سخت ہوئی اور انہوں نے ترجیحی طور پر مسلمانوں کو نشانہ بنایا، ان کو معاشی اور تعلیمی میدان میں پسماندہ رکھنے کی بھرپور کوشش کی اور اس کے لئے مختلف حربے استعمال کئے۔ علاوہ ازیں، انگریزی حکومت کی سرپرستی میں عیسائی پادریوں نے بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ کھول دیا اور کھل کر اسلام اور مسلمانوں کو چیلنج کیا جانے لگا۔ انگریزوں اور عیسائی پادریوں کے اس طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ، بلکہ اس کے نتیجہ میں، تعصب اور فرقہ وارانہ ذہنیت نے مسلمانوں کے خلاف مختلف دوسرے محاذ کھول دیئے۔ پنڈت دیانند سرسوتی بانی آریہ سماج نے خاص طور پر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع کیں، شدھی سنگٹھن تحریک اور فتنۂ ارتداد کا آغاز ہوا اور تقریر وتحریر کے ذریعہ اسلام کی صحیح تصویر کو بگاڑنے کی پوری کوشش کی جانے لگی۔ سیاسی، علمی اور فکری زوال کے ساتھ چاروں طرف سے ہورہے ان مختلف النوع حملوں نے مسلمانوں کو حیران وسراسیمہ کردیا، جس کے نتیجہ میں قوت عمل سے محروم اس قوم کو احساس کمتری ومحرومیت، یاس وحسرت اور باطل افکار وخیالات سے مرعوبیت کی ذہنیت نے افسوس ناک حد تک اپنے شکنجے میں کس لیا۔

اس تشویش ناک صورت حال میں انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل ہی میں اللہ نے ایسے لوگ پیدا کئے، جنہوں نے اس سوئی ہوئی امت کو جگایا، اس کے مردہ وافسردہ جسم میں روح پھونکی اور احیائے امت واحیائے اسلام کی منظم ومنصوبہ بند کوششیں کیں اس کے نتیجہ میں برصغیر کے مسلمانوں میں ایک نئی امنگ اور نیا حوصلہ پیدا ہوا اور انہوں نے اسلام دشمن عناصر کی ریشہ دوانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور یوں دینی، دعوتی، تعلیمی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

ان چند برگزیدہ ہستیوں میں، جن سے اللہ نے برصغیر میں احیائے امت اور احیائے اسلام کا عظیم کام لیا، حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کا نام سرفہرست ہے، جن پر ہورہے

اس سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں آج ہمیں آپ کے استقبال کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔

محترم حضرات! حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی شخصیت، ان کے فکر و فلسفہ، ان کی برپا کی ہوئی دینی، تعلیمی اور اصلاحی تحریکات، تحفظ اسلام کے تعلق سے ان کی مساعی، پر سیر حاصل گفتگو تو ہمارے فاضل مقالہ نگار حضرات سیمینار کی علمی نشستوں میں کریں گے، تاہم یہاں میں مختصراً اتنا ضرور عرض کروں گا کہ انچاس (۴۹) سال کی نسبتاً کم عمر میں امام نانوتویؒ نے سیاسی، سماجی، اصلاحی، دینی، علمی اور دعوتی نقطۂ نظر سے اسلام کے تحفظ و دفاع کی خاطر توفیق الٰہی کی بدولت جو کارہائے نمایاں انجام دیئے، اگر وہ نہ ہوتے تو خدا جانے آج برصغیر میں ہم مسلمانوں کی کیا حالت ہوتی۔ امام نانوتویؒ کی تحریک نے اس دورِ پُر آشوب میں جو جماعت پیدا کی، وہ بلاشبہ خیر القرون کی یادگار، سلف صالحین کا نمونہ اور اسلامی مزاج و مذاق کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ جسے اللہ نے علم و فضل کے ساتھ سادگی، تواضع وللّٰہیت، انابت و تقویٰ اور خدمت دین و ملت کے بے پناہ جذبے سے نوازا تھا۔ آج اِس جماعت سے وابستہ افراد نے برصغیر کے دور دراز علاقوں میں، نہایت بے مایگی کے عالم میں بھی، علم و ہدایت کی جو قندیلیں روشن کر رکھی ہیں، اُن سے عام مسلمانوں میں پھیلی جہالت، بے دینی اور بدعات و خرافات کی تاریکی دور کرنے میں جو مدد مل رہی ہے، اُس سے ہر کس و ناکس واقف ہے۔

معزز سامعین!

آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل جن حالات میں امام محمد قاسم نانوتویؒ نے تحریک دیوبند کی بنیاد ڈالی تھی، جس نے اِحیائے اُمت اور احیائے اسلام کے ساتھ پچھلے ڈیڑھ سو سالوں میں برصغیر ہند کے مسلمانوں کی اسلامی شناخت کو باقی رکھنے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا، آثار بتا رہے ہیں کہ ہم اسلامیانِ ہند دوبارہ کچھ اسی قسم کے تشویش ناک حالات سے دوچار ہونے والے ہیں۔ آج پھر ہماری اسلامی شناخت کو مٹانے کی کوشش کی جا رہی ہے، ہماری شریعت، ہمارے قوانین، ہمارے عقائد، ہماری عبادت گاہیں اور ہمارے مدارس و مراکز کو پھر سے نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ہمیں سیاسی، معاشی اور تعلیمی طور پر پس ماندہ رکھنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس لیے حالات کا تقاضا ہے کہ ہم منصوبہ بندی کے ساتھ درپیش مسائل و خطرات کا مقابلہ کریں اور اس سلسلے میں بانیٔ تحریک دیوبند کے کارناموں کا بھی بہ غور مطالعہ کریں، جنھوں نے ڈیڑھ سو سال پیشتر آج سے زیادہ تشویش ناک

حالات وخطرات میں گھرے برصغیر کے مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کی تھی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس لحاظ سے سیمینار کا انعقاد حالاتِ حاضرہ کی ایک اہم ضرورت تھی۔

مہمانانِ کرام! میں ایک بار پھر آپ حضرات کا خیر مقدم کرتا ہوں اور آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں، ساتھ ہی تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داران وکارکنان کو بھی اپنے اور ہم مسلمانوں کے محسن حضرت امام نانوتویؒ پر یہ کامیاب سیمینار منعقد کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اسی طرح دہلی اور باہر کے جن حضرات نے بھی اپنے گراں قدر تعاون سے نوازا ہے، اُن سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ سیمینار کامیاب ہوگا اور اس سے فکروعمل کے ایسے گوشے سامنے آئیں گے، جو آج کے حالات میں ہمارے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں گے۔

وآخر دعوانا أن الحمدلله رب العالمين.

عزت مآب جناب عبدالرحمٰن ناصر العوہلی*

خطبۂ مہمان خصوصی

یہ میرے لیے انتہائی مسرت اور فخر واعزاز کا مقام ہے کہ میں آپ کے اس مبارک اجلاس میں شرکت کی سعادت حاصل کررہا ہوں جو اسلامی ہند کی مایہ ناز شخصیت، اسلام کے عظیم سپوت اور از ہر ہند کے نام سے معروف برصغیر ہند کی قدیم ترین اسلامی درسگاہ دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی شخصیت اور خدمات پر ہونے والے سیمینار کا افتتاحی اجلاس ہے۔ میں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے مجھے اس اہم اجلاس میں شرکت کی دعوت دی اور سرکردہ علما اور ارباب علم وفکر کے اس مجمع کو مخاطب کرنے کا موقع عنایت کیا۔ مجھے اس اجلاس میں مدعو کر کے دراصل آپ نے اپنے اس بھائی کو دعوت دی ہے جو آپ کے وطن ثانی سعودی عرب کی نمائندگی کرتا ہے۔ سعودی عرب جو دنیا بھر کے مسلمانوں کی نگاہوں کا مرکز اور ان کی کبھی نہ ختم ہونے والی عقیدت ومحبت کی آماجگاہ ہے کہ اسی سرزمین پر وہ مقدس مقامات واقع ہیں جہاں سے اسلام کے آفاقی پیغام کا سورج طلوع ہوا۔ سعودی عرب جو دعوت الی اللہ کا علم بردار ہے اور جس کو بیت اللہ اور حرم نبوی کی خدمت کا شرف حاصل ہے۔

علماء کرام معزز حاضرین!

میں اس مبارک موقع پر آپ کے ساتھ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی عظیم خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں جنھوں نے اپنے رفقاء کار اور دیگر علما کرام کے ساتھ مل کر اس ملک میں اسلامی تشخص کی حفاظت، ہندوستانی مسلمانوں کا اپنے ایمان وعقائد سے رشتہ استوار و برقرار رکھنے اور اسلام مخالف رجحانات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایسے وقت میں جد وجہد کی جو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک مشکل اور نازک دور تھا۔ یہ وہ دور تھا جب بیرونی سامراج نے ہندوستان کی آٹھ سو سالہ مسلم حکومت کا چراغ گل کر دینے میں کامیابی حاصل کر لی تھی اور مسلمانوں کے مذہب اور

---

* سفیر سعودی عرب برائے ہند

عقیدے کو نشانہ بنانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اللہ تعالی نے ان علماء کرام کی بدولت سامراجی طاقتوں کی اس کوشش کو ناکام بنادیا۔

برادران گرامی حاضرین کرام!

میں اس موقع پر دارالعلوم دیوبند کی عظیم دینی وعلمی خدمات کو بھی خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں جس کو مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقا نے ۱۴۰ سال قبل تقویٰ وللّٰہیت کی بنیاد پر قائم کیا تھا۔ اس ادارے کی ابتدا ایک چھوٹے سے مدرسے کی شکل میں ہوئی تھی لیکن اس کے بانیوں کے اخلاص اور کوششوں کی بدولت بہت جلد اس کو ایک مکتب فکر، ایک ہمہ گیر تعلیمی واصلاحی تحریک اور اسلام کے ایک قلعہ کی حیثیت حاصل ہوگئی جو اسلام کی عظمت، آفاقیت اور ابدیت کا ایک ثبوت ہے۔ اس ادارے نے ہزاروں علما اور خادمان دین پیدا کئے جنھوں نے اس ملک میں اسلامی علوم کی نشر واشاعت، کفر والحاد، مغربی تہذیب اور تخریبی طاقتوں کے ساتھ محاذ آرائی اور بدعات وخرافات کا مقابلہ کرنے میں قابل ستائش کردار ادا کیا اور آج بھی کر رہے ہیں۔

علمائے کرام معزز حاضرین!

آپ کو معلوم ہے کہ مملکت سعودی عرب اپنے قیام سے لے کے آج تک دنیا بھر میں مختلف طریقوں سے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کے لیے پیہم کوشاں رہی ہے اور خاص طور پر مسلم اقلیتیں اور ان کے مسائل ومشکلات سعودی عرب کی خصوصی توجہات کا مرکز رہی ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہمارے یہاں ایک مستقل وزارت برائے اسلامی امور قائم ہے جس کی سربراہی ایک کیبنٹ درجہ کے وزیر کرتے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں ہونے والے اسلامی کاموں کو مادی ومعنوی امداد بہم پہنچانا سعودی عرب اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے کہ یہی اسلامی اخوت اور اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے، لیکن ساتھ ہی سعودی عرب اس بات کا پوری طرح خیال رکھتا ہے کہ مسلمان جن ملکوں کے باشندے ہیں یا جہاں مقیم ہیں ان ممالک کے قوانین وضوابط کے احترام میں کوئی کمی نہ آئے، کیونکہ دوسرے ممالک کے معاملات میں دخل نہ دینا اور ان کے نظام اور قوانین کا مکمل احترام ملحوظ رکھنا سعودی عرب کی خارجہ پالیسی کا بنیادی جز ہے۔

علمائے کرام معزز حاضرین! جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ اسلام دین رحمت ہے۔ یہ دین،

اعتدال اور رواداری کا علم بردار ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ساری انسانیت پر اس دین برحق کے بے پناہ احسانات ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول علی صاحبہا الصلاۃ والسلام نے بنی نوع انسان کے لیے ترقی اور تمدن کی راہ روشن کی اور ایسے اصول وضوابط پیش کیے جو انسان کی زندگی منظم کرتے ہیں، اس کو سچائی کا راستہ دکھاتے اور گمراہی کی تاریکیوں سے بچاتے ہیں۔ لیکن آج کچھ ایسی کوششیں ہو رہی ہیں جن کا مقصد اسلام کی روشن اور صاف وشفاف تصویر کو داغدار کرنا ہے۔ آج اسلام کو تعصب، تشدد اور دہشت گردی سے جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے اور کبھی آزادی کے نام پر، کبھی انسانی حقوق کا سہارا لے کر اسلامی شریعت کو بدنام کرنے کی سعی کی جارہی ہے۔ ایسی صورت حال میں آپ جیسے علما و مفکرین سے توقع کی جاتی ہے کہ آپ ان کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کریں گے تاکہ اسلام کی سچی اور حقیقی تصویر دنیا کے سامنے آسکے۔

علمائے کرام معزز حاضرین!

میں آپ کی خدمت میں خادم حرمین شریفین شاہ فہد بن عبدالعزیز، ان کے ولی عہد شہزادہ عبداللہ بن عبدالعزیز، نائب وزیر اعظم دوم شہزادہ سلطان بن عبدالعزیز اور سعودی عرب کی حکومت اور عوام کی طرف سے ہدیۂ سلام اور نیک تمنائیں پیش کرتا ہوں اور آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ حکومت سعودی عرب اپنی صالح قیادت کی زیر رہنمائی، دین برحق کی نصرت وحمایت اور مسلمانوں اور مسلم اقلیتوں کی خدمت میں پورے عزم وحوصلے کے ساتھ سرگرم عمل رہے گی۔ اسی طرح حکومت سعودی عرب نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ حرمین شریفین اور دیگر مقامات مقدسہ کی توسیع وتعمیر کے جو منصوبے زیر تنفیذ ہیں ان کو بحسن وخوبی انجام تک پہنچایا جائے گا اور حجاج وزائرین کرام کو زیادہ سے زیادہ آرام وراحت اور سہولت فراہم کرنے کے لیے مزید منصوبے روبہ عمل لائے جاتے رہیں گے۔ سعودی عرب کا اپنے آپ سے یہ عہد ہے کہ حجاج وزائرین کرام کو بہتر سے بہتر سہولیات بہم پہنچانے کے سلسلے میں کوئی کوشش اٹھا نہ رکھی جائے۔ اس مقصد کے لیے ہمارے یہاں ایک مستقل وزارت برائے حج قائم ہے جس کی سربراہی کیبنٹ درجے کے وزیر کے ہاتھوں میں ہے۔

آخر میں ایک بار پھر تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کے سیمینار کی کامیابی کے لیے اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں۔ ☆☆

ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی*

تعارفی کلمات

الحمدلله رب العالمین والصلوۃ والسلام علیٰ رسوله الکریم.

صدر محترم حضرت مولانا نظام الدین صاحب، علماء کرام، دانشوران عظام، مندوبین ومہمانان گرامی اور حاضرین جلسہ! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ایک ادنیٰ خادم کی حیثیت سے احقر اللہ تعالیٰ کا شکر گذار ہے کہ اس نے تنظیم کو اس امر کی توفیق اور سعادت سے نوازا کہ اس نے اسلام کے عظیم علم بردار، حق وصداقت کے مبلغ، علم وعرفان کے شہسوار، انسانی حقوق کے محافظ، اسلامی شریعت کے ترجمان، حکمت قرآن وسنت کے حامل وعالم حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کی حیات اوران کے زریں کارناموں پر سیمینار منعقد کیا۔ احقر اس سیمینار میں آپ کا خیر مقدم کرتا ہے اور آپ حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے کہ سخت گرمی اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے اپنے عظیم محسن کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے آپ یہاں تشریف لائے۔

حضرات! تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ یہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کی ذات بابرکات ہی تھی جو نہ صرف یہ کہ ظلم واستبداد اور استعماریت کے خلاف برہنہ تلوار بن گئی تھی بلکہ جس نے برصغیر میں اسلامی تعلیم کے مراکز ومدارس قائم کرکے انگریزوں کا طاقت کے بل پر اسلام کا چراغ بجھانے کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہونے دیا اور اسلامی تعلیمات کو دلائل وبراہین کے زیور سے آراستہ کرکے گھر گھر پہونچایا، آج جب فسطائی اور باطل طاقتیں مدارس اسلامیہ اور اسلامی اقدار کو مٹانے کی کوشش کررہی ہیں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت وسیرت ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند اس سیمینار میں ملک کے ممتاز علماء، محققین اور

---

* ناظم اعلیٰ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند

دانشوروں کے ذریعہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی اوران کے زریں کارناموں کومنظرعام پر لاکر مسلمانانِ ہند کے لیے ایک نمونۂ عمل پیش کرنا چاہتی ہے تاکہ وہ حضرت نانوتوی کی مانند اسلامی درس گاہوں اور اسلامی اقدار کی حفاظت کے لیے عزم وحوصلہ کے ساتھ سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

حضرات! تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ عظیم اسلامی دانش گاہ دارالعلوم کے فضلاء اور علماء کی تنظیم ہے۔

جیسا کہ آپ حضرات جانتے ہیں حضرت مولانا نانوتویؒ کا اس ادارہ کو قائم کرنے کا مقصد صرف ایک مخصوص نصاب تعلیم کی تدریس نہیں تھا بلکہ ایسے باصلاحیت اورصاحب عزم افراد تیار کرنا تھا جو اسلامی علوم پر مکمل عبور اور مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ وقت کے ہر طرح کے چیلنج کا جواب دیتے ہوئے اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور وہ یہ ثابت کرسکتے ہوں کہ انسان کے تمام مسائل کا حل صرف اسلام کے نظریۂ حیات میں ہے جو ۱۸۵۷ء کی انگریزوں کے ہاتھوں شکست کو علم وشعور کے ہتھیار کے ذریعہ فتح وکامرانی میں تبدیل کرسکتے ہوں جو غیروں کے قائم کردہ تعلیمی اداروں پر انحصار کرنے کے بجائے خود اپنی تعلیم گاہیں قائم کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں جو دوسروں کی غلامی اور تابعداری کے بجائے قیادت وسیادت کی صلاحیت اور عزم وحوصلہ کے ذریعہ امت مسلمہ کو عزت و وقار سے ہم کنار کرسکتے ہوں۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ کی تربیت کے ذریعہ حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ، حضرت شیخ الہندؒ، مولانا محمود حسنؒ، حضرت مولانا احمد حسن امروہویؒ، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ وغیرہ جیسی شخصیات پیدا ہوئیں جن کی خدمات ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کے زریں باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی وفات کے بعد ان کے تلامذہ نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ تربیت کا جو کام حضرت الاستاذ تنہا انجام دیتے تھے اب اسی کام کو فضلاء دارالعلوم اجتماعی طور پر انجام دیں اور اسی مقصد کے لیے ایک تنظیم کی تشکیل دی جائے۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ، مولانا محمود حسنؒ کی سرپرستی اور حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کی زیر نظامت، فضلاء دارالعلوم کی پہلی تنظیم جمعیت الانصار کے نام ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء میں قائم ہوئی اس کے دو شاندار جلسے مرادآباد اور میرٹھ میں ہوئے لیکن جب حضرت

مولانا سندھیؒ حضرت شیخ الہندؒ کی ایماء پر دیوبند سے دہلی آ گئے تو انہوں نے مسجد فتح پوری میں نظارۃ المعارف قائم کی اور پھر جامعہ اسلامیہ میں بیت الحکمۃ کے ذریعہ اسی مقصد کو عملی جامہ پہنانے کا نظم کیا۔

۱۳۷۸ھ م ۱۹۶۳ء میں دارالعلوم کی مجلس شوریٰ نے فیصلہ کیا کہ دارالعلوم میں تنظیم ابنائے قدیم کا دفتر کھولا جائے تا کہ دارالعلوم اور فضلاء کے مابین رابطہ قائم کیا جاسکے۔ اضلاع اور صوبوں میں بھی اس کے مراکز کھولے گئے لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اس میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ اس کے بعد دارالعلوم کے صد سالہ اجلاس کے موقع پر اس تنظیم کی پھر تشکیل نو ہوئی اور اس نے کافی عرصہ کام کیا مگر اس کی سرگرمیاں پھر مسدود ہو گئیں اگر چہ اس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس باقی تھا۔ چنانچہ ۴؍جون ۱۹۹۰ء کو حضرت مولانا قاضی زین العابدین سجاد مرحوم اور حضرت مولانا وحید الزماں کیرانویؒ کی سرپرستی، مولانا افضال الحق قاسمی، مولانا سید احمد ہاشمی، مولانا محمد عبداللہ مغیثی، مولانا عمید الزماں کیرانوی، مولانا محمد مزمل الحق الحسینی، مولانا آس محمد گلزار قاسمی اور احقر کی کوششوں سے جیون بخش ہال مسجد فتح پوری میں فضلاء دارالعلوم کا ایک بڑا اجتماع منعقد ہوا اور تنظیم کی تشکیل نو کی گئی۔ الحمدللہ دس سال سے نہایت استقلال، استقامت، اخلاص اور تندہی کے ساتھ تنظیم کام کر رہی ہے اس کا باقاعدہ ایک دستور ہے۔ حضرت نانوتویؒ کے رہنما اصولوں کی روشنی میں تنظیم نے فضلائے دارالعلوم کے لیے ایک عملی پروگرام مرتب کیا ہے جس میں فضلا کی علمی، فکری، تعلیمی، سماجی، اصلاحی تربیت کے لیے ہدایات دی گئی ہیں۔

تنظیم کی جانب سے ہر مہینہ پابندی کے ساتھ ترجمان دارالعلوم کے نام سے ایک مجلّہ شائع ہوتا ہے جس کے ذریعہ دارالعلوم کا مسلک، اکابر دارالعلوم کے افکار و نظریات اور فضلائے دارالعلوم کا خودنوشت تعارف شائع کیا جاتا ہے۔

حضرات! تنظیم کا بنیادی مقصد دارالعلوم کے تمام ابنائے قدیم کے درمیان اتحاد و محبت اور یکجہتی کے جذبات اجاگر کرنا اور ہر طرح کے اختلاف وافتراق کو ختم کرنا ہے۔ ابنائے قدیم کے مابین اختلاف کو تنظیم، تحریک دارالعلوم کے لیے نہایت مضر اور نقصاندہ تصور کرتی ہے چنانچہ آج ہم جب اپنی مادر علمی کے بانی کی شخصیت اور خدمات پر تاریخ میں پہلی مرتبہ ایک سیمینار منعقد کر رہے ہیں ہم نے تمام فرزندان دارالعلوم کو خواہ ان کا تعلق کسی بھی جماعت یا ادارہ سے ہو اس سیمینار میں مدعو کیا ہے۔

حضرات! ہماری تنظیم کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنی مادری علمی کی فلاح و بہبود اور اس کی علمی وفکری ترقی اور اس کو عالمی دانش گاہوں میں امتیازی مقام دلانے کے لیے جدوجہد کرے اور اس سلسلہ میں ہر طرح کی کوشش کو وہ اپنے لیے باعث سعادت سمجھتی ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہماری مادر علمی دارالعلوم کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ کی خواہش اور منصوبہ کے مطابق ترقی کے اعلیٰ منازل سے نوازے اور نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بلکہ عالم اسلام اور پوری انسانیت کو اس کے ذریعہ فیض وہدایت حاصل ہو۔ آمین ثم آمین۔

مولانا محمد مزمل الحق الحسینی*

حرفے چند

بانیٔ تحریک دیو بند الامام محمد قاسم النانوتویؒ کے علوم و معارف کی فہم وتفہیم، ان کے افکار ومواقف پر ریسرچ اور تحقیق، ان کی حیات وخدمات کے گوشوں اور پہلوؤں کا احیاء وتذکیر، فرزندانِ قاسمی پر ایک ایسا واجب الادا قرض تھا جو تقریباً ڈیڑھ صدی سے ان کے کاندھوں کو بوجھل اور نگاہوں کو شرمسار کیے ہوئے تھا۔ الامام محمد قاسم النانوتویؒ سیمینار کے انعقاد کے ذریعے تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو اللہ رب العزت نے اس قرض کی ادائیگی کی جانب پیش رفت کی خصوصی توفیق نصیب فرمائی یہاں تک کہ دیکھنے والی آنکھیں اور بولنے والی زبانیں پکار اٹھیں کہ علماء دیوبند کی حالیہ تاریخ میں اس اجتماع سے زیادہ پُر وقار اور نتیجہ خیز اجتماع منعقد نہیں ہوا۔

الامام محمد قاسم النانوتوی سیمینار کے مقاصد میں ایک اہم مقصد ذمہ داران وارکانِ تنظیم کی ایک آرزو کی تکمیل تھا اور وہ آرزو یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صد سالہ کے بعد اکابر دیوبند پھر ایک اسٹیج پر جمع ہو کر علما اور مسلمانوں کی نئی نسلوں کو اتحاد واتفاق کا پیغام دیں۔ اللہ کا فضل ہے کہ ان مؤمنین مخلصین کی یہ پاکیزہ آرزو بھی بڑی حد تک پوری ہوئی اور سیمینار کو جماعت کے تقریباً سبھی اکابر اور بزرگوں کی تائید وسرپرستی حاصل رہی۔

سیمینار کے انعقاد کا ایک اہم ترین مقصد مستقبل میں تنظیم سے وابستہ ہونے والے علما و فضلاء پر افکار قاسمیہ کو واضح کرنا تھا تا کہ وہ ان سے روشنی پا کر اپنے علمی وعملی مستقبل کی مضبوط اور سیدھی بنیاد قائم کر سکیں۔

اکابر کی سرپرستی

سیمینار کو جماعت کے تقریباً سبھی اکابر کی سرپرستی اور دعائیں حاصل تھیں تیاریوں کے

---

* کارگزار ناظم اعلیٰ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند-نئی دہلی

دوران عارف باللہ حضرت مولانا محمد صدیق باندوی رحمۃ اللہ علیہ دہلی تشریف لائے تو مسجد خواجہ پیر فرینڈس کالونی میں راقم سطور نے حضرت کو سیمینار کے انعقاد کے فیصلے کی اطلاع دیتے ہوئے دعا کی درخواست کی، حضرت نے راقم کے سر پر ہاتھ رکھا اور مجموعۂ عام میں ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ: ''اللہ پاک اس اجتماع کو اپنے دین کے لیے قبول فرما اور منتظمین کی غیب سے امداد فرما'' سیمینار کی مجالس نے پالیسی کے طور پر طے کیا تھا کہ سیمینار میں سبھی اکابر کو پوری اہمیت اور احترام کے ساتھ مدعو کیا جائے گا، چنانچہ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید اسعد مدنی صدر جمعیۃ علماء ہند، حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی اور حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی دامت برکاتہم کو باقاعدہ سیمینار کا سرپرست نامزد کیا گیا تھا اور نامزدگی کے فوراً بعد ان اکابر کو اس نامزدگی کی اطلاع بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک کردی گئی تھی اسی کے ساتھ سیمینار کے دفتر سے شائع ہونے والے کتابچوں میں ان کے ناموں کی اشاعت بھی کردی گئی تھی حضرت مولانا محمد تقی عثمانی، حضرت مولانا عبداللہ کاپودروی، حضرت مولانا قاری عبداللہ سلیم، حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی اور حضرت مولانا یعقوب اسماعیل منشی کی تائید و دعائیں ان کے گرامی ناموں سے موصول ہوئی تھیں۔ اسی طرح فضلا دیوبند مقیمین سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، کویت اور قطر کے حلقوں میں بھی سیمینار کا زبردست خیر مقدم کیا گیا تھا خاص طور پر مولانا محمد شمشاد قاسمی جدہ، مولانا جمیل الرحمٰن قاسمی ریاض، مولانا عبدالرحیم قاسمی دبئی، مولانا لئیق اللہ خاں جدہ، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز قطر، ڈاکٹر عبدالقادر خاں قطر، مولانا حفظ الرحمٰن ملک ریاض، عبدالوحید حیدرآبادی ریاض، مولانا عبدالحفیظ صدیقی جدہ اور مولانا طاہر الاسلام قاسمی مکہ مکرمہ وغیرہ کی جانب سے دعاؤں اور خیر مقدمی کلمات پر مشتمل والا نامے موصول ہوئے تھے۔

ستمبر ۱۹۹۸ء میں مجلس عاملہ کی جانب سے سیمینار کی قرارداد کی توثیق کے بعد تنظیم کے ایک چھ رکنی وفد نے جس میں ناظم تنظیم جناب مولانا آس محمد گلزار قاسمی اور ممبران مشاورتی بورڈ جناب مولانا محمد سلیمان قاسمی، مولانا بشیر احمد راشد الامینی مرحوم، مولانا محمد رضوان اختر قاسمی، قاری عبدالرحمٰن عابد اور راقم سطور شامل تھے۔ اکابر کے مشوروں، دعاؤں اور اطلاع کے لیے دیوبند، سہارنپور، مغربی یوپی

اور دہلی کے دینی تعلیمی مراکز کا دورہ کیا تھا۔ خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا سید انظر شاہ کشمیری، حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور، حضرت مولانا محمد طلحہ صاحب سرپرست مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا محمد یونس صاحب شیخ الحدیث مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا محمد سلمان مظاہری ناظم مظاہر علوم سہارنپور، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ دہلی، حضرت مولانا محمد عبداللہ مغیثی مہتمم جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ میرٹھ نے سیمینار کے لیے از راہ تبرک وتعاون اپنی جیب خاص سے عطیات پیش فرمائے اور دعاؤں سے نوازا۔ دیوبند کے مذکورہ سفر میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم نے اپنی جیب خاص سے دوسو روپیہ کا جو عطیہ عنایت فرمایا وہ سیمینار کے لیے حاصل ہونے والا سب سے پہلا عطیہ تھا۔ اس سفر میں حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم سے شرف ملاقات حاصل نہ ہوسکا تھا۔ اکابر کے مشوروں اور دعاؤں کے ساتھ سیمینار کی تیاریاں شروع کردی گئیں اور پھر چند ہی مہینوں بعد جنوری ۱۹۹۹ء میں تنظیم کا ایک اور دورکنی وفد جس میں راقم سطور اور ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز شامل تھے اکابر کو تیاریوں کی اطلاع اور شرکت کی دعوت دینے کے لیے دیوبند گیا۔ سیمینار کے لیے چلائی جانے والی اس مہم کے دوران حضرت مولانا محمد اختر صاحب مہتمم جامعہ اسلامیہ ریڑھی تاجپور، حضرت مولانا محمد اسلم صاحب مہتمم مدرسہ کاشف العلوم چھٹمل پور، حضرت مولانا محمد حنیف صاحب مہتمم مدرسہ خادم الاسلام باغوں والی، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب قاسمی مہتمم مدرسہ ناشر العلوم پانڈولی، حضرت مولانا حسین احمد صاحب خانقاہ محمودیہ پانڈولی، حضرت مولانا مفتی عبدالرحمٰن صاحب مفتی اعظم مدرسہ امینیہ دہلی، حضرت مولانا عبدالغفار صاحب صدر المدرسین مدرسہ عالیہ فتحپوری، ڈاکٹر معین الدین بقائی مہتمم مدرسہ حسین بخش، حضرت مولانا عبدالغفار صاحب مہتمم مدرسہ بیت العلوم جعفرآباد، حضرت مولانا شعیب انجم وحضرت مولانا زبیر احمد جامعی صاحبان مہتمم مدرسہ شمس العلوم شاہدرہ، حضرت مولانا روض الدین صاحب مرحوم مہتمم مدرسہ مصباح القرآن سیلم پور نے بھی خصوصی عطیات عنایت فرمائے۔

جون ۱۹۹۹ء میں سیمینار کی مجلس علمی ومجلس انتظامی کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوا اس اجلاس میں

حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب اور حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی صاحب دامت برکاتہم نے بھی شرکت فرمائی۔ اجلاس کی صدارت حضرت مولانا محمد سالم قاسمی ہی نے فرمائی۔ ذمہ داران تنظیم نے جب ان دونوں اکابر کو تنظیم کے اس متفقہ فیصلے کی اطلاع دی کہ سیمینار میں دیوبند کے سبھی اکابر کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی صاحب دامت برکاتہم مجلس سرپرستان میں شامل ہیں تو اس پر حضرت مولانا سید انظر شاہ صاحب دامت برکاتہم نے فرمایا کہ: حضرت مولانا سید اسعد مدنی سے میرا مختلف طرح کا تعلق ہے، ایک تو یہ کہ وہ میرے استاد زادے ہیں دوسرے یہ کہ وہ میری جماعت کے بزرگوں میں ہیں ان دونوں حیثیتوں سے میں ان کا غایت درجے احترام کرتا ہوں اور مجھے ان کی شرکت پر کوئی اختلاف نہیں اور پھر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا کہ یہی موقف حضرت مولانا کا بھی ہے، حضرت نے اس کی تائید فرمائی۔

ان دونوں بزرگوں کی وسعت ظرفی سے تنظیم اور سیمینار کے ذمہ داران کو بے انتہا تقویت اور حوصلہ حاصل ہوا اور تنظیم کا ایک اعلیٰ سطحی وفد جس میں تنظیم کے صدر حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی، ناظم اعلیٰ ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی اور راقم سطور شامل تھے حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب دامت برکاتہم سے سیمینار کی صدارت یا افتتاح کی درخواست کرنے کے لیے بجنور حاضر ہوا، ان دنوں حضرت علالت کے سبب بجنور ہی میں قیام پذیر تھے، لیکن اسی دن اتفاق سے حضرت کی طبیعت غیر معمولی طور پر شدید خراب ہوئی اور وہ وفد کے پہنچنے سے کچھ ہی دیر پہلے بجنور سے دہلی کے لیے روانہ ہو چکے تھے جہاں وہ بعد میں اپولو اسپتال میں داخل ہوئے۔ اسپتال میں حضرت مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی، حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی، حضرت مولانا ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی، حضرت مولانا ڈاکٹر بدرالدین الحافظ کنوینر مجلس علمی (ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز کے قطر چلے جانے کے بعد ڈاکٹر موصوف کو مجلس علمی کا کنوینر منتخب کیا گیا تھا)، مولانا عبدالستار سلام قاسمی انچارج دفتر سیمینار اور راقم سطور نے حضرت کی عیادت کی، عیادت کرنے والوں میں راقم سطور کا نمبر سب سے بعد میں تھا، گفتگو کے دوران حضرت نے از راہ شفقت و محبت فرمایا کہ اب تم دیوبند کیوں نہیں آتے ہو؟ میں نے چہرے پر قدرے بشاشت دیکھ کر سیمینار کی صدارت، افتتاح یا کم از کم کچھ دیر کے لیے ہی سہی

شرکت کی درخواست کی اس پر حضرت نے فرمایا کہ میں اس سیمینار میں ضرور شرکت کرتا مگر ڈاکٹروں نے معمولی نقل وحرکت سے بھی منع کیا ہے چہ جائیکہ سفر کا عزم کیا جائے اور شاید یہ صورت حال اگلے دنوں تک باقی رہے گی۔ اس سے قبل حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم سے بھی رابطے کی مختلف کوششیں کی جاچکی تھیں جو ناکام ہوئیں۔ سیمینار سے کچھ دن قبل ذمہ داران سیمینار کا حضرت سے براہِ راست رابطہ ممکن ہوا تو حضرت نے شرکت سے معذرت فرمادی ؛

سیمینار کے افتتاحی اجلاس منعقدہ تال کٹورا انڈور اسٹیڈیم میں جب جماعت دیوبند کے سبھی حلقوں کے اکابر واصاغر تقریباً چار ہزار کی تعداد میں جمع ہوکر بانیٔ تحریک الامام محمد قاسم النانوتوی کو خراج عقیدت پیش کررہے تھے اور جماعتی اتحاد واتفاق کا ایک روح پرور مظاہرہ ہورہا تھا تو دل میں بار بار یہ حسرت کروٹیں لے رہی تھی کہ کاش ہماری کوششیں کامیاب ہوتیں اور حضرت مولانا سید اسعد مدنی دامت برکاتہم بھی کسی طرح سیمینار میں شرکت فرمالیتے تو اپنوں اور پرایوں میں کس قدر وقار بلند ہوتا۔

منصوبہ بندی ونگرانی

تنظیم کے موجودہ کارگزار صدر حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی دامت برکاتہم کی سرپرستی ونگرانی میں فضلا دیوبند پر مشتمل تنظیم کی مستقل مجلس عمل نے مجلس عاملہ کی قراردادوں کی روشنی میں سیمینار کی مکمل منصوبہ بندی اور اس کو مرحلہ بہ مرحلہ آگے بڑھانے کا کام انجام دیا، سیمینار کے انعقاد اور اس کی کامیابی میں اس مجلس کا کردار انتہائی اہم اور کلیدی تھا اس کی دیگر ذمہ داریوں میں سیمینار کے علمی کاموں کی ترتیب وتبویب اور مراجعت، سیمینار کی مختلف مجالس کی قراردادوں کو عملی جامہ پہنانا، فراہمی مالیات کی سبیلیں سوچنا اور ان پر عمل پیرا ہونا، ہر طرح کے علمی وانتظامی کاموں کی نگرانی کرنا ہر ہفتہ کارکردگی کا جائزہ لینا اور آئندہ ہفتہ کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا شامل تھا۔ یہ مجلس دراصل تنظیم کی ایک مستقل منظور شدہ مجلس ہے جو کارگزار صدر حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی کی نگرانی میں تنظیم کی پالیسیوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکمتِ عملی تیار کرتی ہے اور ہر ہفتہ اس کی کارکردگی کا جائزہ لے کر آئندہ کے لیے لائحہ عمل طے کرتی ہے۔ اس کے ارکان میں حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی کے علاوہ جناب مولانا فرید الزماں کیرانوی، مولانا بدر الزماں کیرانوی، مولانا خالد القاسمی، مولانا اسعد

الاعظمی اور راقم سطور شامل ہیں حسب ضرورت تنظیم اور دفتر کے دیگر ذمہ داران کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔

مجلس علمی و مجلس انتظامی

تنظیم نے الامام محمد قاسم النانوتوی سیمینار کے انعقاد کا فیصلہ اپنی مجلس عاملہ کے دوسرے اجلاس (منعقدہ اپریل ۱۹۹۱ء بمقام دولت کدہ حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی صاحب) میں جناب ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی ناظم اعلیٰ تنظیم کی تحریک پر کیا تھا لیکن چونکہ اس دوران تنظیم اپنے ابتدائی اور تشکیلی مراحل سے گزر رہی تھی اور وہ اس عظیم المرتبت ذمہ داری کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی اس لیے تقریباً سات سال بعد ستمبر ۱۹۹۸ء میں مجلس عاملہ نے اپنی اس تجویز کی توثیق کر کے مجلس علمی وانتظامی کی تشکیل کی، سیمینار کی یہ دونوں مجلسیں ملک کی تقریباً ایک سو اہم علمی اور سماجی شخصیتوں پر مشتمل تھیں، مجلس علمی کا کنوینر معروف شاعر اور ادیب اور قطر میں تنظیم ابنائے قدیم کے صدر ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز کو اور مجلس استقبالیہ کا جنرل سکریٹری ملک کی معروف ادبی وسماجی شخصیت جناب ڈاکٹر سید فاروق احمد (ہمالیہ ڈرگس) کو منتخب کیا گیا تھا، صدارت کے لیے دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ کے رکن، امیر شریعت بہار واڑیسہ و جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا سید نظام الدین دامت برکاتہم کا انتخاب عمل میں آیا تھا، طے شدہ پالیسی کے تحت سیمینار کی تمام اہم ذمہ داریاں غیر جانب دار اور غیر مختلف فیہ شخصیات کو سپرد کی گئی تھیں تا کہ ہر حلقے کے لیے بلا تامل شرکت کا دروازہ کھلا رہے۔

فراہمی مالیات اور دیگر انتظامات

بجٹ کے خاصا بڑا ہونے اور تنظیم کے وسائل انتہائی محدود ہونے کی بنا پر مالیات کا مسئلہ سنگین صورت حال اختیار کیے ہوئے تھا، ایک موقع پر جب اس کا تذکرہ حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کے سامنے کیا گیا تو حضرت نے فرمایا کہ حضرت نانوتویؒ کے حوالے سے کیے جانے والے کاموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہمیشہ بے سروسامانی کی کیفیت درپیش رہتی ہے مگر وسائل کی کمی کے باعث کوئی کام رکتا بھی نہیں اس سلسلے میں حضرت نے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے کچھ حیرت انگیز تجربات اور مشاہدات کا ذکر فرمایا اور ہمت دلاتے ہوئے کہا کہ آپ لوگ

کام کی ابتدا کریں وسائل غیب سے فراہم ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بے سروسامانی کے احساس نے بعد تک بھی پیچھا نہیں چھوڑا مگر اخراجات اور ضرورتوں کے مطابق وسائل بھی فراہم ہوتے رہے یہاں تک کہ مجلس عاملہ میں پیش کرنے کے لیے جب حسابات تیار کئے گیے تو کچھ قرض باقی تھا جو الحمد للہ بعد میں ادا ہو گیا۔

سیمینار کے لیے فراہمی مالیات کے سلسلے میں جن حضرات نے خصوصی مساعی انجام دیں ان میں حضرت مولانا عمید الزماں کیرانوی، جناب مولانا فرید الزماں کیرانوی، جناب ڈاکٹر سید فاروق احمد، جناب ڈاکٹر معین الدین بقائی (مرحوم) کے اسماء گرامی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی دامت برکاتہم اور جناب ڈاکٹر معین الدین بقائی کی خصوصی توجہ اور تحریک پر افتتاحی اجلاس کے طعام اور ایک گراں قدر رقم کی فراہمی کی ذمہ داری فصیل بند شہر دہلی کے ذمہ داران نے قبول فرمائی تھی جسے انھوں نے شایان شان انجام دیا۔

سیمینار کی تیاریوں کے مختلف مراحل میں ایک سو سے زائد فضلاء گرامی اور ممبران وارکان تنظیم نے اپنی رضا کارانہ خدمات پیش کی تھیں جن میں خصوصیت کے ساتھ مولانا آس محمد گلزار قاسمی ومفتی عطاء الرحمٰن قاسمی دہلی نظماء تنظیم، مولانا اعجاز اللہ دہلوی استاذ مدرسہ حسین بخش، مولانا محمد سلیمان قاسمی خطیب جامع مسجد جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، مولانا بشیر احمد راشد الامینی (مرحوم) مہتمم مدرسہ عربیہ پنج پیران، مولانا عبدالعزیز ظفر جنکپوری، جناب سید عارف میاں صاحب، قاری عبدالرحمٰن عابد، مولانا عبدالقادر شمس قاسمی، مولانا انوار الوفا اعظمی، مولانا محمد انیس شاہجہانپوری، مفتی محمد ارشد فاروقی استاد مظاہر علوم وقف سہارنپور، مولانا یعقوب بلند شہری ناظم تنظیم وترقی مظاہر علوم وقف سہارنپور، مولانا سعید احمد کشمیر، مولانا محمد رضوان اختر قاسمی آفس سکریٹری تنظیم ابنائے قدیم، مولانا عبدالستار سلام قاسمی انچارج دفتر سیمینار، مولانا وارث مظہری، مولانا نوشاد عالم قاسمی آفس انچارج دفتر تنظیم، مولانا بشیر احمد قاسمی استاذ مدرسہ حسین بخش، مولانا بشیر احمد قاسمی اجراڑہ، مولانا عبدالسمیع صاحب اجراڑہ، مولانا انور علی قاسمی، مولانا ذاکر الوحیدی اور مولانا ساجد علی قاسمی کے نام قابل ذکر ہیں، علاوہ ازیں دارالعلوم دیوبند، وقف دارالعلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور، مدرسہ امینیہ دہلی، جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ میرٹھ کے طلبا کی جماعتوں نے بھی اس تاریخی موقع پر رضا کارانہ خدمات کی سعادت حاصل

کی۔

اللہ کا فضل ہے کہ اکابر کی دعاؤں اور اصاغر کی جدوجہد کے نتیجے میں سیمینار کو شاندار اور تاریخی کامیابی نصیب ہوئی۔ سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں دہلی، نواح دہلی، مغربی و مشرقی اتر پردیش، ہریانہ، پنجاب، راجستھان، مدھیہ پردیش، آندھرا پردیش، مہاراشٹر، بہار، بنگال، اڑیسہ، گجرات، کشمیر اور ملک کے دیگر حصوں سے تقریباً چار ہزار فضلا نے شرکت کی اور پھر مسلسل تین یوم تک جامعہ ہمدرد کے اسکالرس ہال میں مقالات کی خواندگی کی نشستیں منعقد ہوتی رہیں جن میں تین سو سے زائد علما، دانشوروں اور محققین نے پوری دلجمعی اور فعالیت کے ساتھ شرکت فرمائی سہولت کے پیش نظر مدعوئین خصوصی اور مقالہ نگاروں کے قیام وطعام کا نظم جامعہ ہمدرد ہی کے اسکالرس ہاؤس میں کیا گیا تھا البتہ اسکالر ہاؤس میں جگہ کی قلت کے باعث کچھ مہمانوں کے قیام کا نظم جناب کمال احمد فاروقی صاحب کی خصوصی عنایت سے نیو ہورائزن پبلک اسکول نظام الدین میں رکھا گیا تھا۔

اہل دہلی کا شکایت آمیز مطالبہ

سیمینار کے لیے چلائی جانے والی عوامی مہم کے دوران اہل دہلی کی جانب سے کئی مجلسوں میں یہ شکایت آمیز مطالبہ سامنے آیا کہ دہلی اہل علم اور اعلیٰ سطحی دینی تعلیمی مراکز سے خالی ہوتی جارہی ہے لہٰذا دہلی میں کام کرنے والی تنظیموں کا فرض ہے کہ وہ دہلی کو مرکز بنا کر ملک کے دیگر حصوں میں دینی ادارے قائم کرنے کے ساتھ ساتھ دہلی میں بھی اعلیٰ سطحی دینی و تعلیمی مراکز قائم کریں تاکہ اس شہر کی تاریخی علمی عظمت کی بازیابی ممکن ہو سکے۔ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند سے اہل دہلی کا یہ مطالبہ اس بنیاد اور اعتماد پر تھا کہ بانی دیوبند حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی عملی و تعلیمی سرپرستی کا سہرا اسی سرزمین رجال ساز کے سر ہے، چنانچہ سیمینار کے بعد جب تنظیم اس کی قراردادوں اور سفارشات کو عملی جامہ پہنانے کی طرف متوجہ ہوئی تو اس نے دہلی میں ایک اعلیٰ سطحی تعلیمی و دینی ادارے کے قیام کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا اور ۲۰۰۳ء میں عربی زبان وادب میں تخصص کے لیے "**معهد التخصص في اللغة العربية**" کے نام سے ایک تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی یہ ادارہ دراصل ایک طویل المدت اور وسیع تعلیمی منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی طرف پہلا قدم ہے اگر اس ادارے کو عوام وخواص کی سرپرستی حاصل رہی تو منصوبے کے تحت تفسیر، حدیث، قضا، تربیت معلمین اور انگریزی وغیرہ میں بھی تخصص کے شعبے قائم

کیے جائیں گے اور پھر انھیں ایک جامعہ کے تحت لے آیا جائے گا انشاء اللہ

مقالات کا مجموعہ

حضرت نانوتویؒ کی حیات و خدمات پر اگر چہ وقتاً فوقتاً اہل علم کی کچھ انفرادی کاوشیں منظر عام پر آتی رہی ہیں مگر الامام محمد قاسم النانوتوی سیمینار دیوبند کی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ تاریخ میں پہلا موقع تھا جب فرزندان و خوشہ چینان دیوبند نے اس عظیم پیمانے پر اپنے محسن اعظم کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور ان کے افکار و خدمات پر بیش بہا کاوشیں اور تحریریں اجتماعی طور پر سامنے لانے کی سعی کی۔ مقالات کا پیش نظر مجموعہ انھیں کاوشوں اور تحریروں کا مرقع ہے جو انشاء اللہ العزیز حضرت الامام کی حیات افکار اور خدمات کے احیاء و تذکیر کا سبب اور چراغ باز روغن دادہ کا مصداق ثابت ہوگا۔

حضرت الامام کے افکار و معارف پر کوئی مضمون لکھنا دراصل ایک ایسی چٹان سے ہیرا نکالنے کے مترادف ہے جس میں ہیروں کے زبردست ذخائر موجود ہوں لیکن اس کے عمق تک رسائی کے لیے تیشۂ فرہاد کی ضرورت ہو اس کا اندازہ مقالوں کی تدوین کے دوران مقالہ نگاروں کی جبینان عرق عرق کو دیکھ کر بار بار کیا جارہا تھا اس سیمینار کے لیے جن محققین نے مقالہ نگاری کا کارنامہ انجام دیا ہے وہ جوئے شیر لانے کے مترادف اور ان کے پایۂ علم و تحقیق کی مضبوطی اور بلندی کی دلیل ہے۔

سیمینار کے لیے تیار کی گئی عنوانات کی فہرست میں کچھ عنوانات ایسے ہیں جن پر مقالات نہیں لکھے جاسکے ہیں اس میں زیادہ تر تو مذکورہ دشواری ہی کو دخل ہے لیکن بعض مقالے اس دوران مفوض الیہ شخصیات کی غیر معمولی اور ہنگامی مصروفیتوں کی وجہ سے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ طے کیا گیا تھا کہ سیمینار کے بعد ہی سہی ان عنوانات پر مقالے لکھوا کر مجموعے میں ایک خصوصی گوشے کی حیثیت سے شامل کردیے جائیں گے مگر مختلف وجوہات کی بنا پر یہ ممکن نہ ہوسکا اب یہ عنوانات کھلے طور پر اہل علم و تحقیق کی خدمت میں پیش ہیں اگر کوئی صاحب ان پر خامہ فرسائی کرنا چاہیں تو دفتر تنظیم سے طلب فرما کر سعی فرماسکتے ہیں، اشاعت کے لیے ماہنامہ ترجمان دارالعلوم کے صفحات میں بھی ان کا خیر مقدم ہے اور مجموعے کی اگلی اشاعتوں میں بھی شامل اشاعت کرنے پر غور کیا جاسکتا ہے چونکہ اب لکھنے والوں کے لیے وقت کی قلت و تحدید مانع نہ ہوگی اس لیے ان موضوعات پر اعلیٰ تحقیقات سامنے آسکتی ہیں۔

سیمینار میں مقالات کی خواندگی کا سلسلہ اگرچہ محققین و منتظمین کی پوری فعالیت اور جفاکشی کے ساتھ تین دن تک جاری رہا لیکن پھر بھی تمام مقالوں کی خواندگی ممکن نہ ہوسکی جن اہل قلم کے مقالات سیمینار میں نہیں پڑھوائے جاسکے ان میں اہم شخصیات شامل ہیں ان مقالات میں سے کچھ تو شامل اشاعت ہیں لیکن کچھ کو مجموعے کی طوالت یا کسی اور اہم مجبوری کے تحت شامل اشاعت نہیں کیا جارہا ہے ہم اس زمرے کے تمام اہل قلم کی خدمت میں معذرت پیش کرتے ہیں والعذر عند کرام الناس مقبول.

دارالعلوم دیوبند حضرت الامام کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کے ذکر کے بغیر ان کی خدمات کا تذکرہ ناقص اور ادھورا ہے لیکن یہ ایک ایسا بحر ناپیدا کنار ہے جس کی گہرائیوں اور وسعتوں کو ناپنے کے لیے خود ایک مستقل سیمینار بلکہ سیمیناروں کی ضرورت ہے اس لیے مجلس علمی نے حضرت الامام کی خدمات کے اس پہلو کو کم چھوا ہے بلکہ اپنی زیادہ تر توجہ ان کی شخصیت اور افکار پر مرکوز کی ہے۔

مجموعے میں شامل مقالات جہاں حضرت الامام کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالتے ہیں وہیں ہمارے لیے فکر وعمل کے نئے گوشے اور مجالات بھی واشگاف کرتے ہیں دعا ہے کہ اللہ رب العزت اس مجموعے کو قبول عام عطا فرمائے اور ہم سب کو اس سے بیش از بیش استفادے کی توفیق نصیب فرمائے آمین۔

پیغامات

پیغامات

مولانا محمد رابع الحسنی الندوی *

آج سے ڈیڑھ صدی قبل علماء حق نے برصغیر ہند میں استعماری نظام کے ملحدانہ وکافرانہ اثر کو روکنے اور دین کی حفاظت وبقا کے لئے جو کوششیں کیں ان میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا کام و مقام سرفہرست آتا ہے، انہوں نے اور ان کے رفقاء نے علوم دینیہ کی تعلیم کے ذریعہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کی دینی شخصیت سازی کے لئے موثر نظام تعلیم چلایا، جس نے دارالعلوم دیوبند کے ذریعہ ملک میں غیر معمولی اثر ڈالا، اس برصغیر میں غیر ملکی اور استعماری حکومت نے اسلام کی بقاء کے لئے جو رکاوٹیں کھڑی کردی تھی اور اپنی استعماری مصلحت کے لحاظ سے جو نظام ونصاب تعلیم جاری کیا تھا، اس کے اثرات کو روکنے میں اس ادارہ نے اور اس کے ہم مقصد دیگر اداروں نے بڑا کام انجام دیا، پھر اس عظیم کام کو علماء دین واخیار امت کی جو جماعت ملی اس نے نہ صرف یہ کہ مذہبی عقائد واقدار، شریعتِ اسلامی سے پختہ واقفیت اور علوم اسلامیہ سے مکمل شناسائی کا عظیم کام انجام دیا بلکہ امت کے لیے دین وتعلیمات دین سے پختہ واقف کاروں کی ایک تعداد تیار کردی، جس نے امت کی دینی وشرعی ضرورتوں کو پورا کیا اور امت کی دینی سرپرستی اس طرح کی کہ دین اپنی صحیح شکل میں محفوظ رہا اور اس کی حفاظت کے لیے افراد برابر تیار ہوتے رہے۔

یہ ایک زبردست کارنامہ تھا جس میں برصغیر کے مسلمان دنیا کے دیگر خطوں کے مقابلہ میں ممتاز ثابت ہوئے اور ان کا مفید اثر نہ صرف برصغیر کی ملت اسلامیہ پر پڑا بلکہ قرب وجوار کے دیگر ملکوں کے افراد ملت پر بھی پڑا، ہمارے یہ علمائے کرام جو اس عظیم دینی تعلیمی مرکز اور اسی قبیل کے دیگر دینی تعلیمی مرکزوں سے تیار ہوکر نکلتے رہے، علوم اسلامیہ سے واقفیت کے ساتھ علی العموم اخلاص لدین اللہ اور رضائے الٰہی کی طلب سے پورے طور پر متصف رہے۔ اُن کے اخلاص ودینداری نے امت اسلامیہ کے اخلاق وکردار کو سنوارنے اور بنانے میں بڑی مدد کی۔

آپ کا یہ سیمینار انشاء اللہ علوم اسلامیہ کے اس زعیم اور حفاظت دین کے انتظام کے اس

---

* ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

رہنما کے مقام کو یاد دلانے اور اس کے احسان کو سراہنے اور قدر کرنے کا فریضہ انجام دے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کو زیادہ سے زیادہ مفید بنائے اور اس کو امت کے سامنے ایک اعلیٰ نمونہ کے تعارف و تذکیر کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

مولانا عبداللہ سورتی کاپودروی*

امام محمد قاسم نانوتویؒ کے بارے میں سیمینار کی تجویز سے بے حد مسرت ہوئی، ابنائے قدیم دارالعلوم کو یہ سیمینار بہت پہلے منعقد کرنا چاہئے تھا۔ بہر حال اب بھی یہ سیمینار صحیح ڈھنگ سے کام کر کے پختہ عزم کے ساتھ ہو تو انشاء اللہ امت اسلامیہ کے لئے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی حیات میں بہت کچھ پیغام مل سکتا ہے۔

فتنۂ اکبری کے دفاع کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے فرزندانِ گرامی کو منتخب فرمایا تھا جنہوں نے اکبر کے ارتدادی فتنہ کا قلع قمع کر کے توحید و سنت کا احیاء فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے امت کی حفاظت فرمائی۔

اسی طرح ۱۸۵۷ء کے بعد امت اسلامیہ ہندیہ جس طوفان میں پھنس گئی تھی اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ اور ان کے رفقاء خصوصی حضرت امام محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے ذریعہ امت کی حفاظت کا سامان فرمایا۔

ہمارے ان بزرگوں نے سیاسی، علمی اور اصلاحی میدان میں وہ عظیم کارنامے انجام دیئے جس نے امت اسلامیہ کو حیاتِ نو بخشی اور اعداء دین کو ناکامی نصیب ہوئی۔ جزاهم الله عن جميع المسلمين خير الجزا.

۱۹۴۷ء کے بعد ملک میں پھر ایک تبدیلی آئی ہے اور آزادی کے ان پچاس سالوں میں جو احوال سامنے آرہے ہیں ان کا تقاضا ہے کہ حجۃ الاسلام امام محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور ان کے تلامذہ نے جس للہیت، قربانی اور دینی حمیت کے ذریعہ اسلام اور امت اسلامیہ کو بچایا تھا ان کے نام لیوا اسی دینی حمیت اور اخلاص وللہیت سے میدان میں آئیں اور طوفان کے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم ذمہ داری ابنائے دارالعلوم دیوبند اور دیوبندی مسلک کے

* ٹورنٹو، کناڈا

اداروں کے فضلاء پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے نقوش کی پیروی کریں پوری بصیرت، بلند ہمتی اور اتفاق واتحاد کے ساتھ جدید فتنوں کا مقابلہ کریں۔

فضلاء مدارس عربیہ اسلامیہ میں اپنے اسلاف کی روح پھونکنے کے لیے اس طرح کے سیمینار نیز ان بزرگوں کی سیرت وسوانح کی نشرواشاعت بہت ہی کارگر ثابت ہوسکتی ہے۔

امید ہے کہ اس سیمینار کے ذریعہ ہمارے اسلاف کا پیغام ہندوستان کے ہر ضلع اور ہر گاؤں میں پہنچے گا۔

ابنائے دارالعلوم کا فرض ہے کہ وہ موجودہ خطرناک موڑ پر اختلاف کو ختم کر کے امت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی فرمائیں۔توحید وسنت اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مضبوط وابستگی کے ذریعہ ہی امت صحیح اسلامی زندگی گذار سکے گی۔

امام محمد قاسم نانوتویؒ نے جس طرح مختلف میدانوں میں مجتہدانہ ومجاہدانہ کارنامے انجام دیے ہیں۔اس کو نشان راہ بنا کر چلنے میں ہی ہماری کامیابی ہے۔

ابنائے دارالعلوم دیوبند کو تعلیم اور اصلاح معاشرہ کے میدان میں آگے بڑھ کر کام کرنا چاہئے نیز امت میں اتحاد اور بھائی چارہ پیدا کرنے کی بھی کوشش کرنی چاہئے۔چھوٹے چھوٹے مسائل کو اہمیت دے کر اختلافات پیدا کرنا شدید نقصان کا باعث ہے۔اس لیے ابنائے دارالعلوم ایک دوسرے کو قریب کرنے اور پچھلی تلخیوں کو فراموش کرنے کی مخلصانہ جدوجہد فرماویں تو انشاء اللہ وہ ایک مضبوط قوت ثابت ہوں گے۔

مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی*

مجھے افسوس ہے کہ میں خاندانِ قاسم نادر اور اللہ کرے تاریخ ساز تقریب میں شرکت کی سعادت حاصل نہیں کر پا رہا ہوں۔لیکن دعا گو ہوں کہ حضرت بانی دارالعلوم کے نام پر ہونے والا یہ سیمینار اپنے بہترین مقاصد میں کامیاب ہو۔بہترین مقاصد کا تعین تو آپ اور آپ کے رفقائے کار فضلا ہی بہتر طور پر کر سکتے تھے۔اور یقین ہے کہ کیا ہوگا ایک خواہش مجھ دور افتادہ کے ذہن میں بھی ہے کہ اس موقع پر حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات، افکار اور کارناموں کے حوالے سے پیش کیا جانے والا مطالعہ فرزندانِ قاسمیہ کے دلوں میں بھی اس طرح کی اجتہادی فکر وبصیرت کا چراغ اپنے زمانے کی ضرورت

* مقیم حال لندن

کے مطابق روشن کر دے جس طرح کی مجتہدانہ فکر و بصیرت حضرت مرحوم کے عملی کاموں اور آپ کے خزانۂ علوم و معارف سے ٹپکتی ہے۔ دقائق اور مسائل کے بیان اور اثبات کے لیے جو طرز کلام اور نہج استدلال آپ نے اپنایا اس کے اچھوتے پن میں کسے کلام ہوگا؟ تاہم ہمارے زمانے کو اپنے مزاج کے مطابق طرز کلام اور منہج استدلال اپنانے کی ضرورت ہے۔

مولانا یعقوب اسمٰعیل منشی القاسمی*

انگریزی استعمار و استبداد نے جب برصغیر ہند میں اپنے پنجے مضبوط گاڑ لیے اور اپنی قوت و اقتدار کے بل پر برصغیر ہند کے مسلمانون کے اسلام و ایمان پر علمی و فکری اور عملی میدانوں میں مختلف نوعیت سے ڈاکہ ڈالنے کی سازشیں شروع کردیں مسلمانوں کو مرعوب کرنے اور عوام و علماء کا باہمی رشتہ ختم کرنے کے لیے برصغیر ہند کے ہزاروں مقتدر علماء کرام کو تختۂ دار پر لٹکا دیا تو اس وقت علماء کرام نے اسلام و ایمان کی خاطر اپنی قیمتی جانوں کے نذرانے اللہ کی بارگاہ میں پیش کیے۔

ایسے خطرناک دور میں برصغیر ہند کے مسلمانوں اور ان کی نسلوں کے اسلام و ایمان کی حفاظت و بقا امام الطائفہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی کوششوں کی مرہون منت ہے، اور ان کوششوں کی ایک مضبوط اور دائمی کڑی ''دارالعلوم دیوبند'' ہے۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ کے مقام کے بارے میں ان کے پیر و مرشد سید الطائفہ امام طریقت و معرفت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کی شہادت کافی ہے: فرماتے ہیں کہ اگر حق تعالیٰ شانہ مجھ سے دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لے کر آئے؟ تو مولوی رشید احمد اور مولوی محمد قاسم کو پیش کردوں گا۔ دارالعلوم دیوبند کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے بانی دارالعلوم کی حیاتِ طیبہ اور خدماتِ جلیلہ پر ہونے والے سیمینار میں استفادے کی غرض سے حاضری کی دعوت راقم کے لیے باعث سعادت ہے۔

راقم آپ بزرگوں کی دعوت و قدردانی کا مشکور ہے ''جزاکم اللہ خیرا'' اور دل سے دعا گو ہے کہ اللہ جل شانہ آپ حضرات کی مساعی جلیلہ کو قبول فرمائے اور سیمینار کو امت مسلمہ کے لیے بالخصوص فرزندانِ دارالعلوم کے لیے مشعلِ راہ بنائے۔ آمین۔ ☆

---

* رئیس مجلس تحقیقات شرعیہ، برطانیہ

پہلا باب

شخصیت اور حیات

مولانا محمد سالم قاسمی*

الامام محمد قاسم النانوتوی کی شخصیت کے امتیازی پہلو

حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ کی شخصیت ایک عہد آفریں اور تاریخ ساز عبقری شخصیت ہے جن کے امتیازات کو قلمی تحدیدات میں محدود کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے اس لئے کہ جسے قدرتِ فیاض کی جانب سے دعاویٔ منقولہ پر ناقابل شکست منقول براہین آفرینی سے منور وہ عقل عظیم عطا فرمائی گئی ہو کہ جس نے اسلام پر عقلی ہتھیاروں سے مسلح حملہ آوروں کو بار بار المناک شکست و پسپائی پر مجبور کر دیا ہو اور جسے ایمانِ کامل سے پُر نور وہ سراپا خشوع و خضوع قلب سلیم بخشا گیا ہو کہ جس نے طالبانِ راہ ہدایت کو حسبِ صلاحیت بہ نگاہ معنوی اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ کے مقامات تک رسائی عطا فرمادی ہو اور جسے حکمتِ قرآن کی ترجمان، وہ فیاض زبان مرحمت فرمائی گئی ہو کہ جس نے دین کے بارے میں شکوک و شبہات اور اعتراضات و تلبیسات کی دلدلوں میں پھنسنے والے محروم یقین طبقات کو دولتِ ایمان و یقین سے مالا مال فرما دیا ہو۔

غرض فہرستِ امتیازات بر سبیل اجمال یوں پیش کی جاسکتی ہے کہ جس کی ذات گرامی علم کتاب وسنت میں بے مثال، عالمگیر فکرِ اسلامی میں بے تمثال، ترتیبِ روحانی میں باکمال، زندگی کے ہر جزو کل میں متبعِ سنت، معلّمیت میں منفرد، طاعت و عبادت میں شب زندہ دار، اصلاح باطن میں ماحیٔ ذوق معصیت، علم و ورع میں مرادحق شناس، تصنیف و تالیف میں اطمینان آفریں نکتہ سنج، انفرادیت میں متین اور اجتماعیت میں متدین رہنمائے عظیم جیسے بیشمار بنیادی امتیازاتِ عظیمہ کی حامل ہو اور ان کا اعتراف اپنوں ہی نے نہیں، بلکہ مخالفین و اعداء اسلام نے بھی زبردست خراجِ تحسین پیش کر کے کیا ہو، اُس سراپا عظمت و امتیاز کی ذاتِ گرامی پر "سیمینار" کے صاحب فکر و نظر ارباب بست و کشاد نے راقم

---

* مہتمم وقف دارالعلوم دیوبند

بے بضاعت کو اس کے "ذکر امتیازات" پر مامور فرمایا ہے اس لئے سوچنا پڑتا ہے کہ تیرھویں صدی کے اس مجدد اعظم کے امتیازات پر قلم حرکت میں آئے تو کیسے آئے؟ کیونکہ انبیاء کرامؑ کی ذاتِ مقدسہ کے علاوہ کسی میں عہد آفریں شخصیت کے تمام نقوش حیات وخدمات کو اس طرح سمیٹنا کہ کوئی گوشہ اظہار وانکشاف سے رہ نہ جائے، نہ صرف ناممکن ہی ہے بلکہ امّت کے آفتابوں اور ماہتابوں کی تابناک تاریخ حیات کے نہاں خانوں سے اس کی کوئی مثال بھی بظاہر پیش نہیں کی جاسکتی......اس لئے اس نقطۂ فکر کے تحت کسی تاریخ ساز شخصیت کے امتیازات کا تذکرہ، مزید غیر معمولی اور مشکل ترین اہمیت کا حامل بن جاتا ہے:

۱۔ حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ کا وہ اولین اور بنیادی امتیاز کہ جو تمام دیگر مہتم بالشان امتیازات کا مورث ہے وہ "اتباع سنت" کا وہ فطری ذوق تھا کہ جس کو حق تعالیٰ نے چھ سال کی عمر میں ایک "رؤیائے صادقہ" کے ذریعہ اس معصوم بچے کی عظیم المرتبت اور تاریخ ساز شخصیت بننے کی امید کو توقع سے آگے بڑھا کر اہل علم وبصیرت بزرگوں کے لیے یقین میں تبدیل کردیا تھا جس کا اجمال یہ ہے کہ حضرت الامام نے چھ سال کی عمر میں خواب دیکھا کہ میں بیت اللہ شریف کی چھت پر کھڑا ہوں اور میرے ہاتھوں اور پاؤں کی تمام انگلیاں پانی کا چشمہ بنی ہوئی ہیں اور ان سے صاف وشفاف پانی نکل کر چار دانگ عالم میں پھیل رہا ہے۔

حضرت الامامؒ کے خاندانی عالم وبزرگ، استاذ الکل حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خواب سن کر تعبیراً فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ محمد قاسم کے ذریعہ دینی علم کا فیضان عالمگیر پیمانے پر جاری فرمائے گا۔" اس سچے خواب کی سچی تعبیر حضرت الامامؒ کے تاسیس فرمودہ اس دارالعلوم دیوبند کی صورت میں دنیا کے سامنے موجود ہے کہ جس کے عالمگیر فیضان پر کسی توضیحی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ اس اساسی امتیاز کے ذکر کے بعد، تعمیلاً للحکم، آغاز کلام کے لیے یہ عرض کرنا انشاء اللہ بے محل نہ ہوگا کہ تیرہ صدیوں پر مشتمل اسلام کی مسلّمہ عظیم علمی اور دینی شخصیات عظیمہ کے دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد ان کے بیشمار، صاحب فضل وکمال منتسبین وتلامذہ میں سے عام طور پر کسی ایک ہی کو قدرتِ فیاض نے ان کے علوم دقیقہ اور معارف عمیقہ کی تشریح وتحقیق کی توفیق سے نوازا ہے جیسے حضرت شمس

تبریزؒ عالم رنگ و بو سے پردہ کناں ہوئے تو ان کے کثیر التعداد تلامذہ میں سے حق تعالیٰ نے حضرت شیخ جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کو ان کے القائی علوم کی ترجمانی کی توفیق سے مشرف فرمایا۔

حافظ ابن تیمیہؒ کے علوم کے بحرِ ذخار سے ہزاروں سیراب ہوئے۔لیکن ترجمانی کی فضیلت ابن قیمؒ کا مقدر بنی، ابن حجر عسقلانیؒ مقبور ہوئے تو ان کے لاتعداد تلامذہ خدمت حدیث کے لئے مؤفق ہوئے،لیکن ترجمانی علومِ ابن حجر کا عز و شرف علامہ سخاویؒ کے حصّے میں آیا۔

صاحب فتح القدیر ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے بعد ان کے متنوع علوم کو ترجمانی کے ذریعہ آفاقی شہرت عطاء کرنے کا اعزاز قاسم ابن قطلو بغا کو نصیب ہوا۔

محسن ملّت، مسند ہند، محدث جلیل حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب وسنّت میں بے مثال استنباطی حکمت سے بے شمار فیضیاب ہوئے لیکن اس مشکل ترین حکمت آفریں علم کی ترجمانی کا شرف کبیر رب العزّت نے اُن کے عظیم المرتبت صاحبزادے حضرت شاہ عبد العزیزؒ کو عطا فرمایا اور سرتاجِ مشائخ کرام حضرت اقدس الحاج حضرت شاہ امداد اللہ صاحب تھانوی قدس سرہ کو لدنّی علوم اور مربیانہ معارف سے حق تعالیٰ نے بہرہ یاب فرمایا تھا ان کی ذات گرامی سے یہ عرفان اور فیضان بے شمار طالبین حق کو پہنچا۔لیکن فہم وفراست کی معقول ترین امتیازی بنیادوں پر امدادالٰہی علوم کی آخری گہرائیوں تک رسائی اور ان سے دُررِ نایاب وعجیب کی دریافت وترجمانی کا اعزاز عظیم حق تعالیٰ نے حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتوی قدس سرہ بانی دار العلوم دیوبند کو عطا فرما کر نہ صرف اس بحرِ ذخار کے برے بڑے شناوروں کو ہی صف مستفیدین میں شامل فرمادیا بلکہ یہ عرض کرنا مبالغہ سے قطعاً مبرّا ہے کہ سرزمین نانوتہ کے اس عظیم الافادہ ''شمس تبریز'' علوم ربّانیہ کے'' حافظ ابن تیمیہ'' آفاقی عظمت ووسعتِ فکر کے'' ابن حجر عسقلانی'' اور'' امداد الٰہی'' علوم لدنیہ کے ترجمان کو امت کے لاتعداد عظمائے علم کی رمز شناسی، زعمائے فکر کی دقت شناسی اور اپنی ذاتی عرفان مآبی کے شرف وامتیاز نے جس باعظمت مقام اختصاص پر فائز فرمادیا تھا اس نے ہمہ جہت ایمانی بزرگی اور مسلّم عرفانی برگزیدگی کے ساتھ آپ کی حیرتناک علمی اور استدلالی ندرت وقدرت کے اعتراف میں انصاف وعرفان ناشناسوں کو چھوڑ کر آج تک ہر دور کے منصف اہل علم وایمان، رطب اللسان بنے ہوئے ہیں۔

۳۔ حضرت الامامؒ کا یہ تیسرا امتیاز بھی قابل ذکر تاریخی اہمیت کا حامل ہے کہ جس طرح قدرت فیاض نے انھیں اپنے منفرد علوم عظیمہ کے ساتھ بیشتر مشاہیر اسلاف کرام کے علوم کا حامل بنایا تھا اُسی طرح اُن کے بعد ان کے بے نہایت نادر الوجود علوم عمیقہ کی ترجمانی وتوضیح بھی طرز مذکور کے مطابق کسی ایک فرد کے نہیں بلکہ راسخین فی العلم کی ایک پوری جماعت کے حصے میں آئی۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں صرف ان مخلص ترین عرفاءِ کاملین کے اسماءِ گرامی سپرد قلم کردوں کہ جنہوں نے حضرت الامام کے فیضان علم ومعرفت کے بعد کی نسلوں کو مستفید ہونے کی راہ ہموار فرمائی ہے اور حق تعالیٰ کے فضل وکرم سے راقم الحروف کو ان کی زیارت اور ان کی مبارک زبانوں سے دیگر اکابر رحمہم اللہ کے علاوہ وقتاً فوقتاً حضرت الامام کے ایمان آفرین کلمات وواقعات سننے کا شرف بھی حاصل ہوا۔ جو درج ذیل ہے:

(۱) محقق جلیل حکیم الامت حضرت اقدس مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سابق سرپرست دارالعلوم دیوبند۔ (۱)

(۲) امین علوم قاسمیہ جامع المعقول والمنقول استاذ الاساتذہ حضرت العلامہ مولانا محمد ابراہیم صاحب بلیاویؒ سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند۔

(۳) متکلم اسلام، محدث جلیل، دانائے رموز قاسمیہ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند۔

(۴) عارف جلیل، نمونہ اسلاف حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری رحمۃ اللہ علیہ۔

---

(۱) حضرت حکیم الامتؒ کے ذکر خیر کے اس موقعہ پر، اپنی تہی دستی کے اعتراف کے ساتھ، بطور تحدیث نعمت اس فضل خداوندی پر مشتمل واقعہ کا تذکرہ نہ کرنا ناسپاسی ہوگی کہ شوال ۱۳۶۲ھ میں احقر کو حضرت والد ماجد علیہ الرحمہ نے اپنی اس آرزو کی تکمیل کیلئے کہ احقر کے دروس عربیہ کا افتتاح حضرت حکیم الامتؒ سے کرائیں۔ احقر کو حضرت والد ماجدؒ نے اپنے سفر مدراس کی وجہ سے مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ اس خواہش پر مشتمل خط دے کر تھانہ بھون بھیجا چنانچہ حضرت حکیم الامتؒ نے ازراہِ شفقت وکرم درس نظامی کی اولین کتاب میزان الصرف بذاتِ خود پندرہ روز میں درساً درساً احقر کو پڑھا کر شرف تلمذ سے نوازا اور یہی نہیں بلکہ حضرت والد ماجد رحمہ اللہ سے تعلق خصوصی کے تحت اس پورے عرصہ میں احقر کو اپنا مہمان رکھ کر عزت بخشی۔ بوقت تحریر ہذا حضرت حکیم الامتؒ کے براہِ راست تلامذہ میں احقر کے علاوہ غالباً کوئی اور زمین پر سانس لینے والا موجود نہیں ہے۔

(۵) غواص بحر معارف، واقف اسرار حکم قاسمیہ، خطیب اعظم حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند۔

(۶) مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، سابق مفتی دارالعلوم دیو بند و بانی دارالعلوم کراچی۔

(۷) عالم ربانی، فقیہ عظیم حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمہ اللہ، بانی جامعہ اشرفیہ لاہور۔

(۸) مربی کامل، مثیل شیخ تھانوی حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ کراچی، (پاکستان)

(۹) مرشد کبیر حضرت مولانا شاہ مسیح اللہ خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جلال آباد، (مظفر نگر)

(۱۰) نمونۂ شیخ تھانوی حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ، الہ آباد۔

(۱۱) مستفید باکمال حضرت مولانا شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمہ اللہ، سابق مہتمم مدرسہ بیت العلوم، سرائے میر، اعظم گڑھ

(۱۲) عارف کامل حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھریؒ، بانی و سابق مہتمم مدرسہ خیر المدارس ملتان (پاکستان)

(۱۳) منیب باکی حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمہ اللہ پشاور (پاکستان)

(۱۴) عارف عرفانِ شیخ تھانوی حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمہ اللہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔

(۱۵) خطاطِ کبیر حضرت مولانا اشتیاق احمد صاحب، سابق صدر شعبۂ کتابت، دارالعلوم دیو بند۔

۴۔ حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی کے علم وقیع اور عالمگیر اسلامی فکر وسیع کے امتیاز کا جس طرح اعتراف وقت کے بلند پایہ علماء اسلام نے فرمایا ٹھیک اسی طرح دیگر مذاہب کے اختصاص علمی میں ممتاز شمار کیے جانے والے غیر مسلم اہلِ علم کو بھی آپ کی قوت استدلال اور ہر دعویٰ کو ثابت کرنے والے ناقابل شکست دلائل و براہین قائم کرنے کی بے مثال صلاحیت پر خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور

ہونا پڑا ہے۔

اس ذیل میں حضرت الامامؒ کی جانب سے معاندین اسلام کے حملوں کے ان دنداں شکن جوابات کو بلاخوف وتردد پیش کیا جاسکتا ہے کہ جنہوں نے اعداء اسلام کی زبانوں کو نہ صرف گنگ کردیا تھا بلکہ عقلِ انسانی کو براہِ راست اپیل کرنے والے اُن جوابات کو سنکر بدترین دشمنانِ اسلام نے اپنی لاجوابی کا اعتراف اس انداز میں کیا کہ اگر کسی کی تقریر پر ایمان لایا جاسکتا تو مولانا محمد قاسم صاحب کی تقریر پر ہم ایمان ضرور لے آتے جس کے معنی اس کے سوا کیا ہوسکتے ہیں کہ حق کے ناقابل تردید مدلل ثبوت کے بعد ان کے دینِ حق کو قبول نہ کرنیکی توجیہہ، اپنے دنیوی اعزاز ومنافع سے محرومی کے خطرے کے سوا کچھ نہیں کی جاسکتی۔

۵۔ حضرت الامام کی یہ عظیم سیاسی رہنمائی، تاریخی اہمیت کی حامل ہونے کے باوجود عام طور پر نگاہوں سے اوجھل رہی ہے کہ فرنگی حکومت غاصبہ سے نبرد آزمائی میں ناکامی اور اس کے پُر فریب امن عام کے اعلان کے بعد حضرت الامامؒ نے بھی بلاتاخیر اپنی فراست ایمانی سے شمشیر وسنان کے بجائے جنگ کا رخ ملت میں علمی اور ایمانی استقامت اور جذبۂ حمیت وطن کی برقراری کے لیے نہ صرف تعلیم دین ہی کی جانب موڑ دیا بلکہ وہ دور چونکہ ملت اسلامیہ پر اقتدار سے محرومی کے بعد غالب وظالم انگریزوں کے بے تحاشا مظالم سے پیدا شدہ شکست خوردگی اور عجز ومایوسی کا دور تھا جس میں ملّی زندگی کا دائرہ فکر وعمل پست فکری سے دوچار ہوچکا تھا اس لئے ایسے شدید اور نازک وقت میں عام سیاسی قائدین کا محور فکر ملت کو اس فکری پستی وناامیدی کی ذلت ناکیوں سے نکالنے کے سوا دوسرا نہیں ہوتا جو بادیٔ النظر میں وقیع اور صحیح بھی معلوم ہوتا ہے اور ضروری بھی۔

لیکن حضرت الامامؒ نے اپنی فراست ایمانی آمیز سیاستِ اسلامی سے اس کو ملت کے مرض کی صحیح تشخیص نہ قرار دے کر اپنا محورِ فکر، ملت کی اُن فطری صلاحیتوں کو بنایا کہ جو عہد مغلوبیت میں مستور تو ہوسکتی ہیں لیکن معدوم نہیں ہوتیں اور قیادتِ سلیمہ پر بھرپور اعتماد کے ساتھ یہ صلاحیتیں بروئے عمل آنے کے بعد شکست خوردگی کے بجائے ''ہمت آفریں شعور'' ذلت ومغلوبیت کے بجائے مددِ خداوندی پر یقین، شدید وقبیح حوادث سے ہمت شکنی کے بجائے حوصلہ مندانہ عزم، رفعت پسندانہ

اقدامات کے نتائج کے بارے میں شکوک وشبہات کے بجائے کامیابی کا یقین اور بااقتدار معاند قوتوں کے سامنے خودسپردگی کے بجائے غیرت مندانہ موقف استقامت قومی زندگی کے دھارے میں انقلاب برپا کرنے کا ایسا مؤثر ذریعہ بنتے ہیں کہ جس کا ادنیٰ تصور بھی مغلوب ومفتوح ملّت کو محض پست فکری اور یاس وناامیدی سے نکالنے کے طرز قیادت میں متصور نہیں ہوسکتا۔

بہ نظر غائر اگر جائزہ لیا جائے تو فطری قیادت کے یہ اُصول خودساختہ نہیں بلکہ کتاب اللہ سے ماخوذ ومستفاد ہیں جن کو فرائض نبوت میں گنواتے ہوئے حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہ عَلَی الْمُؤمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رسُوْلاً مِنْ اَنْفُسِھم یَتْلُوْ عَلَیْھِمْ آیٰتہ ویُزَ کِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَۃَ وَاِنْ کانوا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلاَلٍ مُّبِیْن.

(الف) تلاوت آیات کے ذریعہ مخاطب ملت کو مقصدِ قیادت پر مطلع کرنے کی راہنمائی کے ساتھ اس پر مکمل اعتماد۔

(ب) تزکیہ کے وسیع تر مفہوم سے شکست خوردگی اور اس کے لوازم سے قلب ودماغ کو فراغ بخشنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

(ج) تعلیم کتاب سے قائدانہ احکام کی صحت وافادیت پر ایسا یقین محکم پیدا کرنا ہے کہ اس کے برخلاف کوئی بھی اور کسی کا بھی حکم مخاطبین کے لیے ادنیٰ درجے میں لائق التفات نہ رہے۔

(د) اور حکمت سے مقصدِ حیات کی یاددہانی کے ساتھ، دنیوی زندگی کے علمی، عملی منافع عامہ کو حاصل کرنے کے لئے الدنیا مزرعة الآخرة کے تحت کامیابی کے تمام ضروری وسائل کو استعمال کرنے پر یہ کثیر الجہات کلمہ حکمت مشیر ہے۔

پس حضرت الامامؒ نے انہی قرآنی نقاطِ طیبہ پر اپنی قیادت کی بنا قائم فرما کر اپنے ذوقِ اتباع کتاب وسنت پر انمٹ شہادت قائم فرمادی۔

۶۔ حضرت الامامؒ کی یہ قیادتِ اسلامیہ جس کی صحت پر وقت کی نزاکت من جانب اللہ مُہر تصدیق ثبت کرچکی تھی اس کی عملی تشکیل میں بے سروسامانی کے علاوہ سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ انگریزوں نے برصغیر کی حکومت چونکہ مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے اپنے غاصبانہ اقتدار کی تاراجی

کے بارے میں انگریز اگر خائف تھا تو صرف مسلمانوں ہی سے تھا اسی خطرہ وخوف کے تحت اس نے ۱۸۵۷ء میں مکمل تسلط کے بعد مسلمانوں کے برخلاف قتل وغارت گری، لوٹ مار اور جائیدادوں اور جاگیروں کی ضبطی کو اپنے ظالمانہ اقتدار کی برقراری کا واحد ذریعہ قرار دے کر ان کو دانہ دانہ کا محتاج بنا دیا، لیکن دین وایمان پر اپنا سب کچھ قربان کرنے والے، اور حریت طلبی کو قومی، ملکی اور سیاسی ضرورت سے آگے بڑھ کر مذہبی اور دینی فریضہ باور کرنے والے قائلین: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کو بے تحاشا ظلم وستم کی یہ گرم بازاری...... آزادئ وطن کے لئے جرأت مندانہ اقدامات سے روکنے میں حکومتِ وقت کو ذلّت ناک ناکامی سے دوچار ہونا پڑا، جس کا انگریز نے ایک دانا دشمن کی حیثیت سے گہرا جائزہ لیکر اس حقیقت کو پالیا کہ مسلمانوں کے آزادئ وطن کے جذبۂ صادق کو ناقابل شکست قوت وطاقت دینے والے صرف یہ مدارس دینیہ ہیں جن کا ناقابل شمار تعداد میں ملک بھر کے اندر جال پھیلا ہوا ہے۔

مسلمانوں میں ان دینی تعلیمی سرچشموں سے اسلامی غیرت وحمیّت اور جذبۂ حرّیت طلبی کی آبیاری کے راز کو پالینے کے بعد شاطر دشمن انگریز نے قتل وغارت گری کی پالیسی کو ناکام دیکھ کر اپنی عیارانہ سیاست سے امن عام کا اعلان کر دیا لیکن اس سے زیادہ مسلم کش بلکہ اسلام کش دوسری نئی پالیسی کے تحت مدارسِ اسلامیہ کو محور انتقام بنایا اور ملک بھر کے ان تمام اوقاف کو بحق سرکار ضبط کر لیا کہ جو اُس دور میں مدارس دینیہ کی بقاء کا واحد ذریعہ تھے اور دوسری جانب مسلمان اپنی اقتصادی بدحالی کے باعث ان دینی مراکز کو سنبھالنے کے قابل رہے نہیں تھے۔ اِس لئے اس خطرناک صورتحال کے نتیجے میں بڑی تیز رفتاری کے ساتھ لاتعداد مدارس دینیہ میں تالے پڑ گئے۔

پھر یہ ہی نہیں بلکہ اس سے بڑا المیہ یہ تھا کہ ملک کے درج ذیل تین اسلامی مکاتبِ فکر کہ جو پورے ملک کے مدارس دینیہ کے دینی اور علمی محتسب کا وقیع کردار ادا کر رہے تھے وہ بھی وقت کی اس قہرمانی دستبرد سے محفوظ نہ رہ کر ختم ہو گئے۔

ان میں اوّلین ''مکتب فکر ولی اللّٰہی'' دہلی میں تھا جس نے دین کے مصدر ثانی ''علم حدیث'' کو شرح کتاب اللہ کی حیثیت سے پیش کرنے کا اس دور میں اہم فریضہ اس وقت ادا کیا کہ جب حتمی اور قطعی اور یقینی مرادات ربانی کو واضح کرنے والی حدیث رسول اللہ سے کتاب اللہ کو علماء سوء نے یکسر

منقطع کر کے اور کتاب اللہ کو اپنی زرطلبی اور جاہ طلبی کی حقیر و ذلیل اغراض فاسدہ کے لیے ایسا قوی وسیلہ بنا رکھا تھا کہ اس کے برخلاف آواز اٹھانا دعوت مبازرت کے مترادف بنا ہوا تھا۔

لیکن یہ ہی مکتب فکر ولی اللّٰہی تھا کہ جس نے ایسے شدید ترین صبر آزما احوال وحوادث سے دوچار ہونے کے باوجود حدیث رسول اللہ کو معتبر شرح قرآن کی حیثیت سے پیش کیا اور صحیح مرادات ربانی کی مدلل توضیحات سے ملت کو آشنا بنانے کا زبردست فریضہ انجام دیا۔ جس کے نتیجے میں علم دین کے معتبر و مستند ہونے کے لئے ''فن حدیث'' کی لازمی ضرورت سے واقفیت عام ہوئی اور مکتب فکر ولی اللّٰہی سے اس مصدر ثانی یعنی حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فیض عظیم حاصل کرنا فضلائے مدارس کا ذوق عام بن گیا۔

دوسری جانب ''لکھنؤ'' ''فقہ اور اُصول فقہ'' کا ملک گیر مکتب فکر تھا اس لئے فقہی ذوق رکھنے والے فضلاء لکھنؤ سے مستفید ہوتے تھے۔

اور تیسرا منطق وفلسفہ کا معقول مکتب فکر ''خیر آباد'' تھا اس لئے معقولات سے مناسبت رکھنے والے خیر آباد کا رخ کرتے تھے ان تینوں مکاتب فکر کے ختم ہوجانے کے بعد اس نازک اور خوفناک صورتحال نے دردمندان دین متین کو عمومی طور پر بے چین بنا کر رکھ دیا تھا۔ لیکن حضرت الامام النانوتویؒ کا قلب و ذہن مبارک، پیش آمدہ صورتحال کی وحشت ناکی کے احساس کے ساتھ اس کی امکانی تلافی پر مرکوز تھا جو ایک نئے مرکز علم و دین کی تاسیس کے بغیر ممکن نہیں تھی لیکن جس وقت دشمن اسلام و مسلمین انگریز حکومت کی پوری معاندانہ سیاسی قوتیں مستقل پالیسی کے تحت مدارس اسلامیہ کو تاراج کرنے پر لگی ہوئی ہوں ایسے وقت میں کسی نئے مرکز علم دین کی تاسیس کا تصور جس درجہ خطرناک ہوسکتا تھا وہ کسی وضاحت کا طالب نہیں ہے۔

لیکن حضرت الامامؒ کا یہ عزم الہام خداوندی سے مؤید تھا اس لئے آپ اپنے اس عزم صمیم کو اپنی فراستِ ایمانی سے اس طرح معرض وجود میں لائے کہ ''دیوبند'' جیسی چھوٹی سی بستی میں ایک چھوٹی سی مسجد جو ''مسجد چھتہ'' کے نام سے معروف ہے اس میں ایک انار کے درخت کے نیچے صرف ایک استاد محمود اور ایک شاگرد محمود کے ذریعہ اس عالمگیر مرکز علم و دین کی تاسیس فرمائی۔

حضرت الامامؒ کا یہ تاسیسی عمل ایک طرف آپ کی سیاستِ اسلامی اور فراستِ ایمانی کا بایں معنی مظہر تھا کہ اس مدرسہ کو ظاہری طور پر ایک معمولی مکتب کی متواضعانہ صورت دے کر دشمن مدارس حکومت وقت کی نظر میں ناقابل التفات بنائے رکھا اور دوسری جانب من جانب اللہ بلاتشہیر برصغیر کے بیشتر علمی اور دینی حلقوں نے حضرت الامامؒ کی کتاب وسنت پر مبنی عالمگیر علمی عظمت، فکری وسعت اور کلامی ندرت کی معروف صفات کی بدولت اس دارالعلوم کو ضبطی اوقاف سے پیدا شدہ نقصانِ عظیم کی تلافی کا ذریعہ تسلیم کیا، چنانچہ پہلے ہی سال میں اس مرکز علم و دین میں ملک کے دور دراز مقامات سے علماء اور طلبا کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوگیا۔

پس حضرت الامامؒ کے بیشمار امتیازات میں یہ امتیاز سب سے فائق تر قرار دیئے جانے کا مستحق ہے کہ آپ نے اپنے قائم فرمودہ بلند معیار ''حدیثی مکتبِ فکر دارالعلوم دیوبند'' میں ملک کے اہم ترین منتشر و مندرس مکاتب کو سرزمین دیوبند پر جمع فرما کر حسب تقاضائے وقت ایک جامع ترین علمی اور دینی مجموعہ مکاتب فکر ملتِ اسلامیہ کو عطا فرمادیا اور اس طرح آپ نے نہ صرف عظیم نقصان کی عظیم ترین تلافی ہی فرمادی بلکہ ہندوستان میں اسلام کا نام تک ختم کردینے کے انگریزی ناپاک عزائم کو بھی ہمیشہ کے لیے خاک میں ملادیا۔

دارالعلوم دیوبند کی یہ ہی وہ علمی فکری اور قاسمی جامعیت ہے کہ جو طرّہ امتیاز کی حیثیت سے دارالعلوم کو چار دانگ عالم میں بلا استثناء تمام صحیح العقیدہ دینی مدارس و معاہد کی مرکزیت کا حامل بناتی ہے۔

۷۔ اس عالمگیر مرکز علم و دین کا کتاب وسنت سے ماخوذ درج ذیل تاسیسی فکر بھی حضرت الامامؒ کے عظیم امتیازات میں ایک ایسا بیش قرار اضافہ ہے کہ جو مقبولیت عند اللہ کی بدولت نہ صرف ایشیا بلکہ پوری دنیا میں تاسیس مدارس کے لیے آج اُسوۂ عمل بن چکا ہے اور وہ یہ کہ حسبِ روایت حدیث حق تعالیٰ نے پشت آدم علیہ السلام سے کل اولاد آدم کو نکالا اور تمام حجابات اٹھا کر اپنی ذات سراپا جمال و کمال کی جلوہ نمائی کے ساتھ: **الستُ بربکم** کا سوال فرمایا اور اس سراپا عمل حکمت کے ذریعہ حق تعالیٰ نے انسان کے بھوکے قلب کو اپنے جمال کے ذریعہ ''سوزِ عشق''، کیف علم کے تحفۂ غذا

عنایت فرما کر آسودہ فرمایا اور سوال کے ذریعہ بھو کے دماغ کو ''کیف علم'' کے تحفۂ غذا سے سیری مرحمت فرمائی۔

یہ دوازلی خدائی تحفے اس طرف مشیر ہیں کہ انسانیت، ارتقاءِ مطلوب کی منزل مراد تک صرف اسی نظام کے ذریعہ باریاب ہوسکتی ہے کہ جو بیکراں وسعتیں رکھنے والے انسانی دماغ کو علوم بے نہایت عطا کرے اور عروج الی اللہ کے دانائے راز قلب انسانی کو سوزِ عشق سے راہِ عروج کی راہ نمائی بخش سکتا ہو اور اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ انسانی نظامِ حیات میں علم و عشق کی یہ باہم آمیزی، عقل انسانی نہیں صرف خالق انسان کی قدرت بے نہایت ہی کرسکتی ہے اور بواسطۂ انبیاء علیہم السلام اللہ رب العزت کی جانب سے دین اسلام جیسے علم و عشق سے مرکب نظام کامل و مکمل پر انسان کو عمل کا مخاطب بنایا جانا اس اعلان کو کسی مزید توضیح کا محتاج نہیں بننے دیتا کہ انسان کو اشرف المخلوقات تسلیم کرنے کے باوجود یہ دین فطرت انسان کو مقنن تسلیم نہیں کرتا۔

نیز اسی سے یہ ناقابل انکار انکشاف بھی برملا سامنے آجاتا ہے کہ نہ تنہا ''علم''، مسائل انسانیت کا حل ہے اور نہ تنہا ''عشق'' کیونکہ یہ امر مشاہد اہل علم کے لیے مسلم حقیقت ہے کہ شرک و کبر نے جب بھی جنم لیا تو وہ ''علم بے عشق'' ہی کے بطن سے جنم لیا ہے اور بدعت جب بھی معرض وجود میں آئی ہے تو ہمیشہ اس کا ذریعۂ تخلیق ''عشق بے علم'' ہی بنا ہے۔

لہٰذا علم و عشق کی باہم آمیزی کے معنی یہ ہیں کہ عشق، علم کو تواضع آمیز کر کے صحت و پُر تاثیری عطا کرتا ہے اور علم اتباع سنت کی راہ نمائی کے ذریعہ عشق کو وسیلۂ قرب و معرفت بناتا ہے اور ماضی کی طرح آج بھی ملت اسلامیہ میں علم بے عشق جو فتنے جگا رہا ہے اور ایسے ہی عشق بے علم کی کوکھ سے جن نو ایجاد بدعات کی روز بروز تولید ہو رہی ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔

پس بانی دارالعلوم حضرت الامامؒ النانوتوی نے اپنے رفیع القدر اتباع سنت پر مبنی ذوق کے تحت اس مرکز کے نظام میں علم و عشق کو اس طرح باہم آمیز فرمایا کہ درسگاہوں میں طلبہ کو دورانِ درس اساتذہ سے علمی تحقیق پر مبنی ہر قسم کے سوالات کی اصولاً آزادی عطا فرما کر اور اساتذۂ کرام کو اطمینان بخش جواب دہی کا مکلّف بنا کر طلبہ کے دماغوں کو زیادہ سے زیادہ غذائے علم سے آسودگی کا موقعہ مہیا

فرمایا اور طلبہ پر درس گاہوں سے باہر ''ماحول مدرسہ'' میں احترام کامل کے ساتھ اساتذہ کی بلا چون وچرا ایسی اطاعت وفرماں برداری پر مامور فرمایا جیسی خانقاہوں میں مرید اپنے شیخ کی اطاعتِ کرتا ہے اور اس ذریعہ سے سوز عشق سے حصہ یابی کی طرح ڈال کر حضرت الامامؒ نے خانقاہی مقصد سے بھی طلبہ کو مانوس کرنے کی معقول ومؤثر تدبیر فرمادی۔

بالفاظ دیگر علم وعشق کی باہم آمیزی کی ضرورت وعظمت پر مشتمل معروف دانائی آمیز مقولے ''ہر طالب علمے کہ چون وچرا نہ کند، وہر طالبے کہ چون وچرا کند ہر دورا در چراگاہ باید رسانید'' کو حضرت الامامؒ نے اُصولی حیثیت دے کر شامل نظام تعلیم وتربیت فرمادیا۔

پھر علم وعشق چونکہ اپنی فطرت کے لحاظ سے ظہور وبروز کے طالب ہیں پس مذکورہ پرداز تعلیم وتربیت پر تاریخ شاہد ہے کہ اس مرکز علم ودین کے وابستگان کے ذوق علم کو عشق آمیز تواضع نے شرک وکبر سے نہ صرف دور بلکہ نفور بنادیا ہے اور داعیۂ عشق کو، علم کی رہنمائی کتاب وسنت نے تمام نو ایجاد بدعتوں سے پورے طور پر تحفظ عطا کردیا ہے اور آج بحمد اللہ ملک وبیرون ملک میں لاتعداد مدارس اسلامیہ حضرت الامام علیہ الرحمہ کے جاری فرمودہ اسی علم وعشق آمیز نظام پر نہایت کامیابی کے ساتھ مصروفِ خدمت ہیں۔

۸۔ اسی جامع ترین اسلامی فکر قاسمی کا وہ بنیادی نقطۂ امتیاز جس کو ہر دور میں وارثین فکر قاسمی کے اکابر واصاغر نے بقوت سنبھالا ہے وہ ملت اسلامیہ میں ناصواب مکاتب فکر کی تولید پر چراغ پا نہ ہوکر ان کی اصلاح کی جدوجہد کرنا ہے۔

جس کی قرین عقل وجہ اس کے سوا دوسری نہیں ہے کہ جس امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والسلام کو ظاہر وباطن میں سراپا علم وحکمت کتاب قرآن عظیم کی صورت میں مرحمت فرمائی گئی اور: **انا خاتم النبیین لا نبیَّ بعدی** کے ذریعہ عالمگیر اعلان ختم نبوت اور: **أوتیت علم الاولین والآخرین** کے عالمگیر اعلان اور علم عظیم وکثیر کا منفرد دعویٰ لیکر آنے والی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی پیکر علم وعرفان ذات مقدسہ عطاء فرمائی گئی ہو اس بے حساب کثرتِ علم کے بعد یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں رہتی کہ مکاتب فکر کی کثرت وہیں ہوسکتی ہے جہاں علم کی کثرت ہو پس بلا امتیاز حق وباطل

اور بلا فرق خطا و صواب مکاتب فکر کی بکثرت تولید صرف اسی امت میں ہو بھی سکتی تھی اور اسی امت میں ہوئی بھی ہے دیگر تمام مدعیانِ علم امم و اقوام میں چونکہ یہ کثرت علم نہیں ہے، اس لئے نتیجتاً کثرت مکاتب فکر بھی نہیں ہے۔

چنانچہ دعویٰ علم کے باوجود یہودیت میں اسلام سے بہت قدیم ہونے کے باوجود کوئی بھی دینی اور مذہبی مکتب فکر معروف و معلوم نہیں ہے ایسے ہی دنیائے عیسائیت ''پروٹسٹنٹ'' اور ''کیتھولک'' کے ناموں سے موسوم صرف دو بنیادی مکاتب فکر پر منقسم ہے جو بذاتِ خود اس کی دلیل ہے کہ یہودیت و عیسائیت میں مذہبی اساس پر تقلیل مکاتب فکر کی وجہ قلّتِ علم کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔

۹۔ اس کے برخلاف کتاب اسلام ''قرآن کریم'' اور ''نبی اسلام'' محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سرمنشاء علوم بے نہایت ہیں۔ اس لئے عہد نبوت ہی سے علمی بنیادوں پر خطا و صواب کے جزوی اختلافات پر مبنی مکاتب فکر کی تولید کا آغاز ہو گیا تھا پھر علمی ارتقاء کے ساتھ کتاب و سنت میں مکنون و مستور بے نہایت علوم و معارف کی تخریج نے مخالفین اسلام کی رگ حمیّت و جاہلیت کو جھنجھوڑا اور ان باطل پسندوں نے کتاب اللہ کی سنت رسول اللہ سے مؤید متبادر مرادات و مدلولات میں تاویلاتِ باطلہ کر کے اپنے زیغ قلبی کے تحت تعلیماتِ اسلام سے یکسر منحرف باطل مکاتبِ فکر کے انبار لگا دیئے، لیکن مسلمانوں کے لیے اس لحاظ سے یہ فتنہ کوئی نئی چیز نہیں تھا کہ اس کی پیشین گوئی نبی کریم صلعم بہت پہلے اس طرح فرما چکے تھے کہ یہود و نصاریٰ تو بہتر فرقوں میں بٹے تھے اور میری امّت تہتر فرقوں میں بٹے گی جن میں میرے اور میرے صحابہؓ کے طریقہ پر چلنے والے طبقہ کے سوا باقی سب جہنمی ہوں گے۔ بہتر کا عدد مطلقاً کثرت کی جانب مشیر ہوتا ہے پس یہ روایت اس حقیقت کو واشگاف کرنے کے لئے کافی ہے کہ اس امت میں ایک حق کے بالمقابل باطل مکاتب فکر بھی بڑی تعداد میں پیدا ہوتے رہیں گے کیونکہ یہ سب باطل فرقے قطعی طور پر ثابت شدہ حقائق کے منکر ہونے میں شریک ہوں گے البتہ ان کی تاویلات باطلہ کے پرداز میں فرق ہو گا اس لئے ان سب کے مقابلے میں بلا تامل اول مرحلہ میں ایک حق صریح کو مدلل پیش کر دینے کے بعد دفاع عن الاسلام کا حق ادا ہو جاتا ہے اور ہمیشہ ہوتا بھی رہا ہے۔

لیکن دوسری جانب صواب کے بالمقابل وہ خاطی مکاتب فکر ہوں گے کہ جو اسلام کے اُمور کلیہ کے اقرار میں تو شریک ہوں گے لیکن امور جزئیہ میں تاویلات غیر صحیحہ کی وجہ سے افہام وتفہیم کے مستحق ہوں گے اور ظاہر ہے کہ یہ خاطی مکاتب فکر، باطل مکاتب فکر کے مقابلہ پر بدرجہا تعداد میں ہمیشہ زیادہ ہوں گے اور طلب حق کی مخلصانہ جدوجہد کی وجہ سے: المجتهد یخطئ ویصیب کے تحت ماجور ہوں گے۔

لیکن اس کے برخلاف کتاب وسنت کے علم صحیح سے مستفید وترجمان علماء کرام کا یہ ایک دائمی اہم ترفریضہ ہوگا کہ وہ ہر زمانہ میں باطل مکاتب فکر کے بالمقابل متصلّب ہوں اور خاطی مکاتب فکر کو برداشت کرنے میں بہت زیادہ متحمل اور وسیع الحوصلہ ہوں کیونکہ یہ مکاتبِ فکر ضروریات دین سے منحرف نہیں ہیں۔ لیکن ان کی جزئیات غلط تاویلات قابل تصحیح واصلاح ہونے کے باوجود ان کے دین پر قائم رہنے کے جذبہ کی یقین دہانی کے لئے کافی ہیں۔

اس لئے خاطی مکاتب فکر کے بارے میں اس تحمل پسندی اور وسعت حوصلہ کو دارالعلوم دیوبند کا اجتماعی دینی مزاج بنا دینا حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ کا افراط وتفریط کے مابین اسلامی اعتدال کا وہ بیش قرار نمونہ ہے کہ جس کو حضرت الامام کا ممتاز ترین امتیاز قرار دینا عین انصاف ہوگا۔

اسی معتدل مزاجی کا یہ خوش آئند نتیجہ ہے کہ بعض طبقات نے علماء دیوبند کو اپنی قلّت علم اور حق ناشناسی کی بنا پر ہدف تکفیر بنایا لیکن اسی اعتدالی جماعتی مزاج سازی کے تحت اکابر وعلماء دیوبند مکفّرین کی ضروریات دین کے مُقر ہونے کی بنا پر ان کے اس سراسر غیر اسلامی ایذا رساں حملے کو برداشت کر کے انہیں درس خیر خواہی سے نوازتے رہے اور صحیح تعلیمات اسلام کے تحت ان کی تکفیر سے ہمیشہ ممکن احتراز فرماتے رہے۔

۱۰۔ حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ کے امتیازات میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد بالسیف کا امتیاز بھی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اس ذوقِ عظیم وسلیم سے بھی حق تعالیٰ نے آپ کو وہ حصہ وافر عطا فرمایا تھا کہ جو اس دور میں بھی عوام میں تو آج کی طرح مضمحل ہو ہی چکا تھا خواص میں بھی صرف اخص الخواص ہی ذوق جہاد سے آشنا تھے۔

اسلام میں جہاد کی غیر معمولی عظمت واہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ اسلام نے اعلاء کلمۃ الحق کے لیے ہونے والے جہاد پر عظیم اجروثواب کا وعدہ فرما کر اس کو مہتم بالشان عباداتی حیثیت واہمیت عطا فرمائی ہے۔

کسی مذہب کی دعوت یا کسی مخصوص نظریۂ حیات کی پیشکش کی صورت میں مخاطب کو اس کے قبول کرنے یا نہ کرنے کے مکمل اختیار کا دیا جانا ایک ایسا مسلم اور نا قابل اختلاف متین ضابطہ ہے کہ تمام معقولیت پسند انسانی طبقات میں کبھی اور کہیں بھی یہ ضابطہ دورایوں سے دوچار نہیں ہوا اس ضابطہ مسلّمہ کو جذباتیت یا غیظ وغضب یا جہالت کے تحت قبول نہ کرنا وہیں سر اُبھارتا ہے کہ جہاں مدعی کا فکر وذہن اپنے دعاوی پر یا دلائل قویہ سے خالی ہو یا طریق اثبات کی قوی اور مسکت صلاحیت سے عاری ہو۔

حضرت الامام النانوتویؒ کے فکر وذہن کو حق تعالیٰ نے کمالِ علم وحلم کے ساتھ اپنے دعاوی پر مسکت دلائل قویہ قائم کرنے کی ایسی منفرد صلاحیت عظیم سے نوازا تھا کہ احباب واغیار ہی نہیں بلکہ اعدا بھی ان کی استدلالی قوت پر بصد اعتراف سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوتے تھے۔

مباحثہ شاہجہانپور حضرت الامام النانوتویؒ کی امتیازی قوت استدلال پر ایک ایسی نا قابل انکار شہادت ہے کہ جس سے مؤرخ صرفِ نظر کر کے اپنے اوپر تنگ نظری اور حقائق ناشناسی کا الزام لینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوگا۔

۱۱۔ میدانِ شاملی میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جنگ کی تیاری کے دوران، جماعت میں ایک افتراق انگیز اختلاف پیدا ہوا جس کے سدّ باب میں حضرت الامامؒ کی عالمانہ وعارفانہ ذہانت کی یہ امتیازی کارفرمائی بھی تاریخ کا ایک اہم باب بنی کہ انگریزوں کے برخلاف جنگ کے منصوبے پر علماء وقت کے بھرپور اتفاق کے باوجود جماعت کے ایک مسلّم بزرگ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اس رائے کی وجہ سے ہمنوا نہیں تھے کہ مسلمان جنگ کی قرار واقعی تیاری سے بے سروسامان ہیں اس بے سروسامانی میں جنگ ہلاکت وتباہی کے سوا کسی دوسرے نتیجے تک نہیں پہنچ سکتی، حضرت موصوف کی اس رائے کی وجہ سے ان کے وابستگان کی معتد بہ تعداد کے عدم اتفاق کا خطرہ یقینی تھا اس کے پیش نظر مؤثر وممتاز علماء متفرقاً اور مجتمعاً معتد بہ تعداد میں حاضر ہو کر عرض ومعروض کرتے

رہے لیکن ان کی رائے نہ بدلوا سکے۔

اور وقت کے تمام بزرگ بخطرۂ اختلاف حضرت مولانا شیخ محمد صاحبؒ کی تائید کو ضروری سمجھنے کی وجہ سے مشوش تھے جب کوشش کے باوجود ان کی ہمنوائی سے مایوسی ہوگئی تو جماعت کے حضرات کی آخری کوشش کے طور پر ''حضرت الامامؒ'' نے بموجودگی حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ وغیرہ حضرت مولانا شیخ محمد صاحب سے ملاقات فرمائی اور آغازِ گفتگو اسی پرداز سے فرمایا جس پر اب تک بیشتر علماء کرام فرما چکے تھے اور ان کا جواب بھی وہی تھا کہ جو دوسروں کو دے چکے تھے اس پر حضرت الامامؒ نے سوال فرمایا کہ حضرت کیا ہم اصحاب بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں؟ یہ سن کر سب سے پہلے حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ نے خود فرمایا کہ بس اب الحمد للہ شرح صدر ہوگیا اسی پر اختلاف ختم ہوگیا اور جنگ کی تیاری شروع ہوگئی پس جس خطرۂ اختلاف کو بزرگانِ جماعت محسوس کر کے غیر معمولی خدشہ محسوس فرما رہے تھے وہ حق تعالیٰ نے حضرت الامامؒ کے صرف ایک توکل علی اللہ پر مبنی سراپا دانش سوال کے ذریعہ ختم فرما کر جماعت کو اختلاف سے محفوظ فرما دیا۔

۱۲۔ حضرت الامامؒ کی علمی وسعت پر درج ذیل ایک مزاحی جملے کا عرفانی تجزیہ بھی شاہد ہے کہ ۱۸۷۸ء میں پنڈت دیانند سرسوتی کے چیلنج پر تاریخ مناظرہ طے کرنے کے لیے حضرت الامام النانوتویؒ کی جانب سے دو تلامیذ خصوصی مولانا محمود الحسن صاحب دیوبندیؒ، مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ اور ایک معتمد شیخ نہال احمد صاحب اس وقت روڑکی پہنچے کہ جب پنڈت جی کے لیے کھانے کا انتظام ہو رہا تھا ملاقات کے کمرہ سے باہر ان حضرات کی موجودگی میں پنڈت جی کے لیے کھانا اتنی بڑی مقدار میں تھا کہ جو بہت سے لوگوں کے لیے کافی ہوتا لیکن گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ تنہا ہی پنڈت جی نے کھانا کھایا ہے، واپسی میں شیخ نہال احمد صاحب نے اپنے رفقاء سے مزاحاً کہا کہ علم میں مناظرہ ہوگا تو پنڈت جی ایک منٹ بھی ہمارے حضرت کے سامنے ٹھہر نہ سکیں گے۔ لیکن اگر کہیں کھانے میں مناظرہ ہوگیا تو کیا ہوگا کیونکہ حضرت الامام اتنے کم خوراک تھے کہ اکثر اوقات تو نصف روٹی پر ہی بس فرما دیتے تھے۔ دیوبند واپس آنے کے بعد شیخ نہال احمد صاحب کا یہ مزاحی جملہ حضرت الامامؒ کو پہنچا تو آپ نے شیخ نہال احمد صاحب کو بلایا وہ بہت گھبرائے لیکن جواب دینے کے لیے ان کی زبان سے

حضرت الامامؒ نے فرمایا کہ اس کا ایک جواب الزامی تو یہ ہے کہ کیا ہر مناظرہ کے لیے میں ہی رہ گیا ہوں، کھانے میں مناظرہ ہوا تو تم مناظرہ کروگے۔ پھر فرمایا تمہارے ذہن میں کھانے پر مناظرہ کا سوال کیوں پیدا ہوا؟ نہ کھانے پر مناظرہ کا سوال کیوں نہ پیدا ہوا، کیونکہ کھانا بہیمیت کی علامت ہے جس کا تعلق بے کمال سے ہے اس میں مناظرہ کے لئے ہم بیل، بھینس اور ہاتھی کو پیش کریں گے کہ کھانے میں ان کا مقابلہ کرو اور نہ کھانا ملکیت کی خصوصیات میں سے ہے جو کمال سے تعلق رکھتا ہے فرمایا کہ ہمیں اور پنڈت جی کو کھانا کھلا کر الگ الگ دو کمروں میں بند کر کے تالا لگا دو اور چھ مہینے بعد نکالو جو زندہ نکلے اسے برحق قرار دیا جائے اور تحدیث نعمت کے طور پر یہ بھی فرمایا کہ الحمدللہ اب مجھے زندہ رہنے کے لیے کھانے کی ضرورت نہیں ہے صرف اتباع سنت اور اظہارِ عبدیت کے لیے کھاتا ہوں۔

حضرت الامامؒ کے کمال اتباعِ سنت کے نتیجے میں اس صفت ملکیت سے ہر حصہ یابی کے بارے میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ آپ ''سوئے گردوں رفت زاں راہے کہ پیغمبر گذشت'' کا مصداق تھے۔

۱۳۔ حضرت الامامؒ کے روحانی ومعنوی امتیاز پر یہ ایک واقعاتی شہادت ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ اولین صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند علم حدیث میں باامتیاز اور صاحبِ نسبت بزرگ تھے، جو حضرت الامامؒ اور حضرت گنگوہیؒ سے عمر میں کم تھے اور دونوں کے استاذ زادے بھی تھے اس لئے دونوں حضرات نہایت ادب واحترام کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب کے قلب میں اپنی جلالِ شان کے ساتھ ایک سوال یہ پیدا ہوا تھا کہ انہی دونوں بزرگوں نے مجھے یہاں دارالعلوم میں طلبہ کے ساتھ تعلیم میں مشغول کر دیا جس کی وجہ سے میں ریاضت ومجاہدات کے ذریعہ روحانی ترقیات سے محروم ہو رہا ہوں۔ اسی فکر کے نتیجے پر حضرت والا نے فرمایا کہ یہ آپ کی روحانی ترقی بمشیت اللہ اس تعلیم دین ہی میں مضمر ہے اسے سن کر سکوت تو فرمایا لیکن اور روحانی ترقی کے جذبۂ صادق کے تحت حسب عادت اچانک حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ کچھ روز غائب رہے۔

کچھ روز کے بعد واپس تشریف لائے تو معلوم ہوا کہ اجمیر شریف گئے تھے اور وہاں

حضرت خواجہ غریب نوازؒ سے ان دونوں بزرگوں کا یہ ہی شکوہ کیا کہ خود مجاہدات سے روحانی ترقی کرر ہے ہیں اور مجھ سے یہ کہتے ہیں کہ تیری ترقی تعلیم دین ہی کے ذریعہ ہوگی، اس پر حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی بارگاہ سے القائی جواب یہ ہی ملا کہ وہ دونوں صحیح کہتے ہیں آپ کی ترقی روحانی عند اللہ اسی تعلیم میں مضمر ہے۔

دیوبند واپسی کے بعد یہ تفصیل کسی کو نہیں بتائی اس کے باوجود بوقتِ ملاقات حضرت الامامؒ نے فرمایا کہ وہی بات جب بڑی سرکار سے بھی سامنے آئی تو اب تو یقین ہو گیا ہوگا کہ ہم خدام جو کچھ عرض کرتے تھے وہ سراپا اخلاص وخیر خواہی پر مبنی تھا۔

حضرت الامامؒ کے اس جملہ پر جہاں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کا چہرہ اعتراف کا اظہار کرر ہا تھا، وہیں یہ جملہ حضرت الامامؒ کے عرفانی ارتقاء عظیم پر شاہد عدل بھی بن رہا تھا۔

۱۴۔ حضرت الامامؒ کی مقدس زندگی کے آخری لمحات میں یہ ہی امتیاز بھی آپ کی ولایت کاملہ کا مکمل مصداق بن کر سامنے آیا کہ عالم نزع میں متوسلین ومحبین نے تلقین شروع کی۔ لیکن حضرت الامامؒ انقباض کے ساتھ کبھی چہرہ داہنی جانب پھیر لیتے اور کبھی بائیں جانب، جس سے تلقین کنندگان تشویش وحیرت کے ملے جلے جذبات سے دوچار تھے اور حضرت الامامؒ کے اس انقباض کی کوئی توجیہہ نہیں کر پار ہے کہ اس وقت حضرت الامام کے بحر معرفت کے شناور رفیق لبیب فقیہ الاسلام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی تشریف لے آئے اور تلقین بند کرا کے خود حضرت الامام کی جانب متوجہ ہو کر بیٹھ گئے، چند لمحے بعد وقت موعود آپہنچا اور حضرت الامام رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

اس کے بعد متوسلین نے بوقتِ تلقین حضرت الامام کے انقباض کے بارے میں استفسار کیا تو حضرت فقیہ الاسلام نے فرمایا کہ میرے بھائی اپنی قوت معنوی سے مسمّی تک یعنی ذات بابرکات حق تک واصل ہو چکے تھے اور آپ لوگ تلقین کے ذریعہ اسم کی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کرر ہے تھے تو یہ عروج سے نزول کی طرف لانا ہے۔

ظاہر ہے کہ اسے موجب انقباض ہونا ہی چاہئے تھا وہی ہوا۔ تلقین بند کرنے کے بعد انقباض ختم ہو گیا اور انشاء اللہ وہ مقبولیت کے ساتھ اپنے رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔

۱۵۔ اختتام کلام پر وفات کے بعد کے اس عظیم قرینۂ مقبولیت پر ایک خاص واقعہ کا ذکر اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اس کا بھی اس وقت کوئی جاننے والا موجود نہیں ہے۔ یہ واقعہ میرے نانا خسر جناب شیخ حامد حسن صاحب مرحوم نے غالباً ۱۹۵۴ء میں بطور خاص مجھے بلا کر بالمشافہ سناتے ہوئے فرمایا کہ اس وقت حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحبؒ کو دیکھنے والوں میں شاید میرے سوا کوئی زندہ نہیں ہے اور حضرت الامام کی وفات کے وقت میری عمر چودہ سال کی تھی وفات کی اطلاع پر پورے شہر کے ہر مسلمان گھرانے میں ماتم کی کیفیت تھی۔ میں نماز جنازہ اور تدفین میں بھی حاضر رہا۔ قبرستانِ قاسمی کی زمین پر سب سے پہلی قبر بھی حضرت الامام ہی کی بنی تھی۔ جنازہ جب قبرستان میں پہنچا تو قبر سے ایک عجیب وغریب دل لبھانے والی حیرتناک نہایت تیز خوشبو پورے قبرستان میں پھیلی ہوئی تھی جس کے بارے میں تمام لوگوں کی زبانوں پر یہ ہی الفاظ تھے کہ قبر کی یہ حیرتناک اور دلکش خوشبو حضرت الامام کی عنداللہ مقبولیت کی واضح دلیل ہے اس غیر معمولی خوشبو کی وجہ سے لوگوں نے قبر سے نکلی ہوئی مٹی مٹھیاں بھر کر لے لیں تو میں بھی مٹھی میں وہ مٹی لے کر گھر واپس آیا اور اپنی والدہ کو سارا واقعہ سنایا تو انہوں نے کہا کہ تو بھی مٹی لایا ہے یا نہیں؟ میں نے کہا کہ لایا ہوں۔ وہ مٹی میں نے دی تو انہوں نے اُسے اپنے دوپٹہ کا پلّا پھیلا کر بڑے احترام سے لیا اور فوراً اس کو اندر لے جا کر صندوق میں محفوظ کر دیا۔ میرا بچپن تھا۔ البتہ کانوں میں پڑی یہ بات یاد پڑتی ہے کہ والدہ صاحبہ نے اس مٹی کو اپنے ساتھ دفن کرنے کی وصیت کسی کو کی تھی۔

احقر کے لیے ایک زائر حضرت الامام النانوتوی قدس سرہ سے ملاقات ایک سعادت کبریٰ ہے جس پر اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ:

حرف از زبان یار شنیدن چہ خوش بود یا از زبانِ آنکہ شنید از زبانِ دوست

☆☆☆

مولانا عاشق الٰہی بلند شہریؒ

حضرت مولانا نانوتویؒ کی سیرت ایک نظر میں

دارالعلوم اور مدرسہ شاہی کی تاسیس

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اعلی اللہ درجاتہ ان مبارک ہستیوں میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علوم کثیرہ وافرۃ نافعۃ اور اعمال صالحہ اور اخلاق حسنہ سے بھرپور طریقہ پر نوازا تھا آپ کی زیادہ شہرت بانی دارالعلوم دیوبند ہونے کی وجہ سے ہوئی اور آپ کے علوم کا کچھ حصہ آپ کی کتابوں سے اُمت تک پہنچا، آپ کی کتابوں کا سمجھنا چونکہ بہت مشکل تھا علماء تک مشکل سے سمجھ پاتے تھے اس لئے آپ کی تالیفات زیادہ معروف و مشہور نہ ہوئیں۔ مولانا محمود حسن صاحب (شیخ الہند) رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آب حیات (حضرت مولانا نانوتوی کی تصنیف) وغیرہ میں نے حضرت سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔ آب حیات کے کچھ اوراق حضرت نے خود نکال دیئے تھے کہ انھیں کوئی نہیں سمجھے گا۔

آپ نے خواب میں دیکھا کہ میں کعبہ شریف کی چھت پر ہوں اور میرے پاؤں کے نیچے سے نہر جاری ہے جو کوفہ کی طرف سے آرہی ہے اس خواب کی تعبیر دارالعلوم دیوبند کی تاسیس سے ظاہر ہوئی۔ کوفہ کی طرف سے نہر آنے میں حنفی مذہب کی تائید کی طرف اشارہ ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا فیض پورے عالم میں پہنچ گیا اور پہنچ رہا ہے۔ مدرسہ مذکورہ سے ہزاروں علماء خطباء مدرسین و مبلغین نکل کر پورے عالم میں پھیلے اور جہالت کی اندھیری کو دور کر کے علوم اسلامیہ اور اعمال صالحہ کی شمع روشن کی، نہ صرف محدثین اور فقہا اور مفتی کثیر تعداد میں مادر علمی دارالعلوم کی گود سے نکلے اور پلے اور

بڑھے بلکہ بڑی وافر تعداد میں مصنفین بھی پورے عالم میں پھیلے ان مصنفین میں مفسرین بھی ہیں اور شراح حدیث بھی، کتب فقہ کے شارحین بھی، ادب عربی کے فضلاء بھی اور معقولات کے مؤلفین بھی۔ ان حضرات کی تالیفات کو شمار کیا جائے تو اندازہ ہے کہ ہزاروں تک پہونچے گی۔ تنہا حضرت حکیم الأمت تھانوی قدس سرہ کی تالیفات ومطبوعات اور مواعظ کو جمع کیا جائے تو ایک ہزار کی لگ بھگ انھیں کی تعداد ہو جائے گی۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالی نے چن لیا اور مفتاح الخیر بنادیا حدیث شریف میں ارشاد ہے: طوبی لمن کان مفتاحاً للخیر ومغلاقاً للشر. دارالعلوم کے فضلاء سے پورے عالم میں خیر بھی پھیلی اور پھیل رہی ہے جہالت ڈوبی، شرک مٹا، بدعات بھی کافور ہوئیں۔

۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی تاسیس ہوئی پھر چھ ماہ بعد مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور قائم کیا گیا اس کے بانی مولانا سعادت علی سہارنپوری فقیہ تھے، مولانا محمد مظہر صاحب رحمہ اللہ علیہ نانوتوی کے نام پر (جو حضرت حجۃ الاسلام کے استاذ بھی تھے) اس کا تاریخی نام سن تاسیس کے دس سال کے بعد مظاہر علوم تجویز کیا گیا۔ یہ نام تاریخی بھی ہے جس سے ۱۲۹۲ کے عدد ظاہر ہوتے ہیں اور مولانا محمد مظہر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار کی طرف بھی اشارہ ہے اس کے بعد جامعہ قاسمیہ مرادآباد عرف مدرسہ شاہی کی بنیاد پڑی۔

۱۲۹۶ھ میں حضرت مولانا عالم علی محدث کے انتقال کے بعد مرادآباد کے باخیر حساس قلوب میں ضرورت مدرسہ کا احساس پیدا ہوا، حضرت نانوتوی قدس سرہ مرادآباد تشریف لائے ہوئے تھے سب نے مل کر حضرت مولانا کی خدمت میں عرض داشت پیش کی کہ مرادآباد کی سرزمین دولت علمی سے خالی ہو چکی ہے، اگر چندے یہی حالت رہی تو دینی جذبات ختم ہو جائیں گے، حضرت دعا فرمادیں کہ خداوند کریم اہل مرادآباد کو دوبارہ علمی فیوض وبرکات سے متمتع فرمائے، حضرت نے فوراً دعا کے لئے ہاتھ اٹھادیئے، ہاتھ اٹھانے کی دیر تھی کہ اجابت درحق کے سامنے آئی اور کام بن گیا۔ حضرت نے حاضرین سے فرمایا کہ بطرز دیوبند غریبوں سے تھوڑا تھوڑا چندہ مقرر کرالیا جائے اور اصحاب ثروت بھی اس کار خیر میں حصہ لینا چاہیں تو ان کو بھی شامل رکھا جائے، چنانچہ چندہ کی اپیل کی گئی، کہا جاتا ہے

کہ سب سے پہلے جس نے چندہ پیش کیا وہ ایک بہشتی تھا جس نے ایک پیسہ دیا جو نہایت خوشی کے ساتھ قبول کیا گیا (یہ بہشتی ایک پیسہ میں کسی کے گھر پانی کی مشک ڈال کر آیا تھا)[1] چند ہی روز میں تین پینتیس روپیہ ماہوار کا انتظام ہوگیا اور حسب ہدایت حضرت اقدس حضرت کے تلمیذ رشید جامع محاسن صوری و معنوی حضرت مولانا سید احمد حسین قدس سرہ امروہوی کا بہ مشاہرہ ۳۵ روپیہ تقرر عمل میں آیا۔
یہ جامعہ قاسمیہ مراد آباد کی ابتدائی روداد ہے جو مدرسہ شاہی کے نام سے مشہور ہے۔

شان تواضع

حجۃ الاسلام مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالی نے بہت زیادہ تواضع سے نوازا تھا اپنی ذات کو مٹا کر رکھے تھے لباس میں کوئی ایسی شان ظاہر نہیں ہوتی تھی کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ شخص عالم ہوگا، کھدر کے کپڑے، دھوتر کا لباس سردی میں سر پر کنٹوپ، چال ڈھال میں سادگی اور ساتھ ہی مجلس میں سب ساتھیوں کے ساتھ ایک عام شخص کی طرح بیٹھنا، مجلس میں کوئی امتیازی شان ظاہر نہ ہونے دینا یہ تواضع کی خاص شان تھی۔ ایک موقع پر فرمایا کہ میں جس طرح صوفیوں میں بدنام ہوں اسی طرح مولویت کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے۔ اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے اگر یہ مولویت کی قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک تک کا پتہ نہ چلتا۔ جانوروں کے گھونسلا بھی ہوتا ہے میرے یہ بھی نہ ہوتا اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا ولنعم ما قیل:

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق
ہر ہوسناکے نہ داند۔ جام وسنداں باختن

انگریزوں نے ۱۲۹۲ھ اور ۱۲۹۳ھ میں میلۂ خدا شناسی کے عنوان سے ایک مجلس منعقد کرائی تھی جس میں تمام مذاہب کے قائدین کو بلایا تھا۔ یہ مجلس شاہ جہاں پور میں منعقد ہوئی تھی اس مجلس کی شرکت کے لئے آپ شاہجہاں پور میں تشریف لے جا رہے تھے کوئی خادم ساتھ نہ تھا استقبال سے بچنے کے لئے ایک اسٹیشن پہلے اتر گئے اور پیدل چل کر شاہ جہاں پور پہونچے، راستے میں ایک ندی پڑتی تھی

(۱) مولانا سید محمود احمد صاحب (جو محلہ اصالہ پورہ مراد آباد کے رہنے والے تھے اور مدرسہ شاہی میں ۱۸ سال تک مہتمم رہے تھے) نے کلکتہ کے زمانہ قیام میں احقر کو بتایا تھا کہ بہشتی نے جو ایک پیسہ دیا تھا وہ آج تک مدرسہ شاہی کے خزانہ میں محفوظ ہے۔

اسے پار کیا تو پاجامہ بھیگ گیا جو گاڑھے کا تھا اس کی جگہ چادر باندھ لی اور پاجامہ کو لاٹھی پر ڈال کر کاندھے پر لٹکا کر چلتے رہے تاکہ سوکھ جائے، شاہجہاں پور پہونچے تو ایک سرائے میں جا کر مقیم ہو گئے، وہاں اپنا نام خورشید حسن لکھوادیا، جو آپ کا تاریخی نام تھا ادھر تو یہ ہوا اور اُدھر استقبال کرنے والے اسٹیشن پر پہونچے پوری ریل چھان ماری کسی ڈبہ میں پتہ نہ چلا افسوس کرتے ہوئے واپس لوٹے اور آپس میں کہنے لگے کہ ہر فرقہ کے مناظر آگئے ہمارا مناظر نہیں آیا حیران ہو رہے تھے کہ مقابلہ کے وقت کیا ہوگا؟ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک شخص نے کہا ذرا سرائے میں چل کر تو دیکھیں وہاں پہونچے تو رجسٹر لکھنے والے سے پوچھا کہ محمد قاسم نام کا کوئی آیا ہے اس نے کہا کہ اس نام کا تو کوئی شخص نہیں آیا، جو لوگ تلاش میں نکلے تھے ان میں سے ایک شخص نے کہا ذرا مجھے رجسٹر تو دکھاؤ، جب مندرجہ نام دیکھنے لگے تو ان میں ایک نام خورشید حسن لکھا تھا حاضرین میں سے بعض افراد جانتے تھے کہ یہ آپ کا تاریخی نام ہے کمرہ نمبر معلوم ہونے پر جا کر دیکھا تو حضرت تشریف رکھتے تھے سب کی جان میں جان آگئی اور خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ (۲)

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے دہلی میں مطبع احمدی کے نام سے ایک پریس قائم کیا تھا اس زمانہ میں صرف لیتھو پریس کا رواج تھا (اب تو کمپیوٹر نے سب طریقے بھلادیئے) مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خود ہی کتابوں کے حواشی لکھتے تھے اور خود ہی شائع فرماتے تھے۔ جلالین شریف، ترمذی شریف، مشکوۃ شریف کے جو حواشی رائج ہیں اندازہ کیا جاتا ہے کہ ان ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ مسلم شریف کا حاشیہ لکھنے کے بجائے انھوں نے علامہ نووی رحمۃ اللہ علیہ کی شرح ہر صفحہ کے ذیل میں چھاپ دی۔ ہندو پاک میں مسلم شریف آج تک اسی طرح چھپ رہی ہے۔ بخاری شریف کا حاشیہ بھی ان ہی کا لکھا ہوا ہے۔ ۲۵ پاروں تک تو انھوں نے لکھا ہے اور پانچ پاروں کے حواشی قاسم العلوم والخیرات حضرت نانوتوی رحمہ اللہ سے لکھوائے۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہیں اپنا نام نہیں لکھا۔ مخلصین کی بھی کیا شان ہے۔ (دور حاضر کے محشی حضرات کو دیکھ لیجئے ہر ہر صفحہ میں کئی کئی دفعہ نام اور علمیت جتانے کا پروگرام سامنے رہتا ہے)

(۲) اس کے ہم معنی ارواح ثلاثہ میں ایک اور حکایت بھی ہے (دیکھئے حکایت: ۲۸۴)

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع سے اور حضرت شیخ الاسلام حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی تواضع سے بھرپور حصہ ملا۔

زہد وقناعت اور استغناء

حضرت حجۃ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ میں شان تواضع تو نمایاں تھی ہی زہد اور استغناء بھی بہت تھا۔ جب دارالعلوم دیوبند قائم کیا اس وقت میرٹھ کے ایک پریس میں تصحیح کا کام کرتے تھے، دس روپئے تنخواہ تھی۔ مدرسہ قائم کرکے اس کی سرپرستی تو فرمائی لیکن نہ تنخواہ دار مدرس بنے نہ مجلس شوری کے رکن ہوئے، نہ صدر بنے۔ اسی زمانہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے آپ سے علم حاصل کیا۔

میرٹھ کے ایک رئیس رومال میں بہت سے روپئے باندھ کر حاضر ہوئے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ حجامت بنوا رہے تھے اول تو حضرت نے ان کی طرف سے تغافل برتا پھر کچھ دیر کے بعد فرمایا آہا شیخ صاحب ہیں؟ مزاج اچھا ہے انھوں نے سلام عرض کیا اور رومال میں جو روپئے بندھے ہوئے تھے حضرت کے قدموں میں ڈال دیئے "اس زمانہ میں روپیہ چاندی کا ہوتا تھا" حضرت نے وہ روپیہ اپنے قدموں سے ہٹادیا وہ بڑی منت سے قبول کرنے کی درخواست کرتے رہے لیکن حضرت نے قبول نہ فرمایا۔ وہ آپ کی جوتیوں میں ڈال کر چلے گئے۔ حضرت جب اٹھے تو نہایت استغنا کے ساتھ جوتے جھاڑے اور روپیہ سب زمین پر گر گیا حضرت نے جوتے پہن لئے اور حافظ انوار الحق صاحب سے ہنس کر فرمایا کہ حافظ جی ہم بھی دنیا کماتے ہیں اور اہل دنیا بھی دنیا کماتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم دنیا کو ٹھکراتے ہیں اور وہ قدموں میں پڑتی ہے اور دنیا دار اس کے قدموں میں گرتے ہیں اور وہ انھیں ٹھکراتی ہے اور یہ فرما کر روپیہ وہیں تقسیم فرمادیا۔ (۳)

جس زمانہ میں میرٹھ کے مطبع سے دس روپئے تنخواہ ملتی تھی انھیں دنوں نواب صدیق حسن خان صاحب رئیس بھوپال کی طرف سے پانچ سو روپئے ماہانہ کی پیش کش کی گئی آپ نے جانے سے انکار کردیا ایک بے تکلف ساتھی نے کہا کہ تم کیوں نہیں چلے جاتے؟ جواب میں فرمایا کہ وہ مجھے باکمال سمجھ کر بلاتے ہیں اور مجھ میں کوئی کمال نہیں ہے تو کیسے جاؤں؟ ان کے سبق کے ساتھی اور دوست اور

(۳) ارواح ثلاثہ: حکایت: ۲۶۶

ہم وطن مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے (جو اس وقت دار العلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے) کسی نے کہا کہ آپ چلے جایئے، فرمایا: بابا مجھے دس روپئے تنخواہ ملتی ہے پانچ روپئے میرے گھر کا خرچہ ہے۔ پانچ روپئے طالب علموں کو دے دیتا ہوں اللہ ان کا بھلا کرے کہ سامنے پڑ جاتے ہیں، ڈھونڈنا نہیں پڑتا اتنی بڑی رقم کے بارے میں سوچنا کہ اس کا کیا کروں یہ دھندہ میرے بس کا نہیں:

اولئك آبائی فجئنی بمثلهم　　　اذا جمعتنا یا جریر المجامعُ

ایک مرتبہ حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ جو شخص ہم کو محتاج سمجھ کر دیتا ہے اس کا ہدیہ تو لینے کو جی نہیں چاہتا اور جو اس غرض سے دیتا ہے کہ ہمارے (یعنی دینے والے کے) گھر میں برکت ہو اور ہمارے لینے کو ہمارا احسان سمجھے اس کا ہدیہ لے لینے کو جی چاہتا ہے اگر چہ وہ چند پیسے ہی ہوں۔ (۴)

مناظرے

انگریزوں نے جب ہندوستان میں نامبارک قدم رکھے تو ان کے بُرے عزائم میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو عیسائی بنالیا جائے چونکہ انھوں نے مسلمانوں ہی سے ملک لیا تھا اس لئے مسلمانوں ہی سے خطرہ تھا عیسائیت پھیلانے کے لئے انھوں نے مشن قائم کئے اور اپنے پادریوں کو مناظرے کرنے کے لئے تیار کیا۔ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ سے اکبر آباد میں پادری فنڈر کا مناظرہ ہوا تین دن تک مناظرہ ہونا طے پایا تھا لیکن وہ تیسرے دن نہ آیا اس نے ہندوستان سے راہ فرار اختیار کی اور ترکی میں جا کر یہ پروپیگنڈہ کیا کہ ہندوستان کے مسلمان عیسائی ہوگئے اور مسجدیں گرجاؤں میں تبدیل ہوگئیں اس وقت ترکی کی حکومت حرمین شریفین میں بھی تھی انگریزوں نے مولانا رحمت اللہ صاحب کی جائیداد ضبط کر لی اور وہ کسی طرح چھپتے چھپاتے یمن سے گزرتے ہوئے مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ یہاں شیخ الحرم احمد زینی دہلان سے ملاقات ہوگئی انھوں نے انکا درس شروع کرادیا۔ جب فنڈر نے ترکی میں یہ جھوٹا پروپیگنڈہ کیا کہ ہندوستانی مسلمان العیاذ باللہ نصرانی ہوگئے۔ سلطان بن عبدالعزیز نے ترکی کے شیخ کے پاس قاصد بھیجا کہ اس بات کی تحقیق

(۴) ارواح ثلاثہ: حکایت: ۲۲۵۔

کرے۔ شیخ نے جواب دیا کہ یہ خبر جھوٹ ہے جس بزرگ نے عیسائی مناظر کو شکست دی تھی وہ ہمارے پاس مکہ معظمہ میں موجود ہے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب مکہ میں مقیم رہے پہلے محلہ شامیہ میں کرائے کا کمرہ لے کر مدرسہ کا افتتاح کیا اس کے بعد صولت النساء بیگم بنگال کی جن نے مدرسہ کے لئے حارۃ الباب میں جگہ خرید کر دے دی لہٰذا محلہ شامیہ سے مدرسہ وہیں منتقل ہوگیا اور آج تک وہیں ہے پہلے مدرسہ کا نام مدرسۃ الشیخ رحمۃ اللہ تھا مذکورہ جن کی مالی سخاوت کے بعد مدرسہ صولتیہ کے نام سے مشہور ہوگیا۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی مناظرے کرنے پڑے عیسائیوں کی دیکھا دیکھی ہندوؤں نے بھی پاؤں نکالے اور انھوں نے بھی مناظروں کا سلسلہ چلایا حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے شاہجہاں پور میں تمام مذاہب کے عوام اور خواص کے سامنے زبردست تقریر کی۔ سب سے اسلام کا لوہا منوالیا کسی کو مجال نہ تھی کہ اُف بھی کرے اور کچھ بول سکے۔ حضرت مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایسی زبردست تقریر فرمائی کہ سب دم بخود رہ گئے۔ نصاریٰ کے پادری بھی لاجواب اور آریوں کے پنڈت بھی عاجز، یہ مجلس میلۂ خدا شناسی کے نام سے قائم کی گئی تھی۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر سے حق واضح ہوکر رہا اور: **لیظهره علی الدین کلہ** کا خوب مظاہرہ ہوا لیکن نہ عیسائیوں نے اسلام قبول کیا اور نہ ہندوؤں نے اور اس دنیا میں یہ کوئی نئی بات نہیں ہے حق کو جانتے ہوئے نہ ماننا نسلی اور مذہبی تعصب کی وجہ سے باطل پر جمے رہنا ضد اور عناد والوں کی پرانی عادت ہے۔ یہودیوں کا حال تو معلوم ہی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے کئی سو سال پہلے مدینہ منورہ میں آپ کی آمد کے انتظار میں آ کر بس گئے تھے اور انصار کے قبیلوں سے کہتے تھے کہ نبی آخر الزماں آئیں گے ہم اُن سے مل کر تمہارا ناس کھودیں گے لیکن جب آپ مدینہ منورہ تشریف لے آئے تو انصار کے دو قبیلے اوس اور خزرج مسلمان ہوگئے لیکن یہودی مسلمان نہ ہوئے، سورہ بقرہ میں اللہ نے ارشاد فرمایا: **وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاء هم ما عرفوا کفروا به فلعنة الله علی الکافرین** .(اور آپ کی آمد سے پہلے آپ کی تشریف آوری کی خبر دے کر کافروں کے مقابلے میں آپ کے ذریعہ

فتح یابی کی خبر دیا کرتے تھے سو جب آپ تشریف لے آئے تو آپ کے منکر ہو گئے۔ سو اللہ کی لعنت ہے کافروں پر)

نصاریٰ نجران آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مباہلہ کی بات طے ہوگئی پھران کے پادری نے کہا کہ دیکھو کہ اگر تمہیں ہلاک ہونا ہے تو مباہلہ کرلو ورنہ چلے چلو چنانچہ وہ لوگ فرار ہولئے۔ سامنے نہ آئے کافروں کی عادت رہی ہے کہ حق واضح ہونے پر بھی حق قبول نہیں کرتے دشمنان اسلام کی دشمنی کے باوجود بھی اسلام پھلا پھولا اور پھیلا اور الحمد للہ پھیل رہا ہے۔ یہود ونصاریٰ کی طرح روافض اور قادیانیوں کا بھی یہ ہی طریقہ رہا ہے۔ بار بار مناظروں میں ہارتے ہیں لیکن اسلام قبول نہیں کرتے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ میں شیعوں نے بھی سر اٹھا رکھا تھا حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اعتراضات کے بھی مسکت اور دندان شکن جوابات دیئے اوران کی ہدایت اور خیر خواہی کے لئے ''ہدیۃ الشیعہ'' تحریر فرمائی، شیعہ ہمیشہ سے تقریری اور تحریری مباحثات میں لاجواب ہوتے رہے ہیں انھیں بھی ضد اور عناد نے بے راہ کر رکھا ہے نہ صرف کہ باطل کے پیرو ہیں بلکہ اہل حق کو طرح طرح کی جسمانی اور روحانی اذیتیں پہنچانے کے حق میں رہے ہیں کم لوگ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے حق کو جاننے کے بعد حق کو قبول کیا اور شیعیت سے تائب ہوئے۔ ایک مرتبہ شیعوں کو کیا سوجھی کہ آپ کے ساتھ تمسخر اور استہزاء کرنے کے لئے کہنے لگے کہ آپ ہمارے جنازے کی نماز پڑھادیں ان لوگوں نے ایک نوجوان کو کپڑا اوڑھا کر لٹا دیا تھا اور اُسے یہ سبق پڑھایا تھا کہ حضرت جب دو تکبیریں کہہ لیں تو اٹھ کر بھاگ جانا اول تو حضرت نے نماز پڑھانے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میرے پڑھانے سے تمہاری نماز جنازہ کیسے ادا ہوگی؟ جب وہ لوگ اصرار ہی کرتے رہے تو آپ آگے بڑھے اور نماز شروع کردی۔ دو تکبیریں کہنے پر جب طے شدہ پروگرام کے مطابق جنازہ میں حرکت نہ ہوئی تو پیچھے سے کسی نے ''ہونہہ'' کے ساتھ صاحب جنازہ کو اٹھ کھڑے ہونے کی سسکاردی مگر وہ نہ اٹھا۔ حضرت نے تکبیرات اربعہ پوری کر کے غصہ کے لہجہ میں فرمایا کہ ''اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا'' دیکھا گیا تو مردہ تھا۔ شیعوں میں رونا پیٹنا پڑ گیا اور بجائے

حضرت والا کی بکی کے خود بکی موت آ گئی۔ اس کرامت کو دیکھ کر شیعوں میں سے بہت سے تائب ہو کر سنی ہو گئے۔ (۵)

جہاد ۱۸۵۷ء میں حصہ

۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۲ھ میں انگریزوں سے جہاد ہوا۔ حاجی کی جماعت بھی حرکت میں آ گئی حضرت حاجی صاحبؒ کے رفقائے کار میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا شیخ محمد تھانویؒ اور حافظ ضامن تھانوی شہیدؒ شامل تھے۔ جہاد کے سلسلے میں تبادلۂ خیال ہوا تو مولانا شیخ محمد محدث تھانویؒ نے بے سروسامانی کا ذکر کر کے جہاد آزادی میں حصہ لینے سے گریز کرنے کی تجویز پیش کی۔ مولانا نانوتویؒ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا کہ کیا ہم اصحاب بدر سے بھی زیادہ بے سروسامان ہیں؟ حضرت حاجی صاحبؒ نے یہ فقرہ سنا تو تڑپ اٹھے اور فرمایا کہ اب ''الحمد للہ انشراح ہو گیا'' اور جہاد کی تیاری شروع کر دی گئی، حاجی امداد اللہ امیر، مولانا نانوتوی سپہ سالار، مولانا گنگوہی قاضی مقرر ہوئے اور تھانہ بھون دارالاسلام قرار پایا۔ میرٹھ کے بعد دہلی اور ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگ چھڑ چکی تھی آپؒ نے اپنے امیر کی قیادت میں جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ تھانہ بھون بھی شدید جنگ کی لپیٹ میں تھا۔ قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ مکانات پر مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے قصبہ تھانہ بھون خاکستر کا ڈھیر بن گیا۔ فسادیوں نے یہ کام کیا لیکن انگریزوں کی طرف سے حضرت حاجی صاحب اور آپ کے رفقاء کار پر الزام تھا کہ تھانہ بھون کے فساد میں پیش پیش تھے اس بناء پر وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے لیکن حضرت نانوتوی کو پولیس گرفتار نہ کر سکی۔ سی آئی ڈی بھی پہونچے۔ پولیس بھی پیچھے لگی، لیکن آپ ہمیشہ بچ کر نکلتے رہے۔ ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ آپ مسجد میں باہر فرش پر کھڑے تھے پولیس نے آپ ہی سے پوچھا کہ مولوی قاسم کہاں ہے ایک دو قدم آگے بڑھ کر فرمایا ابھی تو یہیں تھے پولیس والے یہ سمجھ کر یہ کوئی دوسرا شخص ہے چھوڑ کر چلے گئے۔

وارنٹ نکلنے کے بعد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ صرف تین دن پوشیدہ رہے اس کے بعد باہر

(۵) حاشیہ سوانح قاسمی جلد اول ص: ۱۷

آگئے اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین دن غار ثور میں رہے تھے ہم نے اس کا اتباع کرلیا آپ کے دوست خاص اور مصاحب قدیم مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بھی وارنٹ نکلے تھے۔ انھوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے جہاد میں شرکت کی تھی۔ پولیس گرفتار کر کے سہارنپور لے گئی پھر کچھ عرصہ کے بعد مظفر نگر کی جیل میں منتقل کردیا۔ جب پولیس آپ کو مظفر نگر لے جارہی تھی تو مولانا نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ راستہ میں کھڑے ہوگئے اور دور ہی سے آپس میں سلام کی نوبت آئی اور اشاروں سے اظہار محبت جانبین سے کردیا گیا۔ (۶)

حاولن تفديتي وخفن مراقبا　　　فوضعن أيديهن فوق ترائبا

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ چھ ماہ جیل میں رہے انگریز حاکم نے دریافت کیا تم نے ہمارے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں تسبیح تھی تسبیح اٹھا کر دکھائی اور فرمایا: ہمارا ہتھیار تو یہ ہے۔ دیکھو جھوٹ بھی نہیں بولا اور یوں بھی نہیں کہا کہ ہم نے ہتھیار نہیں اٹھایا حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ کما فی الحصن الحصین اپنے اس ہتھیار کا اقرار کرلیا۔

بیعت اور منازل سلوک

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی اور حضرت قاسم العلوم والخیرات نانوتوی رحمۃ اللہ علیہما سبق کے ساتھی تھے کئی سال دہلی میں گزارے تھے۔ مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب میں اور مولوی محمد قاسم صاحب دہلی میں استاذ رحمۃ اللہ علیہ (غالباً مولانا مملوک علی صاحبؒ) سے پڑھتے تھے ہمارا ارادہ سلم شروع کرنے کا ہوا لیکن مولانا کو فرصت نہ تھی اس لئے انکار فرماتے تھے بالآخر میں نے عرض کیا کہ حضرت ہفتہ میں دوبار صرف پیر اور جمعرات (یا جمعہ) کو پڑھا دیا کیجئے یہ منظور ہوگیا اور ہفتہ میں دو سبق ہونے لگے اس سبق کی ہمیں بڑی قدر تھی ایک روز یہی سبق ہو رہا تھا کہ ایک شخص نیلی لنگی کندھے پر ڈالے ہوئے آنکلے اور ان کو دیکھ کر حضرت مولوی صاحب معہ تمام مجمع کے کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ بھائی حاجی صاحب آگئے اور حضرت مولانا نے مجھ سے

(۶) تذکرۃ الرشید ص: ۸۴۔

مخاطب ہوکر فرمایا کہ لو بھائی رشید اب سبق پھر ہوگا۔ مجھے سبق کا بہت افسوس ہوا اور میں نے مولوی محمد قاسم صاحب سے کہا کہ ''بھئی یہ اچھا حاجی آیا ہمارا سبق ہی گیا'' مولوی محمد قاسم صاحب نے کہا: بابا ایسا مت کہو یہ بزرگ ہیں اور ایسے ہیں ایسے ہیں ''ہمیں کیا خبر تھی کہ یہی حاجی ہمیں مونڈیں گے''۔ (۷)

حضرت حاجی صاحب فارغ التحصیل عالم نہیں تھے لیکن ایسے ایسے اکابر ان سے بیعت ہوئے جو علم کے پہاڑ تھے، پھر حاجی صاحب ہی کے ہو رہے اور اسی کو مونڈنے سے تعبیر فرمایا۔ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا حضرت حاجی صاحب مولوی نہ تھے؟ فرمایا مولوی گر تھے، اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میں علوم ہی کی وجہ سے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا معتقد ہوا ہوں۔ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہما حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور بہت جلدی ہی خلافت سے نواز دیئے گئے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دونوں حضرات سے بہت محبت اور عقیدت تھی ایک مرتبہ ارشاد فرمایا:

''جو آدمی اس فقیر امداد اللہ سے محبت و عقیدت و ارادت رکھتا ہے، مولوی رشید احمد سلمہ اور مولوی محمد قاسم سلمہ کو جو تمام کمالات علوم ظاہری اور باطنی کو جامع ہیں بجائے میرے بلکہ مجھ سے بھی بڑھ کر شمار کرے۔ اگر معاملہ برعکس ہے وہ بجائے میرے اور میں بجائے ان کے ہوتا ان کی صحبت غنیمت جاننی چاہیے کہ ان جیسے آدمی اس زمانہ میں نایاب ہیں''۔

ضیاء القلوب میں حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کا یہ ملفوظ بھی ہے:

''اگر حق تعالیٰ مجھ سے دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لے کر آیا تو میں رشید احمد صاحب اور مولوی محمد قاسم صاحب کو پیش کر دوں گا کہ یہ لے کر حاضر ہوا ہوں''۔

آخر کوئی تو وجہ تھی کہ ان دونوں حضرات نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیا اور مرید ہونے کی ضرورت محسوس کی، بات یہ ہے کہ علم کے ساتھ قلب منیب بھی ہونا چاہیے جو لوگ اس ضرورت کو محسوس نہیں کرتے وہ علم کے غرور میں صاحب نسبت حضرات سے دور

(۷) تذکرۃ الرشید۔

بھاگتے ہیں اور محروم رہتے ہیں یہ تو ماضی قریب کی باتیں ہیں ماضی بعید میں حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شمس تبریز کے مرید ہوئے اور پھر ان ہی کے ہو رہے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ بھی یہ ہی واقعہ پیش آیا۔ بہت بڑے عالم تھے صاحب جاہ تھے بڑا مرتبہ تھا لیکن انھوں نے ضرورت محسوس کی اور اپنے باطن کو انابت الی اللہ سے خالی پایا، نفس کا مراقبہ ومحاسبہ کیا۔ اپنے مرشد کی طرف رجوع ہوئے اور اصلاح باطنی کی طرف ایسے متوجہ ہوئے کہ نہ صرف اپنا بھلا کیا بلکہ قیامت تک کے لئے علماء کو بیدار کر دیا منجیات ومہلکات سے آگاہ کیا اور رہتی دنیا تک کے لئے احیاء العلوم دنیا میں چھوڑ گئے۔

جو لوگ تصوف وسلوک سے راضی نہیں وہ کسی صاحب نسبت سے قریب ہی نہیں ہوتے کہ اس لائن کے فیوض وبرکات سے بہرہ ور ہوں: الناس اعداء لما جھلوا تصوف وسلوک کے فوائد سے بے خبر ہیں اس لئے اس کی مخالفت کرتے ہیں، علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ مشہور مصنف تھے شہرت میں حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے لگ بھگ مقام رکھتے تھے انھوں نے تعلق قائم کیا تو ان کے متعلقین میں سے ایک بڑا حلقہ معترض ہوا، بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اتنے بڑے علامہ نے ایک ملا کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ حضرت علامہ نے جواب دیا کہ علم محض سے کام نہیں چلتا، علم کے ساتھ قلب منیب کی بھی ضرورت ہے اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ ایک طرف تو علامہ کہتے ہیں اور دوسری طرف معترض ہو رہے ہیں اس سے تو اور عبرت لینی چاہیے کہ جب اتنے بڑے علامہ کو اصلاح نفس کے لئے کسی مرشد ومصلح کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے تو کم علم کو کیوں کر اس کی ضرورت نہ ہوگی۔

جو حضرات صاحب نسبت ہیں۔ جس کو تعلق مع اللہ کی دولت حاصل ہے وہ کچھ نصیحت کرتے ہیں تو دل میں اترتی چلی جاتی ہے اور جن کو یہ دولت نصیب نہیں ان کے پاس صرف علم ہی علم ہے۔ وہ بڑی بڑی تقریریں کرتے ہیں لوگ ان کی تقریریں کانوں کی عیاشی کے لئے سن لیتے ہیں دل پر کسی کے کچھ بھی اثر نہیں ہوتا۔ یہ تجرباتی باتیں ہیں۔ تجربہ بڑی دلیل ہے اور شاہد عدل ہے۔

مدارس میں اس کی بہت زیادہ ضرورت ہے کہ اساتذہ اور تلامذہ میں ذکر وفکر کی شان پیدا

ہو۔تزکیۂ باطن، تربیت نفس، کثرت ذکر، مراقبہ ومحاسبہ ہر فرد کے اندر ہونا چاہیے ان کاموں کے لئے مرشد ومربی کی ضرورت ہوتی ہے، ہندوستان کے مختلف شہروں میں اکابر دیوبند کے خلفاء موجود ہیں، اہل طلب ان سے رجوع فرمائیں علم بھی حاصل کریں اور عملی زندگی بھی سدھاریں، ظاہر وباطن دونوں آراستہ ہوں۔قرآن وحدیث کا علم تو آج کل مستشرقین کے پاس بھی ہے اسلامیات پر کتابیں بھی لکھتے ہیں۔سب کچھ پڑھتے ہیں لیکن گمراہ ہیں۔ایمان ویقین، علم وعمل ظاہر وباطن کی اصلاح، خدمت دین، فکر آخرت، سب ہی چیزوں کی ضرورت ہے۔

مولانا محمد اسلم قاسمی*

حجۃ الاسلام حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ

مادرِ گیتی تاریخ کے ہر دور میں اپنے سینے سے انسانی قالب میں لعل وجواہر نکالتی رہی۔ انگنت بے مثال ہستیوں نے اس عروس دنیا کو اپنے فکر وعلم سے سنوارا۔ اُن کے علمی وفکری احسانات سے انسان کبھی سر برآ نہیں ہوسکتا۔ ان عظیم ہستیوں کی صف میں اولین درجہ تو اللہ کے سچے پیغمبروں کا ہے جنہوں نے انسان کو مقصد حیات بتلایا، اُن کی رہنمائی نے پیدائش سے موت تک زندگی کے ایک ایک حرکت وسکون کے نوک پلک کو سجایا، بندے کا تعلق خدا سے قائم کیا، جہل وسرکشی کے عفریت پر ضرب لگائی، راہ سے بھٹکے ہوؤں کو منزل مراد بتلائی اور آدم کے شوریدہ سر فرزندوں کو پروردگار کے پُر جلال چوکھٹ پر جھکا دیا۔ پورا عالم انسانیت اللہ کے ان برگزیدہ ترین بندوں کا ہمیشہ احسان مند رہے گا۔

پھر اس کے بعد وہ مشہور شخصیتیں ہیں جو کسی علم وفن یا ہنر میں اپنا نام پیدا کر گئیں یا وہ سلاطین ہیں جو اپنی مسلسل فتوحات کے ذریعہ صفحاتِ تاریخ پر اپنی چھاپ چھوڑ گئے ہیں۔ غرض زندگی کے ہر میدان میں تاریخ کا سفینہ اپنی بیشمار اور مایۂ ناز شخصیات کو محفوظ کئے ہوئے ہے۔

تیرہویں صدی ہجری اور انیسویں صدی عیسوی نے شخصیات کی اس کہکشانی لڑی میں ایک ایسے دُرِ آبدار کا اضافہ کیا جن کی چمک دمک نے صرف اپنے عہد کو ہی نہیں آنے والی صدیوں کو بھی روشن کر دیا۔

یہ گراں مایہ شخصیت حضرت الامام حجۃ الاسلام قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم النانوتوی کی ہے۔ حضرت نانوتوی ولی اللّٰہی سلسلۂ علم وروحانیت کی وہ قد آور شخصیت ہیں جن پر خود زمانہ فخر کرتا ہے۔ آپ حق تعالیٰ کی عطا کردہ گوناگوں صلاحیتوں کا ایک نادر نمونہ تھے۔ اگر علمی لحاظ سے آپ غزالی

---

* استاذ تفسیر وحدیث، وقف دارالعلوم دیوبند

ورازی کی سندِ معقول کے صدر نشین تھے تو روحانی اعتبار سے آپ اپنے وقت میں بوذری فقر و بوریہ نشینی کی یادگار تھے۔ ایک طرف آپ تبلیغ اور ابلاغ دین کے شہسوار تھے تو دوسری طرف بدعات وخرافات کے ابتر ماحول میں آپ ایک عظیم مجدد کے مقام پر نظر آتے ہیں۔ آپ کے قلم البرز شکن نے اصول دین کو کلامی اور عقلی و معقولی انداز میں اس طرح مدلل کیا کہ آپ کے فلسفیانہ استدلال نے ارسطو کے زندیقی فلسفہ کے تار و پود بکھیر دیئے۔ یہاں تک کہ اس راہ پر اپنے پیش رووں میں بعض اکابر سے ایک قدم آگے نظر آتے ہیں۔ چنانچہ بہت کچھ اشکالات جنہیں امام رازی نے بالتفصیل اٹھایا لیکن بغیر جواب دیئے آگے بڑھ گئے اُن کے مدلل جوابات حضرت نانوتوی کے یہاں ملتے ہیں۔ علمی میدانوں میں آپ کی تگ وتاز کی بلند پروازی اگر شاہین وعقاب کے مانند ہے تو دوسری طرف مجاہدہ وریاضت کی دوڑ میں آپ کی شکستگی اور ظاہری سراپا سے بے نیازی سنتِ بوذری کی ایک تابندہ مثال ہے جو آج بھی دلوں کی ایمان افروزی کا ذریعہ ہے۔ حضرت نانوتوی علم وفکر کے اعتبار سے اسرار وحکم کے راز کشا تھے۔ آپ نے اصولِ دین پر مخالفین کی جانب سے کئے جانے والے اعتراضات کا دفعیہ تحریر کے ساتھ ساتھ اپنی مناظرانہ تقریری صلاحیتوں سے بھی کیا اور برجستہ خطابات میں اس طرح معقولی استدلال کئے کہ مخالف کو فرار کے سوا چارۂ کار نہ رہا۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف آپ کے مواعظ نے دین میں کئے گئے اضافات واختراعات کو مٹایا اور مسائل دین پر سے وقت کے غبار کو اڑا کر اُس کے رُخِ روشن کو نمایاں کیا، اس طرح حق تعالیٰ نے آپ کی شان مجددیت کو بھی آشکار کیا کہ دین میں لوگوں کے اختراعات سے جو اس کی شکل بدل گئی تھی حضرت نانوتوی کی مساعی نے اُن بدعات کو بیخ وبن سے اکھاڑ کر اُس کے صحیح خدوخال واضح کئے۔

غرض اللہ تعالیٰ نے حضرت نانوتوی کی شکل میں ایک جامع الصفات شخصیت کو نمودار کیا جس کے ہمہ جہتی کارناموں نے علمی وعملی طور پر ملتِ اسلامیہ کو نشاۃ ثانیہ دی۔ آپ کی ذات نے اس امت محمدی میں جو زوال کے زخموں سے چور اور نڈھال ہو رہی تھی اپنی مسیحا نفسی سے نئی زندگی کی روح پھونکی اور اس بیجان قالب کو پھر سے متحرک کیا۔

حضرت نانوتوی نے رمضان ۱۲۴۸ھ مطابق ۱۸۳۲ء میں اس بزم ہست وبود کو رونق بخشی۔ یہ دور بالعموم پورے ملک اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کے لئے انتہائی پُر آشوب دور تھا۔ جس میں مغلیہ

سلطنت کا چراغ زندگی ٹمٹما رہا تھا۔ مسلمانوں کی گذشتہ سطوت کی بساط الٹتی جا رہی تھی اور ایک با اقتدار فرقہ غیر ملکی قوم کے دبدبے سے پستا جا رہا تھا۔

ہندوستان میں آٹھ نو سو سال حکومت کرنے والی قوم نے اپنے دورِ اقتدار میں جہاں وطنِ عزیز کو تہذیب و تمدن کی رونقیں دیں وہیں بعض فرمارواؤں نے اُن اسلامی اقدار کو تباہ کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا جو اُن کے پیشروؤں نے پورے اخلاص سے قائم رکھی تھیں۔ حکمرانوں کی غلط کاریوں پر نکیر کرنے والے علماء کو دورِ انحطاط میں بھی اپنے فرمانرواؤں کی دینی غیرت سے تقویت حاصل رہی اور وہ نہی عن المنکر کا فریضہ برابر انجام دیتے آ رہے تھے۔ یہاں تک کہ دورِ اکبری میں اُن تمام نقوش کو مٹانے کی کھلی چھوٹ مل گئی جو دینی دردمندی کے طفیل ماضی میں ثبت کئے گئے تھے۔ تاہم اکبر کے جانشینوں نے مغل اعظم کی غلط کاریوں کا ازالہ کرنے میں قدم بڑھایا اور ایک بار پھر اسلامی قدریں زندہ ہوئیں۔ دوسری طرف مغلوں کے عروج و اقتدار کا سورج جو اپنے نصف النہار پر پہونچ چکا تھا روبہ زوال ہونے لگا، دورِ جہانگیری میں عیش و طرب اور کیف و مستی نے قوتِ کار کو مضمحل کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ شاہجہاں کے عہد میں یہ تدریجی انحطاط شاہی خاندان کی باہمی آویزشوں اور محلاتی سازشوں کی صورت میں ابھرا۔

انگریزوں کی ہندوستان میں آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ دورِ اکبری میں ان لوگوں پر بادشاہ کی نظر کرم رہی اور یہ شاہی نوازشوں کے سائے میں پھل پھول رہے تھے۔ پھر جہانگیر کے بعد جب شاہ جہاں تختِ شاہی پر رونق افروز ہوا تو وہ یورپین اقوام کی جسارتیں برداشت نہ کر سکا۔ اُس نے اُن کے خلاف تادیبی کارروائیاں کیں، یہاں تک کہ عہد عالمگیری میں ان کو ملک بدر بھی کیا گیا تاہم پھر اُن کو تجارتی سہولتیں دے دی گئیں۔ عالمگیر کی حکومت اپنی وسعت کے اعتبار سے مغلوں میں سب سے بڑی سلطنت رہی مگر یہ بستر مرگ پر پڑے مریض کا آخری سنبھالا تھا۔ ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب نے جونہی دم توڑا سلطنت مغلیہ کے تین سو سالہ استحکام میں شگاف پڑ گئے۔ مختلف فرقے جو مناسب وقت کے منتظر تھے ایک دم چاروں طرف سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مرہٹوں روہیلوں وغیرہ نے اپنے علاقوں کا رشتہ مرکز سے توڑ کر خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ ادھر شیعہ سُنی فتنے نے پوری شدت سے سر اٹھایا۔

اس ابتری کے دوران سفید فام قوموں نے افراتفری کے ماحول کو اپنے لئے نیک فال سمجھا،

یہ لوگ اگرچہ آپس میں گتھم گتھا ہو رہے تھے مگر ہندوستان کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھانے میں یہ سب یورپین ہم خیال تھے۔ ملک کی ابتری سے سب سے زیادہ فائدہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اٹھایا، بنگال کو کمپنی نے اپنی سازشوں اور فوجی طاقت کا مرکز بنایا اور وہاں کے حکمراں کو ختم کر کے کمپنی نے حاکمانہ صورت اختیار کر لی۔

ادھر امام الطائفہ حضرت شاہ ولی اللہ اس افراتفری سے ملول ہی نہیں تھے بلکہ انقلابی انداز فکر سے اس کا حل ڈھونڈ رہے تھے مگر اسی دوران اُن کے لئے قضاء وقدر کا فرمان آ گیا۔ پھر ان کے خلف الرشید حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنے والد کے مشن کو آگے بڑھایا۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ متوفی ۱۸۲۴ء اور پھر ۱۸۳۱ء میں حضرت سید احمد شہید کے رخصت ہو جانے کے بعد اس امانت کے صحیح وارث حضرت مولانا مملوک علی صاحب اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے علمی و روحانی شاگرد و متوسلین بنے۔ علماء وصلحاء کا یہ مجمع جن شخصیات پر مشتمل تھا وہ قدرت کی عطا کردہ گوناگوں صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان میں سرفہرست حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کا نام نامی ہے جو ایک ایسے بے مثال عالم تھے کہ اگر ایک طرف مسند منقول و معقول پر رونق افروز تھے تو دوسری طرف ایک بے بدل مفکر اور مناظر و مصنف بھی تھے۔ اس اعتبار سے فکرِ ولی اللّٰہی کے امین اور دہلوی مکتب فکر کے حقیقی وارث کی حیثیت سے اگر کوئی نام اکابر دیوبند کے مجمع میں نمایاں ترین نظر آتا ہے تو وہ حضرت نانوتوی رحمہ اللہ کا ہے۔ پھر قدرتی طور پر بھی شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی حکمت کو زندہ رکھنے کا اولین سہرا اسی شخصیت کے سر ہوا۔ حضرت نانوتوی کی عبقری شخصیت نے اس تحریک کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ وقت کے مطابق اس کے نوک پلک کو سنوار کر آگے بڑھایا۔ حکمتِ ولی اللّٰہی کے اسی جدید قالب کو قاسمیت سے تعبیر کیا گیا جو آج دنیا بھر میں مسلک دیوبند یا تحریک دیوبند کے نام سے متعارف ہے۔

بالاکوٹ کے معرکے میں وہ سرزمین حضرت سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید کے لہو سے سرخرو ہو چکی تھی۔ ہندوستان انگریزی سازشوں کی بھٹی میں تپ رہا تھا اور مغلیہ حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ مسلمان اپنے مستقبل کی طرف سے مضطرب تھے مگر تاریخ اسلام کے لئے یہ نشیب وفراز نئے نہیں تھے۔ یہ قوم ایسے ہچکولوں سے ہمیشہ دوچار ہوتی آئی ہے۔ انتہائی مایوس کن حالات میں بھی اچانک غیبی

مدد نے سہارا دیا اور یہ ڈوبتی ہوئی کشتی طوفان کے تھپیڑوں سے نکل کر آسودۂ ساحل ہوئی۔ اب بھی بدترین حالات میں مشیتِ خداوندی آخری دین اور ملتِ بیضاء کی حفاظت کا سامان شروع کر چکی تھی۔

نانوتہ۔ دیوبند کے مغرب میں ایک چھوٹی سی کوردہ بستی ہے۔ اس غیر معروف دیہاتی علاقے کی جغرافیائی نقشوں میں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ مگر قدرت کو اس سرزمین پر پیار آ گیا۔ رمضان ۱۲۴۸ھ م ۱۸۳۲ء میں نانوتہ کے اس ویرانے میں بہار آئی اور یہاں ایک ایسا پھول کھلا جس کی خوشبو رفتہ رفتہ ہندوستان کی فضاؤں سے نکل کر دنیا کے گوشے گوشے کو معطر کر گئی۔ اس بستی کو حق تعالیٰ نے وہ سرفرازی عطا فرمائی کہ یہ گمنام سا قصبہ پورے ملک کے لئے سرمایۂ ناز بن گیا۔ نانوتہ کے صدیقی شیوخ کے گھرانے میں پیدا ہونے والا یہ بچہ جس کا نام محمد قاسم تجویز ہوا اسم بامسمّٰی ہو کر "قاسم العلوم والخیرات" بنا۔ آثار سعادت بچپن سے ہی رونما ہونے شروع ہو گئے۔ ذہانت و ذکاوت آپ کو خاندانی ورثہ کے طور پر ملی، رسم بسم اللہ اور کچھ ابتدائی تعلیم وطن میں ہوئی، اس کے بعد کچھ مقامی حالات کے پیش نظر آپ کو دیوبند میں مکتبی تعلیم کے لئے بھیجا گیا، پھر کچھ عرصہ سہارنپور میں ابتدائی عربی و فارسی کتابیں پڑھنے کے بعد آپ کو تکمیل علوم کے لئے دہلی بھیج دیا گیا۔

دہلی میں آپ کو استاذ الاساتذہ حضرت مولانا مملوک علی صاحب سے تلمذ اور تحصیل علوم کا شرف حاصل ہوا جو اپنے وقت کے جید عالم ہی نہیں بلکہ استاذ العصر بھی ہیں، مولانا مملوک علی صاحب اٹھارہویں صدی کے اُن بے مثال علماء میں سے ہیں جن کے فیضِ علم سے انیسویں صدی کے اکثر و بیشتر مشاہیر اہل علم بہرہ ور ہوئے جیسے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب، حضرت امام نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند، حضرت گنگوہی، مولانا یعقوب صاحب نانوتوی، سرسید احمد خاں بانی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مولوی ذکاء اللہ صاحب پروفیسر آلہ آباد یونیورسٹی، مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری، ڈپٹی نذیر احمد صاحب مترجم قرآن، مولانا محمد احسن نانوتوی مترجم احیاء العلوم، مولانا محمد مظہر صاحب بانی مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہم۔ سرسید نے مولانا کی غیر معمولی مدح سرائی کی۔ ۱۲۵۹ھ کے آخر میں آپ دہلی جاتے ہوئے اپنے صاحبزادے مولانا یعقوب صاحب کے ساتھ ساتھ حضرت نانوتوی کو بھی تعلیم کی غرض سے لے کر دہلی آ گئے، حضرت الامام نے ۱۲۶۰ سے ۱۲۶۷ھ تک اپنے شفیق و فاضل استاد سے فیض علم حاصل کیا، ۱۲۶۷ھ میں حضرت مولانا مملوک علی صاحب کا مرض

یرقان میں انتقال ہو گیا۔

حضرت نانوتوی نے علوم وفنون کی کتابیں مولانا مملوک علی صاحب سے مکمل کرنے کے بعد محدث کبیر حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی (تلمیذ رشید حضرت مولانا شاہ محمد اسحٰق صاحب دہلوی) کے سامنے تحصیل حدیث کے لئے زانوئے ادب طے کیا اوران سے کتب حدیث پڑھیں۔ دہلی کے اسی زمانۂ طالب علمی میں دنیاوی علوم مثلاً علومِ ریاضی، اُقلیدس اورقواعد حساب میں بھی دستگاہ حاصل کی اور کچھ عرصہ ایک سرکاری مدرسہ میں بھی پڑھتے رہے۔ اس طرح دہلی میں آپ نے صحاح ستہ کے علاوہ ادب، ہیئت، ریاضی، منطق وفلسفہ اورمنقولات میں تفسیر واصولِ فقہ اور معانی کی کتابیں پڑھیں، ان علوم میں سے اکثر میں مولانا مملوک علی صاحب ہی آپ کے استاد ہیں۔ تکمیل علوم کے بعد آپ نے کچھ عرصہ معمولی ملازمتیں بھی کیں جن کی آمدنی اکل حلال پر التزام رکھنے کے لئے بس ضرورت بھر تھی۔

علوم ظاہری سے فراغت کے بعد آپ علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے۔ تعلیم سے فراغت ۱۲۶۷ھ میں ہوئی تھی۔ اسی سال آپ کو منازل سلوک طے کرنے کے لئے مرشد کی تلاش ہوئی۔ اُس وقت کے صاحبِ نسبت بزرگوں میں ممتاز ترین اور مرجع خاص وعام ذات حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی تھی۔

حضرت حاجی صاحب ابن حافظ محمد ابن فاروقی ان باکمال بزرگوں میں سے ہیں جن کے مریدین ومسترشدین میں عرب وعجم ہر جگہ کے حضرات شامل تھے، آپ رسمی طور پر تو عالم دین نہیں تھے کیونکہ درسِ نظامی کی تکمیل نہیں کر سکے تھے مگر رموزِ دین اور علم شریعت کی گہرائیوں پر حق تعالیٰ نے آپ کو وہ نظر عطا فرمائی تھی جو ایک عارف اور مرشد کو حاصل ہونی چاہئے۔ آپ ایک صاحبِ کشف وکرامت بزرگ اور خاندانِ چشتیہ صابریہ کے انتہائی ممتاز مشائخ میں سے تھے جن کی ذات پر مختلف ذوق اور مشرب کے لوگ مجتمع تھے۔ اس زمانے کے بڑے بڑے اکثر حضرات حاجی صاحب کے دامنِ روحانیت سے وابستہ نظر آتے ہیں جس طرح حضرت الامام کے استاد اور علمی مربی حضرت مولانا مملوک علی صاحب اُس دور کے استاذ الاساتذہ ہیں اور اکثر مشاہیر وقت مولانا کے ہی شاگردانِ رشید ہیں اسی طرح حضرت نانوتوی کے روحانی مربی اور شیخ طریقت یعنی حاجی صاحب بھی اپنے وقت کے

شیخ المشائخ اور اکثر مشاہیر علماء کے پیر ہیں۔ چنانچہ ان مشاہیر میں حضرت نانوتوی، حضرت گنگوہی، حضرت مولانا یعقوب صاحب، حکیم ضیاء الدین صاحب، حضرت تھانوی اور مولانا فیض الحسن سہارنپوری جیسے نمایاں ترین حضرات شامل ہیں۔

حضرت نانوتوی کی نگاہِ بصیرت نے اس روحانی کمال کو پہچانا اور اُن کی نگاہِ انتخاب اسی مرشد کی ذات پر آ کر ٹھہر گئی۔ یوں بھی حاجی صاحب سے حضرت نانوتوی کا تعلق بچپن کے زمانے سے قائم تھا۔ چنانچہ دہلی کے زمانۂ تعلیم میں وطن آتے جاتے آپ کا تھانہ بھون ٹھہرنے کا معمول تھا جو صرف حاجی صاحب کی زیارت کی وجہ سے تھا۔ اُدھر خود حضرت حاجی صاحب جب کبھی دہلی جاتے تو مولانا مملوک علی صاحب کے پاس قیام فرماتے۔ دہلی میں شاہی خاندان کے بعض افراد حاجی صاحب سے بیعت واصلاح کا تعلق رکھتے تھے، وہاں حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی وغیرہ زیرِ تعلیم تھے۔ اس طرح دہلی میں بھی حضرت نانوتوی کو اس شیخ وقت کی زیارت وخدمت کا موقعہ ملتا رہا۔ چنانچہ آپ جب ۱۲۶۸ھ میں تعلیم سے فارغ ہوئے تو اس کے فوراً بعد حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے۔ حضرت الامام کے کچھ دنوں بعد حضرت گنگوہی بھی حاجی صاحب کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ ان دونوں حضرات کے درمیان دوستی کا تعلق دہلی کے زمانۂ تعلیم میں قائم ہو چکا تھا جو طبیعتوں کی ہم آہنگی کا نتیجہ تھا۔ دونوں کے فراغ تعلیم و تعلم، اخلاصِ قلب، ملی دردمندی اور بلند فکری کے اعتبار سے ہمرنگ تھے۔ لہٰذا ان دونوں اکابر کا یہ تعلق انتہائی مضبوط اور مخلصانہ تھا جو حضرت نانوتوی کی وفات تک قائم رہا۔ ان دونوں حضرات کی گوناگوں صلاحیتوں اور ان کے چہروں سے نمایاں ہونے والے مخلصانہ جذبات واحساسات کو حضرت حاجی صاحب کی نگاہیں تاڑ چکی تھیں۔ چنانچہ حاجی صاحب کے وسیع حلقۂ ارادت میں نانوتہ اور گنگوہ کے افق پر طلوع ہونے والے یہی دونوں ستارے اُن کے سب سے زیادہ چہیتے اور مقرب مرید تھے جن پر خود شیخ کو غیر معمولی ناز تھا جیسا کہ سوانح نگاروں نے بیان کیا ہے۔ لہٰذا مقامِ تعجب نہیں کہ جس جوہر قابل کو حاجی صاحب نے ان دونوں میں پہچانا تھا اُسی کی بدولت دونوں حضرات نے تمام منازلِ سلوک ایک ایک چلّے میں ہی طے کر لیں۔ چنانچہ حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی کو بیعت کے بعد چند ہفتوں میں ہی حاجی صاحب کی طرف سے خلافت اور اجازتِ بیعت حاصل ہو گئی حالانکہ دونوں حضرات اُس وقت جوان العمر تھے۔ گویا اس مصرعہ کے

مصداق تھے:

در جوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبر یست

حضرت نانوتوی کی عمر ۱۲۶۷ھ میں ۱۹ رسال کی تھی اور حضرت گنگوہی کی ۲۳ رسال۔ اس طرح گویا حق تعالیٰ کو امام نانوتوی سے ان کی مختصر سی مہلت عمر میں جو عظیم الشان کام لینے تھے ان کے لئے کم سنی ہی میں ان کو علمی وروحانی کمالات سے آراستہ فرمادیا تا کہ آنے والے تیس سال کا وقفہ جو حضرت کی عملی زندگی کا عرصہ ہے اس عظیم نصب العین کو سمیٹ سکے جس کے لئے قدرت نے آپ کو اس عالم ناسوت میں بھیجا تھا۔

فطری طور پر حضرت الامام کے مزاج میں تواضع اور اپنے نفس سے بے نیازی کا رجحان تھا۔ اپنے سراپائے ظاہر سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ یہاں تک کہ حقیقتاً گدڑی پوش بن کر زندگی گذاری۔ چنانچہ تعلیم کے بعد معاش کے لئے جو کام شروع کیا وہ نہ صرف یہ کہ معاشرہ میں وقیع نہ تھا بلکہ آمدنی کے لحاظ سے بھی نا قابل ذکر تھا۔ مفتی آزردہ نے اُسی زمانے میں ایک بار حضرت گنگوہی سے پوچھا کہ میاں قاسم کیا کرتے ہیں۔ جب جواب میں یہ سنا کہ آٹھ دس روپیہ پر ایک مطبع میں تصحیح کرتے ہیں تو سناٹے میں آگئے اور ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا کہ قاسم ایسا سستا! قاسم ایسا سستا!

دنیا سے بے رغبتی اور نمود ونمائش سے غیر معمولی حد تک کراہت آپ کی طبیعت کا جز تھی۔ اسی گمنامی کی طلب میں بسا اوقات ایسے جملے آپ کی زبان سے نکلے کہ... ”لوگ جان نہ گئے ہوتے تو ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا۔“ یا مثلاً ایک موقعہ پر نمود وشہرت سے انتہائی بیزاری کو آپ کا یہ جملہ ظاہر کرتا ہے کہ ”اگر مولویت کی یہ قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک تک کا پتہ نہ چلتا، جانوروں کا بھی گھونسلہ ہوتا ہے میرے لئے تو یہ بھی نہ ہوتا۔“ (سوانح قاسمی)

حضرت مولانا کا تعلیم سے فراغت اور حاجی صاحب سے وابستگی کے بعد کا زمانہ ۱۸۵۱ء کا ہے جبکہ انگریز ہندوستان پر اپنے پنجے پورے طور پر گاڑ چکے تھے، حریت وطن کے جذبے سے سارا ہندوستان سرشار تھا، علماء وصلحاء جہاد حریت میں پیش پیش تھے اور اپنے خون سے خاکِ وطن کو سینچ رہے تھے، حضرت نانوتوی اور ان کے رفقاء جو اس صورتِ حال سے حد درجہ پریشان ومضطرب تھے جنگ آزادی میں سردھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھے، مغل حکومت کے زوال کے بعد جب برطانیہ نے

ہندوستان پر مکمل طور سے قبضہ کرلیا تو ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کے خون سے ایسی بھیانک ہولی کھیلی جو رونگٹے کھڑے کردینے والی ہے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں ہندو اور مسلمان آزادی وطن کے لئے متحدہ طور پر اٹھے، انہوں نے جان و مال ہی نہیں عزت و ناموس تک کو خطرے میں ڈال کر ایسی بے مثال قربانیاں دیں جو ہمیشہ سنہری حروف میں تاریخ کے صفحات پر نقش رہیں گی۔ اسی دوران علاقہ تھانہ بھون کے بعض بااثر لوگوں کو مخبری کی بنیاد پر انگریزوں نے بلاتحقیق پھانسی دے دی جس سے پورے علاقے میں بے چینی اور اشتعال پھیل گیا، بعض لوگوں نے انگریزی دستوں پر گھات لگا کر حملہ کیا اور گولہ بارود چھین لیا۔ انگریزوں کے مظالم نے صورتِ حال کو حد درجہ سنگین بنادیا۔ اُس وقت حاجی امداد اللہ صاحب اور ان کے رفقاء جہادِ حریت کے جذبے سے جمع ہوئے۔ یہ سب لوگ حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید کے ولولۂ جہاد سے سرشار تھے۔ اس میٹنگ میں نمایاں حضرات یہ تھے: حضرت حاجی صاحب، حافظ ضامن صاحب، مولانا شیخ محمد صاحب، حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی، حضرت گنگوہی، مولانا مظہر نانوتوی اور مولانا محمد احسن نانوتوی۔ یہ اجتماع انگریزوں کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کے لئے ہوا۔ مولانا شیخ محمد صاحب نے اسباب و وسائل نہ ہونے کی وجہ سے اعلانِ جہاد کی مخالفت کی تو حضرت الامام نانوتوی نے جو سر تا بقدم جذبۂ جہاد سے سرشار تھے اُن کو جواب دیا کہ کیا ہماری قوت اور اسلحہ اصحابِ بدر سے بھی کم ہے۔ اس پر مولانا شیخ محمد صاحب لاجواب ہوگئے غرض کچھ دیر بحث مباحثہ کے بعد جہاد کا فیصلہ کیا گیا۔ برطانوی حکومت کا جُوا اتار پھینکنے کا اعلان کر کے ایک عبوری حکومت قائم کردی گئی جس کا امیر و سربراہ حاجی امداد اللہ صاحب کو بنا کر انہیں بیعت دی گئی۔ اس دوران تیاریاں ہوتی رہیں یہاں تک کہ ۱۴ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو ایک انگریزی دستے کے ساتھ شاملی کے میدان میں مقابلہ ہوا۔ اس جنگ میں حافظ ضامن صاحب شہید ہوگئے۔ اگرچہ یہ معرکہ بھی بالاکوٹ کی لڑائی کی طرح نتیجے کے لحاظ سے ناکام ہی رہا لیکن انگریزی حکومت پوری طرح ہشیار ہوگئی۔ ان حضرات کے وارنٹ گرفتاری جاری ہوگئے۔ حضرت نانوتوی دیوبند اور قرب و جوار میں تین دن روپوش رہے۔ گرفتار نہیں ہوسکے لیکن مولانا گنگوہی گرفتار ہوگئے اور چھ مہینے مظفر نگر جیل میں قید و بند کی صعوبتیں جھیلتے رہے۔

۱۸۵۷ء کے ہولناک واقعات کے بعد ہندوستانی مسلمان ایک نئی مگر خطرناک صورتِ حال

کا مقابلہ کر رہے تھے۔ مشرق کے عروج وسطوت کا چراغ مغرب کے اُفق میں جا کر بجھ گیا اور مغربی سامراج کا آفتاب ایک بھیانک صبح کے ساتھ مشرقی افق میں طلوع ہو چکا تھا۔ انگریزوں نے قدیم تمدن کے کھنڈروں پر اپنی جدید تہذیب کی عمارت اٹھائی۔ اسلامی طرز فکر کو فرسودہ اور دینی قدروں کو دہقانیت قرار دیا جانے لگا۔ انہوں نے صرف اپنا نظام حکومت ہی نہیں بلکہ اپنا مکمل دستورِ حیات غلام ہندوستان پر مسلط کر دیا۔ انگریزوں کا اولین حملہ مسلمانوں کے تعلیمی نظام پر تھا جو پورے اسلامی معاشرے کی بنیاد تھا۔ مدارس اور مکاتب جو سرکاری سرپرستی میں چلتے آرہے تھے اس انقلاب کی نذر ہو گئے۔ اُن کے مقابل بدیسی حکومت نے برطانوی نصابِ تعلیم جاری کر کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے قیام کا آغاز کیا جہاں ظاہری رنگارنگی بھی تھی اور فراغت کے بعد سرکاری ملازمتوں کی دلفریبی بھی، ناپختہ کار نوجوانوں کے لئے ان اداروں میں غیر معمولی کشش تھی۔ ابتدائی اسکولوں میں یونیفارم کے نام پر جدید لباس بھی ضروری تھا۔ ظاہر ہے بچپن سے جس لباس اور طرزِ زندگی کی عادت ڈالی گئی وہ عمر بھر کی وضع قطع کے لئے تمہید بنایا گیا تھا۔ غرض معاشرتی طور پر رہن سہن اور کھانے پینے کے طریق سے لیکر پہننے اوڑھنے، آدابِ مجلس، زبان اور طریقِ زندگی غرض ہر بات سات سمندر پار سے ہندوستانیوں کے لئے درآمد کی گئی جس سے ذہن وفکر بدلنے لگا۔ مسلمانوں کا ایک طبقہ اس انقلاب کو نہ صرف ایک خوش آیند تبدیلی تسلیم کر رہا تھا بلکہ اس کو مسلم نوجوانوں کے لئے ترقی کا زینہ قرار دیکر اس کی ترویج کے لئے کوشاں بھی تھا۔ چنانچہ جدید تعلیم اور اس کا طریق کار تیزی کے ساتھ شہر شہر اور قریہ قریہ میں رواج پانے لگا۔ پختہ کار لوگ اس پر کڑھ رہے تھے۔ ناپختہ ذہن اس جدید معاشرت کو اندھا دھند قبول کر رہے تھے مگر علماء اور ملی درد رکھنے والے حضرات کی ایک جماعت اس انقلاب سے بے چین تھی۔ یہ حضرات حیران تھے کہ بے دینی پھیلانے والے اس انقلاب کی راہ کو روکنے کا کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ مغربی تہذیب کا جو طوفان نوجوان دل و دماغ کو متاثر کرتا ہوا بڑھا آرہا ہے اس پر باندھ لگانا تو ضروری ہے لیکن تدبیر کیا ہو اس پر ذہن راہ یاب نہیں تھے۔ مسلم اقتدار کا چراغ گل ہو جانے اور فرنگی سامراج کا پرچم لہرانے کے ساتھ ہی دوسرا طوفان ہندوستان میں عیسائی مبلغین کی صورت میں آیا۔ انہوں نے عیسائیت کے فروغ کے لئے جہاں اپنا تبلیغی لٹریچر تقسیم کیا وہیں دوسری طرف خود مسلمانوں کے جتھوں میں گھوم گھوم کر اُن کے سامنے نصرانیت کو ایک اعلیٰ اور

شائستہ مذہب حق کے طور پر پیش ہی نہیں کیا بلکہ مالی امداد اور بے آسرا لوگوں کی خدمت وتعاون سے بھی اُن کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ ان مبلغین نے مشن اسکولوں کا جال پھیلا کر مسلم بچوں کی تعلیم کے لئے ان کے والدین کو رجھایا اور دامِ فریب میں پھنسایا۔ ساتھ ہی مشن ہسپتالوں کا سلسلہ جاری کر کے بیماروں اور دکھی لوگوں کی خدمت سے اُنہیں پر چایا۔

اس سیلاب بلا پر سب سے زیادہ پریشان وہ علماء تھے جو دبستان ولی اللٰہی کے خوشہ چیں تھے اور اس خانوادہ کے چشمہ فکر وخیال سے مستفید تھے۔ اُنہیں ہر وقت مسلمانوں کی آئندہ نسلوں کی بے راہ روی کا خدشہ تڑپا رہا تھا اور ان کی ذہنی توانائیاں اس کے سد باب کی تدابیر پر مرکوز تھیں۔ اس وقت مسلمانوں کو ایک ایسے مسیحائے قوم کی ضرورت تھی جو اس کے تن مردہ میں جان ڈال سکے۔ یہ دین خیر دین ہے اور یہ امت خیر الامم۔ اس کی نگہبانی خالق دو جہاں خود فرما تا رہا ہے کہ اس امت کو جب اور جیسے حالات سے سابقہ پڑا تو ان حالات کے مناسب شخصیات کو نمودار فرمایا جنہوں نے ان ناسازگاریوں کو امت کے لئے سازگار بنایا۔ چنانچہ اس ہوشربا ماحول میں جب کہ مسلمانوں کے ہاتھ سے اقتدار کی باگ ڈور چھن چکی تھی اور وہ غیر ملکی ہی نہیں غیر مذہب قوم کے زیر نگیں اپنی قدریں پامال ہوتے دیکھ رہے تھے حق تعالیٰ نے حجۃ الاسلام حضرت امام نانوتوی کو اس ڈوبتی ہوئی کشتی کا ناخدا بنا کر کھڑا کیا۔ اس نبض شناس شخصیت نے مرض کی صحیح تشخیص کی اور اس کا مداوا کیا۔

یوں تو اُس دور کے یہ سبھی اکابر ملکی حالات اور مسلمانوں کی قومی ابتری سے پریشان تھے مگر اس مجمع میں حضرت نانوتوی کے فکر رسا نے اس کا حل تلاش کیا جو اُن حالات میں واحد تعمیری طریق تھا اور قوم کو ذہنی غلامی سے نجات دلانے کا کیمیا اثر نسخہ تھا۔ حضرت نانوتوی انگریزی استعمار کے اس طول طویل منصوبے سے مضطرب تھے جس کے تحت وہ اپنا تعلیمی نظام ہندوستان میں رائج کر رہے تھے۔ اس کا مقصد ہندوستانیوں کے اُس تہذیبی ورثے کو مٹانا تھا جو مذہب کی بنیاد پر قائم تھا، اہلِ وطن کو اُن کی تاریخ، اُن کے مذہب اور اُن کے تمدن سے بیگانہ بنا کر جب اُنہیں جدید مغربی افکار کا خوگر بنا دیا جائے گا تو اُن کا اپنا تشخص مٹ جائے گا اور وہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کے مقاصد کو پورا کرنے میں پیش پیش ہو جائیں گے۔ چنانچہ اس نظام کے تحت جن مسلمانوں نے جدید تعلیم حاصل کی اُن کا اندازِ فکر مایوس کن حد تک تبدیل ہو چکا تھا اور وہ نام نہاد آزادی رائے کے علمبردار بن کر اپنے اُس ماضی کو

فراموش کر چکے تھے جو ملت کے لئے قابل فخر سرمایہ رہا ہے۔ جدید مسلم دانشور مسلمانوں کے مستقبل سے پریشان ضرور تھے مگر برطانوی شاطرین اُن کے دل و دماغ کو تہذیب جدید اور سائنسی کرشمہ کاریوں کے ذریعہ مسخر کرتے جارہے تھے۔ جو لوگ اس ظاہری چمک دمک سے متاثر نہیں ہوئے وہ بے چین تو تھے مگر کوئی پروگرام یا مستقبل کا لائحۂ عمل اُن کے پاس نہیں تھا جس کے ذریعہ ملتِ اسلام کا فکری اور عملی تحفظ کیا جاسکے۔ حقیقت میں اُس وقت میں اگر کوئی طبقہ واقعی وقت اور حالات سے نبرد آزمائی کا عزم لئے ہوئے اس پر پوری سنجیدگی اور دردِ دل کے ساتھ سوچ رہا تھا تو وہ بوریہ نشیں علماء کا طبقہ تھا۔ یہ حضرات اجتماعی اور انفرادی طور پر اس طوفان سے قوم کو نکالنے کے لئے کوشاں تھے۔

اس نازک وقت میں توفیقِ خداوندی سے جس شخص کے ذہن رسا کو راہ یابی ملی اور قوم کی کشتی کو اس بھنور سے نکالنے کے لئے مشیت نے جس کو چنا وہ حضرت قاسم العلوم والخیرات کی ذات بابرکات تھی۔ حضرت موصوف بدعات ورسوم کے خلاف مجددانہ جدوجہد تو کرہی رہے تھے لیکن ملت کے اس آزمائشی وقت میں حضرت الامام نے ملت کی جو مسیحائی کی وہ یقیناً ایک الہامی چیز تھی جس کے لئے حق تعالیٰ نے آپ کو چنا۔

جدید تہذیب کے ان منفی اثرات کا توڑ کرنے کے لئے سب سے پہلے حضرت نانوتوی کا ذہن علاج بالمثل کی طرف منتقل ہوا کہ اس جدید تعلیم کے اثر کا جواب تعلیم کے طریق سے ہی کارگر ہوسکتا ہے۔ یعنی اگر مغربی تعلیم تاریخ اور اسلاف سے بیگانہ بنارہی ہے تو اسی تعلیمی راہ سے مسلمانوں کو اس زہر سے بچایا جاسکتا ہے اور دینی تعلیم کے مراکز قائم کرکے مسلم بچوں میں اسلام پسندی اور اسلامی اقدار کے احترام کا جذبہ بیدار کیا جاسکتا ہے۔

اس بنیادی تصور کے ساتھ حضرت کا ذہن اس راہ کی مشکلات پر بھی غور کررہا تھا کیونکہ مغلیہ سلطنت تک تمام گذشتہ مسلم حکومتوں کے عہد میں مدارسِ دینیہ قائم تھے اور ان کے جملہ مصارف کا بار حکومت پر رہتا تھا۔ اس طرح دینی تعلیم کا فروغ سرکاری سرپرستی میں جاری رہا۔ اب مغل سلطنت کی بساط لپٹ چکی تھی اور فاتح انگریز ہندوستان کے حکمراں بن چکے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے طوفان نے ہندوستانیوں کو بے دست وپا بنادیا تھا اور سب بڑے چھوٹے مراکز اس افراتفری میں دم توڑ چکے تھے۔ نہ اب مدارس کی سرپرستی کرنے والی حکومت تھی اور نہ ایسے منظم اوقاف رہے تھے جن کے بل پر

دینی مدارس چلائے جاسکیں۔ لہٰذا حضرت الامام دینی مدرسوں کے قیام سے متعلق اپنے بنیادی فکر کے ساتھ اُن کے چلانے کی صورتوں پر بھی غور کررہے تھے۔ حکومت سے اس مقصد کے لئے ایڈ یا گرانٹ مل سکتی تھی مگر اس کے ساتھ پھر حکومت کا مدرسے کے نصاب میں دخل بھی ضروری ہوتا۔ اب اگر سرکاری دخل اندازی کو انگیز کیا جائے تو فکر قاسمی کی اصل روح ہی متاثر ہوجاتی کہ حکومت پھر جدید علوم کی تعلیم کو بھی نصاب کا لازمی جز قرار دیتی جبکہ حضرت کا مقصود ہی ایک مدرسے سے یہ تھا کہ طالبِ علم خالص دینی ذہن لے کر نکلے اور قوم کی کشتی کو جو منجدھار میں پھنسی ہوئی ہے آسودۂ ساحل کرسکے۔ یہ تبھی ممکن ہے جب مدرسے آزادانہ طور پر قوم کو وہ علوم سکھلاسکیں جن پر ان کی مذہبی پہچان موقوف ہے۔

یہیں سے حضرت نانوتوی کے ذہن رسانے توفیقِ خداوندی سے آزاد تعلیم کے لئے آزاد ذریعۂ آمدنی کا نکتہ تلاش کیا، یعنی ایسی آمدنی کا ذریعہ جس میں دینے والا مدرسہ کو اپنے احسان کا زیربار نہ سمجھے اور اُس کے تعلیمی وانتظامی طریق کار میں مداخلت نہ کرے۔ چنانچہ فکر قاسمی کا یہی بنیادی نقطہ ہے کہ عوامی مدرسے کے مصارف عوامی چندہ سے پورے ہوں جو سرتا سر اخلاص پر مبنی ہوگا اور دینے والا اپنا پیسہ احسان بنا کر نہیں دے گا بلکہ اس کو توشۂ آخرت سمجھ کر دے گا اور اس طرح خود ہی پیسہ دے کر خود کو مدرسہ کا احسان مند قرار دے گا کہ اس انفاق وامداد کی وجہ سے اُس کی آخرت سنور سکتی ہے۔ حکومت سے ایڈ وغیرہ حاصل ہوگی تو بصورت احسان ہوگی جبکہ عوام امداد کے طور پر جو کچھ پیش کریں گے اس کی قبولیت پر مدرسہ کو اپنا محسن قرار دیں گے۔

اسی بنیادی فکر کے ساتھ حضرت نانوتوی نے دوسرے اکابر سے اس بارے میں مشورہ کیا۔ یہ سب ہی حضرات برطانوی سامراج کے عزائم اور ہندوستان میں مسلمانوں کے دینی مستقبل کی طرف سے پریشان تھے۔ اس تجویز پر سب کا اتفاق قدرتی تھا۔ ان اکابر کا مقصود صرف ایک مدرسہ قائم کرنا نہ تھا بلکہ ایک ایسے مرکز کا قیام تھا جو مسلمانوں کو علمی وذہنی تربیت دے کر علم وعمل اور بلند فکری جیسے اوصاف کا اہل بنائے کہ امت ایک طرف حُب دین سے سرشار ہوکر اسلام پر کئے جانے والے حملوں کا عملی واستدلالی جواب دے سکے تو دوسری طرف حب وطن سے سرشار ہوکر اُس کو فرنگیوں کے شکنجے سے آزاد کرانے کے لئے برادرانِ وطن کے ساتھ عملی اقدامات کرے۔ اس طرح قوم استبدادی

قوتوں سے ہر دو میدان میں پنجہ آزمائی کے قابل ہو سکے۔ حضرت نانوتوی کے اس عبقری فکر نے وہ راہ دکھا دی جس کی تلاش میں یہ حضرات سرگرداں تھے۔

دیوبند میں دارالعلوم کی بناء سارے ملک کے مسلمانوں کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوئی۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو اس پریشان خاطری میں ایسی رہنمائی فراہم کرنا تھا جو ان کے مستقبل کی ضامن بن سکے۔ دارالعلوم دیوبند کا وجود اُسی الہامی رہنمائی کی خارجی تصویر بن کر سامنے آیا۔

ہر ادارہ اپنے بانی کے افکار و رجحانات کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ دارالعلوم کی تاریخ اور اس کے طرزِ تعلیم و تربیت میں بھی فکرِ قاسمی کا عکس نمایاں ہے۔ چنانچہ فضلائے دیوبند کے علمی و عملی کارنامے اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس مادرِ علم و فکر کے سپوتوں نے تصنیف و تالیف کی راہ میں آبلہ پائی کی تو ہر موضوع پر علم و تحقیق کے انبار لگا دیئے۔ فضلائے دیوبند نے اپنے بانی کے فکر کی ہمیشہ ایک قیمتی امانت کی طرح حفاظت کی اور ایک بیش بہا میراث کی طرح اس کا حصہ رسد اس کے حقداروں تک پہونچاتے رہے۔ دارالعلوم دیوبند حضرت الامام کی وہ علمی وراثت ہے جو سوا سو سال سے ہندو بیرونِ ہند میں علوم اسلامی کی دولت بانٹ رہی ہے۔

دارالعلوم کی بناء ایک تحریک کی بناء تھی جس نے ایک خوابیدہ قوم میں بیداری و زندگی کی روح پھونکی اور جو مایوسیاں گورے اقتدار اور مغربی استعمار نے اس قوم کو دی تھیں اُن کی جگہ دارالعلوم کی تحریک نے امیدوں کے چراغ جلائے۔ یہ تحریک دوہرے مقاصد کی حامل تھی ایک طرف اس ادارہ کے ذریعہ ملّی تشخص اور انفرادی و اجتماعی وقار کا تحفظ ہو رہا تھا تو دوسری طرف برادرانِ وطن کے ہمدوش اُس بیرونی غلامی کا جوا کاندھوں سے اتار پھینکنے کے لئے ایک نیا ولولہ بھی اسی قاسمی تحریک کی دین تھی۔ تحریک دیوبند اسلام کے بنیادی عقائد و افکار کی ترجمان اور محافظ بنی اور ساتھ ساتھ حال کے تاریک ماحول میں بہتر عروسِ مستقبل کا تابناک رُخ بھی دکھا رہی تھی۔

دہریت و بے دینی کے برخلاف تعلیم کتاب و سنت اور مسلک حق کا سب سے بڑا محاذ یہی دارالعلوم ثابت ہوا۔ یہاں سے اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے دعوتِ اسلامی کے علمبردار ہزاروں ہزار کی تعداد میں نکل کر ایک عالم کی ہدایت کا ذریعہ بنے اور دنیا کے چپے چپے پر انہوں نے دینی مدارس

ومکاتب قائم کر کے اسلام کے دفاعی مورچے تیار کیے۔ آج فضلائے دارالعلوم اور منتسبین دارالعلوم کی تعداد دنیا بھر میں لاکھوں لاکھ ہے۔

۱۹۸۰ء میں بہ موقعۂ اجلاسِ صد سالہ، دارالعلوم کا جلسۂ دستار بندی تقریباً ۷۰ سال بعد ہوا جس میں چھ ہزار سے زائد فضلائے دارالعلوم کو دستارِ فضیلت دی گئی جبکہ اس ستر سالہ مدت میں ہزاروں ہزار فضلاء وہ ہیں جو پیوند زمین ہو چکے اور جن کی دستار بندی کی نوبت ہی نہیں آئی۔ نیز جن فضلاء کی دستار بندی پچھلے جلسوں میں ہوئی وہ بھی ان سے الگ ہیں اور جن حضرات نے اجلاس صد سالہ کے بعد سند فضیلت حاصل کی وہ بھی علیحدہ ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اجلاس صد سالہ کے بعد اب تقریباً ہر سال دورۂ حدیث میں شامل طلبہ کی تعداد قریباً ایک ہزار اور اب حالیہ سالوں میں ایک ہزار سے بھی زائد ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ان گذشتہ بیس سالوں میں تعدادِ فضلاء بیس ہزار تک پہونچ جاتی ہے۔ پھر اس عدد میں اُن مستفیدین کو شامل کر لیا جائے جنہوں نے دارالعلوم میں داخلہ لیکر پڑھا مگر دورۂ حدیث تک پہونچنے سے پہلے گھریلو مجبوریوں کے باعث تعلیم ادھوری چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسے طلبہ کی تعداد بھی قابل لحاظ حد تک کافی بڑی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بہت طولانی فہرت اُن منتسبین کی ہے جنہوں نے دارالعلوم کے کسی ایک شعبہ کی تعلیم مکمل کی اور واپس چلے گئے۔ مثلاً شعبۂ تجوید وقرأت، شعبۂ حفظ، شعبۂ ناظرہ، شعبۂ اردو دینیات، شعبۂ فارسی، شعبۂ خوشخطی اور جامعہ طبیہ، کوئی وجہ نہیں کہ ان کو دارالعلوم کے مستفیدین کی فہرست سے الگ رکھا جائے۔ لہٰذا جن حضرات نے براہ راست دارالعلوم دیوبند سے کسی درجے میں گذشتہ زائد از سوا سو سال کی تاریخ کے دوران استفادہ کیا ہے اُن کی مجموعی تعداد عجب نہیں کہ ایک لاکھ سے اوپر پہنچ جائے۔

اِس شجرۂ طوبیٰ کی جڑوں کو کیسی دعاہائے سحر گاہی نے سینچا اور کیسے گریۂ نیم شبی کا پانی ملا کہ یہ پودا اُگنے کے ساتھ ہی مسلمانِ عالم کی محبت وعقیدت کا مرکز بن گیا اور اطراف واکنافِ عالم سے اس کی طرف رجوع عام ہونے لگا۔ علومِ الٰہی کا یہ سرچشمہ اس تیزی کے ساتھ پھلا پھولا کہ مغربی استعمار کی ساری سازشوں کا تار و پود بکھر گیا۔

حضرت الامام النانوتوی اپنے علمی فضل وکمال، زہد وتقویٰ اور بلندیِ فکر کے اعتبار سے ایک منفرد شخصیت کی صورت میں نمودار ہوئے۔ آپ کے علمی، فکری اور تجدیدی کارناموں نے ملتِ اسلام

میں پیدا ہونے والی مایوسیوں کو کافور کیا۔ آپ کے نصب العین کا اساسی مقصد امت میں تعلیمی نہضہ برپا کرنا تھا تاکہ ماضی کی سطوت وشوکت ختم ہو جانے کے بعد قوم احساسِ کمتری کا شکار ہونے کے بجائے علمی و تحقیقی میدانوں کو سر کرے۔ حکومت وسیاست کی بساط اگرچہ اُلٹ گئی لیکن قوم تعلیم و تعلم کے ذریعہ اس کی تلافی کر کے علمی واخلاقی راہوں سے اپنا امتیاز اور تفوق برقرار رکھے۔ چنانچہ دار العلوم دیوبند نے تعلیمی راہ سے دہریت والحاد کے اُس سیلاب کو روکا جو مغربی تہذیب کے نام پر وطن عزیز میں در آیا تھا۔ یہ ادارہ جو آج ایک بین الاقوامی اسلامی دانشگاہ ہے ساری دنیا کے مسلمانوں کے لئے مینارۂ نور ثابت ہوا اور آج دنیا بھر میں اسلامی علوم کا ایک بے مثال مرکز اور حقیقی مزاجِ شریعت کا ترجمان بن کر اپنی انفرادیت قائم کئے ہوئے ہے۔

☆☆☆

مفتی نسیم احمد قاسمی (مرحوم)

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
خدمات اور کارنامے

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا فیصلہ

انگریز حکمرانوں نے اسلامی شناخت اور تہذیب کو مٹانے اور مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے نصاب تعلیم کو تبدیل کرنا ضروری سمجھا، لارڈ میکالے نے انگریزی تعلیم اور نصاب کا مقصد بیان کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے افراد تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہوں مگر دل ودماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے انگلستانی ہوں''۔

حضرت نانوتوی اور ان کے رفقا نے انگریزوں کے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے ایسے مراکز دینیہ اور مدارس اسلامیہ کے قیام کا فیصلہ فرمایا، جن کی چہار دیواری میں شریعت اسلامی کو تحفظ حاصل ہو کتاب وسنت کے علوم کی ترویج واشاعت ہو اور ایسی نسل تیار ہو جو دل ودماغ اور فکر ونظر کے اعتبار سے اسلامستانی ہو۔ جو قیادت وسیادت کی مطلوبہ صفات اور صلاحیتوں سے متصف ہو، چنانچہ حضرت نانوتوی نے اعلان فرمایا کہ ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نونہال تیار کرنا ہے جو رنگ اور نسل کے لحاظ سے ہندستانی ہو مگر دل ودماغ اور طرز فکر کے لحاظ سے عربستانی اور اسلامستانی ہو، اس طرح دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی۔

حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم اور اس طرز پر چلنے والے مدارس اسلامیہ کے لئے اصول ہشتگانہ مرتب فرمایا، یہ رہنما اصول ہیں جن سے مدارس کے نظام تعلیم وتربیت کو بہتر اور زیادہ مفید بنایا جاسکتا ہے۔ ان میں سے بعض یہ ہیں:

● اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنان مدرسہ کی ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں،

اوروں سے کرائیں خیر اندیشان مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

- اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جاگیر یا کارخانہ، تجارت یا کسی کا امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجاء جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا، اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی، اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ ہے۔
- سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔
- تا مقدور ایسے لوگوں کا چندہ موجب برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائداری کا سامان معلوم ہوتا۔

ان اصول کو بار بار پڑھئے، اس کا ہر اصول الہامی نظر آتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ حضرتؒ نے نور ایمانی اور فراست ایمانی سے یہ اصول طے فرمائے ہیں۔ صوبہ بہار میں وہ مدارس جو حکومت سے منظور شدہ ہیں ان میں تعلیم و تربیت کا معیار ختم ہو رہا ہے اور ملت کا عظیم الشان سرمایہ تباہی کے دہانے پر ہے اور اس کی وجہ انہیں اصول سے اعراض و انحراف ہے اور عوامی چندہ کے بجائے سرکار پر اعتماد ہے۔

دیو بند کے بعد صنعتی شہر مراد آباد میں مدرسہ قاسم العلوم، سنبھل میں مدرسہ عربیہ، امروہہ میں مدرسہ جامع مسجد، گلاؤٹھی میں مدرسہ قاسمیہ، سہارنپور میں مدرسہ مظاہر العلوم، دربھنگہ میں مدرسہ امدادیہ اور انبہٹہ اور تھانہ بھون اور ملک کے دیگر حصوں میں مدارس و مکاتب قائم کئے گئے، ان مدارس اسلامیہ کی کوکھ سے نامور علماء، ائمہ اور مجاہد آزادی پیدا ہوئے۔

عیسائیت اور آریہ سماج کے فتنہ کی سرکوبی

دار العلوم دیو بند کے قیام کے بعد عیسائیت اور آریہ سماج کے فتنوں کی سرکوبی مولانا نانوتوی کا سب سے بڑا اہم کارنامہ ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد انگریزوں نے ہندستان میں عیسائیت کی تبلیغ کے لئے پادریوں اور عیسائی مبلغین کو عام اجازت دیدی، برطانوی دار العلوم کے ممتاز رکن سیگلس نے ۱۸۵۷ کے آغاز میں ایوان میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: ”خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دن اس لئے دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت زیر نگیں رہے تاکہ عیسیٰ مسیح کی فتح کا جھنڈا ہندوستان

کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے، ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے لئے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہئے، اور اس میں کسی طرح تساہل نہ ہونا چاہئے۔[۱] چنانچہ عیسائی مبلغین اور پادریوں نے ہندوستان پر ہلہ بولا اور ملک کے طول وعرض میں پھیل گئے، صرف بہار کے چھوٹا ناگپور علاقے میں ۱۲ ہزار سے ۴۵ ہزار تک عیسائی تھے اور ۱۸۷۲ء تک ہندوستان کے پانچ سو بائیس مقامات پر مشن قائم کئے جا چکے تھے، ان حالات میں سب سے اہم تقاضہ عیسائیت کے سیلاب کو روکنا تھا چنانچہ حجتہ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے رفقا نے عیسائیت کے حملوں کو روکا اور اسلام کے تحفظ کا اہم ترین فریضہ انجام دیا، مختلف مقامات میں عیسائی مبلغین اور پادریوں سے مناظرے کئے اور ان کو لاجواب کیا ۱۲۹۲ھ میں پادری تاراچند سے مباحثہ کر کے اسے لاجواب کیا، نیز ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء میں قصبہ چاند پور کے میلہ خدا شناسی میں حقانیت اسلام، ابطال تثلیث، تردید شرک اور اثبات توحید پر محققانہ تقریر فرمائی، اس میلہ میں عیسائی مبلغین اور پادریوں نے حضرت نانوتوی کے اعتراضات کے جواب نہیں دئے، اسی طرح آپ نے مختلف مقامات میں فتنہ آریہ سماج کی بیخ کنی فرمائی، اس کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی اور اس کے ہم خیال پنڈتوں سے مناظرہ کئے، حضرت مولانا محمود احمد صاحب نستوی تلمیذ علامہ انورشاہ کشمیری نے فرمایا کہ حضرت امام انورشاہ کشمیری نے دوران درس فرمایا کہ:

"حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے عقائد پر اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ آئندہ سو سال تک کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں"۔

علوم دینیہ کی ترویج واشاعت، فرقہ باطلہ کی تردید، عیسائیت اور فتنہ آریہ سماج کی سرکوبی کے علاوہ آپ نے مختلف موضوعات پر قیمتی کتابیں بھی تحریر فرمائی ہیں جو ہمارے لئے مشعل راہ ہیں، جن میں آب حیات، تقریر دل پذیر، ہدیۃ الشیعہ، انتصار الاسلام، حجتہ الاسلام، توثیق الکلام، قبلہ نما، مباحثۂ شاہ جہاں پور، خاص طور پر قابل ذکر ہیں، آپ نے مختصر عمر پائی اور صرف ۴۹ سال کی عمر میں ۴/ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵/ اپریل ۱۸۸۰ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور مزار قاسمی دیوبند میں ہدایت ورشد کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆☆☆

---

(۱) بحوالہ PANJAB-AND- SIND- MISS- NSS-P-294

مولانا اختر امام عادل*

تحفظ دین کی مساعی جمیلہ

مولانا نانوتوی — عہد اور خدمات

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے جس دور میں اپنی آنکھیں کھولیں وہ ہندوستانی تاریخ کا انتہائی پرآشوب دور تھا، ایک طرف آٹھ سو سالہ طویل اسلامی مملکت اپنی حیات مستعار کی آخری سانسیں لے رہی تھی، دوسری طرف ایک اجنبی سامراجی طاقت ملک میں اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کررہی تھی، جس کے تہذیبی، اقتصادی اور سیاسی یلغار سے ملی وتہذیبی وجود خطرہ میں پڑ گیا تھا، اور اقتصاد، عدل وانصاف، مشرقی تہذیب وتمدن، مذہب وملت اور عزت وشرافت ہر چیز پر سوالیہ نشان لگ چکا تھا۔

اقتصادی بدحالی

حضرت نانوتوی کے معاصر وہم درس، اس دور کے حالات کے ذاتی مشاہد، انگریزوں کے وفادار، مگر ملک وملت کے غمگسار سرسید احمد مرحوم کی شہادت شائد اس سلسلے میں سب سے زیادہ معتبر مانی جائے، وہ اپنی مشہور کتاب ''اسبابِ بغاوت ہند'' میں اقتصادی تبدیلیوں پر تبصرہ کرتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''میں نہیں بیان کرسکتا کہ ہندوستانیوں کو کس قدر ناراضگی اور دلی رنج اور ہماری گورنمنٹ کی بدخواہی اور نیز کتنی مصیبت اور تنگیٔ معاش اس سبب سے ان کو تھی کہ بہت سی معافیات صدہا سال سے چلی آتی تھیں جو ادنی ادنی حیلہ پر ضبط ہوگئیں ہندوستانی خیال کرتے تھے کہ سرکار نے خود تو ہماری پرورش نہیں کی، بلکہ جو جاگیر ہم کو اور ہمارے بزرگوں کو اگلے بادشاہوں نے دی تھی وہ بھی گورنمنٹ نے چھین لی، پھر ہم کو اور کیا توقع گورنمنٹ سے ہے۔ (۱)

(۱) اسباب بغاوت ہند ۲۶۔

* جامعہ ربانی، منورواشریف، سمستی پور (بہار)

ابتداء عملداری سے آج تک شاید کوئی گاؤں ایسا ہوگا جس میں تھوڑا بہت انتقال (ردوبدل) نہ ہوا ہو، ابتداء میں ان نیلاموں نے ایسی بے ترتیبی سے کثرت پکڑی کہ تمام ملک الٹ پلٹ ہوگیا۔ (ص:۲۸)

اہل حرفہ کا روزگار بسبب جاری اور رائج ہونے اشیاء تجارت ولایت کے، بالکل جاتا رہا، یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والے کو بھی نہیں پوچھتا تھا۔ پارچہ بافوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ (۲)

حضرت مولانا محمد میاں صاحب فرماتے ہیں:

''پس یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کا یہ خونیں حادثہ —— مٹی ہوئی جاگیر شاہی کی انگڑائی نہیں بلکہ ایک قوم کی بڑھتی ہوئی جاگیر شاہی کے مقابلہ میں دوسری قوم کی حرکتِ مذبوحانہ تھی:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

یہ بحث طویل ہے، اس کا ہر ایک گوشہ ایک داستان رکھتا ہے، تنخواہوں کا تفاوت، مال گذاری کا اضافہ، وصولیٔ مال گذاری کے لئے جائدادوں کا نیلام، نیلام کے دل آزارانہ توہین آمیز طریقے، سود اور سود در سود کا رواج وغیرہ، غرض ہر ایک باب داستان الم ہے (علماء ہند کا شاندار ماضی ۴؍۲۷)

سرسید مرحوم نہایت جوش سے لکھتے ہیں:

''غرض کہ ملک ہر طرح سے مفلس ہوگیا تھا، اگلے خاندان جن کو ہزاروں کا مقدور تھا، معاش سے بھی تنگ آگئے تھے''۔ (۳)

شیخ محمد اکرام نے ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب ''اَوَر انڈین مسلمانز۔'' کے حوالے سے لکھا ہے:

''اگر کوئی سیاست داں دارالعوام میں سنسنی پیدا کرنا چاہے تو اس کے لئے کافی ہے کہ وہ بنگال کے مسلمان خاندانوں کے سچے سچے حالات بیان کردے، یہی لوگ کسی زمانے میں محلوں میں رہتے تھے، گھوڑے گاڑیاں نوکر چاکر موجود تھے۔ اب یہ حالت ہے کہ ان کے گھروں میں جوان بیٹے اور بیٹیاں، پوتے اور پوتیاں، بھتیجے اور بھتیجیاں بھرے پڑے ہیں، اور ان بھوکوں کے لئے ان میں سے

---

(۲) اسباب بغاوت ہند۔ (۳) اسباب بغاوت ہند ۳۶

کسی ایک کو زندگی میں کچھ کرنے کا موقعہ نہیں، وہ منہدم اور مرمت شدہ مکانوں اور خستہ برآمدوں میں قابل رحم زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں اور روز بروز قرض کی دلدل میں زیادہ دھنستے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی ہمسایہ ہندو قرض خواہ ان پر نالش کرتا ہے اور مکان اور زمینیں جو باقی تھیں ان کے قبضے سے نکل جاتی ہیں اور یہ قدیمی مسلمان خاندان ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا ہے۔ (۴)

عدل اور انصاف کی صورت حال

عدل وانصاف کی صورت حال کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں:

اور پھر اس پر اضافہ یہ ہوا کہ باوجود ہندوستانیوں کی مفلسی کے عدالت کی چارہ جوئی پر اسٹامپ لگا دیا گیا جو ناقابلِ برداشت تھا۔ (۵)

تعصّبات، تنگ نظری، اور ناانصافی کے احوال ڈاکٹر ہنٹر کی زبانی سنئے:

مسلمانوں کی بدقسمتی کا صحیح نقشہ ان محکموں میں دیکھا جاسکتا ہے، جن میں ملازمتوں کی تقسیم پر لوگوں کی اتنی نظر نہیں ہوتی، ۱۸۶۹ء میں ان محکموں کا یہ حال تھا کہ اسسٹنٹ انجینئروں کے تینؔ درجنوں میں چودہ ہندو اور مسلمان صفر، امیدواروں میں چار ہندو، دو انگریز اور مسلمان صفر، سب انجینئروں اور سپروائزروں میں چوبیس ہندو اور ایک مسلمان، اوورسیروں میں تریسٹھ ہندو اور دو مسلمان، اکاؤنٹس ڈپارٹمنٹ میں پچاس ہندو اور مسلمان معدوم، وغیرہ۔

سرکاری ملازمتوں کے علاوہ ہائی کورٹ کے وکیلوں کی فہرست بڑی عبرت آموز تھی، ایک زمانہ تھا کہ یہ پیشہ بالکل مسلمانوں کے ہاتھ میں تھا، اس کے بعد بھی ۱۸۵۱ء تک مسلمانوں کی حالت اچھی رہی اور مسلمان وکلاء کی تعداد ہندوؤں اور انگریزوں کی مجموعی تعداد سے کم نہ تھی، لیکن ۱۸۵۱ء سے تبدیلی شروع ہوئی اب نئی طرز کے آدمی آنے شروع ہوئے اور امتحانات کا طریقہ بھی بدل دیا گیا، ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۸ء تک جن ہندوستانیوں کو وکالت کے لائسنس ملے ان میں ۲۳۹ ہندو تھے اور ایک مسلمان......

انہوں نے کلکتہ کے ایک اخبار کی شکایت نقل کی کہ — اب یہ حالت ہے کہ حکومت سرکاری گزٹ میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ رکھنے کا کھلم کھلا اعلان کرتی ہے۔ چند دن

(۴) موج کوثر ص: ۷۵۔ (۵) اسباب بغاوت ہند

ہوئے کمشنر صاحب نے تصریح کردی کہ یہ ملازمتیں ہندوؤں کے سوا کسی کو نہ ملیں گی۔ (۶)

سماجی حیثیت کی پامالی

مسلمانوں کی عزت و شرافت کا حال کتنا ابتر تھا، اس کے بارے میں سرسید لکھتے ہیں:

کیا ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم ہے کہ بڑے سے بڑا ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھا اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف اہل کار صاحب کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کر رہا ہے اور صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی، اس نوکری سے تو گھانس کھودنی بہتر ہے۔

بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کو نہایت بے قدر اور بے وقار کر دیا ہے۔ ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں ہے، جیسی ایک چھوٹے یورپین کی (۷)

مذہبی و تہذیبی اقدار کو خطرہ

سب سے بڑا خطرہ مذہبی اور ملی تشخصات اور تہذیبی اقدار و روایات کو تھا، سرسید اس وقت کے عام احساسات کے بارے میں رقم طراز ہیں:

کچھ شبہ نہیں کہ تمام لوگ جاہل و قابل، اعلیٰ اور ادنیٰ یقین جانتے تھے کہ ہماری گورنمنٹ کا دلی ارادہ ہے کہ مذہب اور رسم و رواج میں مداخلت کرے، اور سب کو، کیا ہندو کیا مسلمان، عیسائی مذہب اور اپنے ملک کے رسم و رواج پر لا ڈالے...... سب کو یقین تھا کہ ہماری گورنمنٹ علانیہ جبر مذہب بدلنے پر نہیں کرے گی، بلکہ خفیہ تدبیریں کر کے مثل نابود کر دیئے علم عربی و سنسکرت کے اور مفلس و محتاج کر دینے ملک کے اور لوگوں کو جوان کا مذہب ہے، اس کے مسائل سے ناواقف کر کے اور اپنے دین و مذہب کی کتابیں اور مسائل اور وعظ کو پھیلا کر، نوکریوں کا لالچ دے کر لوگوں کو بے دین کر دیں گے...... ہندوستان میں وعظ اور کتھا کا دستور یہ ہے کہ اپنے اپنے معبد یا مکان پر بیٹھ کر کہتے ہیں، جس کا دل چاہے اور جس کو رغبت ہو وہاں جا کر سنے، پادری صاحبوں کا

---

(۶) موج کوثر ص: ۷۶۔ (۷) اسباب بغاوت ہند ص: ۴۲

طریقہ اس کے برخلاف تھا۔ وہ خود غیر مذہب کے مجمع یا تیرتھ اور میلہ میں جا کر وعظ کہتے تھے اور کوئی شخص حکام وغیرہ کے ڈر سے مانع نہ ہوتا تھا۔ بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحب کے تھانہ کا چپراسی جانے لگا، پادری صاحب وعظ میں صرف انجیل مقدس ہی کے بیان پر اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ غیر مذہب کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی اور ہتک سے یاد کرتے تھے جس سے سننے والوں کو نہایت رنج اور دلی تکلیف پہونچتی تھی...... دیہاتی مکتبوں کے مقرر ہونے سے سب یقین سمجھتے تھے کہ صرف عیسائی بنانے کو یہ مکتب جاری ہوئے ہیں......
جس گاؤں میں پرگنہ وزیر یا ڈپٹی انسپکٹر پہونچا اور گنواروں میں چرچا ہوا کہ ''کالا پادری'' آیا، عوام الناس یوں خیال کرتے تھے کہ یہ عیسائی مکتب ہیں اور کرسٹان بنانے کو بٹھاتے ہیں......
یہ سب خرابیاں لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہی تھیں کہ دفعتاً ۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ نے دارالامارت کلکتہ سے عموماً اور خصوصاً سرکاری معزز نوکروں کے پاس چٹھیاں بھیجیں، جن کا مطلب یہ تھا کہ:
اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، ریلوے سڑک سے سب جگہ کی آمدورفت ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہیے، اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔''
میں سچ کہتا ہوں کہ ان چٹھیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا، پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی، سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو، سب لوگ بیشک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں۔ (۸)

خوفناک سناٹا

خصوصاً اس وقت جبکہ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے بعد پورے ملک میں بالعموم موت کا سناٹا چھا چکا تھا۔ مشہور مبصر مولانا محمد میاں صاحب کے بقول:
اس دور کے متعلق یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ لوگوں نے انگریزوں کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا، البتہ یہ درست

---

(۸) اسباب بغاوت ہند ص: ۱۷تا۲۳۔

ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے غافل ہو گئے تھے، اور انہوں نے اپنے مستقبل کو پہچاننا چھوڑ دیا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ انگریزوں کو پہچان لینے کے باوجود وہ نہیں کیا یا نہیں کر سکے جو کرنا چاہئے تھا، خود پرستی نے خود غرضی اور ذاتی مفاد کی ہوسنا کی جو قومی عظمت ووقار اور حیات اجتماعی کے لئے سرطان اور پلیگ سے بھی زیادہ مہلک امراض ہیں، اور جن کی بنا پر طوائف الملو کی عروج پاتی ہے، انہیں امراض نے ارباب اقتدار کی چشم کو نابینا اور گوش سخن نیوش کو اصم اور مدہوش بنا دیا تھا۔

فانها لاتعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور یہ عجیب فلسفہ ہے کہ انسان جتنا زیادہ اپنی پرستش میں مشغول ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ خود فراموش ہو جاتا ہے۔ ذاتی مفاد اور خود پرستی کے شوالے جودکن، بنگال اور اودھ میں تعمیر کئے گئے تھے۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے پجاری انگریزوں کو پہچاننے، سمجھنے اور بوجھنے کے باوجود اس پر مجبور تھے کہ سنی کو ان سنی اور دیدہ کو نادیدہ بنا دیں۔ کیونکہ وہ اغراض جن کے آب وگل سے یہ شوالے تعمیر ہوئے تھے ان کا تقاضا ہی یہ تھا ورنہ یہ شوالے مسمار ہو رہے تھے:

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا (۹)

علماء حق

اس ہیبت ناک سناٹے میں ایک علماء حق ہی کی جماعت تھی جو ہر دور میں بیدار اور متحرک رہی، انہوں نے مخالف آندھیوں کی پروا نہیں کی، وہ ہر زمانے میں حق کے خلاف اٹھنے والے طوفانوں سے لڑتے رہے، اور جان وجگر سے دین وملت کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

صف اول کے رہنما

حضرت نانوتویؒ اسی جماعت کی صف اول کے رہنماؤں میں شامل ہیں۔ بلکہ دفاعی محاذ پر بہتوں سے پیش پیش، اور مجموعی لحاظ سے بے مثل و بے نظیر، سرسید مرحوم آپ کے رفیق درس تھے، لیکن طریق تعلیم حالات کی نباضی، اور ملک وملت کی مطلوبہ قیادت کے باب میں دونوں کے نقطۂ نظر میں سخت اختلاف تھا، انہوں نے حضرت نانوتوی کے انتقال پر اپنے مشہور رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' میں

(۹) شاندار ماضی ۴/۵۵۔

جو تعزیتی مضمون لکھا، اس کے یہ اعترافات کتنے بروقت اور حقیقی تھے:

زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا، لیکن ایسے شخص کے لئے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آئے، نہایت رنج وغم اور افسوس کا باعث ہوتا ہے...... لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی اسحاق کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے، مگر مولوی محمد قاسم مرحوم نے اپنی کمال نیکی اور دینداری اور تقوی اور ورع و مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس ولی کی تعلیم وتربیت کی بدولت مولوی محمد اسحاق صاحب کی مثل ایک اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے، بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ ہے......

اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتی علم میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو، الا اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا، مسکینی، نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحاق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا'' (۱۰)

تین دفاعی محاذ

حضرت نانوتویؒ نے تحفظ دین کے لئے مختلف محاذوں پر کام کیا، اس دور کی تاریخ پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ دور کیسے انتشار کا تھا، اور کتنے محاذ کھلے تھے جن پر کام کرنے کی ضرورت تھی۔

(۱) ایک طرف مسلمانوں کی سیاسی قوت کی بحالی، اور ایک طویل عرصہ تک حکومت کرنے والی امت کی عظمت رفتہ کی بازیابی کا مسئلہ تھا۔

(۲) دوسری طرف غیر اسلامی جماعتوں سے نظریاتی جنگ درپیش تھی، آئے دن مختلف جہتوں سے اسلامی عقائد واحکام پر حملے کئے جا رہے تھے، اور اسلامی تصورات کی غلط تعبیرات پیش کی جا رہی تھیں، ضرورت تھی کہ ان حملوں کا بھرپور دفاع کیا جائے، اور اسلامی عقائد واحکام کے حقیقی خدوخال جدید سائنٹفک انداز میں پیش کئے جائیں۔

(۳) تیسری جانب ملک میں مسلمانوں کی جہالت وافلاس کی وجہ سے ذہنی ارتداد کی وبا

---

(۱۰) موج کوثر / ۳۶۷-۳۶۸۔

پھیل رہی تھی، ضرورت تھی کہ مسلمانوں میں ٹھوس دینی تعلیمات عام کی جائیں اوراس کے لئے پورے ملک میں دینی اداروں کا جال بچھایا جائے تا کہ یہ امت اپنے حقیقی دین پر پورے شرح صدر کے ساتھ قائم رہے، اوراسلاف کے علمی ودینی اثاثوں کی حفاظت کرسکے۔

حضرت نانوتویؒ کی انفرادیت

حضرت نانوتوی کی حقیقت آگاہ اور زمانہ آشنا نظروں نے تاریخ کے چہرے پر بکھرے ان مسائل اور تقاضوں کو پڑھا اور تینوں محاذوں پر کام کرنے کی ضرورت کا احساس کیا اوراس کے لئے دوررس منصوبے مرتب کئے۔

اس دور میں حضرت نانوتوی کے سوا کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جس نے ان تینوں محاذوں پر یکساں انداز میں کام کیا ہو، تاریخ کو ہر محاذ پر کام کرنے والے باصلاحیت افراد کی ضرورت تھی، جو جداگانہ ہر محاذ پر اپنی قوتیں خرچ کریں، لیکن اسے ایک ایسی شخصیت بھی درکار تھی جو ہر محاذ پر کام کرنے کی صلاحیت رکھے، جو ہر قسم کی دفاعی اور اقدامی قوتوں سے لیس ہو اور جس کی جامع شخصیت سے ہر محاذ کی قیادت کو فائدہ پہونچے۔

ایسی شخصیت حضرت نانوتویؒ کے سوا کوئی دوسری نہیں تھی، حضرت نانوتوی نے نہ صرف یہ کہ دین کے تحفظ ودفاع کا تاریخی کارنامہ انجام دیا، بلکہ انہوں نے اپنی خدمات سے ایک نئے عہد کو جنم دیا، انہوں نے تاریخ کا رخ پھیر دیا، اس دور کی شخصیات اوران کی خدمات کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کسی نے تاریخ پر اتنے گہرے اثرات نہیں ڈالے جتنے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ڈالے۔

بہت زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، واقعات آئینہ کی طرح تاریخ کے صفحات پر نقش ہیں۔ ہم تینوں محاذوں پر حضرت نانوتوی کی دفاعی خدمات کی ایک ہلکی سی جھلک پیش کرنا چاہتے ہیں۔ مقصد سوانحی حالات وواقعات کو جمع کرنا نہیں بلکہ ان کی اہمیت کا احساس دلانا اوران کے سمت کی تعیین کرنا ہے۔

جنگی محاذ

۱۸۵۷ء کے جہاد میں قائدانہ کردار

اٹھارہویں صدی میں جب مسلمانوں پر سیاسی ادبار کا دور شروع ہوا، اوراس کی گرفت

روز بروز مضبوط ہوتی چلی گئی، تو ان کی سیاسی قوت کی بحالی اور عظمت رفتہ کی بازیابی کے لئے آخری کوشش کے طور پر حضرت نانوتویؒ نے علماء کی ایک جماعت کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے جہاد حریت میں حصہ لیا اور اس میں قائدانہ کردار ادا کیا —— جہاد شاملی کے متعلق تمام لوگ متفق اور ہم زبان تھے سوائے مولانا شیخ محمد تھانوی صاحبؒ کے، ان کا خیال تھا کہ چوں کہ ہمارے پاس اسلحہ اور آلات جہاد نہیں اس لیے نہ صرف یہ کہ جہاد فرض نہیں بلکہ جائز بھی نہیں ہے۔ لیکن جب حضرت نانوتوی نے بدر کی مثال پیش کی تو انھیں بھی شرح صدر ہو گیا اگرچہ یہ تحریک ناکام رہی۔

تحریک کی ناکامی کے بعد جب ان حضرات کے نام گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے، تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی گرفتار ہو گئے اور قریب چھ ماہ جیل میں رہے، جبکہ حضرت نانوتوی اس سے محفوظ رہے، پولیس ان کا تعاقب کرتی رہی اور ان کو گرفتار کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی رہی، لیکن حضرت نانوتوی ان کی زد سے محفوظ رہے، حضرت گنگوہیؒ نے اس کی تکوینی توجیہ یہ فرمائی کہ چونکہ مجھے اس جہاد کی ضرورت میں ابتداءً کچھ تذبذب تھا، اس لئے مجھے جیل کی سزا کھانی پڑی، جبکہ مولانا محمد قاسم صاحب کو اس پر شروع سے پورا شرح صدر تھا، اس لئے اللہ نے ان کی حفاظت فرمائی۔ (۱۱)

ان واقعات سے حضرت نانوتوی کے جذبۂ جہاد، ذوق جاں فروشی، حق شناسی وحق آگہی، حالات کی نباضی، فکر وخیال کی رسائی، تحریک جہاد میں ان کی بنیادی اہمیت اور مجاہدین علماء میں ان کے امتیاز پر روشنی پڑتی ہے۔

عملی طور پر جہاد میں بھی حضرت نانوتوی کا کردار انتہائی سرفروشانہ تھا۔ آپ کے استاذ زادہ، سبق کے ساتھی، بعض کتابوں کے شاگرد اور نہایت مخلص عزیز حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اپنی عینی شہادت بیان فرماتے ہیں:

> چند بار مفسدوں سے نوبت مقابلہ کی آئی، اللہ رے مولوی صاحب ایسے ثابت قدم، تلوار ہاتھ میں اور بندوقچیوں کا مقابلہ، ایک بار گولی چل رہی تھی، یکا یک سر پکڑ کر بیٹھ گئے، جس نے دیکھا جانا گولی لگی، ایک بھائی دوڑے، پوچھے، کیا ہوا، فرمایا کہ سر میں گولی لگی، عمامہ اتار کر دیکھا تو کہیں گولی کا نشان تک نہ ملا اور تعجب یہ ہے کہ خون سے تمام کپڑے تر، انہیں دنوں ایک نے منہ در منہ

---

(۱۱) سوانح قاسمی۔

بندوق ماری، جس کے سنبھے سے ایک مونچھ اور کچھ ڈاڑھی جل گئی اور کچھ قدرے آنکھ کو صدمہ پہونچا اور خدا جانے گولی کہاں گئی اور اگر گولی نہ تھی تو اتنے پاس سے سنبھ بھی بس تھا۔ مگر حفاظت الٰہی برسر تھی، کچھ اثر نہ ہوا۔ (۱۲)

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے مولانا محمد میاں صاحب منصور انصاریؒ کے حوالے سے نقل فرمایا کہ انگریزی فوج جو شاملی میں موجود تھی، وہ مجاہدین کے ہجوم کو دیکھ کر تحصیل کی چہار دیواری میں محصور ہوگئی اور اندر سے فائر شروع کردیئے، مجاہدین کا ہجوم باہر میدان میں تھا، جہاں کوئی آڑ نہیں تھی، اس طرح مجاہدین کا جانی نقصان کافی ہوا۔ اتفاق سے تحصیل کے قریب ایک چھپر تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر چھپر پر پڑی، چھپر اٹھوا کر تحصیل کے صدر دروازہ پر ڈالا گیا اور اس میں آگ لگادی گئی، جس سے پھاٹک جل گیا اور اندر گھسنے کا راستہ کھل گیا، اب فوج میں مقابلہ کی طاقت نہیں تھی، اس کے کچھ سپاہی کسی طرح بھاگنے میں کامیاب ہوئے، کچھ مقتول ہوئے اور باقی گرفتار ہو گئے اور شاملی پر مجاہدین کا قبضہ ہوگیا۔ (۱۳)

حضرت نانوتویؒ برطانوی فرعون کے لئے موسیٰ

۱۸۵۷ء کا جنگی جہاد بظاہر ناکام ہوگیا، مگر حضرت نانوتوی کا جہاد جاری رہا، پوری سامراجی قوت آپ کے درپے آزار رہی، مگر وہ آپ کو کوئی حقیقی نقصان نہ پہونچا سکی اور مظلوم و مقہور ہندوستان کے لئے آپ کا تحریکی تسلسل جاری وساری رہا۔

حضرت مولانا محمد میاں صاحب نے خوب لکھا ہے:

الزام غدر یا اس الزام کے شبہ میں لاکھوں ہندوستانی موت کے گھاٹ اتارے جاچکے ہیں، ظلم وستم اور وحشت و بربریت کی جتنی بھی صورتیں ہوسکتی ہیں ہندوستانیوں کو خوف زدہ کرنے کے لئے کام میں لائی جاچکی ہیں، مگر جو قدرت فرعون کے گھر میں موسیٰ کی پرورش کیا کرتی ہے، وہ عجیب وغریب انداز سے ان کی حفاظت کررہی ہے، جو فرعون برطانیہ کے مقابلے میں موسیٰ بن کر سامنے آنے والے ہیں، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب بھی انہیں منتخب افراد میں ہیں جن کو قدرت خداوندی برطانوی سامراج کے مقابلے میں نہ صرف موسیٰ بلکہ موسیٰ گر بنا کر کھڑا کرنے والی تھی۔ (۱۴)

---

(۱۲) ص:۱۱۳۰سوانح عمری مولانا محمد قاسم صاحب۔ (۱۳) سوانح قاسمی ۲۔ (۱۴) شاندار ماضی ۴/۲۹۶۔

نظریاتی محاذ

ہتھیار کی جنگ کے بعد افکار کی جنگ کا آغاز

حضرت نانوتوی شمشیر وسنان کی جنگ میں ہار گئے، لیکن اسی سے نظریاتی جنگ کی راہ ہموار ہوئی، جنگ کا میدان سر کرنے والی ''سامراجی قوم'' فتح کے نشہ میں میدانِ مناظرہ میں اتر پڑی، شمشیر وسناں کے طویل جنگی تجربات سے انگریزوں نے محسوس کیا کہ وہ جدید ترین ہتھیاروں سے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کا صفایا کرسکتے ہیں (جبکہ وہ بھی آسان نہیں ہے) مگر ان کے ایمان کا صفایا نہیں کرسکتے اور یہ سخت جان امت اپنی جان دے سکتی ہے مگر اپنا ایمان نہیں گنوا سکتی، جبھی تو سخت سے سخت اذیتیں سہنے کے باوجود ایک بھی مسلمان اپنے دین ومذہب سے منحرف نہیں ہوا اور انہوں نے مکہ کی مظلوم تاریخ کی یاد تازہ کردی، مگر کسی نے اپنے دامن ایمانی پر کوئی داغ آنے نہیں دیا۔

یہیں سے انگریزی سیاست کا رخ تبدیل ہوا، مسلمان یوں بھی بالکل کمزور اور نہتے ہو چکے تھے۔ ان کے جسم وجان کی ساری قوتیں یہ ظالم پہلے ہی نچوڑ چکے تھے، ایک ایمان کے سوا ان کے پاس کوئی دوسری پونجی نہ تھی، برطانوی قزاقوں نے ان کی یہ پونجی بھی اڑا لینے کا پروگرام بنایا۔ اور ملک کے طول وعرض میں فضول مناظروں اور بے جا مباحثوں کا سلسلہ شروع کردیا اور اپنے ساتھ اس کوشش میں ہندو پنڈتوں کو بھی شامل کرلیا۔ ان کے مذہبی رہنما پورے ملک میں گھوم گھوم کر اسلامی نظریات کے خلاف غلط فہمیاں پھیلاتے اور بھولے بھالے مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے فریب دینے کی کوشش کرتے۔

اس نظریاتی محاذ پر بھی طبقۂ علماء میں حضرت نانوتویؒ ہی تھے، جنہوں نے سب سے آگے بڑھ کر اس محاذ کو سنبھالا اور اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ مخالف نظریات وشبہات کے دندان شکن جوابات دیئے۔ چناں چہ انھوں نے عیسائی پادریوں اور آریہ سماجی پنڈتوں سے مناظرے کئے اور عوام پر اسلام کی حقانیت واضح کی۔

اسی لئے حضرت نانوتوی کو ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت کی طرف سے اس عہد کی مناسبت سے ان کو وہ خاص علوم عطا کیے گئے، جو کسبی نہیں بلکہ سراسر الہامی اور عطائی تھے۔ جو نہ اس عہد کے علماء میں کسی کو ملے اور نہ اس سے قبل کی کسی کتاب میں ان کا سراغ ملتا ہے۔

تعلیمی محاذ

خاموش دفاع

تیسرا محاذ مثبت اقدام یا خاموش دفاع کا تھا، وہ یہ کہ مسلمانوں میں علوم اسلامیہ کی اشاعت کی جائے اور ان کو اسلامی تعلیمات سے آشنا کیا جائے، تا کہ سیاسی قوت کے زوال کے بعد بھی ان کی علمی، فکری اور شعوری قوت زوال پذیر نہ ہو، ان میں منصوبہ بند اقدامات کی صلاحیت باقی رہے، وہ اسلام پر ہونے والے حملوں کی اصلیت جان سکیں، افواہوں اور غلط فہمیوں سے اپنے کو محفوظ رکھ سکیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین وملت کے وقیع اثاثوں اور اسلاف کے قیمتی سرمایوں کی حفاظت کر سکیں، ہندوستان میں بکھرے ہوئے اسلامی شعائر وآثار کو آباد اور محفوظ رکھ سکیں اور ہندوستانی اقدام کی صحیح اخلاقی وفکری قیادت کر سکیں۔

اس محاذ پر بھی سوائے حضرت نانوتوی کے کوئی دوسرا شخص نظر نہیں آتا، جس نے اس قدر منصوبہ بند طور پر کام کیا ہو، حضرت نانوتویؒ نے اس کے لئے چند علماء ومشائخ کے تعاون سے ۱۸۶۶ء مطابق ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد ڈالی، جو ۱۸۵۷ء کی جنگی سیاست کا نعم البدل تھا۔ حضرت مولانا محمد میاں صاحب فرماتے ہیں:

> حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا محمد منیر صاحب اور ان کے برادر محترم مولانا محمد مظہر صاحب کو ہندوستان چھوڑا گیا اور ابھی شہیدوں کا خون خشک ہونے نہیں پایا تھا کہ ان بزرگوں نے تحریک کی نشاۃ ثانیہ کے لئے دارالعلوم دیوبند، جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مرادآباد، مظاہر العلوم سہارنپور وغیرہ کے حلقے قائم کر دیئے، جنہوں نے سیاسیات سے علیحدگی کا اعلان کیا، مگر دین ومذہب (جس کی تعلیم کو نصب العین بنایا تھا) اس کی ہمہ گیر تفسیر میں ان بزرگوں کے عقیدے کے مطابق وطنی سیاست اور جدوجہد آزادی ایک فرض کی حیثیت رکھتی تھی۔(۱۵)

چنانچہ دارالعلوم دیوبند اپنے نصب العین اور مقاصد میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ ایک طرف اس نے امت کو انتہائی قیمتی رجالِ کار دیئے، جنہوں نے ملک وملت کی کشتی ساحل سے ہمکنار

(۱۵) شاندار ماضی ۴/ ۲۸۷۔

کرنے کی کوشش کی، تو دوسری طرف اس نے ملک و بیرون ملک علمی فضا کی تشکیل کرنے اور دینی مدارس و مکاتب کا جال بچھانے میں بنیادی رول ادا کیا، اگر دارالعلوم دیوبند کا موجودہ نظام تعلیم اور مدارس و مکاتب کا موجودہ سلسلہ اس ہندوستان میں نہ قائم ہوا ہوتا، تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ نئے ہندوستان کا نقشہ کیا ہوتا اور غیر اسلامی ہندوستان میں مسلمانوں کا ملی، سیاسی اور علمی ڈھانچا کیا تیار ہوتا؟

ڈاکٹر اقبال ان مدارس کو ہندوستان میں دین کا سب سے مضبوط دفاعی محاذ اور تحفظ اسلام کا سب سے مستحکم قلعہ قرار دیتے ہیں۔

انہوں نے اپنے ایک نیاز مند حکیم احمد شجاع کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

جب میں تمہاری طرح جوان تھا تو میرے قلب کی کیفیت بھی ایسی ہی تھی میں بھی وہی کچھ چاہتا تھا، جو تم چاہتے ہو، انقلاب، ایسا انقلاب جو ہندوستان کے مسلمانوں کو مغرب کی مہذب اور متمدن قوموں کے دوش بدوش کھڑا کر دے۔

یورپ کو دیکھنے کے بعد میری رائے بدل گئی ہے، ان مکتبوں کو اسی حالت میں رہنے دو، غریب مسلمانوں کے بچوں کو انہیں مکتبوں میں پڑھنے دو اگر یہ ملا اور درویش نہ رہے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟ — جو کچھ ہوگا میں اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں، اگر ہندوستان کے مسلمان ان مکتبوں کے اثر سے محروم ہو گئے تو بالکل اس طرح جس طرح ہسپانیہ میں مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت کے باوجود آج غرناطہ اور قرطبہ کے کھنڈر اور الحمراء اور باب للاخوتین کے سوا اسلام کے پیروؤں اور اسلامی تہذیب کے آثار کا کوئی نقش نہیں ملتا، ہندوستان میں بھی آگرہ کے تاج محل اور دلی کے لال قلعہ کے سوا مسلمانوں کی آٹھ سو برس کی حکومت اور ان کی تہذیب کا کوئی نشان نہیں ملے گا۔(۱۶)

جو نکتہ ڈاکٹر اقبال نے تجربہ کے بعد سمجھا تھا وہ حضرت نانوتوی کی نگاہ دوررس نے پہلے ہی پا لیا تھا اور ملت ہندیہ کی بقاء و تحفظ کے لئے اس جانب وہ پہلے ہی قدم اٹھا چکے تھے، اللہ ان کو ساری امت کی طرف سے جزائے خیر سے نوازے آمین۔

اس مختصر سے مضمون میں تحفظ دین کے لئے حضرت نانوتوی کی جملہ مساعی جمیلہ کو بیان کرنا ممکن نہیں، یہ جو کچھ بھی عرض کیا گیا اس کی حیثیت محض ایک نذرانہ عقیدت سے زیادہ نہیں۔ ☆

(۱۶) اوراق گم گشتہ از رحیم بخش شاہین ص ۳۷۴، ۳۷۵

دوسرا باب

آراءوافکار

ڈاکٹر شمس تبریز خاں*

فکرِ قاسمی کے چند اساسی رجحانات

عوامل ومحرکات:

فکرِ قاسمی یا حکمتِ قاسمیہ کے بنیادی عوامل ومحرکات کچھ اسی قسم کے تھے جو فتنۂ تاتار کے نتیجے میں تباہی بغداد اور خلافت عباسیہ کے خاتمے کے بعد اسلامی ثقافت کے احیائے نو اور نشاۃ ثانیہ کے لیے فکر مند علماء ومشائخ اور مسلم مفکرین وقائدین کے دلوں اور دماغوں میں کارفرما تھے، فتنۂ تاتار کی شدت ہندستان کی مغل حکومت کے خاتمے کے مقابلے میں اس لیے کم تھی کہ وہاں تاتاری صنم خانے سے ہی کعبہ کے پاسبان اور پشتی بان میسر ہو گئے اور تاتاریوں نے مسلمان ہو کر خلافتِ عثمانیہ، کی شکل میں ملت اسلامیہ کو خلافتِ عباسیہ کا نعم البدل فراہم کر دیا اور اسلامی اقتدار کو وی آنا Vianna کی فصیلوں تک پہنچا دیا تاتاری حملہ ایک وحشیانہ حملہ تھا جس سے اسلامی تہذیب وتمدن کے آثار ونقوش کو نقصان پہنچا مگر اسلامی علوم وفنون اور اسلامی فکر ودانش کا اتنا نقصان نہیں ہوا کیونکہ تاتاریوں کے پاس اسلامی فکر وفن کے مقابلے میں کوئی فکری وثقافتی طاقت نہ تھی جبکہ ہندستان میں برطانوی اقتدار کے ساتھ مغربی مذاہب وتہذیب، اور مغربی فکر وفلسفہ، مغربی صنعت وحرفت بھی جارحانہ عزائم کے ساتھ سرگرم عمل تھی اور ہندستانی عوام خاص طور سے ہندستانی مسلمانوں کو مغربی استعمار کے ہمہ گیر سیاسی وتہذیبی، فکری وعلمی، دینی ومذہبی جارحیت کا سامنا تھا۔ اس لیے ہمارے بزرگوں، خاص طور سے اکابر دیوبند کو دوہری مشکلات سے عہدہ برآنا اور مسلمانوں کی سیاسی محرومی، تہذیبی و مذہبی تباہی، اور علمی وفکری بربادی کے کھنڈر اور ملبے پر کم از کم مذہبی وتہذیبی اور علمی وفکری فصیلیں اور شہر پناہیں تعمیر کرنا تھیں جن میں دین ومذہب اور اسلامی ثقافت کے سرمائے کی حفاظت اور ممکن حد تک اشاعت کی جا سکے۔

اکابر دیوبند کو ہندستان سے مسلم اقتدار کے خاتمے کا جو صدمہ تھا وہ انگریزوں کے خلاف ان کے جذبات اور "عملی اقدامات" سے واضح تھا، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت

---

* استاذ شعبۂ عربی لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ

مولانا اسماعیل شہیدؒ کی مجاہدانہ روایات کے امین اور ان کے جانشین ہونے کے سبب ان اکابر نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی قیادت کی، اور یہی جذبات ور جحانات ان کے جانشینوں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ وغیرہ کے حصے میں آئے اور دارالعلوم دیوبند مغرب کے فکری وسیاسی اقتدار کے لیے چیلنج بنا رہا۔ حضرت شیخ الہندؒ کے بقول ''دارالعلوم دیوبند ۱۸۵۷ء کی تلافی کے لئے قائم ہوا تھا'' اور اسے ان مجاہد علماء نے قائم کیا تھا جنہوں نے شاملی کے میدان میں انگریزوں کا مقابلہ کیا تھا اور ان کے عتاب کا نشانہ بنے تھے، اس طرح سیاسی شکست کے بعد انگریز حکمرانوں سے مورچہ لینا اور دین ومذہب کو علمی وعملی طور پر قائم رکھنے کے لئے سازگار فضا اور ماحول بنانا بلاشبہ ایک انقلابی وتعمیری، تجدیدی واجتہادی کارنامہ تھا جس کے اثرات وثمرات سے برصغیر اور دیگر ممالک کے مسلمان اب تک مستفید ہو رہے ہیں اور حکمت قاسمیہ اپنی اصالت وصلابت کی بدولت طاقت کا سرچشمہ بن کر مسلمانوں میں مذہبی وتہذیبی زندگی اور فکری وثقافتی سرگرمیوں کی محرک بنی ہوئی ہے۔

بنیادی عناصر ور جحانات

اسلامی فکر کے کسی بھی دبستان کی طرح 'فکر قاسمی' یا 'حکمتِ قاسمیہ' کے بنیادی عناصر میں بھی کتاب وسنت کی تعلیمات اور توحید ورسالت اور آخرت کے ابعاد ثلاثہ روح رواں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی فکری وعملی سرگرمیوں کا مصدر ومحور بنے ہوئے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی فکر اسلام کے ہمہ گیر فکری وثقافتی، سیاسی ومعاشرتی، مذہبی وتہذیبی غلبہ واقتدار کے تصور پر مبنی ایک عملی فلسفہ اور نظام حیات ہے جو اپنے تاریخی وتہذیبی تسلسل کے ساتھ اکابر دیوبند تک پہنچا ہے، دین کا جو جامع وکامل تصور شاہ ولی اللہؒ نے پیش کیا تھا۔ حضرت مولانا قاسم صاحبؒ نے اسی کی تجدید کرتے ہوئے علمی وعملی سطح پر اس کے نفاذ اور اس کی ترویج واشاعت کی کوشش کی۔ فکر قاسمی کا بنیادی عنصر اسلام کے اصول ومبادی اور اس کی اولیں روایات کی اصلیت واصالت کی حفاظت وصیانت اور بدعت وتحریف، اور ترمیم وتبدیلی سے گریز کے ساتھ زمان ومکان کی رعایت، عصری مشکلات ومطالبات کو پیش نظر رکھنا ہے جس کی بدولت دین اپنی اصلیت وماہیت کو بدلے بغیر اپنی روایت کو تجدیدی واجتہادی تسلسل کے ساتھ قائم رہتا ہے اور ہر زمانے اور ہر جگہ کے لیے ایک جامع اور مثالی وعملی نظام حیات فراہم کرتا ہے۔

'فکر قاسمی' کوئی فلسفیانہ مکتب فکر نہیں بلکہ کتاب وسنت کی جامع تعلیمات کے علم اور اس کے مطابق نظام فکر و عمل کا نام ہے جس میں کلامی طور سے اہلسنت و ماتریدیت، فقہی طور سے حنفیت اور وقت ضرورت دوسرے مسالک فقہ سے استفادہ، وجدانی طور سے احسان وتصوف اور سیاسی طور سے اعلائے کلمۃ اللہ اور اظہارِ دین اسلام کے عناصر ورجحانات نمایاں ہیں۔ (۱)

'فکر قاسمی' کا ایک امتیاز اس کی عملیت اور زندگی میں قابل نفاذ ہوتا ہے۔ جو فلسفیانہ خیال آرائی وموشگافی کے بجائے ایک واضح نظام فکر و عمل ہے، جس کی روح اتباع سنت اور جس کی مثالی شخصیتیں صحابہ وتابعین وسلف صالحین ہیں اس کا مقصد ومنہاج دین کی روایت کو پوری امانت و دیانت کے ساتھ آئندہ نسلوں اور زمانوں تک پہنچانا ہے، اس لیے اس میں مصلحت ومصالحت، مداہنت ومفاہمت پر مبنی رویے سے گریز و پرہیز بہت نمایاں ہے، اس میں مجاہدہ بھی ہے اور جہاد بھی، اس میں تزکیۂ نفس اور اصلاح وتربیت بھی ہے اور سلطنت وحکومت بھی اس میں دنیا کی امامت بھی ہے اور خلافت بھی غرض اس میں دین و دنیا، مذہب و سیاست دوش بدوش ہیں اور جدت وقدامت کا خوشگوار امتزاج موجود ہے۔

دین کی کاملیت وجامعیت کا یقین اتباع سنت، دین کی ابدیت اور ہر مقام اور ہر زمانے کے لیے اس کی صلاحیت پر اعتماد اور اہل سنت والجماعت کے فرقۂ ناجیہ کی خصوصیات وصفات اپنائے رہنے کی سعی پیہم اور جہد مسلسل، سیاسی اقتدار نہ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کی وحدت واجتماعیت اور شیرازہ بندی، اور کتاب وسنت کی تعلیمات سے تمسک، طاقت و وسعت بھر دین کی عملی پیروی، اسلام کے فکری وثقافتی؛ تہذیبی ومعاشرتی، عائلی واجتماعی، شرعی واخلاقی نظام کو عملی طور سے برتنے، غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت وپیغام کو پہنچانے کی انفرادی واجتماعی اور امکانی کوشش اور غلبۂ دین و اعلاء کلمۂ حق کی تمنا بھی 'فکر قاسمی' کے اصول وفروع میں شامل ہے۔

موضوعاتِ فکر ونظر

ہندستان پر برطانوی اقتدار کے عروج کے ساتھ عیسائی مشنری سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور عیسائیت کی تبلیغ کے ساتھ اسلام کے مذہب وتہذیب کو بھی معاندانہ اعتراضات کا نشانہ بنایا

(۱) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو "عقائد علمائے دیوبند" از مولانا محمد طیب صاحب"

جانے لگا، پھر ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی کے تحت انگریزوں کے اشارے پر دیانند سرسوتی اور آریہ سماج کے دیگر پنڈتوں نے اسلام پر اُلٹے سیدھے اور مضحکہ خیز اعتراضات شروع کردیے جن کے بہت سے مضحک نمونے ''ستیارتھ پرکاش'' اور آریہ سماجی لٹریچر میں دیکھے جاسکتے ہیں جن میں اسلام اور اسلامی تہذیب پر سطحی، طفلانہ بلکہ جاہلانہ اعتراضات کیے گئے ہیں جو مغالطہ دہی اور تمسخر و استہزاء اور کینہ وعناد کی پیداوار معلوم ہوتے ہیں، اس کے علاوہ دیانند جی کی ان تحریروں میں خود ہندو پنڈتوں کے خیال کے مطابق ویدوں کی تعبیر وتشریح میں پرانی روایت سے انحراف اور تحریف کا انداز نمایاں ہے جس سے کام لے کر اور سناتن دھرمی اصول سے ہٹ کر ہندوازم کی وہ ایسی تعریف وتعبیر کرتے ہیں جس میں جارحانہ قوم پرستی کی جھلک موجود ہے۔

اس وجہ سے حضرت نانوتویؒ نے عیسائیت کے ساتھ آریہ سماجی ہندوازم کے اعتراضات کے دفاع اور جواب کی طرف توجہ کی اور اپنی تحریروں اور تقریروں سے انہیں لاجواب کردیا۔ حضرت نانوتویؒ نے اپنے جواب میں صرف دفاعی انداز نہیں اختیار کیا بلکہ ضرورت کے تقاضے سے اقدامی اور الزامی سوال وجواب بھی دیے ہیں۔ پھر مغربی انداز فکر اور سائنس کی ترقی کے ساتھ مذہبی تعلیمات، توحید ورسالت اور آخرت سے جو بے زاری وبے توجہی اور الحاد پسندی پیدا ہورہی تھی اس کی طرف بھی حضرت نانوتویؒ نے توجہ کی اور مذہب وغیبی حقائق کے لیے عقلی ومنطقی دلائل وبراہین پیش کیے جو الحاد ودہریت اور نیچریت سے متاثر ذہنوں کے لیے چشم کشا اور بصیرت افزا ثابت ہوئے۔

عیسائیت اور ہندوازم کے بعد انھوں نے تشیع، بدعت، اور بعض فقہی وکلامی واختلافی مگر ضروری مسائل کی توضیح وتشریح کو اپنا موضوع بنایا مگر اہل قبلہ اور کلمہ گو حضرات کے جواب دیتے ہوئے انھوں نے اختلاف کو مخالفت کا رنگ دینے سے شعوری طور پر پرہیز کیا ہے اور مناظرانہ انداز سے بچتے ہوئے علمی وتحقیقی مباحث تک اپنے کو محدود رکھا ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے جس فراست ایمانی، حمیت دینی، بالغ نظری اور اولوالعزمی سے کام لے کر عیسائیت اور آریہ مت کے جارحانہ عزائم کو شکست دی اس کا اعتراف بہت سے اہل نظر نے کیا ہے لیکن ان کے معاصر عالم اور اہم تذکرہ نگار مولوی رحمٰن علی صاحب کی یہ شہادت بہت اہمیت رکھتی ہے کہ:

''حضرت مولاناؒ نے مباحثۂ مذہبی میں پادری تاراچند کو ساکت کردیا، اور ۱۲۹۳ھ میں چاندا پور ضلع

شاہجہاں پور کے میلۂ خدا شناسی میں جہاں ہر مذہب کے علماء جمع تھے مولانا علیہ الرحمہ نے علی رؤس الاشہاد ابطال تثلیث وشرک اور اثبات توحید کا ایسا بیان فرمایا کہ موافق ومخالف تمام حاضرین جلسہ کے دہنوں پر مہر سکوت لگ گئی، اور ۱۲۹۴ھ میں انہوں نے وجود باری وتوحید پر دیانند سرسوتی اور عیسائیوں کے تحریف انجیل پر بحث کی جس پر پنڈت مذکور سر بگریباں ہوگئے اور عیسائی پادریوں نے کتابیں چھوڑ کر راہ فرار اختیار کی اس سلسلے میں رسالہ حجۃ الاسلام مشہور ہے''(۲)

ردآریہ ورد عیسائیت میں ''مباحثہ شاہجہانپور''''انتصار الاسلام''''حجۃ الاسلام'' اور ''قبلہ نما'' کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ''حجۃ الاسلام'' بنیادی کلامی مسائل اور اسلامی اصول ومبادی کے دفاع کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے، جس کی روشنی میں مختلف ومتنوع سطح کے اعتراضات کا جواب دیا جاسکتا ہے، اس میں وجود باری اور اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے اثبات کے ساتھ اسلامی عبادات کے فلسفہ سے بھی اچھی بحث ہے۔ اور اثبات وضرورت نبوت پر تو بالکل منفرد اور اچھوتے انداز سے کلام کیا گیا ہے اور اس کے لیے نئے طرز کے دلائل و براہین اپنائے گئے ہیں جن کو بعد کے لوگوں نے بھی اسلام کے دفاع کے سلسلے میں اپنایا اس طرح حضرت نانوتویؒ نے نبوت محمدیہ کے دلائل میں اضافہ بھی کیا اور بعد والوں کے لیے مزید علمی امکانات بھی پیدا کردیے۔

حضرتؒ نے نبوت محمدیہ کی افضلیت پر روایتی انداز سے ہٹ کر اس کی علمی واخلاقی برتری سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات علمیہ اوروں کے معجزات عملیہ سے افضل ہیں اور ان کی پیشگوئیاں بھی دوسروں سے بڑھ کر ہیں، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق میں بھی سب سے اعلیٰ تھے، اور قرآن شریف، فصاحت وبلاغت کے علاوہ علوم کثیرہ پر حاوی ہونے کے سبب بھی افضل ہے اور پھر اس نکتے پر زور دیا ہے کہ قرآن کلام الٰہی ہے جبکہ دوسری آسمانی کتابیں کتاب الٰہی ہیں جن میں تحریف ہوگئی ہے۔ پھر حضرت مولاناؒ نے یہ دکھایا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم معجزات عملیہ میں بھی دوسرے انبیاء سے بڑھے ہوئے ہیں۔ (۳)

---

(۲) تذکرہ علمائے ہند از مولوی رحمٰن علی ص ۲۱۱ (لکھنؤ ۱۹۱۴ء)

(۳) حجۃ الاسلام ص ۹۲۔۱۱۸ (دیوبند، ۱۹۶۷ء)

''قبلہ نما'' دیانند سرسوتی کے کعبہ پرستی کے لغو و بے بنیاد الزام کے جواب میں عین حالت مرض میں وفات سے چھ ماہ پہلے لکھی گئی جس میں حجۃ الاسلام ہی جیسی وسعت و جامعیت، نکتہ آفرینی و دقیقہ سنجی، دقت فکر و نظر اور فہم و بصیرت نمایاں ہے غالباً غالب کے اس شعر سے اس کا نام رکھا گیا تھا:

ہے پرے سرحدِ ادراک سے، اپنا مسجود قبلہ کو اہل نظر، قبلہ نما کہتے ہیں

''قبلہ نما'' پورے اسلامی لٹریچر میں منفرد حیثیت رکھتی ہے خانۂ کعبہ کی اہمیت و حقیقت اور مظہر محبوبیت ہونے پر اتنی باریک بینی و نازک خیالی کے ساتھ شاید ہی کبھی کچھ لکھا گیا ہو اور اس کے تجلی گاہِ حق اور مرکز عالم ہونے پر اس تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہو اور کعبہ سے متعلق کتاب و سنت کے اسرار و رموز کی اس انداز سے پردہ کشائی کی گئی ہو۔ اس کے ساتھ ہی ذات و صفاتِ باری، اور نبوت محمدیہ کی مرکزیت وشان محبوبیت و خاتمیت پر بھی بصیرت افروز کلام کیا گیا ہے۔

''آب حیات'' بھی عجیب و غریب، حیات بخش و حیات آفریں، روح پرور اور روح افزا، الہامی و وجدانی کتاب ہے جس کا موضوع حیاتِ نبوی کے روحانی و جسمانی دونوں پہلوؤں کا اثبات ہے۔ اسلامی علم کلام و عقائد میں حیات نبوی ایک عقیدہ تو رہا ہے لیکن اس کے جسمانی پہلو پر زور، اس کی تحقیق و تدقیق، تفصیل و تشریح اور اس کے دلائل و براہین سے ایسی بحث بہت کم ملتی ہے، حضرت نانوتویؒ نے :النبی اولی بالمؤمنین من انفسھم و ازواجہ امھاتھم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے امت کے روحانی رشتے اور قربت و ابوّت پر استدلال کیا ہے اور بتایا ہے کہ ابوت روحانی، ابوت جسمانی سے زیادہ قوی اور مؤثر ہوتی ہے حیات نبوی سے انھوں نے دوہرا استدلال کیا ہے اور باغِ فدک میں میراث نبوی کے جاری نہ ہونے کا بھی اسے سبب بتایا ہے کہ آنحضرتؐ چونکہ زندہ سلامت ہیں اس لیے بھی ان کی وراثت کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے اور اسی لیے ان کی ازواج مطہرات سے نکاح بھی جائز نہیں۔ (۴) حیاتِ نبوی کا عقیدہ تشریحات قاسمیہ کی روشنی میں امت محمدیہ کے ایمان و یقین، فکر و عمل، اور نفسیات و عزائم کے لیے طاقت و قوت کا سرچشمہ ثابت ہو سکتا ہے اور اس کے حال و استقبال کے لیے زوردار محرک اور فعّال عنصر بن سکتا ہے اور اس کے حوصلے Morale کو بلند کر سکتا ہے۔

---

(۴) آب حیات: صفحات ۱۸، ۳۱، ۱۴۹، ۱۵۵ (ملتان ۱۴۱۳ھ)

حکیمانہ وداعیانہ طرز خطاب

حکمت قاسمیہ کا ایک بڑا امتیاز اس کے لہجے اور طرز خطاب کی عمومیت و عالمیت اور ہمہ گیری بھی ہے جو کتاب وسنت کے اسالیب کی پیروی کے نتیجے میں ظاہر ہوئی ہے، کتاب وسنت میں خاص فرقوں کو کسی ضرورت سے ہی خطاب کیا گیا ہے ورنہ ان کا خطاب عام طور سے دنیا کے سارے انسانوں ہی سے ہوتا ہے کیونکہ قرآن انسانوں کے لیے جامع دستورِ حیات اور ایک عام ہدایت نامہ کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے اس کی دعوت حق میں انسانوں کے لیے فطری کشش اور اپیل موجود ہے۔ عہد مغلیہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کتاب وسنت کے اس طرز وخطاب کو اپنایا اور پھر ان کے حلقۂ فکر میں حضرت نانوتویؒ نے ان کے طرز فکر ونظر کو اپنایا اور اس کا خیال رکھا کہ ان کی حکمت ودعوت بغیر کسی مذہبی ونسلی اور گروہی وطبقاتی بندش کے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے اور عوام وخواص اسلام کے ان اصول وآفاقی حقائق سے متعارف ہوں جو انسانیت کی مشترکہ میراث وسرمایہ ہیں۔ ''تقریر دل پذیر'' کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس کے بعد گنہ گار، شرمسار، ہیچمداں، بندۂ خیرخواہ خلائق، سب ہندو مسلمان، نصاریٰ، یہود، مجوس آتش پرست کی خدمت میں بہ نظر خیرخواہی اپنے چند خیالات پریشاں کو جمع کر کے عرض کرتا ہے اور امیدوار ہے کہ سب صاحب اپنے تعصب مذہبی اور جی لگی باتوں کی محبت سے الگ ہو کر میری بات کو سنیں، اگر پسند آئے تو قبول کریں نہیں تو اصلاح فرمائیں۔''(۵)

اور اس کتاب میں جو اہم مباحث آئے ہیں وہ بھی عام نوعیت مگر عمومی دلچسپی کے ہیں جیسے دنیا کے لیے صانع کا ہونا ضروری ہے (ص ۲۵) وحدانیت کا ثبوت (ص ۲۹) ابطال تثلیث (۳۱) ہندوؤں کے نزدیک بھی درحقیقت خدا ایک ہی ہے(۴۵) خدا کی ذات لافانی، ابدی اور ازل ہے(۶۴) عقل کی حقیقت اور اس کے مراتب (۱۱۴) ضرورتِ نبوت (۱۷۲) صفات خداوندی لاعین ولا غیر ہیں، زمانے کی ازلیت ناممکن ہے(۳۴۴) زمانہ کیا ہے(۳۷۴) ان تمام بنیادی سوالات کے جوابات ایسے دل نشیں ودل پذیر طرز میں پیش کیے گئے ہیں جنھیں تعصبات اور تنگ نظری سے خالی دل ودماغ آسانی کے ساتھ قبول کرسکتا ہے۔

---

(۵) تقریر دل پذیر ص: ۲۴ (دیوبند ۱۴۱۷ھ/۱۹۹۶ء)

اس کتاب کے علاوہ حضرت نانوتویؒ کی دوسری کتابوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کا طرز اظہار وابلاغ معروضی (Objective) ہے یعنی کسی مسئلے پر اپنے جذبات ومحسوسات سے الگ رہ کر خالص عقلی وفکری اور منطقی انداز سے بحث کرنا اور غیر جانبدارانہ طور سے غور وفکر کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا، اسی وجہ سے نفس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے وہ خالص منطقی اور عقلی مباحث سے استدلال کرنے لگتے ہیں اور حکمت وفلسفہ کی اصطلاحوں سے کام لینے لگتے ہیں۔

ہنود ونصاریٰ کے ساتھ غیر جانبدارانہ انداز بحث کے ساتھ حضرت نانوتویؒ مسلمانوں کے مختلف فرقوں اور جماعتوں: بریلوی، اہل حدیث اور شیعوں سے بھی مناظرانہ ومخاصمانہ طرز بحث کے بجائے روادارانہ ومصالحانہ طرزِ گفتگو اپناتے ہیں جس سے ان کا یہ عندیہ ورجحان سامنے آتا ہے کہ وہ ملّی اتحاد واتفاق اور ملّی وحدت واجتماعیت کو اولین ترجیح دینا چاہتے ہیں اور امت کے شیرازہ کو حتی الامکان منتشر ہونے سے بچانا چاہتے ہیں اور اختلاف کو مخالفت ومخاصمت کا رنگ دینے سے گریز کرتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام کے قائلین کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ہم کو دیکھئے باوجود توجیہات مذکورہ اور استماع تشنیعات معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست وگریباں نہیں ہوتے بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں امام اعظمؒ بھی باوجود عظمت شان امکانِ خطا سے منزہ نہیں کیا عجب ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ ہی صحیح فرماتے ہوں اور ہم ہنوز ان کے فعل کی وجہ نہ سمجھے ہوں، اس امر میں تعصب کو پسند نہیں کرتے، پر جس وقت امام علیہ الرحمۃ کی توہین سنی جاتی ہے دل جل کر خاک ہوجاتا ہے اور یوں جی میں آتا ہے کہ ان زبان درازیوں کے مقابلہ میں ہم بھی لن ترانیوں پر آجائیں اور دو چار ہم بھی سُنائیں، پر آیہ اذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما اور احادیث منع نزاع مانع ہیں۔''(٦)

شیعہ فرقہ کے جواب میں ''اجوبۂ اربعین''اور''ھدیۃ الشیعۃ''میں بھی مناظرانہ ومعاندانہ طرز بحث سے بچتے ہوئے عالمانہ اور بے تعصّبانہ انداز استدلال اپنایا گیا ہے۔ اور آیات وروایات سے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے اور طنز وتعریض سے بڑی حد تک گریز کیا گیا ہے۔

---

(٦) الدلیل المحکم علی قرأۃ الفاتحۃ للمؤتم ص:١٧ (دیوبند، غیر مؤرخ)

مولانا مناظر احسن گیلانی حضرت نانوتویؒ کی کتاب ''هدية الشيعه'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تصنیفی سلسلہ میں تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ سید الامام الکبیر کی کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم کتاب آپ کی وہی ہے جس میں انتہائی دل سوزیوں کے ساتھ شیعوں کی غلط فہمیوں کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے''(۷)

اسی طرح بریلویت اور اہل بدعت کے خلاف بھی حضرت نانوتویؒ مناظرانہ ومخاصمانہ رویہ کے بجائے معقول ومعتدل رویہ اپنانا چاہتے تھے اور ہر نئی بات کو بدعت اور ہر بدعتی کو کافر ومشرک قرار دینے کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، اس سلسلے میں ان کا بیان ہے کہ ''عقائد کے تغیر وتبدل کو ہم راس البدعات کہتے ہیں اور قواعد کلیہ کے تغیر وتبدل کو ہم بدعت کبریٰ قرار دیتے ہیں...اعمال جزئیہ کی کمی بیشی کو ہم 'بدعت صغریٰ' کہتے ہیں.... بالجملہ ہم تغیر وتبدل عقائد کو جیسے شیعہ وخوارج ومعتزلہ نے کیا 'راس البدعات' اور قواعد کلیہ کو مثل ایجاد تعزیہ وماتم داری کو بدعت کبریٰ اور کمی بیشی صدر جزئیہ کو بدعت صغریٰ کہتے ہیں۔ برائی کی کمی وزیادتی بدعات میں بقدر چھوٹائی و بڑائی بدعات کے سمجھتے ہیں...وہ بدعتیں جن کو کبریٰ کہیے بیشتر فرقہائے باطلہ مثل شیعہ وخوارج میں پائے جاتے ہیں اور کمتر بعض جماعات اہل سنت میں نظر آتے ہیں''۔(۸)

عقلی ومتکلمانہ طریقۂ کار

عالم اسلام میں مغربی طرز فکر کے غلبے سے پہلے یونانی منطق وفلسفہ کے اسالیب ہی میں علمی وفکری موضوعات پیش کیے جاتے تھے جو صدیوں تک عصری وعلمی اسالیب بیان سمجھے جاتے تھے، اور اسی لیے اسلامی نصاب تعلیم میں یونانی معقولات داخل نصاب رہیں، دارالعلوم دیوبند کے قیام کے وقت بھی ضرورتِ وقت کے تحت انہیں شامل نصاب کیا گیا، اور حالات کے تقاضے کے پیش نظر انگریزی اور ہندی کے لیے بھی آمادگی اور پسندیدگی ظاہر کی گئی ہندستان میں عہد مغلیہ سے معقولات کا رواج کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا اور میر سید شریف، محقق طوسی، میر زاہد، اور تفتازانی کی کتابوں پر شرح یا

(۷) سوانح قاسمی از مولانا گیلانی ۶۴/۲ (دیوبند، ۱۳۹۵ھ)

(۸) سوانح قاسمی از مولانا گیلانی ۴۶/۲ بحوالۂ فیوض قاسمیہ

حاشیہ نگاری فضیلت علمی کی معراج سمجھی جاتی تھی، اس کے اثر سے ہندستان میں علوم عقلیہ کے متعدد دبستاں قائم ہوگئے تھے اور خیرآباد، جونپور، عظیم آباد، الہ آباد، فرنگی محل اور رامپور ان کے بڑے مراکز سمجھے جاتے تھے جن کے منطقی وفلسفیانہ طرز فکر کے نتیجے میں معقولی طرز عصری وعلمی اسلوب بن گیا تھا جس کی رعایت اور جس سے مطابقت ضروری تھی اور ویسے بھی عقلی وفکری مباحث کے لیے منطقی وفلسفی انداز بحث ضروری ہوتا ہے، پھر آریہ سماج وعیسائیت کے اعتراضات بھی عقلی انداز کے تھے اس لیے انہیں عقلی سکّوں میں ادائیگی ناگزیر تھی اور **کلموا الناس علی قدر عقولھم** کا تقاضا بھی۔ اسی وجہ سے حضرت نانوتویؒ نے مولانا برکات احمد ٹونکی کو دعا دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''اللہ تعالیٰ اس کو علم معقول میں کمال عطا فرمائے'' اور پھر اس کی یہ وجہ بیان فرمائی کہ:

''دین پر قائم رہنا علم معقول حاصل کیے بغیر دشوار ہے''(۹)

عصری علوم کی رعایت

حضرت نانوتویؒ کی فکر وحکمت میں ''حکمت دینیہ'' کو اپنے زمانے کی بہتر، مقبولؒ ومعقول طرز واسلوب میں پیشکش کو فطری طور سے ترجیح حاصل تھی، اسی لیے دارالعلوم سے فراغت کے بعد وہ طالبان علوم دینیہ کے لیے علوم جدیدہ کو باعث کمال سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے ۱۹ ذی قعدہ ۱۲۹۰ھ/۹ جنوری ۱۸۷۴ء کو دارالعلوم میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''اس کے بعد اگر طلبہ مدرسۂ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی (اور) زمانۂ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل سبب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے''(۱۰)

حضرتؒ کے ان خیالات وبیانات کو دیکھتے ہوئے یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ آج کے زمانے میں جدید مغربی علوم اور سائنس وفلسفہ سے استفادہ اور حکمت وعلوم دینیہ کو جدید اسالیب واصطلاحات میں پیشکش کو بھی اپناتے اور اس طرح جدید علم کلام کا ایک مکتب فکر قائم کردیتے۔

یورپی اقتدار، سائنس ومادہ پرستی اور نیچر پر غیر معمولی زور کو دیکھتے ہوئے حضرت نانوتویؒ

---

(۹) سوانح قاسمی ۲/۲۹۸

(۱۰) سوانح قاسمی ۲/۲۸۳

نے وجود باری، اور اسلام کے اصول ومبادی میں توحید ورسالت اور آخرت کے عقلی دلائل سے زیادہ تر بحث کی جو اس وقت کے اسلامی علم کلام کے لیے ضروری وناگزیر تھے۔

تقاضائے وقت کے تحت حضرت شاہ ولی اللہؒ اور حضرت نانوتویؒ نے جو عقلی ومنطقی اور فلسفیانہ وحکیمانہ طرز واسلوب اپنایا اس کی توجیہ کرتے ہوئے حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحب نے بالہام خداوندی بھانپ لیا تھا کہ اب دین کو محض نقل وروایت سے عقیدت مندانہ سمجھنے کا زمانہ نہیں رہا، عقلی مطالبوں اور حجت طلبیوں کا دور شروع ہوگیا ہے، حقیقت شناسی، حق طلبی اور اعتقادی روایات پر ایمانی پختگی سست پڑگئی ہے اور عقل پرستی غالب آتی جارہی ہے تا آنکہ لوگ مغیبات کو بھی عقل ہی کی ترازو میں تولنے کی فکر میں لگ گئے ہیں، اس لئے جب تک منقول دین کو معقول کا لباس پہنا کر پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک اس دور کی عقل پرست طبیعتیں مطمئن نہ ہوں گی اور اسے ان ھذا الا اساطیر الأولین کہہ کرنا قابل التفات ٹھہرادیں گی اور دین سے محروم ہوجائیں گی اس لیے شاہ صاحبؒ نے بالہام خداوندی اس جامع منقول ومعقول مکتب فکر کے ذریعے دین پہنچانے کا فیصلہ فرمایا تا کہ پورا دین جیسے نقل وروایت کے لحاظ سے کامل ہے اسی طرح عقل ودرایت کی رو سے بھی کامل ہی نمایاں ہو اور کسی بھی عقل پرست یا درایت دوست انسان کے لیے ناقابل التفات نہ ہونے پائے اس لیے یہ نادر روزگار کتاب حجۃ اللہ البالغہ خاص اس موضوع پر تصنیف فرمائی''(۱۱)

حضرت نانوتویؒ کے زمانے تک زمانے کی تعقل پسندی کے ایسے ہی رجحانات باقی تھے بلکہ ان میں کچھ اور اضافہ ہی ہوگیا تھا اس لیے حضرت نانوتویؒ کو بھی افہام وتفہیم دین کا ولی اللٰہی انداز کچھ تھوڑے سے فرق سے اپنانا پڑا، حضرت مولانا محمد طیب صاحبؒ اس سلسلے میں مزید تحریر فرماتے ہیں:

''اس ولی اللٰہی خاندان کی پانچویں علمی پشت میں ایک فرد اٹھا جس نے اس مذکورہ نہج پر دین ومذہب دینی عقائد اور دینی اصول وکلیات کو اسی الہام ربانی کی تحریک سے ابتداء ہی قرآن وحدیث یا مذہب وملت کا نام لیے بغیر حقائق قرآن وحدیث کو ایسے استدلالی اور منطقی طرز بیان سے

(۱۱) تاریخ دارالعلوم از سید محبوب رضوی ۱؍۱۴۲ (دیوبند ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء)

زمانہ کے سامنے پیش کیا جیسے وہ اس زمانہ کے حسب حال ایک مضبوط اور مستحکم ازم پیش کر رہا ہے، جس کا ظاہری عنوان ابتداءً نہ اعلان مذہب ہے نہ اطلاع غیب مگر انتہاءً وہی مذہب اور عقیدہ غیب ہے مگر اس ڈھنگ سے کہ جیسے وہ خالص ایک فلسفیانہ ازم کی تلقین ہے کہ اس کے مانے بغیر نہ اس دور کی معاشرت صحیح اسلوب سے چل سکتی ہے نہ سیاست و مدنیت اور نہ ہی مابعد الموت کی زندگی استوار اور کامیاب ہو سکتی ہے اس لیے اس نے ایک نئے حسیاتی فلسفہ وحکمت کی بنیاد ڈالی ہم اسی شخصیت کو حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے نام سے یاد کرتے ہیں"۔ (۱۲)

☆......☆......☆

(۱۲) تاریخ دار العلوم از سید محبوب رضوی ۱/۲۱

مولانا ندیم الواجدی*

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
کی فکری بصیرت اور دورِ حاضر میں اس کی معنویت

دارالعلوم دیوبند کا نام آتا ہے تو اس کے بانی حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتویؒ کی عہد ساز شخصیت اور ان کے لازوال کارناموں کا ذکر ضرور آتا ہے، اسلامی تاریخ کے دامن میں بے شمار شخصیتیں محوخواب ہیں جنھوں نے اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تہذیب وتمدن کے لئے اپنی بیش بہا خدمات کے خوب صورت نگینوں سے تاریخ کے صفحات کو زینت بخشی ہے، لیکن ایسی شخصیات بہت کم ہیں جنھوں نے اپنی فکری بصیرت سے تاریخ کو ایک نئی سمت عطا کی اور جن کی عملی جدوجہد نے آنے والی صدیوں تک اپنا دائرہ وسیع کیا، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کا شمار ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالی نے انھیں برصغیر کے پریشان حال، مظلوم اور مایوس مسلمانوں کا مسیحا بنا کر پیدا کیا اور یہ حقیقت ہے کہ اگر آج برصغیر ہند و پاک و بنگلہ دیش کے آسمان پر اسلام کا آفتاب روشن ہے اور اپنی کرنوں سے سارے عالم کو منور کر رہا ہے تو یہ حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت اور ان کی عملی جدوجہد کا فیضان ہے، آج اللہ نے دارالعلوم کے فیض کو صرف ایشیا ہی نہیں بلکہ افریقہ یورپ اور امریکہ تک عام کردیا ہے، دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں دارالعلوم دیوبند کا فیض یافتہ موجود نہ ہو اور جو اپنے علم کے نور سے اُجالے نہ پھیلا رہا ہو۔

آیئے حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت، عملی جدوجہد اور دور حاضر میں اس کی اہمیت اور معنویت کا ذرا تفصیل سے جائزہ لیں:

حضرت نانوتوی کا عہد اور تعلیم

حضرت نانوتویؒ کی پیدائش ۱۸۳۲ء میں ہوئی، آپ نے جس وقت ہوش سنبھالا سلطنت مغلیہ کا زوال مکمل ہو چکا تھا، مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا، ان کی اخلاقی اور روحانی حالت

* دارالکتاب دیوبند (یوپی)

ناقابل بیان حد تک روبہ زوال تھی، ان کے عقائد درہم برہم ہو رہے تھے، جاہلانہ رسوم ان کی معاشرتی اور تمدنی زندگی میں دور تک سرایت کر چکی تھیں، اسلامی مدارس برائے نام باقی رہ گئے تھے، امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے علوم نبویہ کی جو شمع دہلی کے ایک مدرسے میں روشن کی تھی وہ آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جا رہی تھی، حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے فتویٰ جہاد کا اثر ختم ہو چکا تھا، حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اصلاح بالاکوٹ کے میدان میں دم توڑ چکی تھی، ہر طرف مایوسی کے گھنے بادل تھے، اور روشنی کی کوئی کرن نظر نہ آتی تھی۔

حضرت نانوتویؒ نے ایسے ہی مایوس کن حالات میں اپنی تعلیم کا آغاز کیا، دہلی میں حضرت مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے منطق، فلسفہ، کلام وغیرہ فنون کی کتابیں پڑھیں اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی درسگاہ حدیث میں حاضر ہوئے اور حضرت شاہ عبدالغنی دہلوی مجددیؒ سے حدیث کی مشہور و متداول کتابوں کی سند حاصل کی۔ ۱۷ رسال کی عمر میں علوم نقلیہ وعقلیہ میں مہارت حاصل کرنے کے بعد ذریعۂ معاش کے طور پر مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا مشغلہ اختیار کیا، اسی دوران بخاری شریف کے آخری چھ پاروں کے حواشی بھی تحریر کئے، یہ ۱۸۵۲ء کا زمانہ ہے، اور اس وقت حضرت نانوتویؒ کی عمر زیادہ سے زیادہ اکیس برس تھی۔

۱۸۵۷ء کے جہاد میں شرکت

دہلی میں قیام کے دوران حضرت نانوتویؒ اپنے وطن نانوتہ تشریف لاتے رہتے تھے، ایک مرتبہ وطن آئے ہوئے تھے کہ انھیں میرٹھ میں فوجی بغاوت کی اطلاع ملی، اس بغاوت کا سبب چربی لگے کارتوس تھے۔ ہندو فوجی اس لئے ناراض تھے کہ عیسائی حکومت انہیں گائے کی چربی لگے ہوئے کارتوس دے رہی ہے، مسلمان فوجی اس لئے برہم تھے کہ ان کو جو کارتوس فراہم کئے جا رہے ہیں وہ خنزیر کی چربی سے آلودہ ہیں۔ ہندو اور مسلمان دونوں یہ سوچ رہے تھے کہ اس طرح عیسائی حکومت دونوں قوموں کا مذہب اور عقیدہ خراب کر رہی ہے۔ یہ افواہ کیا پھیلی، فوجی بیرکوں میں بغاوت پھیل گئی، ہندو اور مسلمان فوجیوں نے اپنے افسران کے خلاف بندوقیں اٹھا لیں اور چھاؤنی کے ایک ایک افسر کو چن چن کر قتل کر ڈالا، یہ مئی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔ فوجیوں کی بغاوت کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے ملک میں پھیل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر جگہ بغاوت کے شعلے بھڑک اٹھے، مغربی یوپی کے اکثر

شہر اس کی لپیٹ میں آ گئے، تھانہ بھون جہاں حضرت نانوتویؒ کے پیرومرشد حاجی امداد اللہ مقیم تھے انگریزوں کے خلاف جہاد کا مرکز بن گیا۔

علماء کی ایک بڑی جماعت جس میں حضرت نانوتویؒ پیش پیش تھے مسلمان مجاہدین کی قیادت کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی، سب سے پہلے انھوں نے اپنے مربی اور مرشد حضرت حاجی امداد اللہ سے مشورہ کیا اور درخواست کی کہ جس طرح آپ دینی معاملات میں ہمارے سربراہ ہیں اسی طرح دنیاوی معاملات میں بھی ہماری سربراہی فرمائیں۔ اور امیر المؤمنین کا منصب قبول فرمائیں۔ (۱) چنانچہ تھانہ بھون میں باقاعدہ اسلامی حکومت قائم کی گئی جس کا سپہ سالار حضرت نانوتویؒ کو مقرر کیا گیا اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو قاضی بنایا گیا (۲) حضرت حاجی امداد اللہؒ نے نظم مملکت کے قیام اور انگریزوں کے خلاف جہاد کے انتظام کے لئے جو شوریٰ تشکیل دی اس میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے علاوہ حضرت مولانا حافظ محمد ضامن اور حضرت مولانا محمد منیر نانوتویؒ بھی شامل تھے، اپنے وقت کے ان سربرآوردہ اور غیور علماء کی قیادت میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی لڑی گئی، شاملی کے میدان نے یہ نظارہ دیکھا کہ علماء صرف قلم ہی نہیں چلاتے بلکہ تلوار اور بندوق بھی چلا سکتے ہیں، اس شدید معرکہ آرائی کے دوران انگریز فوجوں سے توپخانہ چھین لیا گیا۔ حضرت مولانا حافظ ضامن اس جنگ میں شہید ہوئے اور مولانا قاسم نانوتویؒ گولی سے زخمی ہوئے۔ (۳) اسی دوران سقوط دہلی کی اطلاع ملی، مجبوراً ان مجاہدین کو بھی ہتھیار ڈالنے پڑے، شاملی کے جہاد کی وجہ سے تھانہ بھون انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنا، انھوں نے اس قصبے کو تباہ و برباد کر ڈالا۔ (۴)

وہ علماء بھی انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے جو اس جہاد میں شریک تھے، چنانچہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوئے اور مخبرین کے لئے گراں قدر انعامات کا اعلان کیا گیا۔ (۵) حضرت حاجی امداد اللہ نہایت خاموشی کے ساتھ انجان اور غیر مانوس راستوں سے ہوتے ہوئے مہینوں کی مسافت

---

(۱) تذکرۃ الرشید ج ۱ ص: ۷۴ (۲) نقش حیات ص: ۴۳ (۳) موج کوثر ص: ۱۹۶ (۴) علماء ہند کا شاندار ماضی ج۴ ص: ۲۸۱ (۵) تذکرۃ الرشید ج ۱ ص: ۷۷

طے کرنے کے بعد مکہ مکرمہ پہنچے (٦) حضرت گنگوہی کو گرفتار کر کے پہلے سہارنپور پھر مظفر نگر جیل میں قید رکھا گیا (۷) آپ کے خلاف مقدمہ بھی چلا، حکام کی کوشش یہ تھی کہ ان کو پھانسی دے دی جائے، مگر خدا کے فضل و کرم سے کوئی کاغذی ثبوت ہاتھ نہ لگ سکا۔ اس لئے مجبوراً رہائی کے آرڈر ہوئے۔ (۸)

حضرت نانوتویؒ اپنے کمال شجاعت، بہادری اور ہمت کے باعث ہر قسم کے خطرات، ڈر اور خوف سے بے نیاز ہو کر کھلے عام پھرتے رہے، لیکن جب انگریزوں نے تلاش میں شدت اختیار کی تو اعزہ و اقارب کے پیہم اصرار پر آپ کو روپوش ہونا پڑا، اس طرح انھوں نے تین دن مسجد چھتہ میں گزارے، لیکن تین دن مکمل ہوتے ہی مسجد سے باہر آگئے اور فرمایا کہ روپوشی کی سنت پوری ہوگئی، اب میں زیادہ دن چھپ کر نہیں رہ سکتا۔ (۹) استخلاص وطن کے لئے جدوجہد اور قربانی کی راہ میں علماء دیوبند نے جو سختیاں برداشت کیں اور اذیتیں جھیلیں اس مختصر تحریر میں ان کا احاطہ مشکل ہے، حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست نے مسلمانوں کو اس درجہ مایوس اور کمزور کر دیا تھا کہ وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہو کر تن بہ تقدیر بیٹھ گئے تھے (۱۰) اگر علمائے دیوبند بھی تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھ رہتے تو بہت ممکن تھا کہ یہاں صرف نام کے مسلمان رہ جاتے اور اسلام رخصت ہو جاتا۔

۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد

۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد انگریزوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کو زبردست نقصان پہنچایا، دہلی، آگرہ لاہور، ملتان، لکھنؤ خیرآباد، بنگال، مدراس اور بہار وغیرہ کے ہزاروں مدارس ہندوستان کے سلاطین اور امراء کی وقف کردہ جائدادوں سے چل رہے تھے، مسلمانوں کی تعلیم کا دار و مدار ان ہی جائدادوں پر تھا۔ ۱۸۸۳ء میں ایسٹ کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو بحق سرکار ضبط کرلیا، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے بہ قول ''مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۸ سال کی لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے۔ (۱۱)

دوسری جگہ وہ صاف لفظوں میں اوقاف کی تباہی کا اعتراف کرتا ہے، مسلمانوں کے اس الزام کا جواب نہیں دیا جاسکتا کہ ہم نے ان کے تعلیمی اوقاف کا ناجائز استعمال کیا، اس حقیقت کو

(٦) علمائے ہند کا شاندار ماضی ج ۴ ص ۲۹۳ (۷) سوانح قاسمی ج ۲ ص: ۲۰۱ (۸) ایسٹ انڈیا کمپنی کے باغی علماء ص ۱۲۵ (۹) سوانح قاسمی ج ۲ ص ۱۷۲ (۱۰) علماء حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ج ۱ ص: ۴۹ (۱۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان ص: ۲۰۰

چھپانے سے کیا فائدہ؟ اگر ہم اس جائداد کو جو صرف اسی مصرف کے لئے ہمارے قبضے میں دی گئی تھی ٹھیک ٹھیک استعمال کرتے تو بنگال میں آج بھی ان کے پاس اعلا اور شاندار ادارے موجود ہوتے (۱۲) اس زمانے کی تعلیمی حالت کا اندازہ گاندھی جی کی اس تقریر سے بھی لگایا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے کہا تھا ''برٹش گورنمنٹ سے قبل ملک میں ۳۰ ہزار ادارے تھے جن میں دو لاکھ طلباء تعلیم پاتے تھے آج حکومت دفتری بمشکل چھ ہزار مدرسوں کا حوالہ دے سکتی ہے (۱۳) ایک طرف مسلمانوں کی مذہبی تعلیم پر کاری ضرب لگائی گئی اور مدارس کے سلسلے کو مٹا کر رکھ دیا گیا دوسری طرف ملک میں ایسی تعلیم رائج کی گئی جو اپنے نتائج کے اعتبار سے اسلام اور مسلمانوں کے لئے سخت نقصان دہ تھی، سرکاری تعلیم گاہیں دراصل وہ کارخانے تھے جہاں سے مسلمان بچے الحاد اور لادینیت کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکلتے تھے، لارڈ ولیم بنٹنک (۱۸۲۸ء/۱۸۳۰ء) کے عہد حکومت میں جب وسیع پیمانے پر سرکاری مدارس قائم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تو شروع میں انگریزوں کا خیال تھا کہ یہ تعلیم مشرقی زبانوں میں ہونی چاہیے، لیکن انگریزوں کے انتہا پسند طبقوں نے جن میں پادری بھی شامل تھے اس کی مخالفت کی اور انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دینے پر زور دیا ان کا یہ مطالبہ منظور کیا گیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستان کے مسلمان اور ہندو عیسائیت سے قریب تر ہونے لگے، فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی نے یہ بات تسلیم کرتے ہوئے اپنے خطبات میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> ''ہندوستان میں یورپین علوم کا جس قدر چرچا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر وہ ہماری تہذیب و تمدن اور ہمارے اصول مذہبی سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں۔ (۱۴)

انڈیا کی سپریم کونسل کے ایک اہم رکن سر چارلس نے جو گورنر کے اہم منصب پر فائز تھے ایک مرتبہ کہا کہ: ''میں یہ امیدیں قائم کئے ہوئے تھا کہ جس طرح ہمارے لوگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی ایک ساتھ عیسائی ہو جائیں گے'' (۱۵) برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر مینگلس نے ۱۸۵۷ء میں دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

---

(۱۲) حوالہ سابق ص: ۲۰۷ (۱۳) اخبار مسافر آگرہ ۳؍دسمبر ۱۹۲۰ء (۱۴) ترجمہ خطبات گارساں دتاسی از ڈاکٹر حمید اللہ ص: ۳۷۸۔
(۱۵) مسلمانوں کا روشن مستقبل ص: ۱۴۳

''ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہیے''۔(۱۶)

انگریز سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمان قرآن کریم پڑھتے رہیں گے اور جب تک وہ شریعت کے اس سرچشمے سے سیراب ہوتے رہیں گے اس وقت تک انگریز ملک پر پوری طرح غالب نہیں آسکتے، چنانچہ برطانیہ کے ایک سابق وزیراعظم گیڈ اسٹون نے مجمع عام میں قرآن کریم کو ہاتھ میں لے کر کہا کہ:

''جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہوسکتی''۔(۱۷)

انگریز یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمان قرآن کریم پر مکمل یقین رکھتے ہیں اور جب تک وہ اس کتاب سے وابستہ رہیں گے کسی انگریز حکومت کے وفادار نہیں ہوسکتے، چنانچہ ہنری طامس کہتا ہے کہ:

''مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو اچھی رعایا نہیں ہوسکتے اس لئے کہ قرآنی احکام کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں ہے''۔(۱۸)

لارڈ میکالے نے اپنے عزائم مخفی نہیں رکھے اور صاف صاف لفظوں میں یہ اعلان کیا کہ:

''ہماری تعلیم کا مقصد ایسے نوجوان پیدا کرنا ہے جو رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں اور دل و دماغ کے اعتبار سے فرنگی''۔(۱۹)

اسلامی تہذیب و تمدن پر عیسائیت کے حملے

ایک طرف علما کو پھانسی کی سزا دی جارہی تھی اور ایک ایک وقت میں کئی کئی سو علما کو تختۂ دار پر چڑھایا جارہا تھا، انھیں پابند سلاسل کیا جارہا تھا یا جلاوطنی پر مجبور کیا جارہا تھا، دوسری طرف عیسائی مشنریز ملک کے طول و عرض میں اپنا جال پھیلا رہی تھیں اور کوشش کی جارہی تھی کہ ہندوستان پر عیسائیت کا جھنڈا بلند کردیا جائے اور یہ امر یقینی بنادیا جائے کہ اس ملک کا ہر شہری عیسائی ہو، اس کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے گئے، مسلمانوں کو عیسائی بننے کی صورت میں ملازمتیں دینے کا وعدہ کیا

---

(۱۶) حکومت خود اختیاری ص:۱۳۶ (۱۷) شیخ الاسلام کا خطبۂ صدارت ص ۱۵ پچاس سالہ اجلاس عام آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ (۱۸) حکومت خود اختیاری ص:۵۵ (۱۹) بحوالۂ مدینۂ بجنور ۲۸ر فروری ۱۹۲۷ء

گیا۔ جو لوگ سالہا سال کی جنگ اور بدامنی کے نتیجے میں غریبی کی سطح سے نیچے جا چکے تھے انھیں ڈیڑھ آنہ یومیہ یا ڈیڑھ سیر اناج دے کر عیسائی بننے پر مجبور کیا گیا۔ بہ قول سرسید "غریب آدمی کے لئے یہ اتنی بڑی دولت تھی کہ وہ اس کے عوض بخوشی اپنی گردن کٹوانے پر تیار ہو جاتا تھا (۲۰) جو لوگ ملازمتوں اور مال و دولت کے جھانسے میں نہیں آتے تھے ان کے لئے یہ انتظام کیا گیا کہ عیسائی پادریوں اور مبلغوں کو اسلام کے خلاف زہر اگلنے اور اپنی جارحانہ تقریروں سے مسلمانوں کی دل آزاری کرنے کی کھلی چھوٹ دی گئی، برطانیہ کی پارلیمنٹ نے طے کیا کہ ہندوستان میں اعلا مناصب پر ایسے پادریوں یا عالموں کو مقرر کیا جائے جو مناظروں سے دلچسپی رکھتے ہوں اور اپنے فرائض منصبی کے علاوہ عیسائیت کی تبلیغ بھی کر سکیں، چنانچہ گورنری اور دوسرے عہدوں پر ایسے لوگ مقرر کئے گئے جنھوں نے اسلام کے خلاف دل آزار کتابیں لکھیں، اور اپنی نگرانی و سرپرستی میں اسلام اور عیسائیت کے خلاف مناظرے کرائے، عیسائی مبلغوں کو اس حد تک چھوٹ دی گئی کہ وہ بازاروں میں، مسجدوں کے دروازوں پر، اور ایسی جگہوں پر جہاں عام مسلمان اٹھتے بیٹھتے ہوں عیسائیت کی تبلیغ کریں اور اسلام کے خلاف زہر پھیلائیں۔

بلاشبہ عیسائی مبلغین نے اپنی جدوجہد میں ہندوستانی مسلمانوں کے نامساعد حالات، جہالت، غربت، اور اقتدار سے محرومی وغیرہ کی بنا پر عیسائیت کی تبلیغ میں کامیابی حاصل کی، چنانچہ مشہور فرانسیسی مستشرق گارساں دتاسی لکھتا ہے "انگریزی مشن جو ہندوستان میں کام کر رہے ہیں انھیں خوب کامیابی مل رہی ہے، ہر روز اینگلو انڈین کلب کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، (۲۱) ایک جگہ لکھتا ہے: "ہندوستان میں تبلیغ عیسائیت کو جو کامیابی حاصل ہو رہی ہے اس میں شبہے کی گنجائش نہیں ہے، اس سے ہر عیسائی کو خوش ہونا چاہیے۔" (۲۲)

عیسائیت کے طوفان کو روکنے کے لئے
حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کا عملی اقدام

اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے اپنی زندگی کے ۳۰/۳۵ سال ایسے ہی ناگفتہ بہ اور غیر مساعد حالات میں گزارے، وہ اگرچہ ۵۷ء کی ناکامی کے بعد کچھ دن گوشہ نشین بھی

(۲۰) اسباب بغاوت ہند ص: ۴۰ (۲۱) خطبات گارساں دتاسی ترجمہ ڈاکٹر حمید اللہ ج ا ص: ۳۰۳ (۲۲) حوالۂ سابق ج ا ص: ۲۷۸

رہے، اور حج کے لئے بھی تشریف لے گئے، اور بسلسلۂ ملازمت میرٹھ میں بھی مقیم رہے، مگر عیسائیت کے پھیلتے ہوئے اثرات، ملک میں انگریزی اقتدار کے استحکام سے پیدا ہونے والے خطرات اور اندیشے ان کے دل ودماغ پر چھائے رہے۔

اس سخت اور جاں گسل صورت حال میں حضرت مولانا نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کرام کے سامنے ایک اہم سوال آیا اور یہ سوال ان کی فکری بصیرت کا امتحان تھا، سوال یہ تھا کہ جو مذہب ایک ہزار برس تک اس ملک کے ہر شعبۂ زندگی پر چھایا رہا، جس ملک کی زلف سنوارنے میں ہمارے اسلاف اور بزرگوں نے عمر بھر جدوجہد کی، جس ملک نے صدیوں اسلام اور اسلامی علوم کی خدمت انجام دی، ان میں اضافے کے لئے لاتعداد دانش گاہیں قائم کیں، دینی درسگاہیں بنائیں، کیا یہ ملک مسلمانوں کے لئے اجنبی ہو جائے؟ اس سوال نے حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کے ذہن وفکر کو متاثر کیا ۱۸۵۷ء کی شکست نے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کر دیا تھا کہ ہم اپنی آزادی فنا کر چکے ہیں اور ایک ایسی قوم کو ہم پر مسلط کر دیا گیا ہے، جو ہماری سیاست پر ہی اثر انداز نہیں ہوگی بلکہ ہمارے مذہب پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوں گے۔ ہماری تعلیم بھی متاثر ہوگی، ہمارے سوچنے کے ڈھنگ میں بھی تبدیلی ناگزیر ہے، عام ذہنوں میں یہ احساس جاگزیں ہو چکا تھا کہ ہم ایک شکست یافتہ قوم ہیں، تنزل نصیب ہیں، ہمیں اب مفتوح کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے، فاتح کی حیثیت سے نہیں، اس احساس نے وقت کا اہم سوال پیدا کیا، کیا ہم اپنے آپ کو اس قوم کے حوالے کر دیں، اپنی تہذیب، ثقافت اور تعلیم کو اس اجنبی قوم کی تہذیب، ثقافت اور تعلیم میں تحلیل کر دیں ضرورت تھی کہ کوئی مرد خدا کھڑا ہو اور اپنی فکری بصیرت سے اس سوال کا جواب ڈھونڈے اور اس مسئلے کا حل سوچے، اور اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے سامنے آئے۔

یہ ایک پیچیدہ اور الجھا ہوا سوال تھا، شکست خوردہ قوم سر اٹھانے کے قابل بھی نہ تھی چہ جائیکہ وہ کچھ سوچ سکے، یا کوئی اقدام کر سکے، ۱۸۵۷ء کی بربادی پر چند ہی سال گزرے تھے اور اس کے لرزہ خیز مناظر دیکھنے والے بہ قید حیات تھے۔

اس مسئلے کے دو حل سوچے گئے، ایک علی گڑھ میں جو زمانی اعتبار سے مؤخر ہے مگر ہم اس کو پہلے ذکر کرنا چاہتے ہیں اور دوسرا دیوبند میں، علی گڑھ میں جو حل سوچا گیا اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہم پر

ایک قوم تسلط حاصل کر چکی ہے، دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے حاکم کے علوم اور اس کی زبان سیکھیں تا کہ اجنبیت کی یہ خلیج پٹ سکے، اسی طرز فکر نے اس دانش گاہ کی بنیاد رکھوائی جسے ابتدا میں مدرسۃ العلوم کہا جاتا تھا اور آج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کہا جاتا ہے، سرسید مرحوم نے ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۸۸۶ء علی گڑھ میں فرمایا تھا:

''اس وقت ہمیں ضرورت ہے کہ جس قدر ہو سکے ایک کثیر تعداد میں ایسے نوجوانوں کو پیدا کریں جو ان علوم میں جو زمانے کی حاجتوں کے لئے ضروری ہیں سربرآوردہ ہوں''۔ (۲۳)

سرسید مرحوم برٹش گورنمنٹ کے ملازم تھے اور اس حکومت کے لئے اپنے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے، بلکہ کسی حد تک ان کی تہذیب سے متاثر بلکہ مداح بھی تھے جیسا کہ گارساں دتاسی نے اپنے ایک لکچر میں لکھا ہندوستانی مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو مسیحی مذہب کی خوبیوں کو اپنے مذہب میں سمورہی ہے، اس جماعت کے اصل لیڈر سید احمد خاں ہیں جو غازی پور میں ہیں (۲۴) اس میں شک نہیں کہ سرسید اپنی قوم کے تئیں مخلص، اور ان کی اصلاح و بقا کے لئے پُرجوش تھے، مگر وہ مذہب کے بجائے شخص کا تحفظ کرنا چاہتے تھے، ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مسلمان ایک مفتوح اور شکست خوردہ قوم ہے، اسے فاتح قوم کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیے اور اپنی وفاداری سے اس کا دل جیتنا چاہیے، ان کا خیال تھا کہ مسلمان پرانے علوم ترک کریں، نئے علوم حاصل کریں، پرانی روایات چھوڑیں، نئی تہذیب اختیار کریں، پستی سے بلندی کی سطح تک پہنچنے کے لئے اور معاشی تفوق حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جدید تعلیم حاصل کی جائے اور خود کو جدید تہذیب کے سانچے میں ڈھالا جائے، سرسید اس نقطۂ نگاہ کی تبلیغ میں اس قدر پرجوش تھے کہ انھوں نے اپنے خیالات کی تائید کے لئے قرآن و حدیث سے استدلال میں جرأت بیجا کا مظاہرہ شروع کر دیا، اس کا بہت کچھ اندازہ ان کے ان مضامین و مقالات سے ہوتا ہے جو ''تہذیب الاخلاق'' کے صفحات پر بکھرے ہوئے ہیں۔

سرسید مرحوم نے انگریزوں کے تئیں اپنی خدمات سے حکومت وقت کا جو اعتماد حاصل کر لیا تھا اس سے انھیں اپنے کام میں بڑی مدد ملی، شخصی طور پر بھی وہ اعزاز و اکرام سے نوازے گئے، یہاں تک

(۲۳) روداد ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۸۶ء علی گڑھ (۲۴) خطبات گارساں دتاسی ج ا ص: ۴۱۸

کہ ''اسباب بغاوت ہند'' لکھ کرانھوں نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی ان کی توقیر کم نہ کرسکی بلکہ انگریزوں نے اس کتاب کو ایک مخلص کے خیالات سمجھ کر بڑی اہمیت دی، اور اس سے ان کی قدر ومنزلت میں بڑا اضافہ ہوا، یہ تھا سرسیدؒ کا نظریہ جو دارالعلوم کی تاسیس کے بعد ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم کی تاسیس کا سبب بنا۔

دیوبند میں جو حل تجویز ہوا اس کا ماحصل یہ تھا کہ ہمیں حاکم وقت کی زبان اور اس کے علوم کے بجائے اپنے دینی علوم کی بقا اور تحفظ کے لئے کوشش کرنی چاہئے، یہی فکر دارالعلوم کی بنیاد کا سبب بنا، دارالعلوم کے بانیوں کا مقصد اسلام کی حفاظت کے لئے مضبوط اور مستحکم قلعوں کی تعمیر کرنا تھا تاکہ اسلام کو ہر خطرے سے بچایا جاسکے۔ اور جو چراغ ہزار برس تک اس ملک میں جلتا رہا وہ لادینیت کی تیز ہواؤں سے گل نہ ہونے پائے، قوم کے نونہال الحاد اور تشکیک کے کارخانوں میں جانے کے بجائے ان اداروں میں پلیں، بڑھیں اور پروان چڑھیں جہاں ان کو ان کے مذہب کے سانچے میں ڈھالا جاسکے۔ ان کا دل، ان کا دماغ، ان کا کردار سب کچھ اسلام کے مطابق بنایا جاسکے، حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء نے اپنی ایمانی بصیرت سے اندازہ کرلیا تھا کہ اگر ان حالات میں مسلمانوں کے دین اور ایمان کی حفاظت اور تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہ ہوا تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ کہیں مسلمان عیسائیت کے فریب میں نہ آجائیں اور خدانخواستہ ایمان کی دولت سے محروم نہ ہوجائیں، ان کی فراست ایمانی نے محسوس کرلیا تھا کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ دین کا تحفظ ہے، خواہ اس کے لئے کتنے ہی افراد کیوں نہ کام آجائیں، اور خواہ اقتصادی اور معاشی میدانوں میں کتنے ہی پیچھے کیوں نہ ہوجائیں۔

مجموعی طور پر دیوبند تحریک نے اس وقت کے مایوس کن حالات میں امیدوں کے چراغ جلائے اور اس خوفناک ماحول میں دینی جدوجہد کا آغاز کیا جس نے مسلمانوں کو توڑ کر رکھ دیا تھا اور بہت سے لوگ حالات کے ساتھ مصالحت بلکہ حالات کے آگے سر جھکانے پر زور دینے لگے تھے، دیوبند نے ان حالات کا رُخ موڑا اور ہندوستان کے مایوس ومجبور مسلمانوں کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑایا، ان کے بے جان جسموں میں عزائم کی روح پھونکی، اور اس طرح اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں پر سخت پہرے بٹھادیئے، حجاز مقدس میں جب دارالعلوم کے قیام کی اطلاع حضرت

حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کودی گئی توان کی زبان سے بے ساختہ یہ دعانکلی ''اے اللہ اس ادارے کو اسلام اور علم دین کی حفاظت کا ذریعہ بنا''۔

دارالعلوم کا قیام

اس الہامی تحریک کی ابتدا ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء کو ہوئی، یہ تحریک اپنی نوعیت اور افادیت کے لحاظ سے بالکل جداگانہ تھا، ہندوستان میں عربی مدارس اور دینی درسگاہوں کی کبھی کمی نہیں رہی، لیکن یہ مدرسہ عربی علوم وفنون کی تعلیم سے زیادہ اسلام کی اشاعت، اور اس کے تحفظ ودفاع کے لئے جدوجہد کا عظیم مرکز بن رہا تھا، ابتدا میں نہ اس کی کوئی مستقل عمارت تھی اور نہ ایسی کوئی باقاعدہ جگہ جہاں اس کا تعلیمی سلسلہ شروع ہوسکتا، ایک چھوٹی سی قدیم طرز کی مسجد تھی، جو دیوبند میں مسجد چھتہ کے نام سے مشہور ہے، یہی مسجد اس مدرسے کی سب سے پہلی عمارت تھی، درسگاہ کے نام پر انار کا ایک درخت تھا جو آج بھی موجود ہے، اسی درخت کے سائے میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہوا، ایک شاگرد اور ایک استاذ، قصبے کے ایک عالم ملا محمود نے پہلا سبق پڑھایا اور دیوبند ہی کے ایک طالب محمود حسن نے پہلا سبق پڑھا۔ بعد میں یہ طالب علم مدرسے کا شیخ الحدیث اور صدر المدرسین بنا اور شیخ الہند کہلایا۔ جن لوگوں نے اس عظیم جدوجہد کا آغاز کیا اور جن مبارک ہاتھوں سے اس عظیم ادارے کی داغ بیل ڈالی گئی ان میں حاجی سید عابد حسینؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رفیع الدین دیوبندیؒ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ، اور مولانا فضل الرحمٰن عثمانی جیسی شخصیتیں تھیں۔

دارالعلوم دیوبند کی تاسیس اور حضرت نانوتویؒ

یہ صحیح ہے کہ جس وقت ۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء کو دارالعلوم کا قیام عمل میں آیا اس وقت حضرت نانوتویؒ دیوبند میں نہیں تھے، بلکہ میرٹھ کے ایک مطبع میں بسلسلۂ ملازمت مقیم تھے، یہ بات بھی صحیح ہے کہ چندے کی تحریک اور اس کی ابتداء حضرت حاجی عابد حسینؒ نے کی اور دوسرے حاضرین نے ان کا ساتھ دیا، اور بہت جلد قصبے کے مخیّر حضرات سے ایک معقول رقم جمع کرلی گئی، جب یہ سب کچھ ہوگیا تو حضرت حاجی صاحب نے حضرت نانوتویؒ کو خط لکھا: ''کل عصر اور مغرب کے درمیان تین سو روپے جمع ہوگئے ہیں اور اب آپ تشریف لے آیئے (۲۵) حضرت نانوتویؒ نے اس پر جواب میں تحریر فرمایا:

(۲۵) سوانح قاسمی ج ۲ ص: ۲۵۰

''میں بہت خوش ہوا۔ خدا بہتر کرے، مولوی ملا محمود کو پندرہ روپۓ ماہوار مقرر کر کے بھیجتا ہوں وہ پڑھائیں گے اور میں مدرسہ مذکور کے حق میں ساعی رہوں گا۔''(۲۶) اس خط وکتابت سے پتہ چلتا ہے کہ قیام دارالعلوم کے وقت حضرت نانوتویؒ دیوبند میں نہیں تھے، اور وہ کسی مصلحت کے باعث دیوبند تشریف نہیں لاسکے۔ لیکن انھوں نے ایک صاحب اختیار شخص کی حیثیت سے مدرس کا تقرر کیا اور تنخواہ مقرر کی، ایک اور روایت سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کے خط میں یہ مضمون بھی تھا: ''وہ جو آپ کے اور ہمارے درمیان مختلف مجالس میں مذاکرات ہوا کرتے تھے کہ کوئی مدرسہ قائم ہونا چاہیے کیونکہ ایک سوال پوچھنے کے لئے آدمی کو سہارنپور بھیجنا پڑتا ہے، فقیر کے دل میں ایک دم خیال آگیا اور چندے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کل عصر ومغرب کے درمیان تین سو روپۓ ہوۓ آپ تشریف لائیۓ''(۲۷) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کا قیام محض کسی ایک شخص کی تحریک یا خیال سے دفعۃً عمل میں نہیں آیا بلکہ بہت پہلے ممکن ہے کئی سالوں سے اس سلسلے میں مذاکرات ہو رہے ہوں اور جب حضرت نانوتویؒ دیوبند تشریف لاتے ہوں تو اس موضوع پر گفتگو ہوتی ہو اور منصوبے تشکیل دیۓ جاتے ہوں۔

ویسے بھی جب ہم حضرت نانوتویؒ کو دارالعلوم دیوبند کا بانی کہتے ہیں تو ہماری مراد اس مکتب سے نہیں ہوتی جو مسجد چھتہ میں قائم ہوا تھا بلکہ اس روحؒ سے ہوتی ہے جو بلاشبہ حضرت نانوتویؒ کی پھونکی ہوئی تھی اور اس فکر سے ہوتی ہے جو حضرت نانوتویؒ نے دیوبند کے مدرسے کو عطا کیا اور یہ ایک چھوٹا سا پودا تناور درخت بنا جس کی سایہ دار شاخیں آج دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ اس مکتب کو مدرسہ اور مدرسے کو دارالعلوم اور دارالعلوم کو ایک تحریک بنا دینا یہ حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت کا کارنامہ ہے۔

حضرت نانوتویؒ نے اپنی فکری بصیرت سے یہ حقیقت سمجھ لی تھی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بقاء، اور اسلام کا تحفظ صرف مدارس اسلامیہ کے ذریعے ہی ممکن ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے دارالعلوم ہی کے طرز پر مرادآباد، امروہہ، اور گلاوٹھی وغیرہ میں عربی دینی مدارس قائم کیۓ، اس حیثیت سے اگر حضرت نانوتویؒ کو بانی مدارس ہند کہا جاۓ تو غلط نہ ہوگا۔

---

(۲۶) سوانح قاسمی ج ۲ ص: ۲۵۰ (۲۷) سوانح قاسمی ج ۲ ص: ۲۵۰، ص: ۲۹

حضرت نانوتویؒ دیوبند تشریف لائے اور مدرسے کے آغاز ہی میں تشریف لائے، جیسا کہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے ''سوانح عمری'' میں لکھا ہے کہ: ''مولوی محمد قاسم صاحب شروع مدرسہ میں دیوبند آئے اور پھر ہر طرح اس کے سرپرست ہوئے'' (۲۸) انھوں نے دیوبند آکر کوئی نیا مکتب یا نیا مدرسہ نہیں بنایا بلکہ جو مدرسہ ان کے مشورے اور رائے سے قائم ہوا تھا اسی کو خلوص اور للّٰہیت کے جذبے سے ایک عظیم الشان درسگاہ بنا دیا، اور اس کو ایک ایسا نظام، ایسا فکر اور طریقہ کار بخشا جس کی نظیر نہیں ملتی، انھوں نے اپنی فکری بصیرت سے دارالعلوم کو جو نظام عطا کیا تھا، اور جو اصول بخشے تھے آج ایک سو چونتیس سال گزرنے کے باوجود وہ اسی طرح تروتازہ، اسی طرح بامعنی، بامقصد اور اسی طرح مفید اور مؤثر ہے۔

حضرت نانوتویؒ نے بڑی مختصر زندگی پائی ہے، دارالعلوم ۱۸۶۶ء میں قائم ہوا اور ۱۸۸۰ء میں آپ رحلت فرما گئے، قیام دارالعلوم کے وقت حضرت نانوتویؒ کی عمر صرف ۳۴ سال تھی اور جب انتقال ہوا تو ۴۸ برس کے تھے، اس طرح آپ کو صرف ۱۴ ر سال خدمت کا موقع ملا، کسی تحریک کو بام عروج تک پہنچانے کے لئے یہ بہت معمولی مدت ہے، مگر اللہ نے چودہ سال کی اس مدت کو اس قدر وسعت بخشی اور اس میں اس قدر برکت عطا کی کہ جو کام برسوں میں بھی ممکن نہ تھا وہ بہت کم عرصہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، دارالعلوم مسلمانوں کی آبرو بن کر ابھرا، اس کی شہرت مشک کی دلآویز خوشبو کی طرح دور دور تک پھیل گئی۔ لوگ اس کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کے لئے اس طرح لپکے جس طرح بے آب وگیاہ میدان میں پیاسے مسافر پانی کی طرف لپکتے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت نے دارالعلوم کو کیا دیا؟

حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت نے دارالعلوم اور اس کے نہج پر قائم ہونے والے مدارس کو جو گراں قدر تحفہ عطا کیا ہے وہ ان کے اصول ہشتگانہ ہیں، جو دارالعلوم کی بنیاد اور اساس کہے جاسکتے ہیں، یہ اصول جو آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں بانی دارالعلوم نے نہایت غور وفکر کے بعد تجویز فرمائے اور تاریخ نے ثابت کیا کہ ایک سو چونتیس سال پہلے بھی یہ نہایت اہم، مفید، مؤثر تھے اور اس وقت بھی ان کی افادیت اور اہمیت اسی طرح برقرار ہے۔ یہ آٹھ اساسی اصول ہیں، جن کا متن تاریخ

(۲۸) ص: ۲۹

دارالعلوم دیوبند کے حوالے سے درج ہے:

(۱) ''اصل اول یہ ہے کہ تا مقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

(۲) ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

(۳) مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آ جائے گا، القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آ جائے گی تو اگر چہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے، اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہلِ مشورہ سے مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہلِ مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئے اور بقدرِ ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار متعد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا؛ ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

(۴) یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپئے توہین نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

(۵) خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

(۶) اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاءاللہ بشرطِ توجہ

الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی جیسے جا گیر یا کارخانۂ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

(۷) سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

(۸) تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے''۔ (۲۹)

عوامی رابطہ

چھٹی، ساتویں اور آٹھویں اصل میں حضرت نانوتویؒ نے مدارس اسلامیہ کو عوامی رابطے کی راہ دکھائی ہے، اور یہ بتلایا ہے کہ اہل مدارس عوام میں اپنی جڑیں جتنی گہری کریں گے اتنے ہی وہ اشاعت دین کے لئے مفید و مؤثر ثابت ہوں گے۔ حضرت نانوتوی نے مدارس چلانے کے لئے جا گیریں بنانے اور کارخانے کھڑے کرنے یا آمدنی کے یقینی ذرائع پیدا کرنے سے بھی روکا ہے۔ دراصل یہ دین کا کام ہے جس میں ایک طرح کی بے سروسامانی مطلوب ہے تاکہ فکر پیدا ہو، کیونکہ فکر سے توجہ الی اللہ پیدا ہوتی ہے، اور توجہ الی اللہ سے اخلاص پیدا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے امراء وحکام کی امداد کے بجائے عوام کے چندے پر زیادہ زور دیا ہے، عوام سمجھتے ہیں کہ یہ مدارس ان کے تعاون سے چل رہے ہیں، اس لئے وہ طبعی طور پر ان سے وابستہ ہونا چاہتے ہیں، اگر امراء وحکام مدرسے چلائیں تو عوام سے ان کا تعلق اتنا حقیقی اور پرجوش نہیں رہتا جتنا مطلوب ہے خود ذمہ داران مدارس کو بھی عوام کی اصلاح کی فکر نہیں رہتی بلکہ وہ زیادہ وقت امراء کی چاپلوسی میں گزارنا پسند کرتے ہیں جو مدارس کے مقاصد کے خلاف اور علماء کی شان استغناء کے منافی ہے، تکثیر چندہ پر حضرت نانوتوی کے اس قدر اصرار اور تاکید کا مقصد بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ مدارس کا تعلق مستحکم، مضبوط اور ہمہ جہتی ہو۔

---

(۲۹) تاریخ دارالعلوم ج ۱ ص: ۱۵۳-۱۵۴

شورائی نظام

دوسری اہم چیز جو حضرت نانوتوی کی فکری بصیرت سے دارالعلوم کو حاصل ہوئی وہ اس کا شورائی نظام ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم کا نظام جمہوری بنیادوں پر رکھا ہے، یہاں روز اول ہی سے شوریٰ قائم ہے جو مہتمم مدرسہ کو مشورے دیتی ہے۔ اور فیصلے کرتی ہے۔ اس اصول کے تحت مہتمم کو اس قدر بااختیار قرار نہیں دیا گیا کہ کسی سے مشورہ لئے بغیر خود ہی اہم اور بنیادی فیصلے کرے، بلکہ اسے یہاں تک ہدایت دی گئی ہے کہ اگر بروقت مستقل اصحاب مشورہ دستیاب نہ ہوں تو واردو صادر ذی عقل اور صاحب رائے سے مشورہ لے لے، اہل مشورہ کو بھی ہدایت دی گئی کہ وہ صرف اپنی رائے دیں، اس کی صحت پر اصرار نہ کریں۔ اصحاب شوریٰ کو چاہیے کہ وہ محض مدرسے کا مفاد ملحوظ رکھیں، اخلاص کے ساتھ مشورہ دیں، سننے والے نیک نیتی اور دردمندی سے سنیں اور قبول کریں۔

تعلیمی نظام

اصل نمبر (۴) میں مدرسین کے لئے ہم مشرب ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ مدرسے کے نظام میں خلل اور تعلیم و تربیت کے اسلوب میں اختلاف واقع نہ ہو، اصل نمبر (۵) میں اس امر پر زور دیا گیا ہے کہ مدرسہ کے اساتذہ متعینہ مدت میں مقررہ نصاب کی تکمیل کرائیں۔ اصول ہشتگانہ میں نظام تعلیم کے لئے یہی دو اصول ملتے ہیں، لیکن ہمیں حضرت نانوتویؒ کے چودہ سالہ دور کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی فکری بصیرت نے دارالعلوم کو ایک ایسا مؤثر، مضبوط اور مستحکم نظام عطا کیا ہے جس کی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔

نظام تعلیم دراصل تین چیزوں کے مجموعے کا نام ہے، اساتذہ، نصاب تعلیم اور تربیت۔ اساتذہ کے سلسلے میں حضرت نانوتویؒ کی سوچ یہ تھی کہ مدرسے میں ایسے ماہر اساتذہ رکھے جائیں جو محض کتاب خواں نہ ہوں بلکہ صاحب فن ہوں، اپنے تلامذہ کے دل و دماغ تک رسائی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ نے خود بھی اس ابتدائی مدرسے میں تعلیم دینا ضروری سمجھا جب کہ وہ اپنے ہم عصر علماء میں ایک انفرادی شان رکھتے تھے، طالب علمی کے دور ہی میں ان کی قابلیت اور علمیت کے چرچے دور دور تک پھیل گئے تھے، عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے ساتھ مناظروں نے اس شہرت میں اور اضافہ کر دیا تھا اور بخاری کے آخری چھ پاروں کے حواشی نے اہل علم

کو یہ تسلیم کر لینے پر مجبور کر دیا تھا کہ وہ نہ صرف معقولات میں درک رکھتے ہیں بلکہ ان کو حدیث اور فقہ پر بھی مکمل عبور حاصل ہے۔ اس کے باوجود حضرت نانوتویؒ نے اس درسگاہ میں جو اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں تھی مسند تدریس کو رونق بخشی اور حضرت مولانا یعقوب نانوتویؒ جیسی یگانۂ روزگار شخصیت کو بھی دارالعلوم میں تدریس کے لئے بلایا، ان حضرات کی موجودگی نے دارالعلوم کو عظمت وشہرت کی بلندیوں تک پہنچایا، اور بہت جلد یہ مدرسہ ایک ایسے کارخانے میں تبدیل ہو گیا جہاں سے مسلمان بچے اسلامی علوم وفنون کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکلنے لگے۔

نظام تعلیم کا دوسرا بنیادی پتھر نصاب تعلیم ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم کے لئے جو نصاب تعلیم مرتب کیا وہ بہ ظاہر درس نظامی کے نام سے مشہور ہے، لیکن حقیقت میں یہ صرف درس نظامی ہی نہیں ہے جس میں معقولات کی کثرت تھی، اور اس زمانے میں معقولی ہونا ہی علم کی معراج تھی بلکہ دارالعلوم کے نصاب میں درس نظامی کے مفید حصوں کو شامل کیا گیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی درسگاہ کے نہج پر حدیث شریف کی تعلیم کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے، اس طرح ہندوستان میں ایک بار پھر حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ چشمے رواں ہو گئے جو زمانہ کی ستم ظریفیوں سے خشک ہو گئے تھے۔ پھر حدیث شریف کو محض روایۃً نہیں پڑھا گیا بلکہ ہندوستان کے فقہی تناظر میں اس کے ذریعے حنفی فقہ کو مؤید کیا گیا، اس طرز تعلیم نے اس قدر مقبولیت حاصل کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے دارالعلوم دیوبند ہندوستان میں حدیث شریف کی تعلیم کا سب سے بڑا مرکز بن گیا، یہی نہیں بلکہ یہاں سے فقہ حنفی کی تائید کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ حضرت علامہ کشمیریؒ کے آتے آتے اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ گیا، اور حضرت علامہ کشمیریؒ نے پورے اعتماد کے ساتھ اعلان فرمایا ''میں نے حنفیت کو اس طرح مستحکم کر دیا ہے کہ انشاء اللہ سو سال تک اس کی بنیادیں غیر متزلزل رہیں گی''۔ (۳۰)

مدارس کا اقامتی کردار

نظام تعلیم کا تیسرا اہم جزء تربیتی نظام ہے، جو محض چند گھنٹوں کی تعلیم وتدریس سے ممکن نہیں تھا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ طلباء ہمہ وقت اپنے اساتذہ کی نگرانی میں رہیں، اور انھیں ایک ایسا

(۳۰) روایت حضرت مولانا یوسف بنوریؒ بحوالہ نقش دوام ص: ۱۷۳۔

ماحول ملے جہاں وہ ہر طرح کے تفکرات سے آزاد ہوکر محض حصول علم میں مشغول ہوسکیں، اس مقصد کے لئے حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم کو اقامتی کردار عطا کیا، دارالعلوم سے پہلے ملک میں اقامتی درسگاہوں کا تصور نہیں تھا، جہاں ہمہ وقت طلباء ایک مخصوص ماحول میں پرورش پاتے ہوں اور مدرسہ ان کی ضروریات زندگی یعنی طعام، لباس اور رہائش کا متکفل ہو، دارالعلوم سے پہلے کسی ایک مدرسے میں تمام علوم وفنون کی تعلیم بھی نہیں دی جاتی تھی، بلکہ طلباء اپنی دلچسپی کے علوم وفنون کی تحصیل کے لئے مختلف اساتذۂ فن کے یہاں حاضری دیتے تھے، بسا اوقات یہ اساتذۂ فن مختلف شہروں اور قصبوں میں مقیم ہوتے تھے، اور طالب علم ایک شہر سے دوسرے شہر کا دشوار گزار فاصلہ طے کر کے اپنی علمی پیاس بجھانے پر مجبور ہوتا تھا۔

حضرت نانوتویؒ نے ایک ہی چھت کے نیچے مختلف علوم وفنون کے ماہرین جمع کر کے طلباء کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ ہر قسم کی ضرورتوں سے بے نیاز ہوکر حصول علم میں مشغول ہوں، اہل مدرسہ کے لئے لازم قرار دیا کہ وہ اپنے طلباء کی ضروریات کی فکر کریں اور ان کو ایک مکمل عالم بننے کے لئے پوری یکسوئی اور مکمل فراغت قلبی فراہم کریں۔

دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت کا شاہکار

دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتوی کی فکری بصیرت کا ایک ایسا شاہکار ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یوں تو ہر دور میں، ہر ملک میں مدارس اور جامعات قائم کئے گئے ہیں لیکن جو جاذبیت اور دلکشی علم کے اس تاج محل کو حاصل ہوئی ہے وہ کسی دوسرے ادارے کو نصیب نہ ہوسکی، بغداد کا مدرسہ نظامیہ تاریخ کا حصہ بن چکا ہے اور اپنی بعض خصوصیات کی بنا پر اسے آج بھی یاد کیا جاتا ہے، جامعہ ازہر ہزار سال گزرنے کے باوجود مصر کی سرزمین پر قائم ہے اور علوم اسلامیہ کی خدمت انجام دے رہا ہے۔ مگر یہ جامعات حکومت وقت کی سرپرستی میں قائم ہوئے، اور اسی کی مالی مدد اور تعاون سے سرگرم عمل رہے، یہ فخر وامتیاز صرف دارالعلوم کو حاصل ہے کہ وہ اپنے قیام کے روز اول ہی سے غریب مسلمانوں کے چندے سے قائم ہے، اور ایک سو چونتیس سال گزرنے کے باوجود اسی تعاون کے سہارے اپنا سفر طے کر رہا ہے۔

دارالعلوم دیوبند آج صرف ایک مدرسہ ہی نہیں ہے جہاں ایک مخصوص نصاب پڑھنے

پڑھانے پر اکتفا کیا جاتا ہو، بلکہ یہ ایک مستقل تحریک اور مدرسۂ فکر ہے۔ آج دیو بند ایک ایسی اصطلاح بن چکا ہے جس کا اطلاق صرف اسی سرزمین پر نہیں ہوتا جہاں دار العلوم قائم ہے، بلکہ دنیا میں جہاں جہاں دار العلوم کے طرز اور مسلک پر مدرسے قائم ہیں وہ سب دیو بندیت کے دائرے میں آتے ہیں، اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد خود کو دیو بندی کہلانا فخر سمجھتی ہے۔

حرف آخر

گزشتہ صفحات میں جو کچھ عرض کیا گیا اس کا خلاصہ کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شکست وریخت کے بعد مسلمانوں میں جو فکری اور دینی اضمحلال پیدا ہوا تھا حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت نے اس کے سد باب کے لئے جو طریقہ اختیار کیا وہ یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ مدارس قائم کئے جائیں۔ چنانچہ دیو بند میں مدرسے کا قیام عمل میں آیا، اور اس کے بعد متعدد جگہوں پر مدارس کی بنیاد رکھی گئی، حضرت نانوتویؒ نے نہ صرف یہ کہ جگہ جگہ مدارس قائم کئے بلکہ ان کو مؤثر، مفید اور مستحکم بنانے کے لئے ایک مخصوص نظام اور دستور العمل بھی عطا کیا۔ دار العلوم کے قیام پر ایک سو چونتیس سال گزر چکے ہیں، لیکن حضرت نانوتویؒ کا عطا کیا ہوا دستور العمل آج بھی دار العلوم دیو بند کے نہج پر چلنے والے مدارس کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا کے فضل سے ہندوستان کے مسلمان خواہ کسی بھی مکتب فکر سے وابستہ ہوں حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت سے روشنی حاصل کر رہے ہیں اور ان کے عطا کردہ زریں اصولوں کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔ ہندوستان بھر میں کشمیر سے کنیا کماری تک مدارس کا یہ سلسلہ اور ان کے بڑھتے اور پھیلتے اثرات حکومت کے لئے چیلنج بن چکے ہیں یہی وجہ ہے کہ حکومت کے ذمہ داران مدارس کو آئی ایس آئی کا اڈہ قرار دے رہے ہیں، اور کوشش کر رہے ہیں کہ مدرسے قائم کرنے والوں اور چلانے والوں کی حوصلہ شکنی ہو اور اسی طرح مدارس کے پھیلتے ہوئے اثرات کا خاتمہ کیا جا سکے۔

اگر ہندوستان میں سیکولر طاقتوں کی پسپائی اور فرقہ وارانہ ذہنیت کے عروج کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو وہ دن دور نہیں کہ حکومت مسلمانوں کے ان مضبوط قلعوں کو برباد کرنے کی اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جائے۔ آج کے مشکل حالات میں حضرت نانوتویؒ کی فکری بصیرت ہمارے لئے مشعل راہ ہے، اہل علم کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ مدرسے قائم کریں تا کہ قوم کے

نونہالانِ علم اور دین کے ساتھ اپنے رشتے مضبوط کرسکیں، ذمہ داران مدارس کو چاہئے کہ وہ عوام سے رابطے کو مزید مستحکم اور مفید بنانے کی کوشش کریں، عوام کے لئے ضروری ہے کہ وہ مدارس کے ساتھ اپنی وابستگی کو اپنی دینی حمیت اور غیرت کی آزمائش سمجھیں، اس طرح ہم سب مل کر اس ملک میں مسلمانوں کو ان کے دین سے دور کرنے کی ہر سازش کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ نے گھٹاٹوپ اندھیرے میں، شدید آندھیوں کے درمیان جو شمع روشن کی تھی اسے ہر طوفان بادوباراں سے محفوظ رکھنا ہی حضرت نانوتویؒ کے تئیں ہمارا حقیقی خراج عقیدت ہوگا۔

ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے یہ مدارس فرقہ پرست اور اسلام دشمن طاقتوں کی آنکھوں میں عرصہ سے کھٹک رہے ہیں، چنانچہ انھیں الزام واتہام کے شکنجوں میں جکڑنے کے لئے مختلف حیلے اور بہانے ڈھونڈے جارہے ہیں۔ جن کے ذریعے ان کے ذمہ داروں کو بے حوصلہ اور ان کے اثرات کو کم کیا جاسکے۔

☆......☆......☆

مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی*

نبی علیہ السلام کے لئے تکوینی اختیار اور حضرت نانوتویؒ کی آب حیات

مسلمانوں کی ایک جماعت نبی اکرم ﷺ کے بارے میں عطائی تکوینی اختیار کا عقیدہ رکھتی ہے اور وہ تکوینی دائرہ کو تشریعی دائرہ پر قیاس کر کے اس طرح کا عقیدہ قائم کرتی ہے۔

قرآن کریم نے حضورؐ کے بارے میں یہ تو فرمایا ہے کہ آپ حکمِ الٰہی کے تحت دنیا کے لئے مطاع ومقتداء بنا کر بھیجے گئے ہیں: وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ الله (النساء:۶۴)'' اور ہم نے رسول کو اس لئے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کے مطابق اس کی اطاعت کی جائے۔'' لیکن کہیں اس بات کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا کہ خدا نے حضورؐ کو اپنی اجازت اور اپنے اختیار سے عالم کون ومکان کا مالک ومختار بنا کر بھیجا ہے۔

قرآن حکیم خدا کا اصولی اور کلی قانون ہے اور نبی ﷺ اس قانون الٰہی کی جزئیات اور عملی صورتیں واضح کرنے والے ہیں۔ یہ شرح وبیان بھی ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہو کر صادر نہیں ہوتا تھا بلکہ ہدایتِ الٰہی کے تحت صادر ہوتا تھا۔ فرق یہ تھا کہ قرآن کے اصولی احکام وحی جلی کی صورت میں

پیش نظر عنوان کا تعلق بھی قرآن کریم کی ایک اہم آیت (سورہ احزاب ۶) سے ہے جس کی تفسیر حضرت نانوتویؒ نے اپنے خاص مذاق (عشق رسالت) کے مطابق کی ہے اور وہ تفسیر مولانا مرحوم کے دینی کلامی نظریات کی اہم کتاب (آب حیات) کا ایک خاص مسئلہ بن گیا اور پاکستان کے ایک سلفی عالم کو اس پر ایک مستقل تنقیدی کتاب لکھنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس کتاب کا نام ہے ''نبوت کی عجمی تعبیر''

پیش نظر مقالہ میں اس ناچیز نے اس تنقیدی کتاب کا تحقیقی جائزہ لیا ہے اور آب حیات کے اس خاص تفسیری مسئلہ کو دیوبندی مکتب فکر کے مسلمہ نظریات کی روشنی میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

* کٹرہ شیخ چاند، لال کنواں، دہلی-۶

نازل ہوتے تھے اوران اصولوں کی تشریح وحی خفی کے مطابق صادر ہوتی تھی۔ جزئیات کی تشریح وبیان میں حضورؐ کو شریعت ساز کہا جاسکتا ہے اور یہ تشریعی اختیار کی ایک صورت ہے — مجازی صورت حقیقت میں شریعت ساز خدا ہی کی ذات قرار پاتی ہے۔ حقیقی شریعت سازی کے لحاظ سے قرآن کریم نے یہ واضح کردیا ہے کہ:

مَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰیٰ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحیٰ — وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَیْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِیْلِ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْیَمِیْنِ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِیْنَ. (النجم: ۴، الحاقہ: ۴۴-۴۶)

''نبی علیہ السلام اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتے، وہ وحی الٰہی کے مطابق کہتے ہیں اور اگر وہ ہماری طرف کوئی بات غلط طور پر منسوب کردیتے تو ہم انہیں سختی سے پکڑ لیتے اوران کی شہ رگ کاٹ ڈال دیتے۔''

تشریع کے دائرہ میں یہ پابندِ وحی اختیار بھی آپ کو اس لئے عطا کیا گیا تھا کہ آپؐ کا منصب شہادتِ حق (قولی اور عملی تشریح) تھا— تکوینی معاملات سے نبی ورسول کا کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لئے تکوینیات میں نبی ورسول کے لئے کسی نوع کے اختیار کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے کہا: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ — وَلَا یُشْرِكُ فِیْ حُکْمِهٖ اَحَدًا.

حکم واختیار صرف اللہ کے لئے ہے اور اللہ تعالیٰ کسی کو اپنے اختیار میں شریک نہیں کرتا۔ (الانعام ۵۷، الکہف ۲۶) مشرکین عرب کے ''لبیک'' سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین عرب اپنے بتوں اور باطل معبودوں کے لئے عطائی ملک واختیار کا عقیدہ رکھتے تھے— مستقل بالذات اختیار کا عقیدہ نہیں: لبیك لا شریك لك لبیك الاّ شریکاً ھو لك. ''تیرا کوئی شریک نہیں۔ سوائے اس شریک کے جسے تو نے خود شریک بنالیا''

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ کا یہ عقیدہ اس وقت لوگوں کی نظروں میں ان کی کم علمی کی وجہ سے مشتبہ اور مشکوک ہوجاتا ہے جب وہ خدا کے خاص بندوں (حضرات انبیاء علیہم السلام) میں معجزانہ قوتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ حضرات انبیاء واولیاء سے غیر معمولی واقعات کا صادر ہونا ان لوگوں کو شبہ میں ڈال دیتا ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ خدا کے ان خاص بندوں کے اندر خدائی طاقت اور تکوینی اختیارات موجود ہیں اور یہ تصور کھلا شرک اور کفر ہے۔

اسلام اور ہادیٔ اسلام ﷺ سے پانچ سو برس پہلے اس گمراہی میں عیسائی قوم اس طرح گرفتار ہوئی کہ انجیل کے مصنفین نے حضرت عیسیٰ کے معجزات کو اس انداز سے بیان کیا جیسے حضرت عیسیٰ کے اندر مردوں کو زندہ کرنے اور بیماروں کو صحت مند کرنے کی ذاتی قوت و ذاتی تصرّف موجود تھا۔

موجودہ انجیلیں حضرت عیسیٰ کے دو سو برس بعد حضرت عیسیٰ کے حواریوں کے شاگردوں نے ترتیب دیں۔ ان شاگردوں نے اپنے استادوں (حوارین مسیحؑ) سے حضرت عیسیٰ کے حالات پر جو کچھ سنا اسے اپنے عقیدت مندانہ انداز میں نقل کر دیا اور عقیدت کے غلو و تشدد نے خدائی معجزہ دکھانے والے پیغمبر کو معجزہ پیدا کرنے والے خدا کے روپ و رنگ میں پیش کر دیا۔

ظاہر ہے کہ جس ہستی میں مردوں کو زندہ کرنے اور مٹی کے پرندوں کو اصلی پرندہ بنا کر اڑانے اور کل کا کھایا پیا بتانے کی قوّت ہو اس کے لئے خدائی کا عقیدہ قائم کرنا عقل کے خلاف نہیں۔ لیکن کسی معجزہ دکھانے والے نبی و رسول نے یہ کہہ کر معجزہ نہیں دکھایا کہ میرے اندر یہ حیرت انگیز تصرّف و اختیار موجود ہے بلکہ ہر ہر قدم پر اس حقیقت کا اظہار کر دیا کہ معجزہ یا کرامت نمودار کرنے کی قوت خدائے واحد کے اندر ہے۔ پیغمبروں کے ذریعہ خدائے قدیر غیر معمولی واقعات ظاہر کر کے ان کی صداقت پر دلیل دکھانا چاہتا ہے۔

خدا تعالیٰ نے اپنے آخری کلام مقدس (قرآن کریم) کی لفظی اور معنوی تنزیل و تحفظ کو اپنے ہاتھ میں رکھا اور تمام نبیوں کے معجزات کے وقوع کو واضح طور پر اپنی طرف منسوب کیا۔ اور نبی آخر الزماں ﷺ کے معاملہ میں تو اتنی احتیاط کی گئی کہ جب مخالفین کی طرف سے فرمائشی معجزات و نشانات کا مطالبہ کیا گیا تو آپؐ سے جواب دلوا دیا گیا کہ معجزہ اور نشان میرے ہاتھ میں نہیں، خدا کے قبضۂ قدرت میں ہے، میں تو صرف حق کا داعی اور مبلغ ہوں:

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ عِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ. قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا

بَشَرًا رَّسُوْلاً۔ (بنی اسرائیل: ۹۰۔۹۳)

''اور منکرین نے کہا ہم اے نبی تم پر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک ہمارے لئے زمین میں ایک چشمہ جاری نہ کردو یا تمہارے پاس ایک کھجوروں اور انگوروں کا باغ نہ ہو اور اس باغ میں تم پانی کی نہریں جاری نہ کردو یا جیسا کہ تم کہتے ہو آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہم پر نہ گرا دو یا خدا اور فرشتوں کو ہماری آنکھوں کے سامنے لاکر کھڑا نہ کردو یا تمہارے پاس سونے کا ایک محل نہ ہو یا تم آسمان پر نہ چڑھ جاؤ اور اس چڑھنے کا ہم یقین نہیں کریں گے جب تک تم آسمان سے ایک کتاب ساتھ نہ لاؤ جسے ہم پڑھ سکیں ــــ رسول اکرمؐ نے اس کے جواب میں خدا کی طرف سے کہا سبحان اللہ (بڑا تعجب ہے) میں کون ہوں صرف خدا کا ایک رسول جو انسان ہے۔''

قرآن کریم نے حیرت انگیز اور دنیا کو عاجز کردینے والے واقعات کو آیاتِ الٰہی، یعنی نشانیوں سے تعبیر کیا ہے، جو رسولوں کی صداقت کے لئے ضدی اور ہٹ دھرم لوگوں کے حق میں اتمامِ حجت کے طور پر ظاہر کی جاتی ہیں: قُلْ اِنَّمَا الْاٰیَاتُ عِنْدَ اللہ۔ (الانعام: ۱۰۹) ''کہدو! نشانیاں اللہ کے قبضہ میں ہیں''۔

قرآن کریم نے سابق قوموں کی گمراہی کے تجربہ کی روشنی میں معجزات کے بارے میں جس قدر احتیاطی اسلوب و انداز اختیار کیا، افسوس کہ آخری امت کے ایک طبقہ (مدعیان محبت) نے اس سے کوئی سبق نہ لیا اور اسی راہ سے گمراہی میں مبتلا ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کو عیسائی قوم کے حوالہ سے عقیدت و محبت کے غلو و مبالغہ سے دور رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور فرمایا تھا:

لا تطرونی کما اطرت النصاریٰ المسیح ابن مریم (حدیث) ''مسلمانو! میری تعریف میں اس طرح مبالغہ آرائی نہ کرنا جس طرح نصاریٰ نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں کی''۔ لیکن اسی کے ساتھ آپ نے ایک پیشین گوئی بھی فرمائی تھی کہ:

لترکبنّ سنن مَن کان قبلکم (مشکوٰۃ ۴۶۵ بحوالہ ترمذی) ''تم مسلمان ضرور (شرک کے کاموں میں) اگلوں کی پیروی کروگے''۔

مشرکین عرب ایک درخت (ذات انواط) کی پرستش کرتے تھے اور اس پر تلواریں لٹکا کر

اس کا طواف کرتے تھے۔ بعض مسلمانوں نے ایک سفر میں اس درخت کو دیکھ کر حضورؐ سے درخواست کی کہ ہمارے لئے بھی آپ ایسا ہی درخت مقرر کردیں اس پر حضورؐ نے بطور پیشین گوئی یہ فرمایا چنانچہ یہ طبقہ حضور ﷺ کے معجزات کو آپ کی ذاتی قوّت قرار دے کر آپ کو تکوینی اختیارات میں شریک ہونے کا عقیدہ کی تبلیغ کر رہا ہے۔

پاکستان کے ایک اہل حدیث عالم نے ''نبوت کی عجمی تعبیر'' کے نام سے ایک تحقیقی کتاب لکھی ہے، جس کا موضوع یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے لئے تکوینی اختیار کے تصوّر کی تخلیق میں دیوبندی اور بریلوی علماء دونوں شریک ہیں اور اس تصوّر کی اساس شیخ ابن عربی کے وحدت الوجودی عقیدہ پر قائم ہے۔ لیکن مصنف محقق نے اس کی نسبت پورے دیوبندی حلقہ کی طرف کرکے انصاف کا خون کیا ہے۔ کیونکہ اس تصوّر کا ماخذ دیوبندی اکابر کی کتابوں میں صرف مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی مشہور کتاب ''آبِ حیات'' نظر آتی ہے اور بریلوی علماء کی کتابوں میں مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلویؒ کی کتاب **سلطنة المصطفی فی ملکوت کل الوریٰ** بنیادی کتاب ہے جس میں خان صاحبؒ نے تمام کائنات کو حضور ﷺ کے زیرفرمان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔

دونوں کتابوں میں فرق صرف تعبیر وتوجیہہ کا ہے، مولانا نانوتوی نے علمی اور منطقی استدلال سے کام لیا ہے اور خانصاحب کے ہاں عوامی اسلوب ہے۔ مثلاً آبِ حیات میں حضورؐ کے لئے درجۂ دوم کی ملکیت کا تصوّر ہے اور خاں صاحب اسے عطائی ملکیت واختیار کہتے ہیں۔ قرین قیاس ہے کہ مولانا بریلوی کے سامنے مولانا نانوتوی کی آبِ حیات رہی ہو کیونکہ خاں صاحب کی عمر مولانا نانوتوی کی وفات کے وقت ۲۵ رسال کی تھی۔

مولانا نانوتوی کی ولادت ۱۲۴۸ھ-۱۸۳۲ء) اور وفات بعمر ۴۹ سال ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء (۱۸۸۰ء) اور مولانا بریلوی کی ولادت ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۶ء) اور وفات بعمر ۶۸ سال ۱۳۴۰ھ ۱۹۲۱ء) ہے۔

خاں صاحب نے سلطنت المصطفےٰ کتاب ۱۲۹۷ھ میں لکھی، جب آپ کی عمر ۲۵ سال تھی۔

مولانا بریلوی کے عوامی اور عامیانہ اسلوب کی ایک مثال یہ دو شعر ہیں جو خاں صاحب کے مجموعۂ کلام سے نقل کئے جاتے ہیں۔

ان کی نبوت، ان کی ابوت ہے سب کو عام
امّ البشر عروس انھی کے پسر کی ہے!
ظاہر میں میرے پھول باطن میں میرے نخل
اس گل کی یاد میں یہ صدا بوالبشر کی ہے

(حدائق بخشش)

آب حیات کے استدلال کے لئے مولانا نانوتویؒ نے حسب ذیل آیت کو اساس بنایا ہے
اَلنَّبِیُّ اَوْلیٰ بِالْمُؤمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ اَزْوَاجُه اُمَّهَاتُهم.(الاحزاب:٦)

اس کا ترجمہ دیوبندی مسلک کے مشہور رہنما مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حسب ذیل کیا ہے: ''نبیؑ مومنین کے ساتھ خود ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں''۔

اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''نفس انسانی اگر بُرا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ مومن کا بدخواہ ہوگا اور اگر اچھا ہے تب بھی وہ زندگی کی بعض مصلحتوں سے بے خبر رہتا ہے اور نبیؑ کو خدا تعالیٰ نے انسانی فلاح و خیر کا ضروری علم عطا فرمایا ہے اس لئے نبیؑ ہر حال میں امت کے خیر خواہ اور ہمدرد ہیں۔'' (بیان القرآن، جلد۹ ص ۴۷)

مفسرین میں ابن جریر طبری (وفات ۳۱۰ھ) امام فخر الدین رازی (وفات ۶۰۶ھ) علامہ ابن کثیر (وفات ۷۷۴ھ) اور صاحب روح المعانی (وفات ۱۲۷۰ھ) اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی، سب نے آیت کا یہی مفہوم بیان کیا ہے اور لفظ اولیٰ کو اُسی مفہوم میں بیان کیا کہ حضورؐ اپنی امت کے حق میں ان سے زیادہ مہربان ہیں آپؐ کی اطاعت اپنی خواہش نفس اور اپنے آباء و اجداد کی حکم برداری سے مقدم ہے۔

قاضی صاحب نے متقدمین مفسرین کی عبارتوں کا ان الفاظ میں حاصل نکالا ہے:

اولی فی نفوذ الحکم علیهم و وجوب طاعته علیهم فلا یجوز اطاعة الآباء والامهات بمعنی حریص علیکم بالمؤمنین رؤف رحیم. (مظہری جلد۷ ص:۲۰۸)

بعض قرأتوں میں وھو ابٌ لھم (نبی ان کے باپ ہیں) بھی آیا ہے اس لئے امام مجاہد نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے: کل نبی اَب لامته — ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے

کیونکہ وہ امت کا مربّی اور مشفق معلّم ہوتا ہے۔ حقیقی باپ جسمانی حیات کا کفیل ہوتا ہے اور نبی کی تربیت سے ابدی حیات حاصل ہوتی ہے۔

پس روحانی باپ ہونا حضور ﷺ کی خصوصیت نہیں، البتہ امّہات المؤمنین کا امت کی ماں ہونا خصوصیات میں سے ہے، دوسرے انبیاء کی ازواجِ مطہرات کا یہ درجہ نہیں۔ (روح المعانی، جلد ۷، ص: ۱۰۷)

ابن جریر طبری نے ابن زید کا ایک قول نقل کیا ہے جس میں نبی اور امت کے باہمی تعلق کو آقا وغلام کے تعلق سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن وہ آقائی اور غلامی احکامِ شریعت کے نفاذ واجراء کے معاملہ میں ہے نہ کہ جسمانی آقائی اور غلامی کے مفہوم میں: النبی اولی کما انت اولیٰ بعبدك ما قضیٰ فيهم من امر جاز كلما قضيت على عبدك جاز. (ابن جریر، جلد ۲۱، ص ۷۰)

علامہ ابن کثیر نے اس آیت کی تشریح میں آیت: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ (النساء: ۶۵) نقل کی ہے۔ اور یہ بتایا ہے کہ نبی کے حکم سے مراد تشریعی حکم ہے، تکوینی حکم کا یہاں کوئی مفہوم موجود نہیں ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابوہریرہ کی یہ مرفوع حدیث نقل کی ہے:

ما من مؤمن الا و انا اولى الناس به في الدنيا والآخرة اقرؤا اِن شئتم النّبي اَولیٰ...... الخ

دنیا وآخرت میں ہر مومن کے ساتھ دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں میرا تعلق زیادہ ہے۔ اگر کوئی مسلمان ترکہ چھوڑ کر مرے تو اس ترکہ کے وارث اس کے حق دار ہوں گے اور اگر کوئی مسلمان قرض دار مرے یا بچے چھوڑ کر مرے تو ان کی کفالت میں کروں گا اور اس کا قرض میں ادا کروں گا۔

ابن کثیر نے آیت مذکورہ کے چند پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

''اس میں ایک بحث یہ ہے کہ کیا حضور کو مسلمان مردوں اور عورتوں کا باپ کہنا صحیح ہے؟ حضرت عائشہؓ اسے درست نہیں سمجھتی تھیں اور امام شافعی کا صحیح قول بھی یہی ہے''۔

ایک حدیث میں آپ نے اپنے لئے والد کا لفظ استعمال کیا ہے لیکن وہ معلّم اور مربّی کے مفہوم میں ہے — فرمایا: انما انا لكم بمنزلة الوالد اعلمكم...... الخ

''میں تمہارے لئے باپ کی مانند ہوں تمہیں پیشاب پائخانہ کرنے کا طریقہ بھی سکھاتا ہوں جس طرح ماں باپ بچوں کو سکھاتے ہیں''۔

حقیقی باپ کے لفظ کی نفی قرآن کریم نے خود کی ہے، فرمایا: مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِجَالِكُمْ. (ابن کثیر جلد ۳، ص ۴۶۸) ''محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں۔''

اردو فارسی کے تمام مترجمین نے اولیٰ کا یہی مفہوم بیان کیا ہے، شاہ ولی اللہ: سزاوار تر، شاہ عبدالقادر: لگاؤ، شاہ رفیع الدین: شفقت، مولانا مودودی: مقدم، ڈپٹی نذیر احمد: زیادہ حق رکھتے ہیں۔

اولیٰ، ولایت کے ایک معنی حکومت و تسلط کے بھی ہیں، جس طرح قرب اور دوستی کے ہیں، لیکن کسی مترجم و مفسر نے اس آیت میں اولیٰ کو حاکمیت و حکومت کے مفہوم میں نہیں لیا۔

مولانا نانوتوی نے آبِ حیات میں حضور ﷺ کی ملکیت درجہ دوم اور ذاتی حیاتؐ کے فلسفہ کی بنیاد اولیٰ کے اسی لغوی مفہوم پر رکھی ہے اور پھر مولانا احمد رضا خاں صاحب نے آبِ حیات کی تاویل کی روشنی میں اس آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے:

''یہ نبی مسلمانوں کا ان کی جان سے زیادہ مالک ہے۔'' (کنزالایمان صفحہ: ۴۹۷)

تصرف کا لفظ شاہ ولی اللہؒ نے تشریحی طور پر اس طرح بڑھایا ہے: ''پیغمبر سزاوار تر است بتصرف در امور مسلمین از ذاتہائے ایشاں'' یعنی ''حضور ﷺ مسلمانوں کے معاملات میں تصرف کرنے کا حق خود ان سے زیادہ رکھتے ہیں۔''

پھر اس مفہوم کو ان کے صاحبزادے شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اس طرح واضح کرتے ہیں:

''نبی نائب ہے اللہ کا، اپنی جان و مال میں تصرف نہیں چلتا جتنا نبی کا چلتا ہے۔'' اپنی جان دہکتی آگ میں ڈالنا روا نہیں اور اگر نبی حکم دے تو فرض ہو جائے۔''

تصرف سے مراد ان حضرات کی تشریعی تصرف ہے، جو بطور نائب خدا کے حکم و ہدایت کے مطابق امت کے دینی معاملات میں جاری ہوتا ہے۔

قرآن و حدیث کے واضح نصوص اس حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں کہ رسول پاک ﷺ

ہدایت خداوندی سے بے نیاز ہو کر تشریعی امور میں دخل دینے کا اختیار نہیں رکھتے تھے۔

محدثین وفقہاء نے وضاحت کی ہے کہ جو ہدایات رسولِ پاکؐ نے ایسی جاری فرمائیں جن کا ثبوت و ماخذ کتاب اللہ میں واضح نہیں وہ ہدایات وحی خفی سے تعلق رکھتی ہیں، انہیں حضورؐ کی ذاتی ہدایات اور ذاتی احکام قرار نہیں دیا جاسکتا، اسی لئے حقیقی مفہوم میں شریعت ساز صرف خدا تعالیٰ ہی کی ذات ہے۔

شاہ ولی اللہؒ نے کتاب وسنت کے باہمی تعلق پر حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ حاصل یہ کہ حضورؐ کا تشریعی تصرّف بھی نائب خدا کے طور پر ہے، جو رسالت کا حقیقی مفہوم ہے۔ اس میں تکوینی تصرف کا کوئی تصوّر موجود نہیں ہے۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے خاص کلامی اجتہاد کی تشریح کے بعد اس حقیقت کو صاف طور پر بیان کردیا ہے کہ یہ تصوّرات جس دلیل پر مبنی ہیں وہ ایک باریک ولطیف شے ہے۔ اس لئے عام ذہن کی گرفت میں نہیں آسکتی، لکھتے ہیں:

> ''رسول اکرم ﷺ کو اہل ایمان کے اموال ونفوس میں تصرف کا حق معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ واسطہ اور وسیلہ کا تعلق ایک لطیف اور مخفی شے ہے جو اہل بصیرت کے سوا کسی پر واضح نہیں بلکہ قرآن واحادیث کے اشارات سے بھی بدشواری سمجھ میں آتا ہے۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے قانونِ شریعت کے عام قاعدہ کے مطابق آپ کے لئے نکاح ومہر اور عدل ومساوات کا فریضہ عائد کیا ہے۔''

اگر ملکیت کے اس حق کا لحاظ کیا جاتا تو عام خواتین آپؐ کے لئے مثل باندیوں کے حلال ہوتیں لیکن اس سے کم فہم لوگوں کو شہوت پرستی کی تہمت لگانے کا موقعہ مل جاتا۔'' (آبِ حیات ص ۲۰۷)

یہی وجہ ہے کہ علمائے دیوبند نے مولانا نانوتوی کے ان اجتہادی اور استنباطی تصوّرات کو عوام میں شہرت دینے سے گریز کیا اور عوام میں انہی عقائد کی تبلیغ وتشہیر کی جو عقیدہ توحید کے مطابق تھے۔

آبِ حیات کے تصوّرات

ذیل میں آبِ حیات کے تصوّرات کا خلاصہ نقل کیا جاتا ہے، یہ حضرت نانوتوی کے تفردات ہیں، جنہیں جماعتِ دیوبند کی طرف سے تسلیم کرنے کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے۔

مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند (نبیرہ مولانا محمد قاسم نانوتوی) کی بعض تحریریوں میں ان تصورات کی جھلک نظر آتی ہے اور ان کی حیثیت بھی مولانا کے ذاتی تصورات کی ہے۔

مولانا نانوتوی نے آبِ حیات میں حضورؐ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس کا حاصل یہ ہے:
اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗ اُمَّهٰتُهُمْ. (الاحزاب)
''حضور ﷺ امت کے روحانی باپ ہیں۔'' روحانی باپ کا درجہ جسمانی باپ سے زیادہ ہے، اہلِ ایمان کی ارواح حضورؐ کی روح پاک سے تخلیق کی گئی ہیں۔
حضورؐ کی حیات ذاتی ہے۔ دوسرے مومنین کی حیات عرضی ہے۔ آپؐ کی حیات قابلِ زوال نہیں، البتہ موت کے وقت یہ حیات مستور (پردہ میں) ہوگئی اور اہل ایمان کی حیاتِ زائل ہوجاتی ہے۔

جیسے سورج گہن میں سورج کی روشنی حجاب (پردہ) میں ہوجاتی ہے، زائل نہیں ہوتی، بخلاف چاند گہن کے، اس کی روشنی زائل ہوجاتی ہے — حضورؐ کی موت کی مثال جیسے چراغ پر سرپوش ڈھانپ دیا جائے اور مومنین کی مثال جیسے چراغ کو بجھا دیا جائے۔
حضور ﷺ اور مومنین کے درمیان اتحاد واشتراک اور مثلیت کا تصوّر غلط ہے۔ اگرچہ شکل وصورت واحکام جسمانی مثلاً کھانے پینے وغیرہ میں مماثل کہا جائے: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ جس طرح آفتاب اور اس کی شعاعوں میں مثلیت ذاتی نہیں بلکہ آسمان وزمین کا فرق ہے، لاکھوں عکس بھی مثل آفتاب نہیں ہوسکتے، اگرچہ صورت اور رنگ میں نور آفتاب اور اصلی آفتاب میں مشابہت ہے لیکن برابری کا خیال باطل ہے۔
ازواجِ مطہرات آپؐ کی باندیاں تھیں، ان پر حضور کا حق: ما ملکت ایمانکم سے زیادہ تھا۔ مالک کی ملک عارضی ہوتی ہے، آزاد کرنے یا فروخت کرنے سے زائل ہوجاتی ہے مگر امتیوں پر آپ کا جو حق ہے وہ کبھی زائل نہیں ہوتا کیونکہ ارواحِ مومنین حضورؐ کی روح سے پیدا کی گئی ہیں۔
حقیقی مالک تو خدا ہے لیکن دوسرے درجہ میں رسول پاک کی ملکیت کو سمجھیے، کیونکہ حضور تمام عالم کے لئے وسیلہ اور واسطہ فی العروض ہیں جیسے ہاتھ اور قلم، اصل میں حرکت ہاتھ کو لاحق ہوتی ہے، قلم

کی حرکت ہاتھ کی وجہ سے ہوتی ہے۔ پس ہر کمال میں حضور واسطہ ہیں۔ خاص کر ارواحِ مومنین کے لئے۔

آخرت میں آپ کو مقامِ وسیلہ کا دیا جانا اسی طرف اشارہ ہے: والعاقل یکفیہ الاشارۃ عجب نہیں کہ یہ روایت صحیح ہو۔

لولاکَ لما خلقتُ الافلاک ''اگر اے نبی! تم نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا'' مضمون تو اس کا صحیح ہے۔ اس لئے مومنین کی ارواح کی قدر و قیمت اور فضیلت ایک حیثیت سے عرشِ اعظم سے بھی زیادہ ہے۔ (آبِ حیات ص: ۲۲۴)

مولانا حسین احمد صاحب مدنی کے نزدیک حضور علیہ السلام کی حیات ''حیاتِ برزخی'' ہے جو حیاتِ جسمانی سے زیادہ قوی التاثیر ہے، لیکن حضرت نانوتوی کے فلسفہ کے مطابق وہ حیات حقیقی ہے یعنی جسم روحانی تعلق کے ساتھ حیات ہے۔

دیوبند کے مشہور محدث مولانا انور شاہ کشمیری کے نزدیک حیات النبیؐ کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کی روحانی توجہات امت کی طرف مبذول ہیں، اسی کا اثر ہے کہ یہ امت بحیثیت مجموعی ہدایت پر قائم ہے۔ ماہر القادری صاحب نے اسی مفہوم کو اس شعر میں بیان کیا ہے:

یہاں سب سو رہے ہیں ایک تُو بیدار ہے ساقی　　کبھی کا کاروانِ کیف و مستی لٹ چکا ہوتا

شہداء فی سبیل اللہ کی حیات کے بارے میں شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ یہ حیات بھی حیاتی اثرات واعمال کے مفہوم میں ہے، جس کی طرف قرآن کریم نے یُرزَقُونَ (وہ رزق دیئے جاتے ہیں) سے اشارہ کیا ہے۔

اوپر علامہ ابن کثیر کے حوالہ سے لکھا گیا ہے کہ ازواجِ مطہرات کے ساتھ حرمتِ نکاح کا تعلق، مقام نبوت کی عظمت وحرمت سے ہے، جو جمہور کا مسلک ہے اور آبِ حیات کے فلسفہ کے مطابق اس حرمت کا تعلق حضورؐ کی حیاتِ حقیقی سے ہے۔

ہمارے اکابرِ دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بارے میں فرمایا کرتے تھے کہ آپ پر محبت نبویؐ کا غلبہ تھا، اسی محبت کا اثر تھا کہ آپ تواضع ومسکنت کا پیکر نظر آتے تھے، آپ کے شیخ حضرت امداد اللہ مہاجر مکی آپ کو نصیحت کرتے تھے کہ مولانا قاسم صاحب! علم کے وقار کا خیال رکھو یعنی اتنی

تواضع اختیار نہ کرو کہ علم کی توہین ہونے لگے۔ مولانا نانوتوی کا لباس، ایک کھدّر کا موٹا تہبند، ایک کھادی کی نیم آستین نہ چغا، نہ عباء اور عصاء کے تکلّفات۔

آپ کے مقابلہ میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی (جو آپ کے ساتھی اور پیر بھائی بھی تھے) کی شان دوسری تھی، آپ پر اتباعِ سنّت کا رنگ غالب تھا، آپ قرآن وحدیث کے واضح نصوص کی پیروی کو ضروری سمجھتے تھے، جس میں محدّثانہ اور فقیہانہ احتیاط ہے اور عام مسلمانوں کے لئے یہی نجات کی راہ ہے۔

حضرت حاجی صاحب کے ہفت مسئلہ سے آپ نے اتفاق نہیں کیا اور جب حاجی صاحب سے کہا گیا کہ مولانا گنگوہی کو ہفت مسئلہ سے اتفاق نہیں ہے تو آپ نے فرمایا ''وہ بڑے عالم ہیں۔''

مولانا نانوتوی نے آبِ حیات میں آپ کے لئے رونقِ طریقت اور زیبِ شریعت کے الفاظ استعمال کئے ہیں، جماعتِ دیوبند کا مسلک جن اکابر کے افکار پر قائم ہے۔ مولانا گنگوہی ان میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں مولانا محمد قاسم نانوتوی عاشقِ رسول کے طور پر مشہور ہیں۔

جماعت دیوبند کے عظیم فقیہ مولانا مفتی کفایت اللہؒ صاحب سے کسی نے ایک سوال میں مختلف مصالح کے تحت بدعی افکار واعمال کی ترویج پر فتویٰ طلب کیا، مفتی صاحب نے احتیاط کی بناء پر تفصیل میں جانے کے بجائے اختصار کے طور پر لکھا: آہ! یہ سوال بہت پیچیدہ اور تفصیل طلب ہے، میں سردست اس کے جواب میں صرف ایک شعر پر اکتفاء کرتا ہوں اور وہ یہ ہے:

مپندار سعدی کہ راہِ صفا   تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰؐ

صلّی اللہ علیہ وسلّم تسلیماً کثیراً ۔۔۔ محمد کفایت اللہ کان اللہُ لہ، دہلی (کفایت المفتی جلد ۱ ص: ۱۴۹)

جماعت دیوبند میں حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ علم حدیث وفقہ اور عملی تقویٰ اور احتیاط دانش مندی میں اپنی مثال آپ سمجھے جاتے تھے۔

☆☆☆

مولانا بدرالحسن القاسمی*

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ
اور جدید علم کلام

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دین کے بنیادی عقائد: وجود باری، توحید، صفات باری، رسالت، عقیدۂ آخرت مسئلہ تقدیر، نبوت، معجزات اور فرشتوں کے وجود وغیرہ کے اثبات کے لئے استدلال کا جو انداز اختیار فرمایا ہے اور جس طرح عقلی دلائل کے ساتھ روزمرہ کے مشاہدات پر مبنی تمثیلوں کے ذریعہ خالص غیبی حقائق کو عقل و وجدان سے قریب کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں بے پناہ زور و قوت کے ساتھ ایسی جدت وندرت بھی ہے جو دوسرے متکلمین اسلام کے یہاں نہیں ملتی اور اس میں حضرت نانوتوی کا خاص امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت نانوتوی کے متفرق رسالوں اور مکتوبات میں بکھرے ہوئے دلائل کو دیکھنے کے بعد مولانا مناظر احسن گیلانی کے اس قول کی تصدیق کرنی پڑتی ہے کہ "اگر ذرا سا ان کا قالب بدل دیا جائے تو عصر حاضر کا بہترین علم کلام تیار ہو سکتا ہے"۔(۱) اور مولانا نانوتوی کے علوم و معارف کے محرم اسرار علامہ شبیر احمد عثمانی کی طرح ہمیں بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ:

> "مولانا محمد قاسم نانوتوی کی تصنیفات میں جتنا غور کر و اتنا ہی ان کی وہبی دانش مندی اور صادق البیانی کا اعتراف لازم ہے اور سب کچھ کہہ دیں تو بے جا نہیں، یہ وہ فاضل ہیں جنھوں نے علم کلام کی ایک ایسی انوکھے طرز پر بناڈالی ہے جو انشاء اللہ قیامت تک کے واسطے پتھر کی لکیر ہے اور جس پر ہمارا ناز کبھی ختم نہیں ہوتا"۔(۲)

مولانا مناظر احسن گیلانی اور ان کے استاذ علامہ شبیر احمد عثمانی دونوں کو اللہ نے مولانا محمد

(۱) دیکھئے سوانح قاسمی کی آخری جلد۔ (۲) دیکھئے رسالہ العقل والنقل

* ص.ب ۱۳، الصفات، کویت

قاسم نانوتوی کے علوم ومعارف سے مناسبت بھی دی تھی اور منطق وفلسفہ کے ساتھ تصوف وعلم کلام کی نازک اور مشکل اصطلاحات پر دسترس کے ساتھ زبان وبیان کی شیرینی اور تشریح وتعبیر کی بے پناہ قدرت بھی عطا کی تھی نیز عصر حاضر کے شکوک وشبہات اور تقاضوں پر بھی ان کی نظر تھی لیکن حضرت نانوتوی کی کتابوں کے قالب بدلنے اور عصر حاضر کے نئے علم کلام کی تدوین وترتیب کا کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا، اور اس طرح:

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اس مہم کو سر کرنے کے لئے اب نہ اس پایہ کے علماء ہیں اور نہ علمی حقائق کی عصری تعبیر وتشریح پہ قدرت رکھنے والے افراد تاہم ایک بچکانہ اور طالب علمانہ کوشش جو مدت ہوئی میں نے کی تھی اور جس کا بڑا حصہ انقلاب دار العلوم کی نذر ہو گیا اور جس کے متفرق حصے عربی زبان میں شائع شدہ بھی تھے، مثال کے لئے صرف اس کا ایک نمونہ ذیل میں اس احساس کے ساتھ پیش خدمت ہے کہ یہ ایک ایسا قرض ہے جو قاسمی برادری پر مسلسل چلا آ رہا ہے، اس لئے کچھ لوگوں کو اس کام کے لئے میدان میں آنا چاہیے۔

اس کام کے لئے اب جو خاکہ میرے سامنے ہے وہ یہ کہ ان دلائل کو عام فہم بنانے کے ساتھ جدید علمی تحقیقات سے ان کو اس طرح مربوط کر دیا جائے کہ نیا طبقہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکے، حضرت نانوتوی کی کتابوں سے دور رہ کر یہ کام انجام نہیں پا سکتا، ممکن ہے مولانا محمد قاسم نانوتوی سیمینار میں پیش کئے جانے والے مقالات میں شاید اس پہلو پر زور دیا گیا ہو اور مستقبل میں اس کی راہ کھلے، ذیل کے مضمون میں ایک محض نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر حضرت نانوتوی کی مختلف کتابوں کو سامنے رکھ کر کسی ایک موضوع سے متعلق ان کے پیش کردہ دلائل اکٹھا کر کے اپنی زبان میں پیش کیا جائے تو اس سے دینی عقائد کو نئے انداز پر سمجھنے کی راہ کس طرح ہموار کی جا سکتی ہے اور وہ متخیل جدید علم کلام کس طرح وجود میں آ سکتا ہے جو ایک طرف قاسمی طریق استدلال پر مبنی ہو اور دوسری طرف جدید عصری اور علمی مؤیدات کو بھی اس میں نظر انداز نہ کیا گیا ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ محض ایک کوشش ہے اور ایک ایسے شخص کی طرف سے جس کی علمی سرحدیں کشادہ نہیں ہیں اور جس کے سامنے اس وقت حضرت نانوتوی کی تصنیفات بھی نہیں ہیں تاہم جو دلائل یہاں جمع کئے گئے ہیں وہ کسی ایک کتاب سے نہیں بلکہ حضرت نانوتوی نے "تقریر دل پذیر"، "حجۃ الاسلام"،

''مباحثہ شاہ جہاں پور''، ''گفتگوئے مذہبی'' اور ''قبلہ نما'' وغیرہ میں جو باتیں متفرق طور پر وجود باری سے متعلق کی ہیں ان کو ایک ترتیب وتسلسل کے ساتھ حضرت نانوتوی کے الفاظ کی پابندی کے بغیر اکٹھا کر دیا گیا ہے اور اس پر بقدر ضرورت ہی اپنی طرف سے حاشیہ آرائی کی گئی ہے، واضح رہے کہ حضرت نانوتوی کے دلائل لئے گئے ہیں، الفاظ کی پابندی نہیں کی گئی ہے اور حاشیہ کی توضیحات میری طرف سے ہیں ان سے حضرت نانوتوی کا کوئی تعلق نہیں اس لئے غلطیوں کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہی ہوگی۔

وجود باری کا مسئلہ دنیا کے تمام ہی عقلاء اور فلاسفروں کے یہاں بنیادی اہمیت کا حامل مسئلہ ہے، حضرت نانوتوی نے اس اہم مسئلہ کو عقلی انداز پر ثابت کرنے کی جس طرح کوشش کی ہے اس کا حاصل یہ ہے:

پہلی دلیل: مصنوع سے صانع کے وجود پر استدلال

۱- دنیا کے تمام عقلا کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر بنی ہوئی چیز کے لئے کوئی بنانے والا، ہر نو پید چیز کو وجود بخشنے والا، ہر حرکت کے پیچھے کوئی محرک اور ہر نظام کے لئے کوئی منظم اور کارکن ہوا کرتا ہے۔

جب ہم کوئی گھر یا عمارت یا بلند منارہ دیکھتے ہیں تو بغیر کسی تردد اور خاص غور وفکر کے یہ باور کر لیتے ہیں کہ اس کا کوئی بنانے والا اور صانع ہے، یہ کسی کی کاریگری اور صناعی کے بغیر از خود وجود میں نہیں آ گیا، روئے زمین پر کوئی چھوٹا سا مکان بھی ایسا نہیں ہے جو بغیر کسی بنانے والے کے وجود میں آ گیا ہو معمولی سی گھڑی جس سے ہم وقت معلوم کرتے ہیں اس کے بارے میں بھی ہم ایک منٹ کے لئے یہ تصور نہیں کر سکتے کہ بغیر پیچیدہ اور باریک میکانیکی عمل کے وجود میں آ گئی ہے تو پھر کائنات کا یہ عظیم سلسلہ چاند وسورج کے طلوع وغروب کا نظام زمین اور آسمان ستارے اور کہکشاؤں کا سلسلہ جنھیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے اور انسان حیرت واستعجاب میں مبتلا ہو جاتا ہے، کس طرح ممکن ہے کہ بغیر کسی خالق کے وجود میں آ گیا ہو اور ان کی تخلیق کے پیچھے کوئی عظیم طاقت کارفرما نہ ہو؟ (۳)

(۳) حضرت نانوتوی نے تقریر دل پذیر، حجۃ الاسلام، اور اپنے بعض دوسرے رسائل میں یہ انداز استدلال اختیار فرمایا ہے، مصنوع کو دیکھ کر صانع پر استدلال منطقی بھی ہے اور فطرت انسانی سے قریب بھی، یہ وہی بات ہے جس کا اقرار صحرا میں رہنے والا بدو بھی نہایت ہی سادگی سے ان لفظوں میں کرتا ہے: سبحان اللہ البعرۃ تدل علی البعیر واثر الاقدام لیدل علی المسیر فسماوات ذات ابراج وارض ذات فجاج وبحار ذات امواج الا یدل ذلک علی وجود اللطیف الخبیر (سبحان اللہ جب مینگنی اونٹ کے گزرنے کا پتہ دے سکتی ہے اور قدم کے نشانات جانے والے کو بتلا سکتے ہیں تو برجوں والے آسمان اور گھاٹیوں ←

دوسری دلیل: انسانی وجود کے زوال سے موجود اصلی کے وجود پر استدلال

سب سے پہلی حقیقت جس سے انسان کو واسطہ پڑتا ہے وہ اس کا اپنا وجود اور اپنی زندگی ہے، اس لئے سب سے زیادہ جو چیز قابل توجہ اور لائق تحقیق ہے وہ اس کا اپنا وجود ہے، ہم اپنے وجود پر غور کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے وجود کو ثبات وقرار نہیں ہے، نہ وہ ازل سے ہے اور نہ ابد تک رہنے والا ہے، ایک زمانہ ایسا گزرا کہ ہم پردۂ غیب وعدم میں تھے اور ایک وقت ایسا آئے گا کہ ہمارا وجود ختم ہو جائے گا اور مٹ جائے گا اور ہم اس دنیا کو چھوڑ کر پھر پردۂ غیب میں جا چھپیں گے، اور ہم سے پہلے کتنی ہی خلقت ہے جو صفحہ ہستی پر ظاہر ہوئی اور پھر راہی ملک عدم ہوئی اور لوگوں کی آنکھوں سے روپوش ہوگئی اور کتنی ہی قومیں ہیں جو ترقی اور شان وشوکت کے بعد صفحہ ہستی سے معدوم ہوگئیں اور ان کا نام ونشان تک مٹ گیا؟

ہمارے وجود کا اس طرح سے زائل ہو جانا اور ہماری ذات سے علاحدہ ہو جانا اور ہمارا

← والی زمین اور موجوں والے دریا ایک پاک وخبیر ذات کے وجود کا پتہ نہیں دے سکتے)

سچ تو یہ ہے کہ اللہ کا وجود ایک ایسی ثابت شدہ حقیقت ہے جس کی شہادت انسان کے جسم کا رواں رواں دیتا ہے، اس کے لئے فلسفیانہ پیچیدگی میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے؛ اسی لئے قرآن نے فلسفیانہ مقدمات قائم کرنے کے بجائے انسان کے وجدان کو خطاب کرکے اللہ کے وجود اور ایک علیم وخبیر ہستی کے خالق ہونے کا عقیدہ ذہنوں میں راسخ کیا ہے۔

بخت واتفاق کا نظریہ تو پہلے ہی سے کسی علمی اساس پر قائم نہیں تھا، جدید علمی تحقیقات نے ان اوہام کی اور بھی قلعی کھول دی ہے، بعض نام نہاد دانشور ہوا پرستی پر قائم اپنے الحاد کی بنیاد اگر آج بھی اتفاق کے نتیجہ میں کائنات کی تخلیق کو بے جان مادہ اور طبیعت سے جوڑتے ہیں تو ان کے نظریہ کی مثال ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص یہ دعوی کرنے لگے کہ فلاں شعر جو موزونیت، تشبیہ اور نازک خیالی میں بے مثال ہے اس کا قائل کوئی شاعر نہیں ہے بلکہ کسی بچہ کے ہاتھ حروف تہجی سکھانے والا پیپر اڑ گیا تھا اور اس کے پرزے پرزے ہو گئے اور وہی حروف ایک مدت تک فضا میں اڑتے اڑتے موزوں شعر بن گیا اور اس میں تشبیہ اور نازک خیالی سب کچھ از خود پیدا ہو گئی، تو جس طرح عقل وہوش رکھتے ہوئے کوئی شخص یہ بات نہیں کہہ سکتا اسی طرح خالق کے وجود پر شاہد کائنات کے ذرہ ذرہ کو دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کے بعد خالق کائنات کے وجود کا انکار کرنے والا عقل وہوش سے محروم ہی کہا جا سکتا ہے، ورنہ قدیم زمانہ سے ہر صاحب ہوش نے اللہ کے وجود کی گواہی دی ہے، مشہور یونانی حکیم فرفریوس کہتا ہے:

''سب سے واضح اور روشن حقیقت جس کا انسان تصور کر سکتا ہے وہ عالم کے صانع اور خالق کا علم ہے اور جو شخص اتنی بڑی اور اہم حقیقت کا ادراک نہ کر سکے وہ حکیم اور فلسفی کہلانے کا مستحق نہیں ہے''۔ (دیکھئے ابن مسکویہ کی الفوز الاصغر ص ۱۴)

موجودہ زمانہ کی فلاسفر بھی بانگ دہل اس حقیقت کا اعلان کرتے ہیں، مشہور انگریز ماہر فلکیات ہرکل کہتا ہے:۔

ہمیشہ ہمیش اس دنیا میں نہ رہنا بانگ دہل یہ اعلان کررہا ہے کہ ہماری ہستی اور ہمارا وجود ذاتی نہیں ہے اور اسی طرح ہر مخلوق کا وجود ذاتی نہیں ہے بلکہ جو موجود اصلی ہے۔ اس کا عطا کردہ اور اس کا فیض وانعام ہے۔

ہماری مثال ایسی ہی ہے کہ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ آگ سے قریب ہونے کی وجہ سے پانی گرم ہو جاتا ہے اور آگ کی گرمی اس میں سرایت کر جاتی ہے پھر جب آگ سے اس کا رشتہ کٹ جاتا ہے تو اس کی ذاتی برودت لوٹ آتی ہے اور آگ کے قرب سے حاصل شدہ حرارت زائل ہو جاتی ہے۔

اسی طرح زمین آفتاب عالم تاب کی روشنی سے منور ہو جاتی ہے، پھر جب سورج ڈوبنے لگتا ہے تو زمین کی روشنی بھی آہستہ آہستہ سمٹنے لگتی ہے یہاں تک کہ جب سورج غروب ہو جاتا ہے تو زمین کی ذاتی ظلمت اور تاریکی لوٹ آتی ہے اور اس کے اوپر رات کی گھٹاٹوپ اندھیری چھا جاتی ہے۔

بار بار یہ مناظر دیکھنے کی وجہ سے ہمیں اس کا یقین ہو گیا ہے کہ نہ تو روشنی زمین کی ذاتی صفت ہے اور نہ حرارت پانی میں ذاتی ہے بلکہ زمین سورج سے حاصل شدہ عارضی روشنی سے جگمگا اٹھتی ہے اور پانی آگ کی عطا کردہ حرارت سے گرم ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ہمارے وجود کا دو عدموں سے گھرا ہونا واضح طور پر بتلاتا ہے کہ ہمارا وجود آگ کی حرارت اور سورج کی روشنی کی طرح ذاتی نہیں بلکہ زمین کی روشنی اور پانی کی حرارت کی طرح عارضی اور مستفاد ہے، چنانچہ جب اس ذات کی طرف سے فیض منقطع ہو جاتا ہے جو ہمیں وجود بخشے ہوئے

← ''جیسے جیسے علم کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا ہے ایک ایسے خالق ازلی کے وجود کے ناقابل تردید دلائل و براہین فراہم ہوتے جارہے ہیں جس خالق کی قدرت کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے، چنانچہ جیالوجی، ریاضیات، نیچرل سائنس اور فلکیات کے ماہرین سبھی علم کے قلعہ کو مستحکم کرنے میں مشغول ہیں جو درحقیقت صرف اللہ کی عظمت کا قلعہ ہے''۔ (دیکھئے محمد فرید وجدی کی دائرۃ المعارف ۱/۵۰۳)

دراصل اللہ کے وجود کا مسئلہ اتنا بدیہی اور فطرت انسانی میں اس طرح راسخ ہے کہ فطرت سلیم ہو تو شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ افی اللہ شک فاطر السموات والارض؟ (کیا اللہ کے بارے میں شک ہے جو زمین و آسمان کا خالق ہے؟) انبیا نے اسی لئے اللہ کے وجود پر دلائل قائم کرنے کے بجائے توحید کی طرف لوگوں کو دعوت دینے پر زور دیا ہے، کیونکہ اللہ کے وجود کا مسئلہ شک اور شبہ سے بالاتر ہے: ولئن سالتھم من خلق السموات والارض لیقولن اللہ (اور اگر تم ان سے دریافت کرو گے کہ زمین کو کس نے پیدا کیا تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے) اسی طرح: فاقم وجهك للدين حنيفا فطرة الله التى فطر الناس عليها لا تبديل لخلق الله ذلك الدين القيم.

ہے تو ہم ختم ہو جاتے ہیں اور عدم کے دبیز پردے میں جا چھپتے ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی تو ہمیں جان لینا چاہیے کہ جس طرح حرارت کا سلسلہ (دنیائے اسباب) میں آگ پر ختم ہوتا ہے اور روشنی کا سلسلہ سورج پر، چنانچہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سورج سے اوپر کوئی چیز اس دنیائے اسباب میں ایسی ہے جس سے سورج کو روشنی ملتی ہے اور نہ آگ سے اوپر کوئی چیز ہے جس سے آگ کو حرارت ملتی ہے تو سورج کی روشنی اور آگ کی حرارت اصلی کہلائے گی، اسی طرح وجود کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی ایسی ذات پر ختم ہونا چاہیے جس کا وجود ذاتی ہو، کسی اور سے مستفاد نہ ہو، وہی موجود اصلی ہے جس نے ہم سبھوں کو وجود بخشا اور تمام موجودات اس کے فیض وجود کا کرشمہ ہے، اسی ذات کو ہم اللہ، رب اور مالک الملک کے نام سے جانتے ہیں۔ اور چونکہ اس کا وجود ذاتی ہے اس لئے جس طرح سورج سے روشنی اور آگ سے حرارت وابستہ رہتی ہے، جدا نہیں رہتی اور آگ کا حرارت کے بغیر اور سورج کا روشنی کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اللہ کی ذات بغیر وجود کے تصور نہیں کی جا سکتی۔

اس کی ذات اور وجود میں اسی طرح کی نسبت ہے جس طرح کہ دو کے عدد اور زوجیت میں ہوتی ہے، جو کسی حال میں جدا نہیں ہوتی، یہ ممکن نہیں ہے کہ دو کا عدد ہو اور زوجیت کا وصف نہ پایا جائے اسی طرح اللہ رب العزت کی ذات سے وجود کی علاحدگی مستحیل اور ناممکن ہے، لہٰذا وہ نہ کبھی معدوم تھا اور نہ کبھی معدوم ہوگا وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس کا وجود ازل سے تا ابد قائم و دائم ہے۔

تیسری دلیل: اختلاف احوال سے اللہ کے وجود پر استدلال

۳- جب ہم اس عالم کی طرف دیکھتے ہیں اور اس میں موجود ہر مخلوق کی حالت پر غور کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی ہر چیز تغیر پذیر ہے، کسی چیز کو اپنی حالت پر ثبات و قرار نہیں ہے، ہر چیز سے ذلت و افتقار اور مجبوری و احتیاج ظاہر ہوتی ہے، جدھر بھی ہم نظر ڈالتے ہیں ہمیں پستی اور حقارت اور کمزوری اور مسکینی ہی ظاہر ہوتی ہے۔

ہم آسمان کی طرف نظر اٹھاتے ہیں، چاند و سورج کو دیکھتے ہیں، ستارے اور کہکشاؤں پر نظر دوڑاتے ہیں تو ہمیں ایک مسلسل اور ہمہ وقتی گردش اور حرکت نظر آتی ہے، اس عظیم کائنات میں یہ بڑی بڑی مخلوقات اور مظاہر قدرت بھی ذرۂ بے مقدار کی طرح معلوم ہوتے ہیں ان کی حیثیت اس تنکے

جیسی نظر آتی ہے جو ہوا کے جھونکے میں ہو۔

چاند سورج ستارے سب اگتے اور ڈوبتے ہیں، اپنے طے شدہ ٹھکانے پر جاتے ہیں، وہ چڑھتے اور ڈھلتے پھر غروب ہو جاتے ہیں اور اگر چاند و سورج کو گہن لگ جائے تو ان کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اور وہ بے نور ہو جاتے ہیں۔

آگ کو دیکھتے ہیں تو وہ بھی بھڑکتی اور شعلہ برساتی ہے پھر بجھ جاتی ہے۔

ہوا کو دیکھتے ہیں تو وہ کبھی پورب جاتی ہے کبھی پچھّم جاتی ہے، کبھی چلتی ہے، کبھی رک جاتی ہے، اور کبھی آندھی اور طوفان کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور کبھی شمال و جنوب کا رخ کرتی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسے چاروں طرف سے بھگایا اور دھتکارا جا رہا ہے۔

پانی کا حال بھی یہی ہے کہ وہ ہوا کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ بہتا پھرتا ہے۔

زمین کو دیکھتے ہیں تو وہ پستی اور حقارت کی آپ مثال پیش کرتی ہے، قدموں سے روندی جاتی ہے لیکن وہ اپنی طرف سے دفاع نہیں کر سکتی، لوگ اسے کھودتے ہیں، اس کے سینہ پر بول و براز اور دوسری غلاظتیں رکھتے ہیں، ہر طرح کی نجاستیں اس کے اندر دفن کی جاتی ہیں۔

نباتات کو دیکھیں تو ان کو بھی اپنی حالت پر قرار نہیں ہے، کبھی بیج سے ان کی کونپل نکلتی ہے پھر وہ بڑھتی ہے اپنے تنے پر کھڑی ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک تناور اور سایہ دار درخت کی شکل اختیار کر لیتی ہے، جب موسم بہار آتا ہے تو زمین خوشنما شاداب اور بارونق بن جاتی ہے، ہر طرف سرسبزی و شادابی کا منظر نظر آتا ہے اور کھیتوں اور باغات کا منظر دلوں کو موہ لینے لگتا ہے لیکن خزاں کا موسم آتا ہے تو گرم ہوا کے جھونکے اس کو خشک کر دیتے ہیں اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ تنکوں اور بھوسوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ہر طرف خشکی و ویرانی کا منظر نظر آنے لگتا ہے۔

پھر ایک ہی طرح کی زمین میں مختلف قسم کے درخت اور پودے اگتے ہیں اور ایک ہی پانی سے ان کی سینچائی بھی ہوتی ہے لیکن وہ الگ الگ رنگ اور ذائقے کے پھل اور پھول دیتے ہیں۔

جانداروں کے زمرہ میں آنے والی مخلوقات کو دیکھیں تو خاص طور پر انسانوں میں باہم توالد و تناسل کے طریقہ میں یکسانی کے باوجود ایک نوع اور دوسری نوع اور ایک فرد اور دوسرے افراد کے درمیان رنگ و نسل شکل و صورت اور اوصاف و خصوصیات کے لحاظ سے بے حد فرق پایا جاتا ہے، اور ہر

ایک کی خصوصیات پر نظر رکھی جائے تو کوئی دوسرے کے مشابہ نظر نہیں آتا اور ہر طرف سے:

لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

کی صدا بلند ہوتی نظر آتی ہے۔

ذی روح مخلوقات طرح طرح کی مجبوریوں اور احتیاجات میں گھری ہوئی ہیں، بھوک، پیاس اور بول و براز کے احتیاج کے علاوہ درد وغم، لذت والم، بیماری اور موت، نفسانی خواہشات کا غلبہ یہ ساری چیزیں ایسی ہیں جو زندگی کو اجیرن کر دینے والی ہیں۔

خاص طور پر انسانوں پر تو حرص و آز اور خواہش نفس کا ایسا زور ہے کہ اس کی عقل و دانش مغلوب ہو کر رہ جاتی ہے اور اس کو دوسری مخلوقات پر جو شرف وفضیلت حاصل ہے اسے بھی پامال کر کے چھوڑتا ہے۔

دوسرے حیوانات تو صرف کھانے پینے کے محتاج ہیں ان کو خوشنما لباس اور عالیشان محلات کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اونچے مناصب اور اعلی عہدوں کی حاجت ہے پھر کھانے میں بھی خوش ذائقہ اور بدذائقہ یا کھٹے اور میٹھے کی پروا نہیں ہوتی لیکن انسان کو ان چیزوں کے بغیر ایک لمحہ سکون نہیں مل سکتا۔

پھر آدمیوں میں جن کے درجے زیادہ بلند ہوتے ہیں ان کی مجبوریاں بھی اتنی ہی زیادہ بڑھی ہوتی ہیں، چنانچہ عام انسان کو اپنی زندگی کے کاموں میں کسی کی مدد درکار نہیں ہوتی، اپنی ضرورتیں وہ خود ہی پوری کر لیتا ہے، لیکن امراء وملوک اور زعماء وقائدین کو ہر لمحہ نوکروں اور خدمت گاروں کی ضرورت ہوتی ہے وہ اپنے گھریلو کام خود نہیں کر سکتے ان کی حفاظت کے لئے بھی پاسداروں اور حفاظتی دستوں کی ضرورت پڑتی ہے، اس طرح:

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز میں اختلاف ہے اور ان سے ذلت ومسکنت اور عاجزی وبیچارگی ظاہر ہوتی ہے چاہے وہ کتنی ہی بڑی اور باعزت چیز کیوں نہ ہو۔

آسمان پر ہمیں چاند وسورج اپنی روشنی کی وجہ سے بڑے اور باصلاحیت معلوم ہوتے ہیں اور زمین پر انسان سب سے عظیم اور اشرف ترین مخلوق ہے بلکہ انسان کو چاند وسورج پر بھی فوقیت حاصل ہے کیونکہ اسے عقل جیسی نعمت سے نوازا گیا ہے، چنانچہ چاند وسورج کی روشنی سے اگر زمین وآسمان کی

فضا منور ہو جاتی ہے تو عقل کی روشنی سے کون ومکان روشن ہو جاتے ہیں، نور عقل کی بے مثال شعاعیں ازل سے ابد تک کو روشن کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔

سورج کی روشنی سے اگر شکلیں صورتیں نظر آتی ہیں تو عقل کی روشنی علمی حقائق سے پردہ اٹھاتی ہے اور فنی حقیقتوں کی عقدہ کشائی کرتی ہے، ان تمام شرف وکمال کے باوجود عالم کی ہر چیز سے پستی اور عبودیت ظاہر ہوتی ہے، جو اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ پوری کائنات کسی عظیم قدرت وطاقت اور سطوت وجبروت رکھنے والی ذات کے زیر تصرف ہے جس نے زمین وآسمان کی ہر چیز کو نوکروں اور غلاموں کی طرح خدمت پر مامور کر رکھا ہے، اور سب کی ڈیوٹی لگا رکھی ہے، ہر ایک اپنی اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگا ہوا ہے، پھر کسی کو ایک حال پر بھی نہیں چھوڑتا تا کہ ان میں خودسری نہ آئے اور کوئی اپنے آپ کو مستقل اور بااختیار نہ سمجھنے لگے، چنانچہ ہر چیز زبان حال سے ایک عظیم وبااقتدار بادشاہ کے قبضہ میں ہونے کی گواہی دے رہی ہے، جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے اور نہ اس کی عظمت اور اقتدار کا ہی کوئی ٹھکانہ اور حد ہے۔

اس لئے کائنات کے متغیر احوال کو دیکھنے کے باوجود صانع عالم اور خالق کائنات کے وجود کا اقرار نہ کرنا انتہائی درجہ کی غباوت اور آخری درجہ کی نادانی ہے۔

چوتھی دلیل: اکثریت کی رائے پر فیصلہ کے اصول سے استدلال

انسانی زندگی کا عام دستور یہ ہے کہ جب کسی معاملہ میں اختلاف رونما ہوتا ہے تو اس کی رائے اپنائی جاتی ہے جو زیادہ ہوش مند، صاحب فکر اور اچھی اور بے لوث رائے رکھنے والا ہو، لیکن اگر عقلا بھی باہم کسی مسئلہ میں اختلاف کا شکار ہو جائیں تو پھر اختلاف کو مٹانے کے لئے اکثریت کی رائے پر فیصلہ کیا جاتا ہے، لہٰذا اگر یہ طریقہ اس اہم مسئلہ میں اپنایا جائے تو خود بخود نزاع ختم ہو جائے گا، کیونکہ دہریوں کی ایک چھوٹی سی جماعت کے علاوہ نوع انسانی کی اکثریت اللہ کے وجود کی قائل ہے، ہندو اور مسلمان، یہود ونصاریٰ، بت پرست اور مجوسی سبھی خدا کے وجود کے قائل ہیں اور اپنے آپ کو اللہ کا بندہ تصور کرتے ہیں جس کے قبضہ قدرت میں سبھوں کی جان ہے۔ (۴)

(۴) مذاہب وادیان کے ماننے والوں کے علاوہ فلاسفہ کی واضح اکثریت بھی اللہ کے وجود کو تسلیم کرتی ہے، خواہ وہ ارسطو اور ڈیکارٹ کے ماننے والے روح اور مادہ دونوں کے وجود کے قائل ہوں یا افلاطون اور برکلے اور برگسان کے ہم خیال تصوریت یا صرف روح کے وجود کے قائل ہوں، صانع عالم کے وجود کو تسلیم کرتے ہیں۔ ←

دہریوں کا یہ طریقہ کتنا قابل تعجب اور باعث افسوس ہے کہ گاؤں کی پنچائتوں اور علمی اور سیاسی مجلسوں میں تو اکثریت کی رائے پر فیصلہ کو اپنائیں اور صانع عالم کے وجود کے بارے میں اس بنیاد پر اس قاعدہ کو ماننے سے اعراض کریں کہ اللہ نظر نہیں آتا۔

سوال یہ ہے کہ جب تمہارے نزدیک کسی چیز کو تسلیم کرنے کے لیے دیکھنا ہی شرط ہے تو پھر:

دیوار کے پیچھے دھواں دیکھ کر آگ کا کیوں یقین کر لیتے ہو؟

گھر کے صحن میں شعائیں دیکھ کر سورج کے طلوع ہونے کو کس طرح باور کر لیتے ہو؟

سڑکوں اور گلیوں میں قدموں کے نشان دیکھ کر کس طرح کسی گزرنے والے کے اس راہ سے گزرنے کا یقین کر لیتے ہو؟

اگر یہ سارے آثار اپنے قدموں کا پتہ دے سکتے ہیں تو یہ سارا عالم جو ایک خاص نظام کے تحت بنایا گیا ہے اپنے صانع اور موجد کائنات کے خالق کے وجود کا پتہ کیوں نہیں دے سکتے؟

نام نہاد دانشوروں کی کیا یہ کھلی ہوئی بے دانشی نہیں ہے کہ عقل و دانش کا دعوی رکھنے کے باوجود اللہ کے وجود کا اقرار نہ کریں؟

یہاں صرف مثال کے طور پر وجود باری کے دلائل اپنے انداز پر مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی طرح توحید، نبوت، اور عقیدۂ آخرت وغیرہ کے دلائل بھی حضرت نانوتوی کی کتابوں سے اخذ کر کے نئے انداز پر مرتب کر دیئے جائیں تو ایک نئے علمِ کلام کی بنیاد پڑ سکتی ہے اور حضرت نانوتویؒ کے علوم و معارف کو لوگوں کے ذہن و دماغ سے قریب بھی کیا جا سکتا ہے، اس مہم کو سر کرنے کے لئے مدت سے حضرت نانوتویؒ کی روح پکار رہی ہے کہ:

کون ہوتا ہے حریف مئے مرد افگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

نہ جانے یہ سعادت کس خوش بخت کے لئے مقدر ہے، لیکن قسمت آزمائی تو سبھی کر سکتے ہیں کہ:

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے

☆☆☆

← منکرین میں صرف مادہ پرستوں کا ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو حکیم دیمقراطیس کا ہم خیال ہے اور خدا کے وجود کا انکار کرتا ہے۔

مولانا عبدالحفیظ رحمانی*

اسلام پر عیسائی مبلغین کے اعتراضات
اورالامام النانوتوی کی استدلالی فکر

قل یا اهل الکتاب تعالَوْا إلی کلمةٍ سواءٍ بَیْننَا وبَینکم اَلَّا نَعْبدَ إلا اللهَ و لا نُشرِكَ بهِ شیئًا ولایتخذَ بَعضُنا بَعضًا اربابًا من دونِ الله فَاِن تَوَلّوا فقولوا اشهَدُوا بِاَنا مسلمون. (البقرہ:٦٤)

(آپ کہہ دیجئے اے اہل کتاب آؤ ایک بات کی طرف جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ بنائیں اور کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ پھر اگر وہ قبول کریں تو کہہ دیجئے کہ تم گواہ رہو کہ ہم تو حکم کے تابع ہیں)۔

اللہ نے اپنی آخری نازل کردہ کتاب قرآن مجید میں یہود ونصاریٰ کو اہل کتاب کے خطاب سے نوازا ہے اوران کو ایک ممتاز مقام عطا کیا ہے۔اس کتاب میں ان دونوں اہل مذاہب کے عقائد واعمال کے جابجا تذکرے ہیں۔توریت اورانجیل سے ان کا انحراف،ان کا آسمانی کتابوں میں حذف واضافہ اورتحریف وتبدل،عقائد واحکام میں شرک اور حلال کوحرام اور حرام کو حلال کرنے کی جسارت، نیز نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں آخری رسول کی مکمل علامات کو جان بوجھ کر تسلیم نہ کرنے کی جرأت اور علاماتِ نبوت کو قصداً دوسری شخصیت کا مصداق بتانا۔ یہ سب کچھ قرآن مجید میں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کے اس انکشاف کے بعد ہی دنیا کو یہود ونصاریٰ کی تحریفات وکج اعمالیوں اور اعتقادی خامیوں کا علم ہوسکا اور توریت وانجیل کی تحریفات موضوع بحث بنیں۔لیکن تحریفات کا اعتراف کرنے کے باوجود اہل کتاب عناد وعداوت کی بنا پر شہادتِ حق سے محروم رہے۔

اسلام کو بے سروپا اعتراضات کا ہدف بنایا اور اسلام سے برگشتہ کرنیکی ہر ممکن تدبیر اختیار کرنے سے دریغ نہیں کیا۔عیسائیوں کی یہ کوشش پہلی صدی ہجری سے آج تک برابر جاری ہے۔

---

* لوہرسن،سنت کبیر نگر(یوپی)

یہاں تک کہ اسلام کے دامن شفاف کو داغدار کرنے کیلئے عیسائیوں نے اسلامیات کے مطالعہ میں اپنی عمریں صرف کردیں اور کچھ نہ بن پڑا تو مستشرقین کے اس گروہ نے مسلمانوں کے عقائد میں تشکیک پیدا کرنے کی ناروا جسارت کی اور یہ تشکیک وارتیاب پیدا کرنا آج بھی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ عیسائیوں نے عیسائیت کو فروغ دینے اور اس کو تسلیم کرانے کی وہ ناروا جدوجہد بھی کی ہے جس کو نوکِ قلم پر بھی نہیں لایا جاسکتا۔ عموماً عیسائی مبلغین اپنے مذہب کی اشاعت کیلئے دنیا کے وہ علاقے منتخب کرتے رہے ہیں جو افلاس زدہ اور علم کی روشنی سے کوسوں دور ہوں تا کہ ان کی جہالت اور غربت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عیسائیت کو اس علاقے کے گلے کا ہار بنادیں۔ خواہ وہ علاقے برّ اعظم افریقہ کے ہوں یا برّ اعظم ایشیا کے، عیسائی مبلغین کو اس طرح کے علاقوں کی مسلسل جستجو رہا کرتی ہے۔

ہندوستان کے غربت زدہ علاقوں کو مسیحی عیسائیت کی آماجگاہ بنائے ہوئے ہیں اور غربت کی ماری ہوئی پسماندہ برادریاں عیسائیت کے دام تزویر میں آجاتی ہیں۔

لیکن اسی ملک کا ایک دور وہ بھی تھا جب اس پر انگریزی سطوت وحکومت کا پرچم لہرا رہا تھا۔ انگریز حکومت کے نشے میں اس قدر چور تھے کہ وہ پورے ملک کو عیسائیت کے دریا میں ڈبو دینا چاہتے تھے۔ عیسائیوں کا ایک سیل رواں تھا جو ہر گلی کوچے اور آبادی میں بہ رہا تھا۔ عیسائی مبلغین برسرِ بازار اسلام کا مذاق اڑاتے تھے اور مسیحیت کی صداقت کا اعلان کرتے تھے اور مسلمان ہوں یا ہندو، اپنے مذاہب کی توہین، ظلم وجور کے خوف سے سننے پر مجبور تھے۔ اس دور میں عیسائی مبلغین نے نہ صرف یہ کہ عیسائیت کی تبلیغ واشاعت پر اکتفا کیا بلکہ مناظرانہ دعوے بھی کیے۔ عموماً مسلمان اسلامی خون کی گردش کے باوجود عیسائیت کے دعوے نظر انداز کر جاتے تھے مبادا فساد کی چنگاری بھڑک اٹھے اور مسلمانوں کو عظیم جانی ومالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑے۔

مگر پانی سر سے اونچا جا چکا تھا اور مسلمانوں کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی۔ چار وناچار مآل کار کی پروا کیے بغیر عیسائیت کے سیل رواں کو روکنے کیلئے میدان میں اتر آئے اور ایسا مضبوط ومستحکم بند باندھا کہ مسیحیت اس میں معمولی شگاف بھی نہ کرسکی۔

عیسائیوں کا جواب عام مسلمانوں نے بھی دیا اور متبحر علماء اسلام نے بھی۔ جہاں بھی عیسائی

مبلغین اسلام کو اعتراضات کا نشانہ بناتے تو ان کو منہ کی کھانی پڑتی۔ مقابلے دونوں طرح جاری رہے زبانی بھی اور تحریری بھی۔ بحث و مباحثہ ہوتا اور چھوٹے بڑے رسالے اور کتابیں دونوں طرف سے منظر عام پر آتیں۔ جہاں تک مسلمانوں کے تحریری دفاع اور عیسائیت کے اصلی چہرے کو بے نقاب کرنے کا تعلق ہے اس میں وہ کبھی پہلوتہی کر کے نہیں بیٹھے۔ جب بھی ضرورت ہوئی اور حالات نے تقاضا کیا تو علماء اسلام نے اسلام کی صداقت کو روز روشن کی طرح واضح کرتے ہوئے دیگر مذاہب کی خامیوں اور کمزوریوں کو پیش کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا اور کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ عیسائیت کی تردید میں بہت سی مدلل، محققانہ اور بصیرت افروز کتابیں منصۂ شہود پر آئیں۔ ان کتابوں نے ایوان عیسائیت میں ہلچل مچادی اور اس کے پائے چوبیں ہل گئے۔ ان مصنّفین کی فہرست بہت طویل ہے جن کی تحریریں عیسائیوں کیلئے سرمۂ چشم بصیرت ثابت ہوئیں اور عیسائیوں کے قلم کی سیاہی خشک ہوگئی۔ ان مصنّفین میں سے چند ایسے علماء اسلام کا ذکر ناگزیر ہے جنھوں نے انگریزی حکومت کے دور قہرمانی میں عیسائیت کے تارو پود بکھیر دیئے اور ان کی مدلل کتابوں نے عیسائی علماء کو سراسیمہ کر دیا۔ ان میں حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی علیہ الرحمہ سرفہرست ہیں۔

دنیائے عیسائیت کا مشہور مناظر عالم پادری فنڈر حکومت کی شہ پر انگلینڈ سے ہندوستان آیا اور جابجا اپنی تقریروں میں اسلام پر اعتراضات کئے اور مسلمان علماء کو مناظرے کی دعوت دی، حضرت مولانا کیرانوی رحمہ اللہ گویا منتظر بیٹھے تھے، چیلنج کو بصد مسرت قبول فرمایا اور اکبرآباد کے تاریخی مناظرہ میں پادری فنڈر کو ایسی شکست فاش دی کہ وہ منھ چھپا کر میدان مناظرہ سے بھاگ کھڑا ہوا اور مصر جا کر دم لیا۔ حضرت مولانا کیرانویؒ تعاقب میں مصر جاپہونچے۔ اس نے تشریف آوری کی خبر سنی تو قسطنطنیہ روانہ ہوگیا اور حضرت مولانا کیرانویؒ مکہ مکرمہ چلے گئے۔ مولانا کی معرکتہ الآراء کتاب ''اظہار الحق'' آج بھی ردّ عیسائیت میں اہم ترین کتاب ہے، عیسائیت کے موضوع پر قلم اٹھانے والا اس کتاب سے بے نیاز نہیں ہوسکتا اور نہ ''اعجاز عیسوی'' سے۔

اسی دور میں جب مولانا کیرانوی پادری فنڈر کو شکست دے کر اسلام کی صداقت و سربلندی کا پرچم لہرا چکے تھے۔ عیسائیوں نے فتنہ کا ایک نیا دروازہ کھولا تا کہ اپنی ہزیمتوں پر پردہ ڈال سکیں اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے ٹکرا کر عیسائیت کو ''آتشیں شریعت'' سے محفوظ رکھ سکیں۔

چنانچہ ۱۸۷۶ء میں ایک انگلستانی پادری نولس نے موضع چاندا پور ضلع شاہجہاں پور کے ایک رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی کو نہ جانے کس طرح ایک ایسے عظیم جلسہ کے انعقاد پر آمادہ وتیار کرلیا جس میں ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے علماء کو اپنے اپنے مذہب کی صداقت ثابت کرنے کا موقعہ فراہم کیا جائے۔ ہر مذہب کے بلند پایہ علماء کو دعوت دی گئی اور بڑے پیمانے پر جلسہ کو مشتہر کیا گیا اور اس کا نام منشی پیارے لال نے ''میلۂ خداشناسی'' رکھا۔

خداشناسی کا پہلا میلہ ۷رمئی ۱۸۷۶ء کو منعقد ہوا۔ اس میں بہت سے علماء اسلام شریک ہوئے، الامام النانوتوی حضرت مولانا محمد قاسم، حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی، حضرت مولانا احمد حسن امروہوی، حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی، حضرت مولانا عبد المجید، مولانا احمد علی بریلوی، امام فن مناظرہ اہل کتاب حضرت مولانا ابو المنصور دہلوی رحمہم اللہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندو پنڈتوں میں پنڈت دیانند سرسوتی، منشی پیارے لال، منشی اندرمن اور عیسائیوں میں پادری نولس، پادری واکر، پادری اسکاٹ اور پادری محی الدین قابل ذکر ہیں۔

یہی ''میلۂ خداشناسی'' دوسرے سال ۱۹/۲۰ رمارچ ۱۸۷۷ء میں منعقد ہوا، اس میں بھی وہ علماء شریک ہوئے، دیگر بہت سے علماء متباحثہ کی شہرت سن کر چاندا پور پہنچ گئے اور شائقین کا بے پناہ ہجوم ہوا، مفصل روداد کیلئے ''گفتگوئے مذہبی'' اور ''مباحثۂ شاہ جہاں پور'' ملاحظہ فرمائیں۔

یہاں پیش نظر الامام النانوتوی کی استدلالی فکر اور طرز گفتگو ہے، لیکن اس سے پہلے کہ الامام النانوتوی نے شاہجہاں پور کے میلہ خداشناسی میں کیا فرمایا اور آپ کی دیگر کتابوں کی استدلالی فکر اور محور کیا ہے؟ اس دور کے مباحثوں اور مناظراتی تحریروں کا سرسری جائزہ لینا ضروری ہے تاکہ الامام النانوتویؒ کی عبقریت اور طرز استدلال کا امتیاز اور علمی مقام سمجھنے میں آسانی پیدا ہوجائے۔

اس دور میں جب عیسائی مبلغین اسلام پر اعتراضات کررہے تھے اور اپنی تقریروں میں نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات نبوت پر رکیک حملے کررہے تھے، علماء اسلام نے دقیق علمی بحثوں کے بجائے تورات اور انجیل کو اپنا ہدف بنایا اور قرآن کریم کے انجیل سے متعلق دعوائے تحریف کو دو اور دو چار کی طرح ثابت کردکھایا اور عیسائیوں کو تحریف تسلیم کرلینے پر مجبور کردیا۔ اس طرح کی کاوشیں حافظ ابن قیمؒ سے لیکر مولانا عبد الحق حقانی تک جاری رہیں۔ یہی موضوع آنجہانی

مرزا غلام احمد قادیانی اوراس کے متبعین کا بھی رہا۔ مباحثۂ شاہجہاں پور میں بھی تحریف کا عنوان الامام النانوتوی زیر بحث لائے اور عیسائی پادریوں کو چارو ناچار تحریف کو مان لینا پڑا۔ اس کا ثبوت امام فن مناظرہ اہل کتاب مولانا ابوالمنصور دہلویؒ نے الامام النانوتویؒ کے اشارے پر پیش کیا اور بائبل کا وہ مرزاپوری نسخہ سامنے لاکر رکھ دیا جس میں تحریف کا کھلا ہوا اعتراف موجود تھا۔ آئندہ تحریفات کے عنوان سے ہم کسی قدر تفصیل سے اس کا جائزہ لیں گے۔

الامام کی استدلالی فکر

اس تناظر میں الامام النانوتویؒ کا استدلالی رنگ اور طرز فکر سب سے جداگانہ تھا۔ الامام کی علمی بصیرت اور فکری وسعت نے ذیلی مباحث کے بجائے عقائد کو اپنا موضوع بحث بنایا۔ کیوں کہ مذاہب کی صحت وتعمیر کا دارومدار عقائد ہی پر ہے، اگر کسی مذہب کے عقائد کو عقل تسلیم نہیں کرتی اور عقل وشعور کی میزان میں وہ عقیدے ہلکے، اور بودے ہیں تو مذہب بھی اسی درجہ میں بے بنیاد اور نا قابل عمل ہوگا۔

اس نکتہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے قابل توجہ یہ عقیدہ ہے کہ دنیا میں پھیلے ہوئے تمام مذاہب توحید کا اقرار کرتے ہیں کہ خدا، پرمیشور صرف ایک ہے اور اس کائنات کا خالق وہی ہے۔ اس کے باوجود کسی مذہب میں ہزاروں معبود ہیں اور کسی میں تین خدا ہیں یعنی وحدت میں کثرت ہے اور کثرت میں وحدت ہے۔ الامام النانوتویؒ نے اپنی تقریروں میں علمی وعقلی استدلال کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ وحدت بھی حقیقی ہو اور کثرت بھی حقیقی ہو امر محال ہے۔ اس کو مثالوں کے ذریعہ عام فہم ثابت کر دیا کہ عقیدۂ تثلیث بالکل غلط اور نا قابل فہم ہے۔ اسی بحث میں الامام نے یہ بھی واضح کیا کہ وجود ذاتی کو کسی چیز کی احتیاج نہیں، وہ بے نیاز ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام، شری رام اور شری کرشن کو معبود کہنا یوں بھی عقل میں نہیں آسکتا کہ وہ کھانے پینے کے محتاج تھے۔ پاخانہ، پیشاب، مرض اور موت سے مجبور تھے۔

اس کے ساتھ انسان کے مقصد تخلیق کو واضح کرتے ہوئے عقل کی روشنی میں اطاعت کو لازمی قرار دیا پھر اطاعت کی شناخت کیلئے رسالت کو بنیادی ضرورت بتایا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ الامام کی مدلل تقریر، بصیرت افروز اور لاجواب ہوتی ہے۔ اس میں کسی طرح کے اعتراض اور سوال کی گنجائش نہیں ہوتی بشرطیکہ وہ تقریر منصفانہ عقل وہوش اور شہادت حق کیلئے سنی گئی ہو ورنہ اعتراض کرنا تو آسان کام ہے۔ چارو ناچار عیسائیوں نے خوبیٔ تقریر واستدلال کی داد تو دی لیکن وہ باتیں

دہرائیں جن کی گنجائش نہیں تھی۔

چنانچہ پادری نولس کو مسلمانوں کی توحید تو پسند آئی لیکن تثلیث کے بغیر توحید ان کیلئے نا قابلِ فہم تھی۔ ان کے الفاظ میں توحید بے تثلیث ممکن نہیں۔ اس کو سمجھاتے ہوئے پادری نولس نے کہا۔ دیکھو ہم ایک کا ہندسہ لکھتے ہیں اور اس میں طول بھی ہوتا ہے اور عمق بھی ہوتا ہے اور عرض بھی، وہ ہندسہ ایک ہے پر بے ان تین باتوں کے موجود نہیں ہوسکتا۔ آدمی کی روح ایک ہے مگر اس میں خواہش بھی ہے قوت خیالیہ بھی ہے، دیکھو روح ہے پر بے ان تین باتوں کے ہو نہیں سکتی۔ دیکھو درخت ایک ہے پر اس میں جڑ بھی ہے شاخیں بھی ہیں پتے بھی ہیں وہ ایک ہے بے ان تین چیزوں کے نہیں ہوتا"۔

الامام کا استدلالی جواب ملاحظہ فرمائیے:

آپ کا دعویٰ ہے کہ جیسے ہمارا خدا واحد حقیقی ہے ایسے ہی وہ باوجود وحدت حقیقی کے کثیر بھی حقیقی ہوتا ہے یعنی حقیقت میں تین بھی ہے سو آپ نے اجتماع وحدت حقیقی اور کثرت حقیقی کیلئے جو دلیل بیان کی تو وہ کی جس سے کثرت حقیقی اور وحدت اعتباری کا اجتماع ثابت ہوتا ہے۔ (گفتگوئے مذہبی ص: ۲۸)

الامام نے اس کو مثالوں کے ذریعہ مبرہن کیا اور فرمایا کہ پادری صاحب نے جتنی مثالیں بیان کی ہیں سب اسی قسم کی ہیں۔ توضیح کیلئے ایک مثال عرض کرتا ہوں سنئے اگر ایک برتن میں شکر ہو، ایک برتن میں کیوڑہ ہو اور ایک برتن میں پانی ہو، پھر ان تینوں کو ایک کٹورے میں ڈال کر شربت بنالیا جائے تو گو دیکھنے میں فی الحال وہ تینوں چیزیں ایک نظر آتی ہیں مگر عقل صائب ہنوز ان تینوں چیزوں کو بدستور کثیر مختلف الحقیقت سمجھتی ہے۔

غرض ان تین چیزوں کو تین مزوں کیلئے ملایا ہے۔ اگر وہ تینوں شربت بن جانے کے وقت تین نہ رہیں تو وہ تین باتیں جو مطلوب تھیں یعنی شیرینی اور خوشبو اور تسکین حرارت یا یوں کہئے رفع تشنگی، کاہے کو حاصل ہوتیں کچھ اور ہی بات ہو جاتی۔ سو جیسے یہاں تین چیزیں ایک ظرف میں اکٹھی ہوگئی ہیں اور اس وجہ سے باوجود کثرت اور تثلیث حقیقی کے مشاہدے کے وقت ایک نظر آتی ہیں اور آنکھ سے ہر ایک جزو کو جدا جدا تمیز نہیں کر سکتے ایسے ہی پادری صاحب نے جتنی مثالیں بیان فرمائیں ان سب میں تین تین چیزیں ایک جا اکٹھی ہیں اور نظر سرسری اجمالی میں ہر جگہ وہ تینوں ایک نظر آتی ہیں اور باہم

متمیز نہیں ہوتیں ورنہ حقیقت میں سب مثالوں میں مضامین مختلف جمع ہیں۔
یہ تو تھے الامام النانوتوی کے الفاظ جو تثلیث کے نامعقول اور بدیہی البطلان ہونے کا ثبوت فراہم کررہے تھے، اگر پادری نولس کی مثال ایک کے ہندسے پر معمولی سی توجہ دی جائے تو اس مثال میں صرف طول، عرض، عمق، ہی نہیں ایک کے ہندسہ میں سیاہی کی چمک اور خوبصورتی بھی ہے اس لئے تثلیث کے بجائے تخمیس کو عقیدہ بنانے میں کیا مضائقہ ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اوصاف اور موصوف میں عیسائیوں نے کوئی فرق محسوس نہیں کیا حالانکہ ایک ہی چیز میں متعدد صفات ہوتی ہیں۔ ایک درخت میں سیکڑوں شاخیں اور بے شمار پتے ہوتے ہیں، ایک انسان میں کتنے اوصاف حمیدہ اور اخلاق ہوتے ہیں لیکن موصوف ایک ہے، ایک خدا میں کتنی صفات کمالیہ ہیں؟ تو کیا ان صفات کی بنیاد پر بے شمار خدا ہوں گے؟ عقل کثرت اجتماع حقیقی اور وحدت حقیقی کو محال تسلیم کرتی ہے۔ بیک وقت ایک ہی جگہ پر دھوپ بھی ہو اور سایہ بھی، ایک ہی چیز گرم بھی ہو اور سرد بھی، سراسر خلاف عقل ہے۔ اسی کا نام معقولیوں کی اصطلاح میں اجتماع الضدین ہے اور اضداد کا اجتماع عقل ومشاہدہ کی دنیا میں محال ہے۔

تقدیر پر اعتراض

تقدیر کو تسلیم کر لینے پر بندہ بے گناہ اور خدا ظالم ٹھہرتا ہے اس لئے کہ پہلے ہی سے خدا نے بہت سے آدمیوں کو جہنم کیلئے تجویز کرلیا اور پھر اسی کے موافق کیا (ص: ۲۷)

حقیقت یہ ہے کہ مسیحی جب لاجواب ہوجاتے ہیں اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو تقدیر پر اس غلط فہمی کی بنا پر اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان علماء ہمارے اس آخری حملہ کی تاب نہیں لاسکیں گے اور بہت سے مسلمان تشکیک میں مبتلا ہوجائیں گے، لیکن الامام النانوتویؒ کی استدلالی جودت فکر نے عیسائیوں کی یہ گتھی اس طرح سلجھائی کہ عیسائیت دم بخورده گئی، اگر مسیحی علماء نے سنجیدگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اختیار وتصرف اور مالکانہ حقوق پر غور کیا ہوتا تو مسئلہ تقدیر کی وہ پیچیدگی جو ان کے ذہن میں در آئی تھی دور ہوجاتی۔ بلکہ اس سے فروتر ہوکر اپنے مالکانہ تصرف اور اختیارات پر غور کر لیتے تو بھی اعتراض کرنے کی نوبت نہ آتی۔ اپنا مکان اور اپنی چیزوں پر ہر شخص کو جو مالکانہ اختیار و تصرف حاصل رہتا ہے وہ سامنے کی بات ہے۔ چنانچہ الامام نے جو مشاہداتی تجربی اور عقلی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ ایک شخص کے پاس ایک افتادہ زمین ہے۔ اس نے اپنی ضروریات کو پیش نظر رکھتے

ہوئے ایک آرام دہ مکان کا خاکہ تیار کیا اور اپنے مرتب نقشے کے مطابق اس میں چھوٹے بڑے کمرے، وسیع ہال، دالان، پیشاب خانہ، پاخانہ اور غسل خانہ بنوایا۔ اس مکان تعمیر کرنے والے پر کوئی الزام عائد نہیں کرسکتا کہ تم نے زمین کے ایک ٹکڑے پر غسل خانہ وغیرہ تعمیر کر کے اس قطعۂ ارضی پر ظلم کیا ہے اور اگر زمین کو قوت گویائی مل جائے تو وہ بھی یہ شکایت کرنے کی جرأت نہیں کرسکتی کہ اس کو اس مصرف کیلئے کیوں استعمال کیا گیا؟ اس لئے کہ زمین بزبان حال اقرار کررہی ہے کہ میں دست بستہ خدمت کیلئے حاضر ہوں جس طرح میں کام آسکوں آپ ہی کا قبضۂ و تصرف ہے۔

اس زمین کو چند برسوں کے بعد وہ از سرِ نو دوسرے نقشہ کے مطابق کام میں لاسکتا ہے تو کیا وہ ذات پاک جو احکم الحاکمین اور وحدہ لاشریک لہ ہے اپنی مخلوقات پر اس طرح کی حکمرانی اور تصرف نہ کرسکے گا جبکہ اس کو مکمل اختیار حاصل ہے کہ نظامِ عالم کی موزونیت اور اس میں تناسب کیلئے جس طرح کی خانہ پری درکار ہے کرے۔ بلاشبہ تخلیق کائنات سے پہلے حاکم مطلق نے اپنی تمام مخلوقات کا نقشہ بنایا ہوگا اور اسی کے مطابق کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔ اسی مرتب خاکہ کا نام اسلامی عقائد کی اصطلاح میں تقدیر ہے۔

عصمت انبیاء

چوں کہ عیسائیوں کے معتقدات میں ایک عقیدہ یہ بھی شامل ہے کہ کوئی انسان گناہ کے ارتکاب سے محفوظ نہیں ہے اس لئے وہ انبیاء علیہم السلام کو بھی گناہ گار سمجھتے ہیں اور ان کی عصمت کے قائل نہیں ہیں، چنانچہ بائبل میں حضرت لوط علیہ السلام پر اپنی بیٹیوں سے زنا کا الزام وحضرت داؤد علیہ السلام پر اپنے ہمسایہ کی بیوی سے زنا کا الزام، حضرت سلیمان علیہ السلام پر شرک وبت پرستی کا الزام آج بھی موجود ہے، مغربی ممالک میں اباحیت کو اسی عقیدہ کے نتیجے میں قانونی جواز حاصل ہے۔

اس کے برخلاف اسلام میں زنا بدترین قابل تعزیر جرم ہے جس کی سزا موت ہے اسلامی مزاج دواعی زنا کو بھی برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہے اور رہا مسلم معاشرہ میں کسی شریف آدمی کیلئے زنا کا تصور تو وہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

شرافت اور بدکاری میں اتنی بڑی خلیج حائل ہے کہ دونوں کا اجتماع ناممکن ہے۔ اسلام میں شرافت کا معیار ہی اسلامی احکام کی پابندی اور تقویٰ و پرہیزگاری ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کا

انتخاب رائے عامہ یا اہل الرائے کی صواب دید پر نہیں ہوتا بلکہ اس مقدس جماعت کا ہر فرد اپنے اخلاق حمیدہ کی بناء پر خدا کا برگزیدہ بندہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اپنی حکمت و مصلحت کے مطابق ہر زاویہ سے انسان کامل کو تاج نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں اور اس منصب جلیل پر فائز کرنے کے بعد اس کو ہر طرح کے گناہوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔ نبی سے کبھی کوئی گناہ صادر نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی گناہ کی طرف رغبت ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام منصب نبوت پر فائز ہونے سے پہلے بھی گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں اور اس عظیم الشان منصب کو سنبھالنے کے بعد تو گناہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن سطحی فکر و نظر کے لوگ انبیاء علیہم السلام کے زلات اور لغزشوں کو گناہ سمجھنے کی غلطی میں مبتلا ہیں۔ مسیحی تو دونوں کو ایک گردانتے ہیں۔ مسلمانوں میں ایک نوزائیدہ جماعت بھی انبیاء علیہم السلام کو معصوم تسلیم کرنے سے ہی کتراتی ہے۔

حالانکہ یہ بات تو ایک عام آدمی بھی سمجھتا ہے کہ دنیا کے حکمراں اور بادشاہ بھی اسی کو اپنا معتمد وزیر اور پیغام رساں بناتے ہیں جن کی اطاعت اور وفاداری میں ان کو یقین ہوتا ہے، ان سے کسی طرح کی حکم عدولی ان کے علم میں نہیں آئی ہے۔ تو کیا خالق کائنات جس نے نبوت و رسالت کیلئے اپنے خاص بندے کا انتخاب کیا ہے جس کی نظروں میں سب کچھ ہے۔ عدم بھی وجود بھی، حال بھی، مستقبل بھی، اعمال و اخلاق بھی اور اطاعت و فرمانبرداری بھی۔ اس کا انتخاب غلط ہوسکتا ہے؟ یہ منصب جلیل تو ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی کو سرفراز کرنے کے بعد معزول کردیا جائے اور اس کی غلطیوں کو وجہ عزل بنایا جائے۔

اس عمل میں پہلے تو خدائے حکیم و خبیر مورد الزام ٹھہرے گا اور دوسری قباحت یہ سامنے آئے گی کہ احکام خداوندی کی تعمیل کوئی کر ہی نہیں سکتا ورنہ اس کے برگزیدہ بندوں سے گناہ کیوں سرزد ہوتے عقل اس کو تسلیم کرنے سے اباء کرتی ہے کہ واجب الوجود کو جامع صفات کمالیہ نہ مانا جائے۔

الامام النانوتوی فرماتے ہیں :

> اور ظاہر ہے کہ جس کا وجود کامل ہو اس کی کسی بات میں نقصان مقصود نہیں ورنہ وجود میں نقصان لازم آئے گا کہ جب اس کا علم کامل ہوا اور اس وجہ سے اس کو کسی کے موافق مرضی اور ظاہر و باطن مطیع سمجھنے میں غلطی ممکن الوقوع نہ ہوئی تو جن کو اس نے اپنا مقرب بنایا ہوگا ان کا معزول ہونا اور اپنے عہدۂ "احکام رسانی" سے موقوف ہو جانا بھی خلاف عقل ہوگا۔ الحاصل انبیاء میں کوئی ایسی بات

نہ ہوگی جو ناپسندیدۂ خداوندی ہو اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان کے تمام اخلاق حمیدہ کا ہونا اور تمام قوائے علمیہ کا برگزیدہ ہونا لازم آئے گا جس سے ان کی معصومیت کا اقرار کرنا پڑیگا۔(گفتگوئے مذہبی ص:۱۵)

عرب میں آپ سے پہلے کون؟

قرآن مجید کی آیت وان من امة الا خلا فيها نذير اور لكل قوم هاد. سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر عظیم گروہ میں اللہ تعالیٰ نے ہادئ برحق بھیجے ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں کس نبی کی بعثت ہوئی ہے؟ یہ ایک سوال عیسائیت کی طرف سے اسلام پر ہے۔ غالباً مسیحی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جب عرب میں کسی نبی کی بعثت نہیں ہوئی تو قرآن مجید کا دعویٰ غلط ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کی نازل کردہ کتاب نہیں ہے۔ دوسرا مقصد اس سوال کے پس منظر میں یہ ہے کہ قبل بعثت آپ کے اعمال وافعال اللہ تعالیٰ کے احکام ومرضی کے مطابق نہ تھے اس لئے معصومیت میں رخنہ پڑیگا اور معصومیت ثابت نہ ہوگی۔

اس باب میں بھی الامام النانوتوی کا استدلالی رنگ اور طرز فکر وہی ہے جواب تک پیش کیا جاچکا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں اپنے رسول وہادی مبعوث فرمائے اور اپنے احکامات ومرضیات کو اپنے بندوں تک پہونچایا۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر قرن اور ہر زمانے میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت ہو کہ وہ اپنے دوسرے انبیا کی فہرست انسانی ہاتھوں تک پہنچادے۔ یہ تو انسانی جماعتوں اور قوموں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے نبیوں کی تعلیمات اور اعمال کو محفوظ رکھیں اور ان کی تعلیمات کی رہنمائی میں اللہ کے احکام کی تعمیل میں کسی طرح کی غفلت نہ برتیں۔

اس کے برخلاف اگر کسی قوم نے انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات اور ان کی سیرت کو محفوظ نہ رکھا اور مرور ایام کے ساتھ وہ تعلیمات صفحۂ ہستی سے ناپید ہوگئیں تو اس مجرمانہ غفلت کی ذمہ داری اسی قوم پر عائد ہوگی اور اس کو اس جرم کی قرار واقعی سزا ملنی چاہیئے۔ لیکن وہ قوم جو اپنے آباء واجداد کی غفلت کوشیوں کے نتیجہ میں انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات سے ناواقف اور بے بہرہ ہو انصاف یہ ہے کہ وہ مجرموں کے دائرہ سے باہر رہے۔ ہاں ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اس قوم پر اپنے لطف وکرم کی بارش ضرور کرے گا اور وہ قوم جہالت کی تاریکیوں سے نکل کر ہادی برحق کے دائرہ میں ضرور داخل ہوگی۔

قوم عرب بھی نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے اسی طرح کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی، وہ خود کو دین ابراہیمی کا پیروکار اور محافظ تو سمجھتی تھی لیکن دینِ ابراہیمی کیا ہے؟ وہ اس سے بالکل بے خبر تھی۔ یہی حال دین موسوی اور دینِ مسیحی کا بھی تھا کہ یہ ادیان بھی اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہ تھے۔ نہ اصل کتابیں محفوظ تھیں نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مبارک سیرتیں۔ ظاہر ہے ایسے حالات میں جب احکام خداوندی معلوم کرنے کے سارے راستے مسدود ہوں اور انبیاء کی تعلیمات ضائع ہو جانے کی وجہ سے عقل و خرد کو فکری رہنمائی نہ مل رہی ہو اس تاریک دور کے لوگ احکام خداوندی بجانہ لانے کے مجرم کیوں کر ہو سکتے ہیں، یہ جرم تو اس وقت عائد ہوتا جب انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا وجود ہوتا اور ان سے واقفیت حاصل کرنے میں کوئی چیز سدّ راہ نہ ہوتی۔

لیکن الحمد للہ اس تاریک ترین دور میں بھی نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن ہر طرح کے رذائل، شرک، بت پرستی اور کج اخلاقی سے پاک رہا اور آپ کی سلامتی فکر و نظر نے راہ حق کی تلاش میں غار حراء تک پہونچا دیا اور یہیں آپ کو خالق کائنات نے آخری اور عالم گیر رسالت عظمیٰ سے منتخب فرمایا اور ثمرۂ نبوت کے طور پر ایسے معجزات عطا فرمائے جو انبیائے سابقین کے معجزات سے عظیم و برتر تھے۔

معجزات

یوں تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو معجزات عطا فرمائے لیکن معجزات مدار نبوت نہیں ہیں اور نہ کاروبار نبوت معجزات پر موقوف ہے، البتہ معجزات ثمرۂ نبوت ضرور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نبوت عطا کرنے کے بعد حسب ضرورت معجزات کے ذریعہ نبوت کی تائید و حمایت کرتے ہیں۔ ان معجزات سے انبیاء علیہم السلام کی ان صفات کا اظہار ہوتا ہے جو اس مقدس جماعت کو حضرت حق جل مجدہ اپنی صفات کمالیہ کا کوئی حصہ عطا فرما دیتے ہیں۔ معجزات کے ظہور سے اس غالب صفت کا اندازہ ہوتا ہے جو سرچشمۂ فیض سے حاصل ہوتی ہے چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزۂ عصا اور ید بیضا کی اعجوبہ کاری سے صفت تقلیب و تبدیل کا پتہ چلتا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزہ احیاء موتیٰ اور مریضوں کی شفاء سے جان بخشی کے مضمون کا سراغ ملتا ہے لیکن الامام النانوتوی کے نظریۂ استدلال سے یہ بات بالکل عیاں ہے کہ نبیٔ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کو جو معجزات عطا ہوئے وہ انبیاء سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام سے

زیادہ حیرت انگیز اور فائق تھے۔ فرماتے ہیں:

''مگر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بدلالت اعجاز قرآنی وکمال علمی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صفت علم سے مستفید ہیں اور بارگاہ علمی میں باریاب ہیں''۔ (مباحثۂ شاہ جہاں پور: ص ۲۲)

یہ ایک حقیقت ہے کہ علم وہ عظیم صفت ہے جس کا عمل اور کارگزاری کسی دوسری صفت پر موقوف نہیں ہے بلکہ دیگر صفات اپنے عمل اور کاروبار میں صفت علم کی محتاج ہیں، علم کے بغیر اشیاء خورد ونوش بھی استعمال میں نہیں لا سکتے، کیونکہ کھانے پینے سے پہلے اس کا علم ضروری ہے کہ جس چیز کے کھانے یا پینے کا ارادہ کیا جا رہا ہے کیا واقعی وہ کھانے پینے کی چیز ہے یا نہیں۔ چار و ناچار یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ تمام صفات جن کا تعلق غیر سے ہوتا ہے ان میں صفت علم ہی سب سے بلند و بالا ہے۔ اس صفت سے جو شخص جس قدر متصف ہوتا ہے اور اس کی علمی حیثیت جتنی بلند ہوتی ہے اسی قدر وہ ممتاز اور قابل احترام ہوتا ہے۔

یہی حال انبیاء علیہم السلام کا بھی ہے کہ وہ اپنے عہد کے ممتاز علمی مقام پر فائز ہوتے تھے لیکن معجزات کے تناظر میں ان کی دیگر صفات علم کی صفت سے فائق نظر آتے ہیں۔ لیکن نبی آخرالزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس مقدس جماعتِ انبیاء میں سب سے زیادہ علوم کمالیہ عطا کئے گئے اس لئے آپ کے مراتب بھی سب میں زیادہ ہیں اور حق وانصاف یہ ہے کہ جس ذات نبوت کو نور علم سے منور کر دیا گیا ہو سرداری اسی کے شایان شان ہے اور خاتمیت بھی۔ چنانچہ نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم خاتم المرسلین بھی ہیں اور سید المرسلین بھی۔ آپ کی صفتِ علم قرآن مجید اور احادیث کی شکل میں ابدالآباد تک نور ہدایت کی روشنی سے منور کرتی رہے گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور سرداری کی پیشین گوئی پہلے ہی کر چکے تھے کہ ''میرے بعد دنیا کا سردار آنے والا ہے۔'' راقم الحروف نے اپنی کتاب ''بائبل اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم'' میں تمام پیشین گوئیوں کو جمع کر دیا ہے تفصیل اس میں دیکھی جا سکتی ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ آپ کو صرف علمی معجزات سے نوازا گیا اور عملی معجزات سے آپ بہرہ مند نہ تھے بلکہ غور وفکر اور معجزات کے تقابل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ کے عملی معجزات بھی انبیاء سابقین کے معجزات سے زیادہ محیر العقول تھے۔ دیکھئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ

عصا بلاشبہ حیرت انگیز اور تعجب خیز ہے لیکن اسطوانۂ حنانہ اس سے زیادہ تعجب خیز ہے۔ عصائے موسوی میں زندگی کے آثار اس وقت نمایاں ہوئے جب اس کا قالب بدلا اور لاٹھی سانپ بن گئی یعنی اس شکل میں آئی جس میں زندگی اور حرکت ہوتی ہے، اس کے برخلاف اسطوانۂ حنانہ کا قالب نہیں بدلا اور نہ ہی نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خشک لکڑی پر اپنا دست مبارک اظہار معجزہ کیلئے پھیرا اور نہ ہی اس وقت معجزہ دکھانے کی ضرورت تھی۔ ہاں ایک مدت تک آپ اس تنے کا سہارا لیکر خطبہ دیا کرتے تھے۔ اس دست نبوت کی معجزانہ صفت نے اس میں زندگی کی حرارت پیدا کردی اور جدائی کے وقت وہ تنا انسانوں کی طرح بلبلا کر رویا۔ اس کیفیت کو مولانا جلال الدین رومی نے اس طرح واضح کیا ہے:

استن حنانہ از ہجر رسول — نالہ می کردے چوں ارباب عقول

گفت پیغمبر چہ خواہی اے ستوں — گفت جانم از فراقت گشت خوں

اسی طرح دیگر معجزات کا مقابلہ کرنے کے بعد نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی معجزات کی فوقیت اور برتری واضح ہوجاتی ہے۔ بلاشبہ حضرت مسیح علیہ السلام کی مسیحائی سے بہت سے بیمار شفایاب ہوئے اور بہت سے مردے زندہ ہوئے۔ یہ عظیم معجزات آپ کی نبوت کے واضح دلائل ہیں لیکن نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پھیرنے اور لعاب دہن لگانے سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ ٹھیک ہوجانا اور آنکھوں کی تکلیف کا دور ہوجانا، معجزات مسیح علیہ السلام سے برتر دکھائی دیتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قم باذن اللہ کہہ کر مردوں کو زندہ کیا کرتے تھے اور نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال جسمانی کی برکت سے بیمار شفایاب ہورہے تھے۔ دونوں میں جو واضح فرق ہے وہ سامنے ہے۔ یہ دو معجزات بطور استشہاد پیش کئے گئے ہیں ورنہ معجزۂ انشقاق قمر عملی معجزات میں سرفہرست ہے، انبیاء سابقین میں حضرت یوشع علیہ السلام کے اعجاز سے آفتاب ایک جگہ دیر تک ٹھہرا رہا اور ایک نبی کے اعجاز سے آفتاب غروب ہونے کے بعد لوٹ آیا۔ یہ دونوں معجزات اتنے حیرت انگیز نہیں ہیں جتنا محیر العقول معجزۂ انشقاقِ قمر ہے۔ کیوں کہ ہر جسم کا جسمانی تقاضا سکون ہے اور حرکت طبعی تقاضے کے خلاف ہے، اس لئے اگر کوئی جسم حرکت میں ہے پھر اس کی یہ حرکت بند ہوگئی اور سکون ہوگیا تو اس کا طبعی تقاضا ہی یہی تھا اس لئے سکون تعجب خیز بات نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی چیز آگے جاتی ہوئی پیچھے پلٹ آئی تو اس میں بھی اچنبھے کی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو حرکت معکوس کہیں گے،

اس کے علی الرغم کسی جسم کا پھٹ جانا اس کی طبیعت کے خلاف ہے اس لئے حیرت انگیز بھی زیادہ ہے، الامام النانوتویؒ فرماتے ہیں:

پھٹ جانا تو ہر جسم کے حق میں خلاف طبیعت ہے اور سکون کسی جسم کے حق میں بحیثیت جسمی خلاف طبیعت نہیں بلکہ حرکت ہی خلاف طبیعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جیسے اجسام کے پھٹ جانے کیلئے اور اسباب کی حاجت ہوتی ہے ایسے ہی حرکت کیلئے بھی اور اسباب کی ضرورت پڑتی ہے اور سکون کیلئے کسی اور سبب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ (مباحثہ ۲۸)

عملی معجزات کے تقابلی مطالعہ کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ انبیاء سابقین علیہم السلام کو حیرت انگیز عملی معجزات عطا کئے گئے تھے اور علمی معجزہ جو قرآن کریم کی شکل میں موجود ہے اور بے شمار بندگان خدا کے سینوں میں محفوظ ہے وہ کسی نبی کو بارگاہ علیم وخبیر سے عطا نہیں ہوا اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی، یہی وجہ ہے کہ سابقہ آسمانی کتابیں اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں ہیں صرف ان کے تراجم دستیاب ہیں وہ بھی محرف اور حد درجہ مشکوک ہیں۔

اس کے برخلاف قرآن کریم کو محفوظ رکھنے کی ضرورت تھی تا کہ آخری رسالت کی تعلیمات سے دنیا ابد تک مستفید ہوتی رہے۔ اس موقعہ پر یہ اشارہ کر دینا بھی ضروری ہے کہ قرآن کریم وہ لازوال علمی خزانہ ہے جس نے بے شمار عالی دماغ انسانوں کو سیکڑوں علوم وفنون ایجاد کرنے پر مجبور کر دیا۔ کسی نے اس کی ادبی خصوصیات کو اپنا موضوع بنایا تو کسی نے ذات وصفات پر بحث ونظر کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا۔ کسی نے آخرت کو اپنا موضوع بنایا تو کسی نے احوال برزخ پر قلم اٹھایا۔ کسی نے علم اور اخلاق پر اپنے توسن فکر کو مہمیز کیا تو کسی نے قرآنی جغرافیہ پر نظر ڈالی۔ کسی نے قرآنی حیوانات کو موضوع تحقیق بنایا تو کسی نے نباتات قرآنی پر اپنی فکری توانائیاں صرف کیں۔ کسی نے شخصیات قرآنی پر نگاہِ تحقیق ڈالی تو کسی نے نظمِ قرآن کو اپنا موضوع بنایا۔ کسی نے قرآنی تاریخ کو موضوع تحقیق بنایا تو کسی نے حکمت وفلسفۂ قرآنی پر فکر وتدبر کیا۔ یہ علوم وفنون قرآن کریم کے اعجاز کی بجائے خود شہادت پیش کر رہے ہیں اور یقین دلاتے ہیں کہ یہی کتاب کلام الٰہی ہے اور اسی کی تعلیمات پر عمل کرنا موجب نجات اور عقل کا تقاضا ہے۔

لیکن اس طرح کے دو اور دو چار کی طرح واضح استدلال اور معجزات کے تقابلی مطالعہ کی تاب

مسیحی علماء نہ لاسکے اور یہ اعتراض کیا کہ معجزات محمدی کا ثبوت آپ کو قرآن سے دینا تھا۔ قرآن سے آپ نے ثبوت نہیں دیا۔

الامام النانوتوی نے اس پورے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے فرمایا:

اول تو (معجزات کا) قرآن شریف میں مذکور ہونا کوئی شرط ثبوت نہیں، روایت صحیح چاہئے، سو بحمداللہ روایاتِ احادیث اسلام جن میں اکثر معجزات محمدی منقول ہیں ایسے صحیح ہیں کہ تورات و انجیل کی روایات اس کے ہم پلہ نہیں ہوسکتیں۔ علاوہ بریں معجزۂ انشقاق قمر اور پیشین گوئی خلافت وغیرہ قرآن شریف میں نہیں اور کاہے میں ہیں؟ (مباحثہ ۳۸)

الامام کا معارضہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے لوگ انبیاء علیہم السلام اور اوتاروں کے معجزات اور کرشمے بیان کرتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی کتابیں صحت وتواتر کے معیار پر پوری نہیں اترتیں اس کے باوجود عیسائیوں اور ہندوؤں کا ان پر ایمان ہے، تو قرآنِ کریم اور احادیث صحیحہ میں جو معجزات بیان کئے گئے ہیں ان پر ایمان لانا ازبس ضروری ہے۔ توریت اور انجیل کے صحیح ہونے کی سند آج کسی کے پاس موجود نہیں ہے۔ نہ ہی یہ معلوم ہے کہ یہ کتابیں کس زمانے میں لکھی گئیں اور ان کتابوں کے راوی کون کون اور تعداد میں کتنے ہیں۔ اس کے برخلاف قرآن وحدیث کی صحت اور ان کے اسناد کا حال یہ ہے کہ ہم سے لے کر نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم تک راویوں کی تعداد معلوم، نسب اور سکونت معلوم، اس کے ساتھ ساتھ ان راویوں کے مفصل حالات، ان کی عدالت وثقاہت اور حافظہ کی کیفیت معلوم ہے، ایسی صورت میں تورات وانجیل تو معتبر ہوجائیں اور قرآن وحدیث کا اعتبار نہ کیا جائے ایک طرفہ تماشا ہی تو ہے۔

افضل کون؟

ایک اور اعتراض عیسائیوں نے درود ابراہیمی کا سہارا لے کر کیا ہے کہ اس سے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا افضل ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ تشبیہ میں مشبہ بہ، مشبہ سے افضل ہوا کرتا ہے۔

اس اعتراض کی حیثیت ڈوبتے کو تنکے کا سہارا سے زیادہ نہیں ہے۔ الامام نے عقلی دلائل کی روشنی میں یہ واضح کردیا ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کمالات علمیہ اور عملی معجزات کے پیش نظر افضل الانبیاء اور خاتم الانبیاء ہیں۔ اس مضبوط استدلال پر تو کسی مسیحی کو لب ہلانے کی جرأت نہ

ہوئی تشبیہ اور مشبہ بہ کی بحث چھیڑ دی۔ بظاہر تو سوال طاقتور اور افضلیت کے حق میں قابل اعتنا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تشبیہات مجازی میں مشبہ بہ کا افضل ہونا ضروری ہے، تشبیہات حقیقی میں مشبہ، مشبہ بہ کا وجہ شبہ میں برابر ہونا لازمی ہے۔ کوئی کسی سے کم یا زیادہ نہ ہو ورنہ تشبیہ غلط ہوگی۔ درود ابراہیمی میں تشبیہ مجازی نہیں تشبیہ حقیقی ہے۔ لیکن اس سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم علیہ السلام دونوں مرتبے میں برابر ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ تشبیہ فی النسبۃ میں نسبت کا مساوی ہونا تو ضروری ہے لیکن منسوب الیہ اور منسوب کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے، جیسے ایک کو دو کے ساتھ جو نسبت ہے وہی ایک کروڑ کو دو کروڑ کے ساتھ نسبت حاصل ہے اور قاعدہ تشبیہ کے مطابق نسبت مساوی بھی ہے اس کے باوجود ایک کو ایک کروڑ کے ساتھ اور دو کو دو کروڑ کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تشبیہ فی النسبت میں نسبت کا برابر ہونا ضروری ہے اطراف کا برابر ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کی دوسری مثال سامنے رکھئے جو عام طور پر بولی جاتی ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ یعنی روح اچھی ہے تو رحمت کے فرشتے روح قبض کرنے آتے ہیں اور اگر روح بری ہے تو قبض روح کے لیے عذاب کے فرشتے آتے ہیں۔ اس مثال کو بولتے ہوئے سب یہ سمجھتے ہیں کہ کہاں انسان کی روح اور کہاں فرشتے۔ نسبت میں تساوی تو ہے لیکن مراتب میں نمایاں فرق ہے یہی کیفیت درود ابراہیمی میں بھی ہے کہ نسبت میں تساوی کے باوجود مراتب میں تفاوت ہے۔ اس استدلال کے ساتھ الامام النانوتوی ایک اور نکتے کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ وہ نکتہ الامام کے الفاظ ہی میں ملاحظہ فرمائیے:

> سو اسی طرح درود شریف میں بھی خیال فرمالیجئے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ جیسے درویشی اور طریقت کے سلسلے متعدد ہیں ایسے ہی نبوت کے سلسلے بھی متعدد ہیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک سلسلہ میں ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چلا اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا اور حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک سلسلہ میں ہیں۔ یہ سلسلہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے چلا اور دور تک چلا گیا۔ مگر سلسلۂ اول میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بمنزلۂ تخم سمجھئے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بمنزلۂ درخت کامل سمجھئے جس میں شاخ و

برگ، پھول پھل سب موجود ہوں۔ علیٰ ہذا القیاس سلسلۂ ثانی میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو بمنزلۂ تخم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بمنزلۂ درخت کامل خیال فرمائیے او، پھر فرمائیے کہ باوجود امکان صحت تشبیہ تساوی کیوں کر لازم آتی ہے اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کس طرح ہاتھ سے جاتی ہے؟ (مباحثہ: ۴۵)

یہ وہ چار اعتراضات تھے جن پر مسیحیوں کو ناز تھا، لیکن وہ کس قدر بے وزن اور کمزور تھے وہ جوابات کی روشنی میں سب کو نظر آ گئے ہیں، رہا مسلمانوں کا دیگر مذاہب کے بارے میں نقطۂ نظر وہ بھی بالکل واضح ہے کہ عہد حاضر کے مذاہب اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے عقائد عقل وہوش کی دنیا میں سراسر بے بنیاد اور مضحکہ خیز ہیں۔ الامام النانوتوی رحمہ اللہ نے اپنی تقریروں میں مذاہب عالم کی ان بنیادی خامیوں پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ آپ کا اصرار تھا کہ اگر اثبات وتحقیقِ مذہب مقصد ہے تو پہلے ذات باری میں گفتگو ہونی چاہئے کہ وہ ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو ایک ہے یا متعدد خدا ہیں۔ اس کے بعد صفات باری کو موضوع تحقیق بنایا جائے کہ ذات باری کے مخصوص صفات کیا ہیں؟ کتنی صفتیں پائی جاتی ہیں اور ذات باری میں کتنی صفات درکار ہیں پھر تجلیات باری پر گفتگو کی جائے، ان پر سیر حاصل بحث وتحقیق کے بعد نبوت کو موضوع بحث بنایا جائے کہ انبیاء علیہم السلام کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اور کون نبوت سے سرفراز کیا گیا اور کون نہیں؟ نبوت کس طرح کے اعمال واخلاق کا تقاضا کرتی ہے؟ اس کے بعد احکام پر بحث کی جائے کہ کونسا حکم عقل تسلیم کرتی ہے اور کس سے انکار کرتی ہے لیکن احکام پر بحث وگفتگو بے سود ہے۔ نبوت کے ثابت ہونے اور اس کے متعین ہو جانے کے بعد اس کی گنجائش نہیں رہتی کہ عقل نارسا کو احکام کی بھلائی اور برائی کو پرکھنے کیلئے استعمال کیا جائے۔ مگر اصرار کے باوجود ہندو اور عیسائی علماء اس اصولی گفتگو پر آمادہ نہیں ہوئے بلکہ ہر فریق سے تقریر کا مطالبہ کیا گیا اور تقریر ہی کے کسی گوشہ کو موضوع بحث بنا لیا گیا۔ الامام النانوتویؒ نے اپنی تقریروں میں اسی ترتیب کو پیش نظر رکھا اور عقائد پر ایسی مدلل ومعقول تقریر فرمائی کہ اس پر کسی فریق کو اعتراض کی گنجائش نہیں ملی، البتہ الامام نے اپنی تقریروں میں ہندو اور عیسائی عقائد پر وہ اعتراضات کئے جو آج تک قائم ہیں۔ ان کا کوئی جواب عیسائی دنیا اب تک نہیں دے سکی اور نہ درحقیقت ان کا کوئی جواب ہے۔ ذیل میں الامام کے چند اعتراضات ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفارہ ہو جانا ممکن نہیں یعنی یہ بات جو عیسائیوں کے اعتقاد میں جمی ہوئی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام امتیوں کی طرف سے ملعونِ خدا ہوئے نعوذ باللہ اور تین دین ان کی وجہ سے جہنم میں رہے ہرگز قرین عقل نہیں۔

۲۔تثلیث مخالف عقل ہے۔کسی مذہب میں ایسا مخالف عقل مسئلہ نہیں ہے۔

۳۔قرآن شریف میں بیشک تورات وانجیل کی تصدیق ہے مگر اُس تورات وانجیل کی تصدیق ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں۔وہ تورات وانجیل میں مذکور نہیں جو آپ صاحبوں کے ہاتھ میں ہے۔اس کا اعتبار نہیں کیونکہ اس میں تحریف یعنی تغیر و تبدل واقع ہو چکی ہے۔

الامام کے ان اعتراضات کا کوئی جواب عیسائی دنیا کی طرف سے آج تک سامنے نہیں آیا۔
عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تختۂ دار پر اپنی جان قربان کر کے اپنے امتیوں کے گناہوں کا کفارہ بن گئے۔عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی۔بائبل میں ہے کہ:

> مسیح جو ہمارے لئے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔(گلتیوں:۳/۱۳)

الامام فرماتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کفارہ ہو جانا ممکن نہیں ہے اور عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ وہ ملعون ہوئے اور تین دن جہنم میں رہے قرین عقل نہیں ہے۔ایک طرف تو حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا اور محبوب کہنا دوسری طرف ان کو ملعون و معذب سمجھنا کہاں کی دانشمندی ہے۔محبوب میں کوئی وجہ محبت ضرور ہوتی ہے اسی طرح دشمن میں سبب عداوت بھی ہوتا ہے۔مرحوم ہے تو اس میں وجہ رحمت بھی ہوگی اور ملعون ہے تو اس میں لعنت کا سبب بھی ہوگا۔یہ کیوں کر ممکن ہے کہ حسن و خوبصورتی تو کسی میں نظر آئے اور محبوب کسی بدصورت اور کریہ المنظر کو بنایا جائے۔اطاعت و فرماں برداری کوئی کرے اور اطاعت کا انعام نافرمان کو ملے۔بدصورتی کی بنا پر نفرت اور ہیبت جس سے ہونی چاہئے اس کے بجائے نفرت حسن خداداد سے ہو جائے عقل میں سمانے والی بات نہیں ہے۔اسی طرح مجرم کوئی اور ہو اور سزا بے قصور کو ملے عقل اس سے بھی اباء کرتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور اس کے مطیع و فرماں بردار

ہیں، کسی طرح کا کوئی گناہ ان سے سرزد نہیں ہوا اور مسیحیوں کے اعتقاد میں خدا کے بیٹے ہیں تو باپ بلاوجہ اپنے محبوب بیٹے کو سزا دے کر رسوا کیوں کرے گا۔ جبکہ مسیحی بھی خدا کو راستباز اور عادل وصادق مانتے ہیں۔ اور یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ خدا کو نفرت شریروں سے ہے۔ امثال ۱۵/۹۔۲۶ میں ہے:

''برے منصوبوں سے خدا کو نفرت ہے'' ''شریروں کی روش سے خدا کو نفرت ہے (لاہوری نسخہ) یہ بھی مانتے ہیں کہ انسانوں کے گناہ کی وجہ سے خدا نظر نہیں آتا۔ وہ روپوش ہے۔ (دیکھئے یسعیاہ ۵۹/۲)

''تمھارے گناہوں نے اسے تم سے روپوش کر دیا'' وہ راستباز اور سچا ہے، اس کے فیصلے برحق ہیں۔ (دیکھئے زبور ۱۱۹/۱۳۷)

''اے خداوند تو صادق ہے اور تیرے احکام برحق ہیں''

اس کے باوجود کسی بے قصور کو سزا دینا یہ ثبوت فراہم کرتا ہے کہ توریت وانجیل محرف ہیں ورنہ کلام خداوندی میں تضاد بیانی نظر نہ آتی۔ اسلامی اور مسیحی دونوں نقطۂ نظر اس بات پر متفق ہیں کہ بے قصور کو سزا نہیں دیجاتی اور مسیحیت تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا محبوب مانتی ہی ہے کیونکہ بائبل میں ''خدا کا بیٹا مجازی معنی میں مستعمل ہے یعنی محبوب۔ اس کا ثبوت خود بائبل فراہم کرتی ہے۔ دیکھئے۔

''سرائیل خدا کا بیٹا ہے'' ''اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پہلوٹھا ہے'' (لاہوری نسخہ زبور۔ خروج باب ۴ آیت ۲۲)

''داؤد خدا کا بڑا بیٹا ہے۔'' ''اور میں اس کو اپنا پہلوٹھا بناؤں گا'' (باب ۸۹ آیت ۲۶۔۲۷)

''سلیمان خدا کا بیٹا ہے''۔ (تاریخ اول باب ۲۲ آیت ۹۔۱۰)

''قاضی مفتی خدا کے بیٹے ہیں''۔ (زبور باب ۸۲ آیت ۶)

''سب بنی اسرائیل خدا کے بیٹے ہیں''۔ (رومیوں باب ۹ آیت ۴)

''تمام یتیم بچے خدا کے لڑکے ہیں''۔ (زبور باب ۶۸ آیت ۵)

''بدکار لوگ خدا کے لڑکے ہیں''۔ (یسعیاہ باب ۳۰ آیت ۱)

اسی طرح کتاب مقدس یہ ثبوت بھی فراہم کرتی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اصلاً انسان کے بیٹے ہیں خدا کے ''حقیقی'' بیٹے نہیں مجازی فرزند ہیں۔ چند حوالے ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) یسوع مسیح ابن داؤد بن ابراہیم (متی ۱/۱)

(۲) انسان کا بیٹا کھاتا پیتا آیا۔ (متی ۱۱/۱۹)

(۳) مسیح اپنے تئیں ابن آدم کہتا ہے۔ (متی ۸/۲۰)

(۴) مسیح ابن آدم (متی ۱۲/۸)

یہ محبوبیت اور عزت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت اور کفارہ کو بے بنیاد ٹھہراتی ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ تختۂ دار پر ان یہودیوں نے سازش کے تحت لٹکایا تھا جو حضرت مسیح علیہ السلام کی رسالت پر ایمان نہیں لائے تھے، وہ پھانسی دے کر یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ حضرت مسیح جھوٹے مدعی نبوت ہیں اور اپنے دعوی میں سچے نہیں ہیں۔ اس کی ایک علامت یہ ہے کہ ان کو تختۂ دار پر لٹکایا گیا جبکہ توریت کہتی ہے:

''جو دار پر لٹکایا گیا سو لعنتی ہے۔'' (استثنا ۲۱/۲۳)

فیصلۂ شریعت کے مطابق ملعون نبی نہیں ہوسکتا۔ لیکن پولوس نے اس مصلوبیت کو کفارہ کا رنگ دے دیا۔ یہی غلط فہمی آج تک چلی آ رہی ہے۔ اس کے برخلاف اسلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مصلوبیت کو غلط قرار دیتا ہے۔ الغرض الامام النانوتویؒ نے کفارہ کے اعتقاد کو عقل کی میزان میں بے وزن تو ثابت کیا ہی خود ان کی الہامی کتاب بھی کفارہ کو تحریف والحاق باور کراتی ہے یہی حال عقیدۂ تثلیث کا بھی ہے، جس کا ثبوت محرف توریت وانجیل بھی بہم نہیں پہنچاتی۔

تثلیث

الامام النانوتوی کا عقلی استدلال اس عقیدے کے سراسر خلاف عقل ہونے پر گزر چکا ہے۔ اس موقعہ پر الامام کے اس دعوی کا بائبل سے ثبوت فراہم کرنا ہے کہ عقیدۂ تثلیث انجیل میں الحاقی ہے۔

یوحنا باب پانچ درس ۷ میں ہے کہ:

''تین ہیں جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ اور کلام اور روح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں''۔

بحوالہ مباحثہ ۳۹

۱۸۷۰ء میں مرزاپور کی بائبل سوسائٹی نے جو اردو بائبل شائع کی اس میں اس درس کے متعلق حاشیہ میں لکھا ہے کہ..... ''یہ الفاظ کسی قدیم نسخے میں نہیں پائے جاتے''

پادری نولس نے اس فقرہ کو زائد تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے:

بے شک یہ فقرہ زائد ہے اور جو کچھ پادریان مرزاپور نے حاشیہ میں لکھا صحیح و درست ہے۔

(مباحثۂ شاہجہاں پور ص:۴۱)

ظاہر ہے کہ کسی ایک فقرہ کو الحاقی تسلیم کر لینے کے بعد بائبل مشکوک الصحت ہو جاتی ہے اور اس الحاق کی تائید ہوتی ہے کہ عقیدۂ تثلیث اضافہ ہے۔ (دیکھئے: تیمتھیس باب ۲ درس ۵)

''کیونکہ خدا ایک ہے''۔

وہ ہر جگہ موجود ہے۔ کوئی چیز اس سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ (دیکھئے: یرمیاہ: ۲۳/۲۴)

کیا کوئی آدمی پوشیدہ جگہوں میں چھپ سکتا ہے کہ میں اسے نہ دیکھوں، خداوند فرماتا ہے کیا زمین و آسمان مجھ سے معمور نہیں؟

خدا قادر مطلق ہے۔ ساری کائنات اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ (دیکھئے: متی ۱۹/۲۰ بحوالہ خوشحال زندگی کی راہ ص ۸ مطبوعہ نئی دہلی) وہ ہر چیز پر حاوی ہے ساری چیزیں اس کے قبضہ میں ہیں۔ خدا کے بیٹے یسوع مسیح نے خود کہا ہے خدا سے سب ہو سکتا ہے۔

خدا پر ہر چیز منکشف ہے اور وہ عالم الغیب ہے۔ (دیکھئے: امثال ۱۵/۳)

خداوند کی آنکھیں ہر جگہ ہیں اور نیکیوں اور بدوں کی نگراں ہیں۔

خدا ازلی و ابدی ہے اور وہی واجب الوجود ہے۔ (دیکھئے: زبور ۹۰/۲)

اس سے پیشتر کہ پہاڑ پیدا ہوئے یا زمین اور دنیا کو تو نے بنایا ازل سے ابد تک تو ہی خدا ہے۔

خدا کی ذات و صفات میں کوئی تبدیلی ناممکن ہے۔ (دیکھئے: ملاکی ۳/۶)

میں خداوند لاتبدیل ہوں۔

پولوس رسول توحید کا اقرار کرتے ہوئے کہتا ہے:

اگرچہ فضا میں اور زمین پر ایسے ہیں جو خدا کہلاتے ہیں چنانچہ یوں بہتیرے خدا اور بہتیرے خداوند ہیں لیکن ہمارے نزدیک فقط ایک ہی خدا ہے یعنی باپ۔ (۱۔ کرنتھیوں ۸/۵)

اس سے آگے کہتا ہے:

جس کی طرف سے چیزیں ہمیں ملیں اور اسی کے ہم ہیں۔ (۱۔ کرنتھیوں ۸/۶)

پولوس رسول یہ بھی کہتا ہے کہ:

خدا ایک ہے اور خدا اور آدمیوں کے بیچ میں ایک آدمی بھی درمیانی ہے اور وہ یسوع مسیح ہے جو انسان ہے۔(ا۔ تیمتھیس ۲/۵)

توحید کی مزید وضاحت کرتا ہے:

سب کا خدا اور باپ ایک ہی ہے جو سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور سب کے اندر ہے۔ (افسیون ۴/۵)

یہ چند حوالے عہد نامۂ قدیم اور عہد نامۂ جدید سے نقل کئے گئے ہیں جو خدا کی وحدت، وحدانیت اور بساطت کے ثبوت کیلئے کافی ہیں۔ عہد نامہ قدیم میں تو بے شمار مواقع پر توحید اور باری تعالیٰ کی صفات کا اقرار کیا گیا ہے اور شرک و بت پرستی کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی گئی ہے بلکہ اس کی بھی صراحتیں موجود ہیں کہ بنی اسرائیل کو شرک و بت پرستی اور دیگر بداعمالیوں کے نتیجے میں طرح طرح کے عذاب میں مبتلا کیا گیا۔ راقم کی کتاب ''توریت اور یہود اپنے آئینے میں'' تفصیل کیلئے دیکھی جاسکتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تثلیث کے تعلق سے الامام کے چند فقروں کو سنا کر تحریف کا ثبوت بہم پہنچایا جائے۔ الامام النانوتوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اب ذرا کان دھر کے سنئے! کہ نصاریٰ جیسے اس بات کے قائل ہیں کہ عالم کے خدا حقیقت میں تین ہیں، ویسے ہی اس بات کے بھی قائل ہیں کہ وہ تینوں حقیقت میں ایک بھی ہیں۔ اور اس بات کے اثبات کیلئے سوا اس کے کہ انجیل میں ہے یا ہم اپنے باپ دادوں سے سنتے چلے آئے ہیں، کوئی دلیل بیان نہیں کرتے۔ اور ادھر عقل کے نزدیک تین کا حقیقۃً ایک ہونا اور ایک کا تین ہونا ایسا ظاہر البطلان ہے کہ جیسا دن کا رات ہونا اور رات کا دن ہونا بلکہ اس سے بھی زیادہ، حتی کہ عقل کے نزدیک ظاہر البطلان ہونے میں اس سے زیادہ نہیں، یہاں تک کہ دو کے ایک ہونے کے محال ہونے میں اور اسی طرح چار، پانچ، چھ، سات وغیرہ کے ایک ہونے کے باطل ہونے میں نصاریٰ بھی سارے جہاں کے شریک ہیں۔ پر تین کے ایک ہونے میں انجیل کے مقابلے میں کسی کو تو کیا اپنی عقل کی بھی نہیں سنتے۔'' (تقریر دل پذیر ص ۳۲۔۳۳، مطبوعہ شیخ الہند اکادمی دیوبند)

تحریف

الامام النانوتوی نے میلۂ خداشناسی میں انجیل کو محرف قرار دیا اور پادری نولس سے تحریف کا اقرار بھی کرایا۔ اس مباحثہ کے علاوہ "تقریر دل پذیر" وغیرہ میں بھی الامام نے تحریف کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اور موجودہ اناجیل کو خدا کی کتاب ماننے سے گریز کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی شہادت کے ساتھ ساتھ بائبل کے اندرونی اختلافات اور متضاد عبارتوں پر الامام کی گہری اور وسیع نظر تھی۔ گو ہمیں تحریری طور پر مفصل گفتگو دستیاب نہیں ہوسکی لیکن اناجیل کی تاریخ تدوین کے تعلق سے الامام نے جو سوالات پیش کیے ہیں وہ بجائے خود اس موضوع پر دستگاہ کامل کا پتہ دیتے ہیں۔ ہم ذیل میں انھی سوالات کی روشنی میں سب سے پہلے مسیحی علماء کی تحریریں اختصار کے ساتھ عہد نامۂ جدید (اناجیل) کے تعلق سے پیش کرتے ہیں کہ وہ اپنی مقدس کتابوں کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

پادری ڈبلو. ایچ گرڈز صاحب لکھتے ہیں:

> "یہ کہنا کس قدر غلط ہے کہ انجیل یا کوئی کتاب مسیح پر نازل ہوئی وہ خود کلام تھا یہ نہیں کہ کلام اس کے پاس تھا۔" (الہام: ۵۰)

یہ مسئلہ تو صاف ہوا کہ حضرت مسیح علیہ السلام پر کلام خداوندی نازل نہیں ہوا تھا اور رہی بات حضرت مسیح علیہ السلام کے سراپا کلام ہونے کی وہ اناجیل سے ثابت ہے کہ حضرت مسیح کلام نہیں تھے کلام ان پر نازل ہوتا تھا۔ (دیکھئے: یوحنا ۱۵/۱۵)

> اس لئے جو باتیں میں نے باپ سے سنیں وہ سب تم کو بتادیں۔

اسی یوحنا میں دوسرے موقعہ پر ہے کہ:

> "میں نے تیرا کلام انہیں پہنچادیا۔" (یوحنا ۱۴/۱۷)

اسی یوحنا میں یہ بھی ہے کہ:

> "کیونکہ جو کلام تو نے مجھے پہنچایا وہ میں نے ان کو پہنچایا"۔ (یوحنا: ۸/۱۷)

ان حوالوں سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کلام نہیں تھے بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان پر بھی دیگر انبیاء علیہم السلام کی طرح اپنا کلام نازل فرمایا:

اس سے بھی زیادہ صاف وصریح اور غیر مبہم الفاظ یہ ہیں۔

کیونکہ میں نے کچھ اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ باپ جس نے مجھے بھیجا ہے اسی نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ کیا کہوں اور کیا بولوں اور میں جانتا ہوں کہ اس کا حکم ہمیشہ کی زندگی ہے بس جو کچھ میں کہتا ہوں باپ نے جس طرح مجھ سے فرمایا ہے اسی طرح کہتا ہوں۔ (یوحنا ۱۲/ ۵۰۔۴۹)

اس جملہ معترضہ کے بعد انہی پادری ڈبلیو ایچ گرڈز کی تحقیق سماعت فرمائیے:

یوحنا کے مکاشفہ کے علاوہ ایک بھی کتاب انجیل میں نہیں ہے جس کا یہ دعوی ہو کہ اس کے مصنف پر یہ کتاب نازل ہوئی ہے یا اس کے مصنف کو خدا نے لکھنے کیلئے مامور کیا تھا۔ مقدس پولوس کے خطوط کی مانند چند کتابوں میں بے شک صفائی سے الٰہی ہدایت کے زیر اثر ہو کر لکھنے کا دعوی کیا ہے۔ لیکن دیگر کتابوں میں جن میں چند نہایت ضروری کتابیں شامل ہیں۔ مصنف نے کہیں ایسا دعوی نہیں کیا اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ ان کے مصنفوں نے یونہی یا اپنی مرضی سے حسب موقع ان کو تحریر کیا ہے۔ الہام ص ۴۴

ایک دوسرے پادری ڈاکٹر ایچ یوسٹینٹن صاحب لکھتے ہیں:

اناجیل اربعہ کو بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خداوند مسیح کے بعض اقوال اور اس کی زندگی کے واقعات کا ایک مجموعہ کہا جاسکتا ہے۔ (دیباچہ تفسیر متی ص:۱۲)

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ انجیل جو اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل کی تھی وہ ضائع ہوگئی اور موجودہ اناجیل اربعہ میں عرصہ دراز کے بعد سنے سنائے اقوال کو مرتب کردیا گیا ہے۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام کے شاگرد مسیحیوں کے خیال میں اتنے ناخواندہ اور پسماندہ تھے کہ ان کو صحت کے ساتھ مرتب نہ کرسکے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بے عقل بھی تھے۔ ملاحظہ فرمائیے پادری ڈاکٹر جیمس سٹاکر کے الفاظ:

(مسیح) جس کو وہ اپنے پیچھے اپنا قائم مقام ہونے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ وہ ناخواندہ چھوٹے تھے اور عموماً سب صاحب عقل نہ تھے۔ (حیات پولوس ص:٦)

یہ خیالات اناجیل کے پورے مجموعے سے متعلق ہیں۔ ان کے علاوہ اناجیل اربعہ، متی، مرقس، لوقا اور یوحنا پر عیسائی محققین نے تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ان مصنفین کے حالات اور سن تصنیف لامعلوم ہیں۔ یہی حال عہد نامہ جدید میں شامل پولوس کی

کتاب اعمال اور اس کے خطوط کا بھی ہے جس میں کوئی تاریخی ترتیب نہیں ہے۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے۔ اس لئے اسی مشتے نمونہ از خروارے پر اکتفا کرتے ہوئے چند اندرونی شہادتیں ملاحظہ فرمایئے جو تحریف وتبدل اور اختلاف وتضاد کی آئینہ دار ہیں۔

(۱) چونکہ بنی اسرائیل میں نسب نامہ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کا لحاظ رکھتے ہوئے متی نے اپنی انجیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نسب نامہ تحریر کیا ہے۔ پہلے باب کے درس ۱۵ میں حضرت مسیح کے باپ یوسف کے باپ کا نام یعقوب بتایا ہے یعنی دادا کا نام یعقوب تھا۔ اس کے بالکل متضاد لوقا نے اپنی انجیل میں دادا کا نام عیلی بتایا ہے۔ (دیکھئے: لوقا ۳/۲۴)

(۲) متی نے اپنی انجیل میں لکھا ہے کہ سلیمان کی اولاد میں سے یوسیاہ پیدا ہوا اور اس سے یکونیا پیدا ہوا اس سے سیالتی ایل پیدا ہوا۔ متی ۱/۷۔۱۲ یعنی سیالتی ایل کا باپ یکونیاہ تھا اور اس کا باپ یوسیاہ لیکن لوقا کہتا ہے سیالتی ایل کا باپ نیری تھا۔ اس کا باپ ملکی تھا۔ (لوقا ۳/۲۷۔۳۱)

دونوں میں کس نسب نامہ کو صحیح مانا جائے اور کس کو غلط؟ کیا اس کے باوجود انجیل کو معتبر مانا جاسکتا ہے؟

(۳) متی ۱۹/۱۷ میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت مسیح کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا ''اے نیک استاد میں کون سا نیک کام کروں کہ ہمیشہ کی زندگی پاؤں؟'' حضرت مسیح نے فرمایا تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے نیک تو کوئی نہیں مگر ایک خدا'' ...... حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ جواب زبور (۱۱۹/۶۷) کے مطابق تھا کہ ''خدا نیک ہے'' کوئی انسان خدا کے حضور راستباز نہیں اور زبور (۱۴۳/۲) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے لیکن زبور کے اس حوالہ کو بائبل مطبوعہ ۱۹۰۸ء میں یوں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔ ''نیک استاد'' کی جگہ صرف ''استاد'' نیک کو اڑا دیا گیا اور ''تو کیوں مجھے نیک کہتا ہے'' کے بجائے یہ تحریف کی گئی کہ ''تو مجھ سے نیکی کی بابت کیوں پوچھتا ہے؟'' یہ تحریف کیوں کی گئی تا کہ تضاد رفع کیا جاسکے؟ لیکن اس تحریف سے مقصد رسالت ہی فوت ہو گیا۔

(۴) حضرت مسیح علیہ السلام کا متی اور مرقس میں ارشاد ہے کہ:

جس نے میرے نام سے گھر بھائی یا بہن یا ماں یا باپ یا جورو کو چھوڑا سو گنا پاوے گا۔ (متی ۱۹/۳۰، مرقس ۱۰/۲۹)

نئے ایڈیشنوں سے جورو کا لفظ نکال دیا گیا ہے۔ سو گنا جورو دیئے جانے پر بعد میں غور و فکر کیا ہوگا کہ اس طرح تو ہر شخص کو ایک کے بجائے سو بیویاں ملیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ نیقیہ کی کانفرنسوں سے لیکر یہ سلسلہ اب تک جاری ہے کہ ہر نئے ایڈیشن میں تحریف کی جاتی ہے اور عقائد میں بھی ردوبدل کیا جاتا ہے۔ اگر صرف مشینی دور کی تحریفات کی تفصیل پیش کی جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے گی۔ چند تحریفات کا ایک نقشہ بطور نمونہ پیش خدمت ہے۔

	انجیل مطبوعہ ۱۸۹۵ء میں	انجیل مطبوعہ ۱۹۰۸ء	انجیل مطبوعہ ۱۹۴۷ میں دوبارہ ڈال دی گئی۔
۱	متی ۱۸/۱۱ آیت موجود ہے	یہ آیت غائب ہے،	
۲	متی ۱۷/۲۱ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ ڈال دی گئی۔
۳	متی ۲۳/۱۴ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ قوسین میں لکھ دی گئی۔
۴	مرقس ۷/۱۶ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۵	مرقس ۹/۴۴۔۴۶ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۶	مرقس ۱۱/۲۶ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۷	لوقا ۲۳/۱۷ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۸	لوقا ۱۷/۳۶ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۹	یوحنا ۵/۴ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔
۱۰	اعمال ۸/۳۷ آیت موجود ہے۔	غائب ہے	دوبارہ لکھ دی گئی۔

یہ تحریفات صرف تین مطبوعات سے بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں۔ چند ایڈیشنوں کا مزید مقابلہ کیا جائے تو تحریفات کی تعداد کتنی ہوگی نہیں کہا جاسکتا۔ الامام النانوتویؒ نے تحریف کے سلسلہ میں جو سوالات قائم کیے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ان کیلئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے جو کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ حالات نے مساعدت کی تو انشاءاللہ الامام النانوتوی کے سوالات کی الگ سے تحقیق پیش کرنے کی سعادت حاصل کی جائے گی۔ سردست الامام النانوتویؒ کی استدلالی فکر کے زاویوں کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسی پر اکتفا کرتے ہوئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ:

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

مولانا اسعد اسرائیلی (فاضل دیوبند)*

ہندوستانی غیر مسلموں کے اشکالات اور حضرت نانوتوی کے جوابات

نوٹ: یہ مقالہ محترم مولانا اسعد اسرائیلی کے وقیع وطویل مقالے کا ایک حصہ ہے جو اپنے آپ میں ایک مکمل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مکمل مقالے کو کتاب کی شکل میں بھی تنظیم کی طرف سے جلد ہی شائع کیا جائے گا۔ (ادارہ)

اس مقالے میں ہندوستانی غیر مسلموں سے مراد وہ غیر مسلم ہیں جو حضرت نانوتویؒ کے دور میں ہندو دھرم کے پرچار کے لئے اسلام کی مخالفت کررہے تھے، مسٹر تارا چند (جس سے حضرت نانوتوی کا پہلا مناظرہ ہوا) جیسے ہندستانی غیر مسلم جو یہاں عیسائیت کا پرچار کررہے تھے اس مقالے کے موضوع سے خارج ہیں، اس اعتبار سے جہاں تک ہندستانی غیر مسلموں سے مباحثہ ومناظرہ کا تعلق ہے حضرت نانوتوی کا پہلا مباحثہ قیام دارالعلوم دیوبند کے ۹ سال بعد ۷رمئی ۱۸۷۶ء کو چاندا پور (شاہ جہاں پور) میں ہوا۔ اس کی پوری تفصیل میلۂ خداشناسی کے نام سے شائع ہوئی ہے، اس واقعہ کا پس منظر اور واقعات مختصراً اس طرح ہیں۔

۱۸۷۵ء میں بنارس سے سوامی دیانند کی مشہور کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' شائع ہوئی، اس سے قبل سوامی دیانند کا چرچا سارے شمالی ہندوسان میں ہورہا تھا، اخبارات میں ان کے لکچرز اور بیانات شائع ہورہے تھے، سوامی جی اسلام اور عیسائیت دونوں کو اپنا نشانہ بنارہے تھے، ان کی کتاب ستیارتھ پرکاش میں بھی دونوں مذاہب پر متعدد اعتراضات کئے گئے تھے، مسلمانوں کے بارے میں اُن کا یہ فقرہ مسلمانوں میں سخت اشتعال پھیلا رہا تھا کہ مسلمان بڑے بت پرست اور پورانی اور جینی

---

* ہلالی سرائے، سنبھل ضلع مرادآباد (یوپی)

چھوٹے بت پرست ہیں۔ یہ فقرہ آج بھی اُن کی کتاب ستیارتھ پرکاش میں موجود ہے۔ پنڈت جی کے اس طرح کے اعتراضات والزامات سے مسلمانوں میں سخت ہلچل مچی ہوئی تھی۔اس کتاب کا کوئی باقاعدہ جواب بھی نہیں آیا تھا۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری کی طرف سے اس کا جواب ''حق پرکاش'' ۱۹۰۷ء میں منظرعام پر آسکا۔

ہندوستان میں اسلام پر اعتراضات کی شروعات سب سے پہلے مرادآباد کے ایک شخص پنڈت اندرمن نے کی، جوتھوڑی بہت اردو اور فارسی کے ذریعے اسلامی تعلیمات وروایات کا مطالعہ کرسکے تھے۔ پنڈت اندرمن نے اسلام اور مسلمانوں پر حملے شروع کیے۔ مرادآباد ضلع میں قصبہ بچھرایوں کے ایک عالم مولانا محمد علی صاحب اُن کے مقابلے میں ہندو مذہب کی تعلیمات وروایت کو موضوع بحث بناتے تھے۔مولانا بچھرایونی کی کتاب سوط الله الجبار ہندوستان میں پہلی تصنیف تھی جس میں پنڈت اندرمن کی ہرزہ سرائیوں کا جواب دیا گیا تھا،اس کے بعد ۱۸۵۱ء میں تحفة الهند ایک نومسلم بزرگ کی پہلی کتاب شائع ہوئی تھی، جو اسی موضوع پر تھی۔

پنڈت اندرمن اپنی کم علمی اور مفلسی کی وجہ سے اپنی تحریک کو زیادہ نہیں پھیلا سکے، وہ تقریر کی صلاحیت سے بھی محروم تھے،اس لئے جلسوں سے خطاب نہیں کرسکتے تھے۔ اہل مرادآباد کی کوشش سے پنڈت جی کی کتب پر پابندی بھی لگ گئی تھی اور ۵۰۰ روپے کا جرمانہ بھی حکومت کی طرف سے ہوا تھا، اس طرح اُن کا فتنہ دب گیا تھا۔

۱۸۵۷ء میں ستیارتھ پرکاش کے منظرعام پر آنے کے بعد اسلام کے خلاف لکچروں اور تقریروں کا ایک ماحول بن گیا۔ پنڈت اندرمن بھی سوامی دیانند کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں بلائے جانے لگے۔اسی سال ۱۸۷۵ء میں ایک عام اعلان اخباروں میں شائع ہوا جس کا مضمون یہ تھا کہ:

> پادری نولس صاحب پادری شاہ جہاں پور اور منشی پیارے لال کبیر پنتھی موضع چاندا پور متعلقہ شہر شاہ جہاں پور نے مل کر ۱۸۷۶ء میں ایک میلہ بنام میلۂ خداشناسی موضع چاندا پور میں جو شہر شاہ جہاں پور سے ۶ کوس فاصلے پر لب دریا واقع ہے مقرر کیا اور تاریخ میلہ ۶ رمئی ٹھہرائی ہے۔

مسٹر رابرٹ جارج گری صاحب کلکٹر ومجسٹریٹ شاہ جہاں پور کی اجازت کے بعد ۷رمئی ۱۸۷۶ء کو سخت گرمی میں میلہ جو درحقیقت عیسائیت، ہندوازم اور اسلام کا سہ طرفی مناظرہ تھا منعقد کیا گیا۔

حضرت نانوتوی کو یہ اطلاع ملی تو آپ نے اپنے دوست اور عزیز مولوی محمد منیر صاحب کو جو اس زمانے میں بریلی میں رہتے تھے، تحریر فرمایا کہ کیفیت مناظرہ اور محل نزاع سے مطلع کریں، شاہجہانپور کے مسلمانوں نے اس مناظرے کے لئے حضرت نانوتوی کو اصرار سے مدعو کیا تو حضرت پیادہ پا نانوتہ سے روانہ ہوئے، ایک شب دیوبند میں قیام فرمایا، ایک ایک رات راستہ میں مظفرنگر اور میرٹھ گزارتے ہوئے دہلی پہونچے۔

حضرت نانوتوی نے اس میلہ میں شرکت کے لئے دلچسپی کا جو اظہار فرمایا اس کی وجہ ظاہر تھی۔ پنڈت دیانند کی کتاب نئی نئی مارکیٹ میں آئی تھی۔ پہلی بار ایک مناظرے میں عیسائیوں کے ساتھ ہندو مذہب کے نمائندوں کے بھی آنے کی خبر تھی اور اعلان بھی ایک ہندو رئیس ہی کی طرف سے کیا گیا تھا۔ میرٹھ جو حضرت کی راہ میں پڑا پنڈت سوامی دیانند کا مرکز تھا۔ آریہ سماج کا آرگن آریہ سماچار وہیں سے شائع ہوتا تھا۔ مطابع میں تصحیح کے کام کے حوالے سے میرٹھ شہر سے حضرت کی وابستگی بھی رہی تھی۔ توقع تھی کہ پنڈت جی میلے میں آئیں گے، مگر باوجود توقع پنڈت سوامی دیانند سرسوتی اس میلے میں نہیں آئے، کچھ ناقابل ذکر ہندو نمائندے شریک ہوئے تھے جن کا نام میلہ کی روداد میں موجود نہیں البتہ ہندو حضرات کی طرف سے دو تحریریں ہندی میں پڑھی گئیں اور کسی نتیجہ پر پہونچے بغیر یہ میلہ ختم ہو گیا۔

اس موقعہ پر حضرت نانوتوی نے اسلام کی حقانیت وصداقت پر ایک تحریر بہت عجلت میں دن اور رات کے ایک حصے میں بیٹھ کر تیار کرلی تھی، اگرچہ میلے میں یہ تحریر پیش کرنے کی نوبت نہ آئی مگر اس تحریر کی مدد سے حضرت کے تلامذہ نے اس میلے میں ''صداقت اسلام'' پر جگہ جگہ تقریریں فرمائیں۔ بعد میں یہ تحریر حضرت کے تلمیذ خاص مولانا فخرالحسن صاحب گنگوہی نے ''حجۃ الاسلام'' کے نام سے طبع کرادی۔ غیر مسلموں کے اشکالات کے جواب میں خود حضرت نانوتوی نے وہاں ایک مدلل تقریر فرمائی جس نے سامعین کے دلوں کو نور ایمان سے بھر دیا۔ اس میلے کی روداد میرٹھ کے مطبع ضیائی کے ذمہ داروں: محمد ہاشم علی اور محمد حیات صاحبان نے مرتب کر کے واقعۂ میلۂ خداشناسی اور گفتگوئے مذہبی کے نام سے شائع کردی تھی۔ وہاں حضرت نانوتوی نے جو تقریر فرمائی اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

صداقت مذہب عقائد پر موقوف ہے احکام پر نہیں۔ چونکہ حاکم کو تو ہر حکم دینے کا حق ہوتا ہے

ورنہ وہ مجبور ومحکوم قرار پائے گا حاکم نہیں اور بنائے معبودیت صرف حکومت ہے۔لہٰذا عقیدہ کی رو سے اگر دیکھیں تو اسلام کی افضلیت نمایاں ہے، اس کا عقیدہ ہے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، جس کا جزو اول توحید ہے، جس سے کسی کو اختلاف نہیں، نہ عیسائی حضرات کو نہ ہندوؤں کو حتی کہ مشرکین مکہ کو بھی اس سے اختلاف نہ تھا، عقل سلیم بھی توحید پر شاہد ہے، چونکہ تمام اشیاء اپنے وجود میں ایک وجودِ اصل کی محتاج ہیں، وہی وجود اصلی ذاتِ باری ہے جس کو واحد واَحد ہونا ہی چاہئے، چنانچہ عقل ونقل دونوں کی بنا پر شرک ظلم عظیم ہے کہ اطاعت کے دونوں بنیادی سبب یعنی نفع کی امید اور نقصان کا اندیشہ ذات باری میں ہی پائے جاتے ہیں تو کسی اور کی اطاعت کیوں ہو جو خود اپنے وجود میں وجود اصل کا محتاج ہو۔

کوئی انسان معبود نہیں ہوسکتا کیوں کہ وہ خود محتاج ہے، کھانے، پینے، مرض اور موت سے مجبور ہے اور جب یہ طے ہوگیا کہ اطاعت وعبادت صرف ذات باری ہی کی ہونا چاہئے تو سوال یہ ہے کہ وہ کس طرح ہو؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے احکام سے مطلع فرمائے۔ ہماری عقلِ نارسا تو ناکافی ہے اور خود ذات باری ہمارے پاس اپنا پیغام پہونچانے آئے گی نہیں، کیونکہ ایک معمولی بادشاہ تک اپنے احکام کسی قاصد ہی کی معرفت بھیجتا ہے، لہٰذا یہاں بھی ایک قاصد کی ضرورت ہے۔ البتہ قاصد کو بھیجنے والے کا مقرب ہونا چاہئے، انبیاء ورسل اسی لئے معصوم ہوتے ہیں کہ وہ مقربین ذاتِ باری ہوتے ہیں اور چونکہ مقرب ہوتے ہیں اس لئے بارگاہِ خداوندی میں ان کی سفارش سُنی جاتی ہے، لیکن سفارش اور کفارہ میں فرق ہے۔ کفارے کا نظریہ غیر معقول ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا اپنے گناہ گار بندوں پر تو رحمت کررہا ہے اور عذاب ایک مقرب کو سہنا پڑ رہا ہے۔

اس مناظرے میں حضرت نانوتوی نے جو تحریر لکھی تھی اور جو بعد میں حجۃ الاسلام کے نام سے شائع ہوئی اس میں اگر چہ زیادہ حصے میں عیسائیوں کو مخاطب بنایا گیا ہے، لیکن اصولی مباحث کی افادیت عام ہے۔ اس تحریر کے آخری حصے میں معجزہ شق القمر کا تذکرہ کرتے ہوئے ہندوستان میں اس معجزے کے نظر آنے کا خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے۔ نیز اہل ہنود کے ایک مشہور اشکال کا رد کیا گیا ہے جو وہ گوشت خوری کے سلسلے میں کرتے ہیں اور اسے ہتیا اور جانوروں پر ظلم قرار دیتے ہیں۔

حضرت نانوتوی نے اس اشکال کا جواب دیتے ہوئے عقلی ونقلی دونوں طرح کے دلائل دیئے ہیں جن کو درج ذیل نکات میں سمیٹا جاسکتا ہے۔ یہ دلائل اس قدر بصیرت افروز ہیں جن سے نہ

جانے کتنے ضمنی سوالوں کا جواب ہوتا چلا جاتا ہے۔

۱۔ ہم اللہ کی اجازت کے بغیر اگر جانوروں کو ذرا بھی ستائیں تو بے شک یہ چیز ظلم ہو سکتی ہے، لیکن اگر اللہ کی اجازت سے بھی یہ جانور حلال نہ ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خداوندِ عالم کو جانوروں پر اختیار نہیں اور حقیقت میں ظلم تو یہ ہے کہ ایک مالک کو اپنی ہی چیز کا اختیار نہ ہو۔

۲۔ اگر جانوروں کا ذبح کرنا ظلم ہے تو ان پر سواری اور بار برداری اور اُن کا دودھ پی لینا کیا اسی دلیل سے ظلم نہیں ہے؟

۳۔ اگر مطلب یہ ہے کہ خدا کو اختیار تو ہے مگر انسان کے لئے جانوروں کا گوشت موزوں نہیں تو آخر کیوں؟ کیا انسان جانوروں سے بہتر نہیں؟ پھر ایک پرانے مکان کو گرا کر نیا عمدہ بنا لیں تو کیا حرج ہے؟ انسان کے لئے گوشت مادۂ قریب ہے، حیوان کا گوشت جسم انسانی میں آ کر روحِ اعلیٰ کا آلہ بن جاتا ہے، یہ ایک جسم حیوانی کے لئے ترقی مدارج ہے۔

۴۔ انسان کو شیر اور چیتے کی طرح نوک دار دانت دیئے گئے ہیں، یہ خود اس کا اشارہ ہے کہ انسان کی خوراک گوشت ہے، کیوں کہ انسان کو یہ کچلیاں بے وجہ تو نہیں دی گئیں۔

۵۔ البتہ یہ تسلیم ہے کہ سارے حیوانات انسان کے لئے موزوں نہیں، بعض جانور انسان کے جسم یا اخلاق کے لئے نقصان دہ ہیں، جیسے شیر کا گوشت یا خنزیر کا گوشت، اُن کو ضرور ممنوع ہونا چاہئے۔ اسی طرح خون چونکہ جسمِ انسانی کا فضلہ ہے اس کو بھی ناجائز ہونا چاہئے۔

۶۔ بے ذبح اگر کوئی جانور مر جاتا ہے تو ناپاک خون گوشت میں جذب ہو جاتا ہے، لہٰذا اس مردہ جانور کو بھی کھانے کے لئے ممنوع ہونا چاہئے۔

۷۔ ذبح میں حلق کے کاٹنے کی وجہ یہی ہے کہ حلق میں ساری رگیں اکٹھا ہو جاتی ہیں اور سارا خون باہر نکل جاتا ہے۔

۸۔ بدن کے ساتھ روح کا چونکہ ایک مقناطیسی جیسا رابطہ ہے، اس لئے بدن اگر فاسد ہوتا ہے تو اس سے روح بھی فاسد ہوتی ہے اور اس روح سے ناپاک خیالات اور ناپاک خیالات سے ناپاک اعمال وجود میں آتے ہیں۔

۹۔ غلہ پھل اور نباتات پر انسانی زندگی منحصر ہے، لہٰذا اس کے استعمال کی اجازت تو واضح

ہے۔ البتہ حیوانات کا انسان کے لئے ہونا اتنا واضح نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسے انسان کے ہاتھ پیر آنکھ کان ہیں جن کے ذریعے وہ دنیا کی چیزوں سے استفادہ کرتا ہے، اسی طرح جانور میں بھی ہیں اور غلہ پھل ونباتات اُن کے بھی کام آتے ہیں۔ لہٰذا نباتات میں تو صرف اُن کا موجود ہونا ہی اجازت ہے، البتہ حیوانات کو اپنے استعمال میں لانے کے لئے انسان کو مالکِ حیوانات کی خصوصی اجازت کی ضرورت ہوگی، اس کی اجازت کے بغیر استعمال اللہ کی مخلوقات میں تقرب بے جا کا ظلم ہوگا۔

۱۰۔ مالک اسی وقت اجازت دے سکتا ہے جب تصرف کرنے والا مالک کو مالک سمجھتا ہو، اس کا اعلان بھی کرتا ہو۔ لہٰذا بوقت ذبح اللہ کا نام لینا ضروری ہوگا اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا مالک کی ناخوشی کا سبب ہوگا اور ایسے جانور کا گوشت جائز نہ ہوگا۔

۱۱۔ ذبح کی ایک شکل یہ ہے کہ کسی کی محبت میں اپنی قربانی دی جائے یا کسی ایسے جانور کی قربانی دی جائے جو ہمیں عزیز ہو یا ذات محبوب سے صاحب واسطہ ہو اور اس قربانی سے مقصد گوشت حاصل کرنا نہ ہو تو ایسی قربانی بھی محبوب اصل کے لئے ہونی چاہئے جو ذات باری ہی ہے، اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے جانور ذبح کیا جائے گا تو گویا غیر خدا کی محبوبیت تسلیم کی جائے گی اور محبت کے لئے اطاعت لازم ہے تو گویا غیر خدا کے لئے اطاعت تسلیم کی جائے گی اور یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ درست نہیں ہے، اس لیے اس نے عام ذبیحہ اگر اپنے استعمال کے لئے ہے تو قربانی کا ذبیحہ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہے۔

۱۲۔ قربانی کے گوشت کی بیع وشرا بھی اسی لئے منع ہے کہ وہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور گوشت کھا لینے کی اجازت منجانب اللہ صرف بمنزلۂ ضیافت ہے۔

۱۳۔ اس طرح واضح ہوا کہ حیوانات سے متعلق حرمت چار طرح کی ہے۔ ایک تو مردار کی حرمت، دوسرے خون کی حرمت، تیسرے ان حیوانات کی حرمت جو مضر اخلاق وصحت ہونے کی بنا پر حرام ہوں، چوتھے غیر خدا کے نام پر یا خدا کا نام نہ لینے کی بنا پر حرمت ہے، باقی سارے حیوانات کا گوشت حلال ہے۔ پھر اگر خدا کو مالک مانتے ہوئے صرف استعمال کے لئے ذبح کیا جائے تو وہ صرف حلال ہے اور اگر براہِ محبت خداوندی ذبح کیا جائے تو اس پر ثواب بھی انشاء اللہ ملے گا۔

گوشت خوری کے سلسلے میں یہ طرزِ استدلال کتنا عجیب ہے جس میں گوشت سے متعلق

سارے اسلامی احکام کی نہ صرف حکمتیں ظاہر ہو جاتی ہیں بلکہ حلت وحرمت، حیوانات کا فلسفۂ حرمت کی تمام قسمیں، قربانی کی اہمیت اور متعلقہ مسائل، بسم اللہ کہنے کی ضرورت اور اللہ کے مالک حقیقی ہونے پر ایمان کی شرط ساری چیزیں بے حد مرتب اور دل نشیں انداز میں نقل ہوتے ہوئے بھی عین مقتضائے عقل محسوس ہونے لگتی ہیں اور یہی حکمتِ قاسمیہ کا امتیاز ہے۔

اگلے سال ۱۹/۲۰/مارچ ۱۸۷۷ء کو اسی میدان میں پنڈت دیانند سرسوتی آئے پنڈت اندرمن ان کے ساتھ تھے۔ سوامی جی ایک ہفتہ پہلے سے چاندا پور پہونچے ہوئے تھے اور مناظرہ میں پیش کئے جانے والے سوالات مرتب کر رہے تھے۔

مباحثہ میں کس ترتیب سے بحث ہو؟ اس کے بارے میں حضرت نانوتوی نے یہ رائے پیش فرمائی کہ اول ذاتِ باری میں گفتگو ہو کہ وہ ہے یا نہیں اور ہے تو ایک ہے یا متعدد، پھر صفاتِ باری میں گفتگو ہو کہ صفات مخصوصہ ذات خالق کیا کیا ہیں؟ پھر تجلیات باری میں گفتگو ہو، یعنی انبیاء کی ضرورت ہے یا نہیں اور کون ہے کون نہیں ہے؟ اس کے بعد احکام میں مباحثہ ہو۔

جو لوگ گفتگو کے فن سے آشنا ہیں اور جانتے ہیں کہ گفتگو کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے منصوبہ بند گفتگو کس طرح کی جاتی ہے وہ حضرت نانوتوی کی اس ترتیب کو ہی معقول قرار دیں گے، لیکن منشی پیارے لال نے سوامی جی کی ہدایات کے تحت لکھی گئی جو ترتیبِ نکات پیش کی وہ یہ تھی:

۱۔ دنیا کو پرمیشر نے کس چیز سے بنایا اور کس وقت اور کس واسطے؟

۲۔ پرمیشر کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟

۳۔ پرمیشر عادل ہے اور رحیم بھی ہے۔ دونوں کس طرح؟

۴۔ وید، بائبل اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟

۵۔ نجات کیا چیز ہے اور وہ کس طرح حاصل ہو سکتی ہے؟

ظاہر ہے ان نکات میں کوئی استدلالی ترتیب نہیں ہے۔ خدا نے دنیا کو کس چیز سے بنایا؟ اس کا سیدھا تعلق انسان کی غرض وغایت سے کیا ہے؟ وہ محیط کل ہے، عادل ہے، رحیم ہے، یہ سب ہی کو تسلیم ہے، پھر بحث کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ مناظرہ تھا کوئی مذہبی کلاس تو نہیں؟ حضرت نانوتوی کو خدا نے جو استدلالی فکر عطا فرمائی تھی اس کا اندازہ اُن کی قائم کردہ ترتیبِ نکات ہی سے بخوبی ہو جاتا ہے، جبکہ

منتظمین مناظرہ اور سوامی دیانند کی بدنیتی ان کے مقرر کردہ سوالات سے صاف طور سے آشکار ہوتی ہے۔

مباحثہ میں پہلے کون بیان کرے اس سلسلے میں بے حد اختلاف رہا۔ حضرت نانوتوی کی دلیل معقول تھی کہ چونکہ ہمارا دین سب سے بعد کا ہے، اس لئے ہم سب سے بعد میں بیان کریں اور سب کے سوالات کے جواب دیں، لیکن دیگر حضرات کو اندیشہ تھا کہ جو شخص بھی پہلے تقریر کرے گا وہی سب کے اشکالات واعتراضات کا ہدف بنے گا۔ سارا دن اسی بحث میں گزر گیا۔ شام کے ۴ بج گئے، پادریوں، آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں نے حضرت نانوتوی پر ہی بحث شروع کرنے کے لئے دباؤ ڈالا، چنانچہ عصر کی نماز کے بعد حضرت نانوتوی اسٹیج پر تشریف لائے اور اپنی طے کردہ ترتیب نکات کے مطابق ایک مسبوط تقریر فرمائی جس کا حاصل یہ تھا کہ:

ہم پہلے اپنی ذات سے شروع کریں۔ ہم ایک شعلۂ مستعجل تھے، اب ہیں، آئندہ نہ ہوں گے۔ ہم آفتاب کی کرن کی طرح ہیں، کرنیں جاتی ہیں نئی کرنیں آتی ہیں، مگر آفتاب موجود رہتا ہے، ہم سب کی زندگی کا سرچشمہ بھی کہیں نہ کہیں موجود ہے اور وہی سرچشمہ ذات باری ہے، ہماری طرح ساری دنیا کی چیزوں کی یہی حالت ہے، ان کا وجود وعدم بھی آنی وفانی ہے، لیکن اسی کے ساتھ چیزیں الگ الگ بھی پہچانی جاتی ہیں کہ یہ درخت ہے وہ سمندر، یہ چیزیں جس بنا پر الگ الگ ہیں اسی کو حقیقت کہتے ہیں۔ ہر چیز میں وجودِ عارضی بھی ہے اور حقیقت بھی، البتہ یہ ممکن ہے کہ حقیقت نہ ہو مگر وجود ہو کہ یہ دونوں لازم وملزوم نہیں، البتہ یہ ممکن نہیں کہ وجود ہی معدوم ہو جائے۔ چونکہ اگر دوعدم ہو جائے تو وہ وجود ہی کہاں تھا کہ وجود تو کہتے ہی عدم عدم کو ہیں، یہی واجب الوجود ذات باری ہے۔

اور جب ساری اشیاء اس واجب الوجود کے لئے وہ حیثیت رکھتی ہیں جو آفتاب کے لئے حرارت رکھتی ہے تو ظاہر ہے ساری اشیاء عدم سے وجود میں آئیں گی، کیوں کہ ان کا وجود اپنے آپ نہیں ہے اور جب عدم سے وجود میں آئیں تو وجود سے عدم میں بھی جائیں گی، کیوں کہ جب ان کے لئے پہلے عدم تھا تو بعد میں بھی عدم ممکن ہوگا، البتہ جس ذات کی وجہ سے یہ ساری رونق ہے تو اس کا وجود ازلی ابدی ہوگا، نہ پہلے عدم نہ بعد میں عدم اور جب وہ وجود لامحدود ہے تو اس کے ٹکڑے نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا کئی موجود اس جیسے نہیں ہو سکتے جو واجب الوجود ہوں، وہ تو ایک ہی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ جو منبع وجود ہو وہی منبع اوصاف بھی ہو۔ لہٰذا ضرور ہے کہ تمام کائنات میں علم وادراک، قوت اور حس وحرکت

قلیل ہو یا کثیر ضرور ہو۔ (نوٹ: جدید سائنسی تحقیقات عین یہی بات ثابت کرتی ہیں۔)

جب سارے کمالات ذات باری میں ہیں تو وہ واجب الاطاعت ہوا، چونکہ اطاعت کے بظاہر تین اسباب ہیں۔ کسب نفع، دفع ضرر اور محبت، جن کو ایک لفظ میں ہم ملک کہہ سکتے ہیں کہ کسب نفع اور دفع ضرر کی توقع ہم اُسی سے کریں گے جس کو مالک سمجھیں اور محبت بھی اُسی سے کریں گے جو ہماری جان و مال کا مالک ہو تو سبب اطاعت صرف ایک ہوا اور وہ صرف ذات باری میں پایا جاتا ہے۔

اثبات رسالت

اطاعت کہتے ہیں دوسرے کی مرضی کے مطابق کام کرنے کو، جس کے لئے اطلاع کی ضرورت ہے، بادشاہ اپنے مقربوں کے ذریعہ اپنی مرضی کا اشارہ کردیتے ہیں، خداوند تعالیٰ جن مقرب انسانوں کے ذریعے اپنی مرضی کا اشارہ کرتا ہے وہ پیغمبر کہلاتے ہیں۔

عصمت انبیاء

اور خدا کے مقرب وہ ہوتے ہیں جو اس کی ناراضی سے محفوظ ہوں اور اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرتے ہوں اگرچہ بھول چوک ہو جائے، جن کا اخلاق پاکیزہ ہو اور ساتھ ہی عقل کامل ہو، کیونکہ اخلاق حمیدہ کا وجود عقل کامل کے بغیر ممکن نہیں۔

ذات محمدیؐ

اخلاق و علم میں ہم دیکھتے ہیں تو ذات رسالت مآبؐ سے زیادہ مکمل کوئی دکھائی نہیں دیتا، آپؐ علم میں کامل ہیں اخلاق میں کامل ہیں۔ اگر ان دلائل کی بنا پر آدم وابراہیم وعیسیٰ خدا کے پیغمبر ہو سکتے ہیں تو آخر محمدؐ رسول اللہ کیوں نہ ہوں؟ بلکہ آپ تو کامل واکمل ہیں، خاتم کمالاتِ انبیاء ہیں اور اسی سے آپ کی خاتمیت زمانی بھی لازم آتی ہے کہ جو سب سے اونچا ہوتا ہے وہ سب سے آخر میں ہوتا ہے، جیسے پارلیمنٹ تک کسی رافع کی نوبت سب سے بعد میں آتی ہے۔ رسول اقدسؐ کے معجزات خود ظاہر کرتے ہیں کہ آپ تمام پیغمبروں میں بلند ترین مقام رکھتے ہیں، یہ معجزات ہم کو قرآن واحادیث جیسے مستند ذرائع سے بہم پہونچے ہیں جو یقیناً توریت وانجیل وغیرہ دیگر مذہبی کتب میں مذکور دوسرے پیشوایان مذاہب سے منسوب معجزات سے زیادہ قابل اعتماد ہیں۔

سب سے آخر میں آپ کا آنا اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اب آپ ہی کے اتباع میں

رضائے الٰہی ہے، جیسے برسرِ کار گورنر کی موجودگی میں کسی سابق گورنر کے احکامات قابل تسلیم نہیں ہوتے حالانکہ سابق گورنر بھی گورنمنٹ ہی کا مقرر کردہ ہوتا ہے جبکہ سابقہ مذہبی کتب میں یوں بھی بہت کچھ ردوبدل ہوا ہے۔

قرآنی احکامات میں بھی تو نسخ ہوا ہے۔ اس طرح کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ جو تبدیل وتحریف تورات وانجیل میں ہوئی ہے وہ بتصرف بشری ہے اور قرآن میں تبدیلی بتصرف الٰہی ہے اور ہم بمنزلۂ یقین یہ بات جانتے ہیں کہ پہلے یہ حکم تھا اور اب یہ ہے، لہٰذا قرآن کو تورات وانجیل کی تحریف پر قیاس کرنا درست نہیں۔

مباحثہ کے دوسرے دن پادری اسکاٹ کی تقریر پہلے ہوئی، اس کے بعد سوامی دیانند اسٹیج پر آئے اور اپنا نشانہ اسلام اور قرآن کو زیادہ بنایا مگر ناقابل فہم سنسکرت زبان میں اُن کے بھاشن کو کوئی پوری طرح نہیں سمجھ سکا۔

خدانے کائنات کو کس شے سے پیدا کیا؟ اس کے جواب میں پنڈت دیانند کا کہنا تھا کہ مادہ اور ذات باری دونوں ہمیشہ سے ہیں، البتہ ترکیب مادّہ سے اس کائنات کو خداوند عالم نے ایجاد کیا ہے جس پر حضرت نانوتویؒ کا جواب تھا کہ اگر مادہ ہمیشہ سے خود بخود تھا تو وہی خدا تھا اور اگر نہ تھا تو وہ مخلوق ہوا، حادث ہوا اور قدیم نہ ہوا۔ دیانند نے اس کے جواب میں کہا کہ اگر مادہ کو حقیقتِ وجود قرار دیا جائے تو مادہ کے نقائص بھی وجود باری کی طرف منسوب ہوں گے جس پر مولاناؒ نے ایک خوب صورت مثال دیتے ہوئے واضح فرمایا کہ مخلوقات مادی کو باری تعالٰی کے وجود سے شعاعِ آفتاب کی سی نسبت ہے۔ دھوپ آڑی ترچھی ہو تو اس سے آفتاب کا آڑا ترچھا ہونا قطعاً لازم نہیں آتا۔

مباحثہ کے تیسرے دن بھی پادری اسکاٹ کی تقریر پہلے ہوئی اور ان کا موضوع سوالِ خامس یعنی ''مفہوم نجات کیا ہے اور کس طرح ممکن ہے'' تک محدود رہا، اس کے بعد پنڈت دیانند سرسوتی نے اسی موضوع پر تقریر کی۔ پنڈت دیانند کے بعد حضرت نانوتوی کھڑے ہوئے اور لفظ نجات کی تشریح کرتے ہوئے سیدھے اپنے ہدف تک پہونچ گئے۔ سوامی دیانند نے نجات کا مطلب گناہ سے بچنا بتایا۔ حضرت نانوتوی نے واضح کیا کہ نجات عذاب الٰہی سے بچنے کو کہتے ہیں۔ پنڈت جی گناہ سے بچنے کو نجات کہتے ہیں مگر یہ نہیں بتاتے کہ گناہ کسے کہتے ہیں؟

یہ ایک ایسا نکتہ تھا جس نے گفتگو کا رُخ ہی پلٹ دیا۔ اس لئے کہ گناہ کی پہچان کے لئے ہدایت الٰہی اور رسالت کی ضرورت کا اثبات خود بخود ہو رہا تھا اور یہی وہ ٹرننگ پوائنٹ تھا جس سے سوامی دیانند اور پادری اسکاٹ دونوں بچنا چاہتے تھے۔ چونکہ رسالت کا تصور صرف اسلام کے یہاں ہے، عیسائیت اور ہندو دھرم میں یہ تصور سرے سے موجود نہیں ہے۔

دورانِ تقریر دیانند نے بے سروپا سوالات پریشان کرنے کے لئے اٹھائے، مثلاً کہا کہ یہ بہشت کہاں ہے؟ بعد میں یہ سوال جب آپ کے سامنے آیا تو آپ نے کہا کہ دنیا میں ہم عیش بھی دیکھتے ہیں اور تکلیف ومشقت بھی، اس کا مرکب ہے ہماری زندگی تو اس مرکب کے مفردات کا سر چشمہ بھی کہیں ہوگا۔ کہیں مرکز عیش ہوگا اور کہیں مرکز مشقت، پہلا مرکز جنت ہے اور دوسرا جہنم۔

شیطان وملائکہ کے بارے میں بھی اسی قسم کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ عیش وراحت ہی کی طرح اعمال میں خیر اور شر ہے، تو اعمال میں ایک جامع خاصیت شر ہوگا اور ایک جامع خاصیت خیر، پہلا ملائکہ ہے دوسرا شیاطین۔

خدا نے خیر کے ساتھ شر کو کیوں پیدا کیا؟ اس کو واضح کرتے ہوئے آپ نے مثال دی کہ جیسے مکان میں پاخانہ بھی تکمیل مکان کے لئے ضروری ہے، یا ابرو اور مژگاں کی بدرنگی چہرۂ روشن پر جا کر جمال بن جاتی ہے۔ اس عالم میں بھی ترکیب متضادین اسی طرح کے عمدہ نتائج پیدا کرتی ہے۔

اس مباحثہ کے بعد اکتوبر ۱۸۷۷ء میں حضرت نانوتوی حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو گئے، وہاں سے ۶ ماہ بعد واپسی ہوئی۔ مارچ ۱۸۷۸ء میں آپ ہندوستان واپس تشریف لائے تو سوامی دیانند کے اسلام مخالف لکچرز کی دھوم ہر طرف تھی۔ حضرت نانوتوی سفر حج میں بہت علیل ہو گئے تھے، زیادہ دیر تک بولنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ سوامی دیانند نے رڑکی ضلع سہارنپور کو اپنی تحریک اور کدوکاوش کا مرکز بنالیا تھا۔ اپنی کتاب قبلہ نما کے دیباچے میں حضرت نانوتوی نے تحریر فرمایا:

> ''سن بارہ سو پچانوے ہجری رجب (مطابق ۱۸۷۸ء ماہ جولائی) میں پنڈت دیانند صاحب نے رڑکی میں آکر سر بازار مجمع عام میں مذہب اسلام پر چند اعتراضات کئے''۔

پنڈت دیانند کی اس حرکت سے مقامی مسلمان بے چین ہو گئے۔ اہل رڑکی حضرت نانوتوی کو رڑکی بلانے کے لئے بے حد مصر تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ سوامی دیانند کہتے ہیں ''مولبی کاسم'' آئیں

گے تو بات کروں گا ورنہ نہیں۔“

غالباً پنڈت دیانند یہ سوچے ہوں گے کہ ایک لمبے سفر سے واپسی کے بعد بیماری اور نقاہت کے عالم میں حضرت آنے سے انکار کردیں گے اور مجھے ایک بہانہ مل جائے گا، لیکن حضرت کے دل کو تو ایک لگن لگی ہوئی تھی۔ شروع شعبان میں شدید ضعف اور کمزوری کے عالم میں حضرت نانوتوی ایک بیل گاڑی سے سفر کرکے رڑکی پہونچ گئے اور وہاں مسلسل ۷ اروز قیام فرمایا۔

حضرت نانوتوی کے رڑکی پہونچنے پر وہاں ایک کثیر تعداد لوگوں کی اکٹھا ہوگئی۔ حضرت والا چاہتے تھے کہ سوامی دیانند سے دوبدو گفتگو کریں، لیکن بقول مولاناؒ وہ شخص کسی قیمت پر پکا نہ ہوا۔ منتیں کیں، غیرت دلائی، حجتیں کیں، مگر وہاں نہیں کی نہیں رہی، پہلے تو فساد ہوجانے کا اندیشہ ظاہر کیا، مجسٹریٹ نے انتظام کا یقین دلایا تو شرط لگادی کہ ۲۰۰ افراد سے زیادہ نہ ہوں اور پھر یہ شرط لگادی کہ صرف میری قیام گاہ پر گفتگو ہوگی، جبکہ وہ جگہ بے حد تنگ تھی۔ پھر وقت کی شرط لگائی کہ شام ۶ بجے سے گفتگو ہوگی جب کہ پنڈت جی کی قیام گاہ شہر سے کافی دور تھی اور لطف یہ کہ یہ جگہ فوجی چھاؤنی میں تھی جہاں مذہبی بحث کی سرے سے اجازت ہی نہ تھی۔ چنانچہ پنڈت جی کے اندازے کے عین مطابق حکام نے قطعاً ممانعت کردی کہ سرحد چھاؤنی رڑکی میں مناظرہ نہ ہونے پائے (سوانح قاسمی ۴۹۴ دوم) حضرت نے عیدگاہ میں گفتگو کی تجویز پیش کی، مگر پنڈت جی نے ایک نہ سنی، مجبور ہوکر حضرت نانوتوی نے مجمع عام میں پنڈت کے ۱۱ر اعتراضات کا تذکرہ کرکے ۳ر روز تک اُن کے جوابات دیئے۔

۲۳ر شعبان ۱۲۹۵ھ کو حضرت نانوتوی رڑکی سے واپس ہوئے۔ راستہ میں ایک روز منگلور رہے اور دوسرے روز دیوبند پہونچے۔ ۲، ۳ دن بعد نانوتہ آئے اور پنڈت جی کے اعتراضات کے جواب لکھے جو کل گیارہ تھے، دس اعتراضات کے جواب الگ لکھے جن کو تلمیذ خاص مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہی نے ”انتصار الاسلام“ کے نام سے شائع کردیا۔ خانۂ کعبہ کی طرف سجدہ کرنے پر پنڈت جی کا جو اعتراض تھا وہ تفصیل چاہتا تھا، اس کے لئے الگ سے ایک مفصل کتاب ”قبلہ نما“ مرتب فرمائی، بعد میں وہ کتاب بھی شائع ہوگئی۔

انتصار الاسلام

کتاب انتصار الاسلام میں پنڈت جی کے ۱۰ر اعتراضات اور ان کے جوابات کا خلاصہ

درج ذیل ہے۔ پنڈت جی کے ہر سوال کا جواب مولانا نے دو سطح پر دیا ہے، ایک الزامی سطح پر، دوسرا تحقیقی سطح پر۔

اعتراض ۱

اسلام کے مطابق خدا قادر مطلق ہے، تو کیا وہ خود کو مارنے اور چوری وغیرہ کرنے پر بھی قادر ہے؟

جواب الزامی

خدا کو قادر مطلق تو ماننا ہی ہوگا، اگر وہ قادر مطلق نہ ہوگا تو قادرِ مقید ہوگا یعنی محدود قوت وقدرت کا مالک ہوگا اور اگر خدا کو قادر مقید مان لیا جائے تو اس کے لئے ایک اور مطلق ماننا ہوگا۔ چونکہ ہر مقید کے لئے ایک مطلق ضرور ہوتا ہے جیسے انسان کے مقید مفہوم حیوانِ ناطق کے اوپر حیوان مطلق ہوتا ہے اور چونکہ مطلق مقید سے بڑا ہوتا ہے، اس لئے لازم آئے گا کہ وہ قادر مطلق خدا اس قادر مقید سے بڑا ہو کہ وہ جیسے اپنی موت وحیات پر قادر ہو اس دوسرے خدا کی موت وحیات پر بھی قادر ہو۔ اس صورت میں تو یہ خدائے مقید خدا ہی نہ رہے گا، چونکہ خدا وہ ہوتا ہے جس کا وجود حقیقی اور ذاتی ہو، وہ خدا ہی کیا جو اپنی زندگی اور اپنے وجود کا بھی مالک نہ ہو۔

جواب تحقیقی

ہر فعل کے لئے ایک فاعل چاہئے ایک مفعول۔ فاعل اثر انداز ہوتا ہے، مفعول اثر قبول کرتا ہے۔ یہ دونوں اگر اپنی صلاحیتوں میں کامل ہوں تو تاثیر وتأثر کی ایک مکمل شکل بنے گی، اگر کوئی ایک بھی اپنی صلاحیت میں نامکمل ہے یا محرومِ صلاحیت ہے تو قطعاً دوسری صورتیں بنیں گی اور یہ ضروری نہیں کہ فاعل یا مفعول میں سے کوئی اگر اپنی صلاحیت میں کامل ہو تو دوسرا بھی ضرور کامل ہو یا ایک ناقص ہو تو دوسرا بھی ضرور ناقص ہو۔ مثلاً سورج کا عکس آئینہ میں مکمل ہوگا، چونکہ سورج اور آئینہ دونوں اپنی صلاحیت میں مکمل ہیں، سورج اپنی تابش میں اور آئینہ اس کو قبول کرنے میں، لیکن ہم سورج کا عکس اگر پتھر میں دیکھیں تو وہ نامکمل ہوگا، چونکہ مفعول ناقص صلاحیت کا حامل ہے اور اس نقص کا مطلب یہ نہ ہوگا کہ سورج اپنی صلاحیت میں ناقص ہے، اسی طرح آئینہ تو شفاف ہے لیکن اس میں عکس کسی دھندلے ستارے کا ہے تو عکس نامکمل ہوگا، مگر اس سے آئینہ کی صلاحیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

جس طرح سورج اپنی صلاحیت میں مکمل ہے، خدا بھی قادر مطلق ہے۔ لیکن ممتنعات جب موجود ہی نہیں ہیں تو گویا آئینہ موجود ہی نہیں ہے یا تاریک ہے۔ تب خدا کی قدرت کا اظہار کس طرح ہوسکتا۔ یہ مفعول کا نقص ہے نہ کہ فاعل کا۔ زنا، چوری موت خدا کی قدرت کا محل بننے سے یکسر عاری ہیں، اس لئے وہ مقدوریت کی صلاحیت سے محروم ہیں نہ یہ کہ خدا قادریت سے محروم ہے۔

اعتراض ۲

شیطان کا کوئی وجود نہیں ہے۔ بقول اہل اسلام شیطان انسانوں کو بہکاتا ہے تو شیطان کو کس نے بہکایا؟ ظاہر ہے کسی نے نہیں تو گویا شیطان کا وجود ہی نہیں ہے؟

جواب الزامی

اگر ہمیں کسی چیز کا علم نہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ چیز موجود نہیں ہے۔ بالفرض ہم شیطان کے بہکانے والے کو نہیں جانتے تو اس سے یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ شیطان موجود نہیں ہے؟

جواب تحقیقی

ہر وصف کا ایک ذاتی مصدر ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ بہت سی چیزوں میں پایا جائے مثلاً دھوپ کی روشنی سے بہت سی چیزیں روشن ہوتی ہیں، لیکن اس کا مصدر ذاتی سورج ہے جس سے یہ روشنی کبھی جدا نہیں ہوتی۔

وصفِ گمراہی کا بھی ایک مصدرِ ذاتی ہے جسے شیطان کہتے ہیں اور جیسے آگ خود گرم ہے مگر بہت سی چیزوں کو گرم کر دیتی ہے مثلاً کمرہ گرم کر دیتی ہے تو یہ گرمی آگ کی صفتِ ذاتی ہے، مگر کمرے کی نہیں۔ اسی طرح گمراہی شیطان کی صفت ذاتی ہے اور انسان اس کے اثر سے گمراہ ہوتے ہیں۔ چنانچہ شیطان جب خود ہی گمراہی کا سرچشمہ ہے تو یہ سوال فضول ہو جاتا ہے کہ شیطان کو کس نے گمراہ کیا۔ یہ ایسا ہی سوال ہے جیسے یوں کہا جائے کہ سورج نے ساری چیزوں کو روشن کیا تو سورج کو کس نے روشن کیا؟

یہاں پھر بھی یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ شیطان کا خالق تو بہر حال خدا ہے، لہٰذا اس کی گمراہی کا خالق بھی وہی ہے، تو اس کا جواب ہے کہ برائی کا پیدا کرنا عیب نہیں، اس کا صادر ہونا عیب ہے۔ خدا نے برائی کو اسی طرح پیدا کیا جیسا اور بُری اشیاء مثلاً بُری صورت، بُری آواز اور پاخانہ پیشاب وغیرہ پیدا کیا یا زہر کو پیدا کیا، ان چیزوں کے خلق میں بُرائی نہیں صادر ہونے میں بُرائی ہے جیسے زہر

میں برائی نہیں اس کے کھا لینے میں برائی ہے اور گمراہی بہر حال شیطان سے صادر ہوتی ہے خدا سے نہیں۔

اعتراض ۳

اسلام میں نسخ احکام کا نظریہ غیر معقول ہے، نسخ احکام کی ضرورت خطاء ونسیان سے مرکب انسان کو تو پیش آسکتی ہے خدائے علیم کو نہیں۔

جواب الزامی

کسی چیز کا حکم دینا اور کسی چیز کا ارادہ کرنا دونوں یکساں اہمیت کی چیزیں ہیں، لیکن ہم خدا کے ارادے کی تبدیلی ہر وقت دیکھتے ہیں، حیات وموت، صحت ومرض، فقر وغنا اور عزت وذلت سے انسان دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ کیا یہ چیز ارادۂ خداوندی کی تبدیلی کا مظہر نہیں؟ تو کیا اس پر بھی اعتراض کیا جائے گا؟

جواب تحقیقی

کسی حکم کو صرف غلطی کی بنا پر نہیں بدلا جاتا، مصلحت تبدیل ہو جانے پر بھی بدل دیا جاتا ہے۔ ایک حکیم مریض کے نسخے تبدیل کرتا رہتا ہے اور کوئی شخص بھی اس کو حکیم کی ناسمجھی ونادانی پر محمول نہیں کرتا۔

اعتراض ۴

اگر خدا ہر وقت روحوں کو پیدا کرنے پر قادر ہے تو کیا ضرورت ہے کہ وہ قبل از وقت ارواح پیدا کر کے اپنے یہاں جمع رکھے۔ خلقِ ارواح کی نسبت نظریۂ تناسخ زیادہ معقول ہے جس کی رو سے ساڑھے چار ارب ارواح گردش میں رہتی ہیں۔ خلقِ ارواح کا نظریہ مانیں تو کھرب ہا کھرب ارواح کا وجود تسلیم کرنا ہوگا۔ لہٰذا یہ نظریہ رد کر کے نظریۂ تناسخ کو مانیں تو نظریۂ حشر ونشر کی ضرورت نہ رہے گی۔

جواب الزامی

۱۔ اگر قبل از وقت کسی شے کا پیدا کرنا قابل اعتراض ہے تو پھر پھلوں، میوؤں اور اناج کے موسم بنانے کی جگہ خدا کو چاہیئے تھا کہ قبل از وقت چیزوں کو پیدا کرنے کی جگہ وقتِ ضرورت ہاتھ کے ہاتھ پیدا کر دیا کرتا تب لوگ سال بھر کے لئے چیزیں ذخیرہ کر کے نہ رکھا کرتے۔

۲۔ ساڑھے چار ارب روحوں کی بات بھی مضحکہ خیز ہے، سوامی جی اگر صرف ایک گاؤں

کے پھر گن لیں تو وہ بھی اس سے زیادہ ہوں گے اور جب یہ بات مسترد ہو جائے گی تو نظریہ تناسخ خود بخود مسترد ہو جائے گا۔

۳۔ جزا و سزا کا یہ کون سا نظریہ ہوا کہ انسان اس جنم میں جانتا نہیں کہ وہ پچھلے جنم کے کس جرم کی سزا بھگت رہا ہے یا کس چیز کا انعام پا رہا ہے۔

جواب تحقیقی

۱۔ روح چونکہ سوار ہے، جسم سواری اور اعضاء و جوارح آلات سواری ہیں، قاعدہ کے مطابق سب سے پہلے فاعل کا پھر مفعول کا پھر آلات فعل کا وجود ہوتا ہے، اس بنا پر پہلے روح کا وجود ہونا چاہیے تاکہ وہ جسم پر سوار ہو سکے پھر جسم کا اور پھر آلات فعل کا۔

جس طرح سوار اوپر اور سواری نیچے ہوتی ہے اسی طرح روح اوپر ہے اور جسم نیچے ہے، جس طرح سوار حاکم اور سواری اس کی پابند ہوتی ہے اسی طرح روح حاکم اور جسم محکوم ہوتا ہے۔

۲۔ پنڈت جی کو کھربوں روحوں کے وجود پر حیرت ہو رہی ہے، حالانکہ خدا کی طاقت و شوکت سامنے رکھیں تو کچھ بھی تعجب کی بات نہیں، مگر کنویں کا مینڈک کنویں سے زیادہ بڑی کسی جگہ کا تصور نہیں کر سکتا، اسی طرح پنڈت جی کو کائنات اتنی ہی چھوٹی نظر آ رہی ہے جتنی اُن کی بساط ہے۔ (نوٹ: دور جدید کے سائنس دانوں نے کائنات کی وسعت کے بارے میں جو حیرت انگیز تفصیلات پیش کی ہیں اگر اُن کو سامنے رکھیں تو پنڈت جی کا اعتراض بے حد احمقانہ نظر آتا ہے۔)

۳۔ نظریہ تناسخ کو رد کرنے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ اس کے لیے کوئی دلیل عقلی موجود ہے نہ دلیل نقلی، جہاں تک اس نظریہ کے نقلاً ثابت نہ ہونے کی بات ہے حقیقت یہ ہے کہ چاروں ویدوں میں اس کا ذکر نہیں اور اگر کہیں ہو بھی تو ویدوں کا کلامِ الٰہی ہونا خود ثابت نہیں، اس کے لیے نہ کوئی داخلی شہادت موجود ہے اور نہ خارجی۔ اس کے برعکس ہم دیکھتے ہیں کہ ویدوں میں غیر خدا کی پرستش کا حکم موجود ہے، جبکہ خدا اپنے کلام میں کسی غیر مستحق کو اپنی جگہ مستحق عبادت کس طرح قرار دے سکتا ہے، لازمی طور سے وید یا تو کلامِ انسانی ہیں یا تحریف شدہ ہیں۔

جہاں تک نظریہ تناسخ کے عقلاً ثابت نہ ہونے کی بات ہے ساڑھے چار ارب روحوں والی بات تو قطعاً غیر معقول ہے ہی، ایک بہت مشہور دلیل جو اس ضمن میں دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں

بہت سے پرہیزگار دکھ کی زندگی گزارتے ہیں اور بہت سے بدکار عیش وعشرت کی، لازماً یہ اُن کے پچھلے جنم کے اعمال ہی کا پھل ہے۔

ا۔ اس دلیل میں سب سے کمزور بات یہ ہے کہ راحت وتکلیف کو جزا وسزا سمجھ لیا گیا ہے، حالانکہ ہم کسی مسافر کی مدد کرتے ہیں جبکہ وہ اس کے کسی عمل کی جزا نہیں ہوتی، ڈاکٹر مریض کو کڑوی دوا پلاتا ہے حالانکہ وہ سزا نہیں ہوتی، والدین اپنی اولاد کو ڈانٹتے ہیں حالانکہ وہ سزا نہیں تربیت ہوتی ہے۔

اگر کوئی یوں کہتا ہے کہ نہیں اللہ تو راحت وتکلیف کو بطورِ جزا وسزا ہی پہونچاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بندے خدا سے بھی زیادہ ہوئے جن کے یہاں راحت وتکلیف، تعلیم وتربیت، سخاوت ومروّت اور اصلاح وتزکیہ کی بنا پر بھی ہوتی ہے، گویا بندے مربی بھی ہو سکتے ہیں اور سخی بھی لیکن خدائے تعالیٰ صرف ایک سخت گیر داروغہ ہے جو محض سزا یا جزا دیتا ہے۔

ب۔ نظریۂ تناسخ اس لئے بھی غیر معقول ہے کہ انسان کو جب یہ خبر ہی نہیں کہ اُسے کس چیز کی جزا یا سزا مل رہی ہے تو یہ کیا جزا سزا ہوئی اور اس سے اس کے اعمال کی کونسی اصلاح ہوئی جبکہ نظریۂ تناسخ کے تحت راحت وتکلیف کی معنویت ہی یہ ہے، اسلامی نقطہ نظر میں تو جزا وسزا کے وقت گزشتہ اعمال کا یاد رکھنا ضروری ہی نہیں ہوگا کیوں کہ وہاں تو جزا وسزا برائے تربیت نہیں مقصود بالذات ہے اور انتہائے اعمال کے بعد ہے۔

اگر کوئی شخص عہد الست کے بارے میں یہ سوال اُٹھائے کہ وہ بھی تو ہم کو یاد نہیں پھر اس سے کیا فائدہ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ نظریۂ تناسخ اور عہد الست میں فرق ہے، کیونکہ نظریۂ تناسخ میں راحت و تکلیف برائے تربیت ہیں اور عہد الست کے واقعہ کا تعلق تعلیم سے ہے اور تعلیم میں مقصود صرف حصولِ علم ہے، اس کے حصول کی کیفیت اور زبان ومکان کا یاد رکھنا ضروری نہیں ہے۔

ج۔ کائنات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تخلیق کا اصل مقصد عبادت ہے، کائنات کی ساری اشیا عبادت کے اس عمل میں انسان کی معاون ہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ انسان تو سب چیزوں کا محتاج ہے مگر یہ چیزیں انسان کی محتاج نہیں گویا انسان کی حیثیت اصل عامل کی ہے، باقی اشیاء انسان کی خادم ہیں۔

اگر کائنات کی تمام اشیاء کا مقصد انسان کی خدمت ہے تو سوال یہ ہے کہ انسان کا مقصد کیا

ہے؟ ظاہر ہے یہی کہ وہ اپنے خالق کی عظمت کا اعتراف کرے، عجز و نیاز کا اظہار کرے کہ یہ چیز دوسری اشیاء سے ممکن نہیں اور چونکہ خدا کے پاس عجز و نیاز کے علاوہ سب کچھ ہے اس لیے اس کا مطلوب یہی ہے، کیوں کہ ہر ایک کو وہی شے مطلوب ہوتی ہے جو اس کے پاس نہ ہو۔

چونکہ پوری کائنات فعل عبادت میں انسان کی معاون ہے، اس لیے یہاں کی راحت و تکلیف بھی منجملہ عبادت ہوگی جبکہ نظریہ تناسخ میں یہ جزا و سزا ہوگی اور یہ چیز محال ہے کہ ایک چیز عبادت بھی ہو اور اس کی جزا یا سزا بھی ہو۔

د۔ نظریۂ تناسخ کے غیر معقول ہونے کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ انسان بچپن سے بڑھاپے تک روحانی و جسمانی ارتقا کے متعدد مراحل سے گزرتا ہے یہاں تک کہ ایک انتہا پر پہونچ کر یہ سلسلہ رُک جاتا ہے، اگر کسی وجہ سے کوئی چیز پھر اپنی ابتدائی حالت کی طرف آنا چاہے تو اُسے لازماً وہی مراحل طے کرنے چاہئیں جو اس نے ارتقاء کے وقت طے کئے تھے، اگر تناسخ کا نظریہ مان لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک روح اپنے ارتقائی سفر کے دوران جس آخری منزل تک پہونچی ہے وہاں سے اُسے واپسی کا سفر طے نہیں کرنا پڑتا اور یک لخت دوسرے جسم میں اپنی ابتدائی حالت میں آجاتی ہے۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کوئی آسمان میں ڈھیلا پھینکے اور ڈھیلا آخری اونچائی تک پہونچ کر نیچے گرے بغیر پھر پھینکنے والے کے ہاتھ میں آجائے، ظاہر ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے۔

روح کو جو صفات عارض ہوتی ہیں اُن کا جسم سے ایک لخت جدا ہو کر نسیاً منسیا ہو جانا ممکن نہیں ہے۔ مثلاً کوئی انسان حلیم و بردبار ہوتا ہے، کوئی غصیلا ہوتا ہے، کوئی بخیل، کوئی غنی اور کوئی فہیم و عقل مند۔ یہی حال علوم و کمالات کا ہے وہ اگر چہ روح کو عارض ہوتے ہیں مگر کسی جسم سے اس طرح ان کی یک بارگی جدائی ممکن نہیں جیسے چراغ کے ہٹاتے ہی دیوار سے روشنی غائب ہو جائے، کیوں کہ چراغ کی روشنی دیوار سے بالکل جدا ایک چیز ہے جب کہ روح کی صفات جسم میں پوری طرح اثر انداز ہوتی ہیں اور وہ ایک دم جدا نہیں ہوسکتیں۔ یہ کہنا کہ بے ہوشی میں تو روح کمالات علمیہ سے جدا ہو جاتی ہے درست نہیں ہے، کیوں کہ بے ہوشی میں کمالات علمیہ زائل نہیں ہوتے بلکہ چھپ جاتے ہیں اور بے ہوشی کی چادر ہٹتے ہی دوبارہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔

مذکورہ بالا وجوہ کی وجہ سے نظریۂ تناسخ ایک غیر عقلی و غیر علمی نظریہ قرار پاتا ہے۔

اعتراض ۵

اہلِ اسلام کے بقول اگر کوئی مرد کسی کو روزہ افطار کرادے تو اسے ۷۰ حوریں ملیں گی اگر عورت کسی کو روزہ افطار کرادے تو اسے ۷۰ مرد ملنا چاہئیں۔ مگر اہلِ اسلام کے بقول ایسا نہیں ہوسکتا تو عورت اور مرد میں یہ امتیاز کیسا؟

جواب الزامی

ایسی کوئی روایت موجود نہیں ہے، لہٰذا اصولی طور سے یہ اعتراض ایک غلط بنیاد پر قائم ہے، البتہ جس طرح دنیا میں ایک مرد کو متعدد بیویاں رکھنے کا حق ہے مگر عورت کو متعدد شوہر رکھنے کا حق نہیں اسی طرح جنت میں ایک مرد کو متعدد حوریں مل سکتی ہیں، اس صورت میں یہ اعتراض وہی مشہور اعتراض ہے جو تعدد ازدواج کے تعلق سے غیر مسلموں کی طرف سے کیا جاتا ہے اور جس کے ہر گوشے پر علماء اسلام روشنی ڈال چکے ہیں۔

جواب تحقیقی

عورت کو اولاد کے حوالے سے وہی حیثیت حاصل ہے جو پیداوار کے حوالے سے کھیت کو حاصل ہے، البتہ فرق یہ ہے کہ ایک کھیت کی پیداوار کئی کسانوں میں اس لئے تقسیم ہوسکتی ہے کہ وہ یکساں ہوتی ہے، مگر ایک عورت کی اولاد کئی باپوں میں تقسیم نہیں ہوسکتی ہے، وجہ یہ ہے کہ اولاد میں صورت، شکل اور ذہانت و صلاحیت کے اعتبار سے بہت فرق ہوتا ہے، لہٰذا ایسی تقسیم باعث نزاع ہوگی، اسی طرح ایک عورت اگر کئی مردوں کے نکاح میں ہو اور بیک وقت سارے شوہروں کو یا کئی شوہروں کو جنسی ضرورت پیش آجائے تو ایک ساتھ اس کا پورا ہونا ممکن نہیں۔ یہ چیز باعث نزاع بن جائے گی، لہٰذا مناسب یہی ہے کہ ایک عورت کے متعدد شوہر نہ ہوں۔

۲۔ جنت میں مردوں کو بہت سی حوریں ملنا اور عورت کو صرف اس کا شوہر ملنا ہی مناسب ہے، وجہ یہ کہ جنت انعام کی جگہ ہے اور انعام میں وہ شے دی جاتی ہے جو باعث راحت و عزت ہو، اسلام اگرچہ مرد و عورت دونوں کو یکساں حقوق دیتا ہے مگر ازدواجی رشتہ میں عورت چونکہ ماتحت ہوتی ہے اور مرد نگراں، ایک نگراں کے کئی ماتحت ہوسکتے ہیں لیکن ایک ماتحت کے کئی نگراں ہوں تو یہ چیز خود اس (عورت) کے لئے باعث اذیت نہ ہوگی؟ یہ کوئی جزا نہیں ہوگی۔

اعتراض ۶

اسلام کی رو سے توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور گناہ گار سزا سے بچ جاتا ہے، حالانکہ یہ نظریہ غیر منصفانہ ہے۔ جس طرح ایک نیک انسان کو جزا سے نوازا جاتا ہے، ایک بدکار کو لازمی طور پر سزا ملنی چاہیئے، نظریہ تناسخ کی رو سے اعمال کی جزا و سزا ایک ضابطہ کے تحت آجاتی ہے اس لئے یہی نظریہ معقول ہے۔

جواب الزامی

یہ عقیدہ تو خود ہندوؤں کی مقدس کتابوں مہابھارت وغیرہ میں موجود ہے کہ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ سواتھربن وید میں ذکر الٰہی سے گناہ معاف ہو جانے کا ذکر ہے، ظاہر ہے توبہ بھی ایک ذکر الٰہی ہی ہے جو احساسات ِ ندامت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

جواب تحقیقی

حاکم اگر کسی کا حق دبالے یا کسی مظلوم کو اس کا حق نہ دلوائے تو یقیناً قابل اعتراض ہے، لیکن اگر وہ اپنا حق چھوڑ دے اور معاف کر دے تو یہ ظلم نہیں بلکہ اس کی مہربانی ہے، البتہ یہ مہربانی صرف اُن بندوں کو حاصل ہوتی ہے جو اس کے مستحق بن چکے ہوں۔ اس لئے توبہ کی مقبولیت کے لئے ایمان کی قید لگائی گئی اور جزا کے لئے عملِ صالح کی۔

اعتراض ۷

جانوروں کی حلّت و حرمت کے بارے میں اسلامی نظریہ غیر معقول ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا تو جانور حلال ہو گیا، اس طرح تو اگر شیر اور چیتے کو بھی بسم اللہ پڑھ کر ذبح کر دیں تو اُسے حلال ہو جانا چاہیئے اور اگر حلّت موت سے آتی ہے تو جو بھی جانور مر جائے اس کو حلال ہونا چاہیئے، چند جانوروں کی کیا تخصیص ہے۔

جواب الزامی

خود ہندوؤں کی مذہبی کتب میں یہی بات موجود ہے جس پر اعتراض کیا جا رہا ہے، مہابھارت میں ہے کہ جن جانوروں کے قتل کے وقت وید پڑھا جائے اُن کا گوشت پاک ہے، اسرب پنکھ رکھ وید میں یہ بھی تخصیص ہے کہ قابل خوراک جانور وہ ہیں جن کے نیچے کے دانت ہوں اوپر کے نہ ہوں۔

جواب تحقیقی

ہمیں سوچنا چاہیئے کہ کسی چیز کے حلال ہونے کی وجہ کیا ہے؟ کیا صرف اجازت ہی اس کی وجہ ہوتی ہے تب اگر کوئی شخص اپنا بول و براز کھانے کی اجازت دیدے یا اپنی ماں بہن بیوی کے استعمال کی اجازت دیدے تو یہ چیزیں استعمال کے لئے جائز ہوجائیں گی، اجازت سے پہلے یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اشیاء میں حلال ہونے کی صلاحیت بھی ہے یا نہیں۔ لہٰذا بسم اللہ پڑھ کر صرف وہی جانور حلال ہوں گے جن میں حلال ہونے کی ذاتی صلاحیت موجود ہو۔

۲۔ خدا کے نام میں یہ تاثیر موجود ہے کہ ذبیحے کو حلال کردے مگر اس تاثیر کا تعلق صرف اُن جانوروں سے ہے جن کو کھانے کی اجازت اسلام نے دی ہے، جن جانوروں کا گوشت استعمال کرنے کی اجازت نہیں ان میں بسم اللہ کی تاثیر قبول کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

اعتراض ۸

اسلامی عقیدے کے مطابق جنت میں شراب کی نہریں ہیں۔ آخر شراب جنت میں حلال کیوں ہوجائے گی اور جنت کی اُن نہروں کا طول وعرض کیا ہے؟ کہاں ہیں؟ بہاؤ کا رخ کیا ہے، اُن کی شراب سڑتی کیوں نہیں؟

جواب الزامی

ویدوں میں خود شراب کے حوض اور نہروں کا ذکر ہے، لہٰذا پنڈت جی کے یہ سارے سوالات خود اُن پر عائد ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اگر اس طرح کے سوالات کو اہمیت دے کر جنت کی نہروں کے بارے میں ساری تفصیلات مہیا کر بھی دی جائیں تو اس کی افادیت کیا ہے؟

رہا یہ کہ جنت میں شراب حلال کیوں ہوجائے گی تو اس طرح کی چیزیں بھی خود مہابھارت اور ہندوؤں کی دیگر مقدس کتب میں موجود ہیں۔ مہابھارت کے پرب اول میں ہے کہ شراب پہلے زمانے میں برہمنوں پر حلال تھی اب حرام ہوگئی۔

۲۔ اگر جنت کی نہروں پر تب ہی ایمان لایا جائے گا جب اُن کا طول وعرض، مقام اور بہاؤ کا رخ معلوم ہوجائے تو اس اصول پر تو جنت کی نہریں دور رہیں خود دنیا کے حوضوں اور نہروں میں شاید ہی اس شرط پر کوئی پوری اُترے۔ کیا کوئی گنگا کا صحیح طول وعرض اور ہر جگہ اس کے عمق وغیرہ کی

تفصیلات مہیا کرسکتا ہے۔ تو کیا محض اس وجہ سے گنگا کے وجود پر یقین نہ کریں؟

۳۔ جہاں تک شراب نہ سڑنے کا سوال ہے تو خود پنڈت جی کے نزدیک بھی بہتی ہوئی شراب نہیں سڑتی۔ لہٰذا جنت کی بہتی نہروں کی شراب کیوں سڑے گی، جو خدا دنیا میں سینکڑوں نہروں اور جھیلوں کو سڑنے سے بچاتا ہے وہی جنت میں نہروں کو سڑنے سے بچائے گا۔

جواب تحقیقی

جنت کی نہریں آلودگی سے پاک ہیں غذاؤں کے متعفن مادے وہاں نہیں ہیں، آفتاب کی حرارت وہاں نہیں، زمین کی کدورت وہاں نہیں تو پھر وہاں نہریں کیوں سڑیں جو صفائی اور تنقیح کے اُن مراحل سے گزر رہی ہیں جن میں فضلہ کا نام ونشان تک نہیں اور اجزائے کثیفہ سے پاک ہیں۔

دنیا میں شراب جو حرام ہے وہ نشہ آور ہونے کی وجہ سے حرام ہے، یہ بات خود ہندو مذہب کی کتابوں مہابھارت وغیرہ میں مذکور ہے۔ چنانچہ شراب سے اگر نشہ زائل ہو جائے تو وہ حرام نہیں رہتی۔ مثلاً سرکہ حلال ہے، جنت کی شراب میں نشہ نہیں ہے اس لئے وہ حلال ہے۔

۲۔ جنت کی شراب میں اگر نشہ ہو تب بھی وہ حلال ہونی چاہئے، چوں کہ نشہ انسان کے دینی واخلاقی فرائض کی ادائیگی میں حارج ہے اس لئے ممنوع ہے اور جنت میں آدمی تمام فرائض وواجبات سے سبکدوش ہوگا۔ لہٰذا جنت کی شراب اگر نشہ آور بھی ہو تو اس کے حلال ہونے میں کوئی حرج نہیں۔

اعتراض ۹

دفن میت کا اسلامی طریقہ موزوں نہیں ہے۔ اس سے بہتر تو مردوں کو جلا دینا ہے، دفن کی صورت میں زمین مردے اور لاش کی آلائشوں کی وجہ سے ناپاک ہو جاتی ہے، جلانے کی صورت میں آلودگی کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔

جواب الزامی

دفن میں تو زمین کا اندرونی حصہ ہی آلودہ ہوتا ہے، جلانے میں تو زمین کا باہری حصہ اور ساری خارجی فضا آلودہ ہو جاتی ہے۔ ہوا مسموم ہو جاتی ہے جس سے انسانوں کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔

جواب تحقیقی

انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے، روح جوہر لطیف اور جسم تودۂ خاکِ کثیف ہے۔ اِس تضاد

کے باوجود روح جو عالمِ علوی کا نور ہے، جسم کثیف میں بسیرا کرتی ہے اور جب اللہ کا حکم ہوتا ہے جدا ہو جاتی ہے۔ اس ملنے یا جدا ہونے میں روح یا جسم کسی کا دخل نہیں، لہٰذا روح و جسم کی علیحدگی کے بعد جسم کو کیوں سزا دی جائے؟ بہتر یہی ہے کہ اس کو اعزاز و اکرام کے ساتھ خاک ہی میں پہونچا دیا جائے۔

اگر دفن اس لئے ممنوع قرار دیا جائے کہ اس سے زمین آلودہ ہو جاتی ہے تو پھر تو بول و براز تک ممنوع ہونا چاہئے۔ کیوں کہ اس سے زمین کی آلودگی کہیں زیادہ ہوتی ہے، جبکہ بول و براز کا عمل تو اختیاری ہے موت تو غیر اختیاری عمل ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ صورتِ حال برعکس ہے، زمین پاک ہے اور اس میں اشیاء کو پاک کرنے کی تاثیر ہے، لہٰذا دفن کے بعد تو زمین خود جسم میت کو پاک کر دیتی ہے اور کسی آلودگی و نجاست کا نام و نشان نہیں رہتا۔

جلانے کا طریقہ توہین آمیز اور اذیّت ناک ہے، اس سے خود مردہ کے اعزّہ اور دیگر جانداروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ جلتے وقت مردے کے بدن سے نکلنے والی بد بو نہایت تکلیف دہ ہوتی ہے، مردے کی مسخ شدہ صورت پر نگاہ پڑتی ہے، اس کے جراثیم فضا میں سرایت کرتے ہیں، اس کے برخلاف میت کو نہلا دُھلا کر عطر و خوشبو لگا کر سفید باوقار کفن میں اعزاز و اکرام کے ساتھ دفن کرنے سے مردے کی تکریم ہوتی ہے۔

۲۔ دفن کے ذریعہ میت کے عناصر اربعہ زمین میں جا کر اپنی اپنی اصل میں جا ملتے ہیں جس سے زمین کی قوت نمو میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ غور کریں کہ جب جسم کا فضلہ بول و براز تک زمین کی قوت نمو میں اضافہ کرتا ہے تو خود جسمِ انسانی اُس میں اضافہ کیوں نہ کرے گا، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ قبرستان اور اس کے قرب و جوار کے علاقے سرسبز و شاداب ہوتے ہیں، اپنے عناصر اربعہ کے ساتھ میت زمین میں جا کر اس طرح لیٹ جاتی ہے جیسے بچہ مادر مہربان کی آغوش میں سو جاتا ہے اور اس کی مٹی مٹی میں، پانی پانی میں، آگ آگ میں اور ہوا ہوا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔

اعتراض ۱۰

اسلام کے مطابق انسان مرنے کے بعد قیامت اور حساب کتاب کے مراحل سے قبل برزخ کی زندگی گزارتا ہے، جس میں اس کی حیثیت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو حوالات میں بیٹھا اپنے

بارے میں آخری اور حتمی فیصلے کا انتظار کرتا رہتا ہے، جبکہ انصاف یہ ہے کہ جزا و سزا میں تاخیر نہ ہو، عقیدۂ تناسخ ہی انصاف کے تقاضوں کے عین مطابق ہے جس کی رو سے انسان کو مرتے ہی اس کے اعمال کی جزا یا سزا مل جاتی ہے۔

جواب الزامی

۱۔ تاخیر تو عقیدۂ تناسخ کی رو سے بھی لازم آتی ہے، کیوں کہ انسان اِس عقیدہ کے مطابق اچھے یا برے اعمال کرنے کے بعد اپنی طبعی موت کا انتظار کرتا رہتا ہے، اس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے کی نوبت نہیں آتی۔

۲۔ جزا و سزا کا خدائی عمل کسی مزدور کی مزدوری ادا کرنے کا عمل نہیں ہے جس کی فوری انجام دہی ضروری ہو اور اگر اسے مزدوری ادا کرنے کا عمل بھی مان لیں تو یہ حقیقت ہے کہ مزدور کو مزدوری کام کے خاتمے پر ہی ملتی ہے۔ جیسے باورچی کو کھانا پکا لینے کے بعد اور درزی کو کپڑا سی لینے کے بعد ملتی ہے اور اگر کام اجتماعی ہو جیسے ٹھیکہ کا کام ہوتا ہے تب تو اور بھی تاخیر ہو جاتی ہے، لہٰذا ہر مزدوری کا بھی فوراً دینا ضروری نہیں ہے۔

۳۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جزا و سزا کے معاملے کو مزدوری کے معاملے پر قیاس کرنا ہی درست نہیں۔ عبادت تو بندے کا فرض ہے، خدا اس پر اگر انعام و اکرام سے نوازے تو یہ اس کا فضل ہے، یہ اس پر قرض نہیں کہ اس کی فوری ادائیگی ضروری ہو۔ اسی طرح اگر سزا میں خدا تاخیر کرے تو یہ خلافِ عدل نہیں، عین مقتضائے عدل و کرم ہے۔

حقوق العباد میں جو کوتاہی انسانوں سے ہوتی ہے اس کے بارے میں صورتِ حال مختلف ہے، خدا نے ایک مشفق و مہربان کی طرح بندوں کے لئے یہ راہ نکال رکھی ہے کہ کل روزِ قیامت جب نفسا نفسی کا عالم ہوگا اور لوگوں کے پاس خدا کی رحمت اور اپنے باقی ماندہ حقوق کے سوا کوئی سامانِ نجات نہ ہوگا تو اس سخت گھڑی میں یہ محفوظ سرمایہ ہی اُن کے کام آئے گا۔

جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ قیامت آنے کی دلیل کیا ہے تو اس کے لئے بہت سے دلائل ہیں۔ پہلی دلیل تو یہ ہے کہ مختلف الاغراض اجزا سے مرکب ایک شے لازمی طور پر تخریب کا شکار ہوتی ہے اور اس کے اجزا الگ الگ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہونچ جاتے ہیں۔ اس کائنات کے

مختلف الاغراض اجزا پر مشتمل ہونے کی حقیقت اس کی ہر شے سے ظاہر ہے، لہٰذا اس کائنات کی شکست وریخت لازمی ہے جس کے بعد اس کے مختلف اجزا اپنی اپنی اصل میں جاملیں گے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اسی واقعے کا نام حساب کتاب کے بعد جنت یا جہنم کے مراحل طے کرنا ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ مجموعۂ کائنات کو جسم انسانی سے بڑی حد تک مشابہت ہے، جسم انسانی میں اگر تغیر وفساد رونما ہو جائے تو اُسے مرض یا علامتِ مرگ کہتے ہیں۔ کائنات کے مزاج میں تغیر وفساد رونما ہو جائے تو اسے علامات قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اگر جسم انسانی میں تغیر اتنا شدید ہو کہ اس کی روح اس سے الگ ہو جائے تو اُسے موت کہتے ہیں اور اگر کائنات میں تغیر اتنا شدید ہو کہ اس کی روح اس سے الگ ہو جائے تو اسے قیامت کہتے ہیں۔ پھر جیسے موت کے بعد انسان کے عناصر اربعہ مٹی مٹی میں، پانی پانی میں، ہوا ہوا میں اور آگ آگ میں مل جاتی ہے اسی طرح کائنات کی موت کے بعد نیکی اور نیک جنت میں، برائی اور بروں کا طبقہ جہنم میں پہونچ جائے گا۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ انسان خدا کی عبادت کے لئے دنیا میں آیا ہے اور یہ مقصد جب پورا ہو جائے گا تو یہ دنیا بند ہو جائے گی، جس طرح کھانا پکانے کے بعد باورچی خانے کا چولھا ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ بات اپنے آپ سمجھ میں آتی ہے کہ قیامت سے پہلے دین اسلام کا ساری دنیا پر چھا جانا ضروری ہے تاکہ اس کی عبادت کا عمل مکمل ہو سکے۔

یہاں یہ ملحوظ رہے کہ رات دن محض جسمانی وظاہری طور پر مصروف رہنے کا نام عبادتِ کاملہ نہیں بلکہ یہ اس مجموعۂ عجز ونیاز کا نام ہے جو خدا کی ہر صفت اور ہر کمال کے مقابلے میں مجملاً ظاہر کیا جائے اور یہ عمل صرف عبد کاملؑ کے ورودِ مسعود کے نتیجے میں کیفی طور پر پورا ہوا اور فیضان محمدیؐ کے نتیجے میں کمی طور، پر جب یہ عمل مکمل ہو جائے گا قیامت قائم ہو جائے گی۔

چوتھی دلیل یہ ہے کہ دنیا ہنوز نشو ونما اور اس کے بعد اشیاء کے ظہور کے مراحل سے گزر رہی ہے بقول اقبال:

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

یہ ناتمام کائنات جب مکمل ہوگی تو لازماً ایک بڑی تبدیلی سے دوچار ہوگی اور تبدیلی کے اِسی مرحلے کو قیامت کہا جاتا ہے۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ اس کائنات کا حاکم خداوند قدوس ہے، اس کی رعیت میں کچھ سرکش ہیں اور کچھ مطیع ومنقاد لوگ، تو ظاہر ہے سرکشوں کو ملیا میٹ کرنا اور وفاداروں کو انعام دینا ضروری ہے جس کے لئے خدا کائنات کے اس نظام کو درہم برہم کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا یا سزا دے گا، اسی مرحلے کو قیامت اور حشر ونشر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سوامی دیانند کا گیارہواں اعتراض قبلہ پر تھا، اس اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان کعبہ میں موجود ایک پتھر کی طرف رخ کر کے سجدہ کرتے ہیں، بت پرست بھی پتھر کے بت کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں، لہٰذا مسلمان بھی بت پرست ہوئے اور الزام سے بچنے کے لئے جو جواب مسلمان دیں گے وہی جواب بت پرستوں کی طرف سے بھی دیا جاسکتا ہے۔

حضرت نانوتوی نے اس اعتراض کے جواب کے طور پر ایک مستقل کتاب ''قبلہ نما'' مرتب فرمائی جس میں اس اعتراض کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے اور الزامی وتحقیقی دونوں قسم کے جواب دئے ہیں جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

جواب الزامی

بت پرست لوگ استقبال کعبہ پر اعتراض نہیں کرسکتے اس لئے کہ استقبال کعبہ اور بت پرستی میں ۷/فرق بالکل نمایاں ہیں۔

پہلا فرق خود لفظ استقبال کعبہ اور لفظ بت پرستی سے ظاہر ہے، استقبال کعبہ کا مطلب ہے کہ صرف رُخ اس کی طرف کرلیا جائے، جبکہ بت پرستی کا مطلب ہے کہ بت کو معبود اور کارساز سمجھ کر اس کی پرستش کی جائے۔ دوسرا فرق نیت کا ہے، استقبال کعبہ کے لئے نیت کی ضرورت نہیں آدمی کا چہرہ کعبہ کی طرف ہو تو نماز درست ہو جائے گی، جبکہ بت پرستی کے لئے قصد واہتمام کی ضرورت ہے۔ تیسرا فرق یہ ہے کہ استقبال کعبہ کرتے وقت نمازی کے کسی بھی قول یا فعل سے خدائے واحد کی پرستش کے سوا کچھ اور ظاہر نہیں ہوتا، جبکہ بت پرستی میں پجاری کے ہر ہر قول وعمل سے بُت کی تعظیم وتکریم ظاہر ہوتی ہے۔ چوتھا فرق یہ ہے کہ استقبال کعبہ میں صرف سمت کعبہ کی طرف رخ ہونا کافی ہے، کعبہ کی دیواروں کا تقابل ضروری نہیں، جبکہ بت پرستی میں بتوں کا سامنا ہونا ضروری ہے۔ پانچواں فرق یہ ہے کہ اسلام میں کعبہ بیت اللہ (اللہ کا گھر) ہے اور ظاہر ہے کہ گھر میں مکین ہی مطلوب ومقصود ہوتا ہے،

جبکہ بت پرستی میں بت ہی مطلوب و مقصود ہوتا ہے۔ چھٹا فرق مسلمانوں اور بت پرستوں کے نظریات کی بنا پر ظاہر ہوتا ہے، مسلمان خدا کے علاوہ کسی کو معبود و مسجود نہیں سمجھتے حتی کہ محمدؐ رسول اللہ کو بھی، تو وہ کعبہ کو مسجود کس طرح سمجھ سکتے ہیں، جبکہ بت پرستوں کے نزدیک بت ہی معبود و مسجود ہیں، مسلمانوں کے لئے کعبہ صرف جہت سجدہ ہے۔ ساتواں فرق یہ ہے کہ استقبال قبلہ حکم خداوندی ہے، لہٰذا قبلہ کی طرف منہ کر کے درحقیقت خدا کی اطاعت کی جاتی ہے، جبکہ بت پرستی قطعاً حکم خداوندی نہیں جو مماثلت کا شبہ کہا جائے اور یہ کہنا کہ کعبہ ہی کی طرف رخ کرنا کیوں حکم خداوندی ہے تو اس الزامی جواب میں مختصراً صرف اتنا بتایا جاسکتا ہے کہ کعبہ چوں کہ جلوہ گاہِ تجلیات ربانی ہے، اس لئے اللہ نے اس جہت کو سجدہ کے لئے متعین کیا، کیونکہ عبادت اگرچہ اصلاً ایک روحانی امر ہے مگر اس کا اظہار جسمانی سطح پر بھی ہونا چاہئے ورنہ اس کی افادیت ظاہر نہ ہوسکے گی اور عبادت کا جسمانی اظہار جہت و مکان کی قید سے آزاد نہیں ہوسکتا، جبکہ جہت کی تخصیص بندوں میں نظم و انضباط اور ایک سلیقہ پیدا کرے گی۔

رہا یہ سوال کہ بت پرستی کو خلافِ عقل کیوں سمجھا جائے اور استقبال قبلہ کو کیوں نہیں؟ تو جواب واضح ہے، استقبال میں اصل مقصود عبادتِ خداوندی ہے اور جہت کعبہ کی تعین محض رفع حرج اور نظم و سلیقہ پیدا کرنے کے لئے ہے، جبکہ بت پرستی کا مطلب خدا کے علاوہ بھی کسی اور کو جو مالکِ نفع و ضرر نہیں مستحق عبادت سمجھنا ہے اور حماقت کی انتہا یہ ہے کہ جسے مستحق عبادت سمجھا جارہا ہے وہ صاحب شعور و اختیار تو کیا، ذی روح اور جاندار تک نہیں، محض ایک نام ہے جسے رکھ لیا گیا ہے اور اُسے مسمّٰی سمجھا جارہا ہے۔

اگر کسی بت پرست کی طرف سے یوں کہا جائے کہ ہمارے نزدیک بت پرستی بھی حکم خداوندی ہے اس لئے واجب التسلیم ہے، وید میں برہما وغیرہ کی پوجا کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو قبلہ اور بت میں کیا فرق رہا؟

جواب یہ ہے کہ استقبال کعبہ کا حکم قرآن میں ہے جس کا کلامِ الٰہی ہونا اور محمد رسول اللہ کا رسول برحق ہونا یقینی ہے، جبکہ وید کا کلامِ الٰہی ہونا یقینی نہیں جس کے لئے دلائل موجود ہیں۔

داخلی شہادت یہ ہے کہ ایسے کسی حکم کا خدا کی طرف سے ہونا ممکن ہی نہیں جس میں خدا کسی نااہل کو اپنا ہم سر قرار دے۔ محض اس حکم کی موجودگی کی وجہ سے ہی ویدوں کا کلامِ الٰہی ہونا مشتبہ

ہو جاتا ہے۔

قرآن اور محمد مصطفیٰ کی صداقت پر متعدد دلائل موجود ہیں، ان دونوں کی صداقت لازم وملزوم ہے، قرآن نزول سے اب تک من وعن محفوظ ہے جیسا کہ اس کا دعویٰ تھا، محمد مصطفیٰ دیگر ادیان ومذاہب کے پیشواؤں سے علم وعمل، فہم وفراست، اخلاقِ حمیدہ، معجزات وخوارق عادت ہر شے میں ممتاز ہیں۔ محمد مصطفیٰ اور آپؐ کے اصحاب کا مسلسل کردار خود آپ کی صداقت کی دلیل ہے کہ کس طرح کے لوگوں میں کیسے عظیم اخلاق آپ نے پیدا کردئے، ان تمام کمالات پر وہ ذخیرۂ احادیث شاہد ہے جو معیارِ استناد کے اعتبار سے عام تاریخی روایات سے بہت زیادہ بلند ہے۔

اس الزامی جواب کو ختم کرتے ہوئے حضرت نانوتویؒ نے پنڈت دیانند کے اُن دو اعتراضات کا بھی ضمنی طور پر جواب دیا ہے جو اُنہوں نے معجزۂ شق القمر پر کئے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس واقعہ کا وقوع عملاً ممکن ہی نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس واقعہ کی کوئی تاریخی شہادت بھی نہیں۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اگر اس معجزہ کا خارقِ عادت ہونے کی وجہ سے انکار کیا جاتا ہے تو پھر ہر مذہب[۱] کے لوگ جن خوارقِ عادت ومعجزات کو اپنے پیشواؤں سے منسوب کرتے آئے ہیں اُن سب کا انکار کردینا چاہئے، دنیا کی اتنی بڑی تعداد کا خوارقِ عادت چیزوں پر یقین رکھنا خرقِ عادت کے وجود کا یقین دلاتا ہے، پنڈت جی خود وید کو کلام الٰہی مانتے ہیں جو برہما کے منہ سے نکلا ہے، کیا یہ خارقِ عادت نہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے، وہی خدا اپنے کسی فعل کے صدور کے لئے اپنے بندوں میں سے کسی کو واسطہ بنالے تو اس میں کونسا عقلی استحالہ ہے؟

پوچھا جاسکتا ہے کہ خوارقِ عادت کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے تو یہ خدا کے پیغمبروں کے لئے خدا کی خصوصی مدد ہوتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے کسی حکومت میں وزراء کی مدد فوج کرتی ہے۔

معجزۂ شق القمر کے سلسلے میں سوامی دیانند کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ تاریخی طور پر ثابت نہیں، حالانکہ کئی وجوہ سے اس معجزہ کا ثبوت موجود ہے۔ خود قرآن میں جو تاریخی طور پر سب سے زیادہ مستند کتاب ہے اس معجزے کا تذکرہ موجود ہے، کتب حدیث میں موجود ہے جو اعلیٰ تاریخی معیار کی حامل ہیں۔ اب اگر کوئی شخص سورج کے طلوع کا صرف اس لئے انکار کرے کہ جنتری یا کیلنڈر میں اس کا تذکرہ

نہیں ہے تو اس کا کیا علاج ہے؟

پنڈت جی کہہ سکتے ہیں کہ اس معجزے کا تذکرہ صرف اہلِ اسلام کی کتب میں کیوں ہے؟ تو اُن سے بھی سوال ہوسکتا ہے کہ وہ خوارق عادت جو وہ اپنے بزرگوں سے منسوب کرتے ہیں اُن کی خاص مذہبی کتب کے علاوہ ان خوارق کا تذکرہ کہیں اور کیوں مذکور نہیں؟

شق قمر کا یہ واقعہ جو رسولِ اقدسؐ کے اشارۂ انگشت سے ظہور میں آیا کچھ ایسے وقت پیش آیا کہ اہل عرب بلکہ اہلِ حجاز کے علاوہ کوئی اس کو نہ دیکھ سکا، ہندوستان میں اس وقت آدھی رات تھی اور غالباً موسم سرما کی رات تھی، مغربی مما لک میں طلوع سحر سے قبل کا ٹائم تھا، شمالی جنوبی مما لک میں خط زاویہ مخروطہ کی وجہ سے نصف ہی چاند نظروں کے سامنے آیا ہوگا۔ شق قمر کی یہ کیفیت زیادہ دیر نہیں رہی، لوگ سو رہے تھے، کتنے لوگ جاگ رہے ہوں، اُن میں کتنے آسمان کی طرف دیکھ رہے ہوں، کتنے لوگ دیکھ کر بھی گردوغبار یا ابرو کہبار کی وجہ سے نہ دیکھ پائے ہوں۔ ایسی صورت میں اگر کثیر تعداد نے نہ دیکھا تو یہ فطری بات ہے، حالانکہ تاریخ فرشتہ میں موجود ہے کہ بھارت میں اودے پور کے راجہ نے اس اعجاز کا مشاہدہ کیا تھا، کیا یہ تاریخی شہادت نہیں ہے؟ مگر دنیا میں خاص طور سے عرب والوں میں اس وقت تک تاریخ نویسی کا رواج نہ تھا، اسی لئے تاریخوں میں اس کا تذکرہ بہت زیادہ نہ آسکا۔

جواب تحقیقی (برائے اعتراض بر استقبال قبلہ)

مسلمانوں کے نزدیک کعبے کی حیثیت مسجود و معبود کی نہیں، البتہ فضائے کعبہ میں جمال خداوندی عکس ریز ہے۔ فضائے کعبہ محض جلوہ گاہ ہے، مسلمان جب کعبہ کو رخ کر کے سجدہ کرتا ہے تو یہ کعبہ کی دیواروں کو سجدہ نہیں ہوتا، اس جمال الٰہی کو ہوتا ہے جو فضائے کعبہ میں عکس ریز ہے۔ اسی لئے ایسا بھی ہوا ہے کہ جب کعبہ کی عمارت منہدم ہوگئی تب بھی سجدہ اُسی سمت کیا جا تا رہا۔ بُت چوں کہ معبودِ حقیقی کی جلوہ گاہ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس لئے وہ معبودِ حقیقی کی عبادت کے لئے واسطہ وجہت بھی نہیں بن سکتے۔

کعبہ اسی طرح جلوہ گاہ خداوندی ہے جس طرح آئینہ سورج کی جلوہ گاہ ہے، دیگر چیزوں کو سورج کی روشنی سے وہ نسبت حاصل نہیں جو آئینہ کو ہے، اسی طرح کعبہ کو تجلیات باری سے جو نسبت حاصل ہے دنیا کی کسی چیز کو نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جمال خداوندی مبدأ وجود ہے اور فضائے کعبہ

مبدأ موجودات ہے کہ سب سے پہلے دنیا میں کعبہ ہی جسمانی طور پر موجود ہوا، تو جلوہ الٰہی کے ساتھ
اس جلوہ گاہ کا ایک گونہ تقابل ہوا جیسے سورج و آئینہ میں ہوتا ہے۔ کعبہ کا مبدأ عالم اجسام ہونا معروف
مذاہب کی معتبر مذہبی کتابوں میں متواتر روایات سے ثابت ہوتا ہے۔

آئینہ اور سورج کی یہ مثال یہ بھی واضح کرتی ہے کہ فضاء کعبہ میں تجلی باری صرف منعکس ہوتی
ہے محدود نہیں ہوتی جس طرح سورج کی روشنی آئینہ میں صرف منعکس ہوتی ہے آئینہ میں قید نہیں
ہوتی۔ بت چوں کہ جلوہ گاہ ذات باری نہیں بن سکتے، لہٰذا وہ کعبہ کی طرح مسجود الیہ بھی نہیں بن سکتے۔

سفر میرٹھ

پنڈت دیانند رڑکی میں حضرت نانوتوی سے کسی قیمت پر مذہبی مباحثہ کے لئے تیار نہ
ہوئے، مگر اپنے لکچروں کے ذریعے آس پاس اسلام کی مخالفت میں زہر افشانی کرتے رہے۔ رڑکی
کے بعد وہ میرٹھ پہونچے، وہاں اُن کا مرکز بھی قائم تھا، اُن کا رسالہ بھی نکلتا تھا۔ میرٹھ میں پنڈت جی
کے لکچر جب عوام میں پھیلے تو میرٹھ کے عوام نے حضرت نانوتوی کو یاد کیا۔ عوام کے اصرار پر آپ
جولائی ۱۸۷۹ء میں میرٹھ تشریف لے گئے، میرٹھ میں آپ بسلسلۂ تصحیح کتب عرصہ دراز تک رہے تھے،
میرٹھ کی گلیوں اور بازاروں سے بخوبی آشنا تے، اس لئے بنگلے پر پہونچ گئے جہاں پنڈت جی اکثر آیا
کرتے تھے۔ وہاں نہیں ملے تو پنڈت جی کی دوسری قیام گاہ پر پہونچ گئے اور وہیں پنڈت دیانند سے
ملاقات ہوئی، لیکن حسب سابق وہ وہاں بھی کسی گفتگو کے لئے تیار نہ ہوئے۔ اس دوران پنڈت جی
کے ایک معتقد لالہ انندلال نے سوامی دیانند کے اخبار آریہ سماچار میں اسلام پر کچھ اعتراضات اُٹھائے
تھے جس کا لہجہ بھی کافی گستاخانہ تھا، حضرت نانوتوی نے چاہا کہ اسی لہجے میں اس کا جواب دے دیا
جائے۔ مولانا عبدالعلی میرٹھی اس کے لئے تیار ہو گئے اور حضرت کے ارشادات کی روشنی میں یہ کتاب
مرتب ہوئی اور جواب ترکی بترکی کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کو بعد میں مولانا اشتیاق صاحب
استاذ دارالعلوم دیوبند نے تسہیل کر کے براہین قاسمیہ کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ پوری کتاب علم
کلام کا شاہکار ہے، وجود باری اور صفاتِ باری کی دقیق بحثیں ہیں، آخر میں قرآن کو کتاب الٰہی ثابت
کیا گیا ہے، انبیاء کی ضرورت، ان کا مقام و مرتبہ اور آخر میں سرور کائنات ؐ کے خاتم النبین ہونے کو
واضح کیا گیا ہے۔

کتاب کے آخر میں پنڈت جی کو ایک بار پھر مباحثہ کا چیلنج دیا گیا ہے اور اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے کہ حسبِ دستور پنڈت جی اس چیلنج کو بھی قبول نہیں کریں گے۔

کتاب "جواب ترکی بترکی" کی اشاعت کے چند ماہ بعد ہی ۴۹ سال کی عمر میں حضرت نانوتوی اس دنیائے فانی سے رحلت فرما کر اپنے ربّ جلیل کے حضور پہونچ گئے۔ بقول مولانا مناظر احسن گیلانیؒ پنڈت دیانند سے براہِ راست گفتگو کرنے کی یہ حسرت حضرت والا کے دل میں اتنی شدید تھی کہ

> کہنے والوں سے میں نے سنا ہے کہ بالآخر یہی قصہ عالمِ اسباب میں حضرت نانوتویؒ کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ (سوانح قاسمی جلد دوم ص ۵۱۵)

اور اس طرح وہ بے قرار ہستی قیامت تک کے لئے خاموش ہوگئی جس نے ہمیشہ اسلام کی عظمت کے خواب دیکھے، جس کا دل اسلام دشمنوں کو سرنگوں دیکھنے کا زندگی بھر خواہاں رہا، جس کے ارمان آخری سانس تک اسلام کی سربلندی کے لئے وقف رہے اور اپنی ذات کے لئے جس کے سینے میں کبھی کوئی ارمان نہ تھا۔ رحمه الله تعالیٰ رحمة واسعة.

ماخذ

۱۔ مباحثہ شاہجہاں پور — مولانا فخر الحسن گنگوہی — کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند

۲۔ حجۃ الاسلام (تسہیل وتشریح) — مولانا اشتیاق احمد — مجلس معارف القرآن دار العلوم، دیوبند ۱۹۶۷ء

۳۔ تقریر دل پذیر — حضرت نانوتویؒ — کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند

۴۔ انتصار الاسلام — حضرت نانوتویؒ — کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند

۵۔ قبلہ نما (تشریح وتسہیل) — مولانا اشتیاق — شعبۂ نشر واشاعت دار العلوم، دیوبند ۱۹۶۹ء

۶۔ عظمت اسلام — خالد القاسمی — دار المؤلفین، دیوبند ۱۹۹۱ء

۷۔ افادات قاسمی — خالد القاسمی — دار العلوم حیدر آباد ۱۹۹۴ء

۸۔ جواب ترکی بترکی — حضرت نانوتوی — مجلس معارف القرآن، دیوبند ۱۹۶۷ء

۹۔ صداقت اسلام — خالد قاسمی — دار المؤلفین، دیوبند ۱۹۸۸ء

۱۰۔ مولانا قاسم نانوتویؒ — اسیر ادروی — شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند ۱۹۹۵ء

۱۱۔ تحفۂ لحمیہ — حضرت نانوتویؒ — کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند

۱۲۔ سوانح قاسمی جلد دوم — مولانا مناظر احسن گیلانیؒ — دفتر دار العلوم، دیوبند ۱۳۷۵ھ

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز*

امام محمد قاسم نانوتوی کی وجودی فکر اور جدید فلسفۂ وجودیت

وجود کیا ہے؟

وجود و موجودات کی حقیقت کا مسئلہ ہمیشہ ایک اہم سوالیہ نشان بن کر فکر انسانی سے نبرد آزما رہا ہے۔ انسان نے جب بھی فکر و نظر سے زندگی و موت اور حیات و کائنات کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی تو اس کے سامنے وجود و موجودات کا مسئلہ متعدد زاویوں سے توجہ طلب رہا:

(۱) زندگی اور موت یا وجود و عدم کی فی نفسہ حقیقت کیا ہے؟

(۲) کیا اس کارخانۂ حیات و کائنات کا کوئی خالق ہے یا خود بخود پیدا ہو گیا ہے اگر ہے تو اس کا اس کے پیدا کرنے سے کوئی مقصد و منصوبہ ہے یا بغیر مقصد کے اس کو پیدا کیا ہے؟

(۳) انسانی وجود کی حقیقت کیا ہے اور اس کا خالق اور دیگر مخلوقات سے کیا رشتہ و تعلق ہے؟

(۴) کیا خالق و مخلوق دونوں قدیم و لافانی ہیں یا دونوں فانی و حادث ہیں یا خالق قدیم اور مخلوقات حادث ہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

وجود کی حقیقت جاننے کے سلسلہ میں جب تفلسف زیادہ گہرا ہوتا ہے تو انسان حیرت و درماندگی کا اسیر ہو جاتا ہے، اس کے تمام مشاہدے اور منطقی مفروضے شکست و ریخت اور خود تناقضی کا شکار ہونے لگتے ہیں اور وہ غالب کی زبان میں کہہ اٹھتا ہے:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے
اور کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے!

فلسفہ کی حیرت کسی حد تک اطمینان کا سانس اس وقت لیتی ہے جب اسے ایک درمیانی راہ نکلتی نظر آتی ہے کہ موجودات میں کچھ حقیقت ہے اور کچھ افسانہ، ہندو فلسفہ میں مایا کا تصور عجیب

---

* کلاں محل، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

وغریب ہے کہ ایک شئے بیک وقت موجود بھی ہے اور اسی لحہ واہمہ وفریب بھی ہے، ایک ہندو فلسفی شاعر کہتا ہے:

بس یہ کہنے پر یاروں نے بے دین مجھے ٹھہرایا ہے
سب عین حقیقت ہے لیکن یہ بھی سچ ہے سب مایا ہے

جب قدیم فلاسفہ کے یہاں یہ مسئلہ اٹھا تو پارمنی ڈس Parmenides (-504-470)۔نے پورے عالم کوایک وجود مطلق سے تعبیر کیا جو کہ ازل سے قائم ودائم اور متصل و کامل ہے، ہرقلیطس (Heraclitus/525-475BC) نے اس وجود مطلق کو مسلسل حرکت میں اور بہتر سے مزید بہتر کی طرف متحرک بتایا۔سقراط (Socrates/469-399BC) نے کہا کہ جو ماہیات خیر ہیں مثلا رحم سچائی، علم اور عدل وانصاف وغیرہ ان کا وجود حقیقی ہے جو ازلی ابدی اور کامل و مستقل ہے باقی ان کے اضداد بدی کی صفات کا وجود عارضی اور غیر حقیقی ہے، افلاطون (Plato/427-347BC) نے اپنے بیشتر وفلاسفہ کے افکار سے استفادہ کرتے ہوئے ایک مفصل فکری نظام مرتب کیا اور کہا کہ موجودات کی دوقسمیں ہیں، ایک عالم اعیان وامثال ہے اور دوسرا عالم محسوسات جو کہ دراصل عالم معانی وامثال کا سایہ ہے (اشباح واظلال ہے) عالم مثال دائمی اور مستقل ہے اور عالم محسوسات و اظلال مسلسل متغیر و متحرک ہے ، یہی افلوطین فلسفہ جب افلوطین (270-204ADPlotinus/plotine) کے ہاتھوں نوفلاطونی فلسفہ کی شکل میں سامنے آیا تو ہمارے متعدد عظیم اشراقی صوفیہ اس سے متاثر ہوئے۔تجلیات وتنزلات پر مبنی ان کے کشف والہام نے حسب توفیق واستطاعت انہیں مذکورہ ماہیتوں کی حقیقت کا عرفان بخشا۔افلاطون کے بعد اس کے شاگرد ارسطو (Aristotle 384-322BC) نے موجودات کی تقسیم جواہر و اعراض کی شکل میں پیش کر کے اپنے مابعد فلاسفہ کے لئے فکر کا ایک مستقل مقیاس ومعیار عطا کیا۔موجودات کی دس اجناس جنھیں مقولات عشر کہا جاتا ہے ان کی جنس الاجناس وجود وموجود ہی ہے۔عہد اسلامی کے فلاسفہ نے ارسطوئی منہج ومنطق کو تفلسف کا معیار تسلیم کرتے ہوئے موجودات کو دو قسموں پر تقسیم کیا واجب الوجود اور ممکن الوجود ، اس طرح فارابی اور ابن سینا وغیرہ کے یہاں وجودی استدلال (Ontological argument) معرض وجود میں آیا کہ وہ ذات جس کی ماہیت ہی وجود وبقا

ہو واجب الوجود لذاتہ ہے اور چونکہ دیگر سارے وجود اس کے عطا کردہ ہیں اس لئے ممکن فی ذاتہا کی حیثیت رکھتے ہیں۔قدیم یونانی فلاسفہ کے یہاں وجود کے سلسلہ میں ایک بحث یہ بھی ہے کہ اس کی ماہیت میں وحدت ہے تو اصل موجودات کیا ہے؟ کسی نے کہا ہوا کسی نے کہا پانی، کسی نے ذرہ کو اصل بتایا اور کسی نے عناصر اربعہ کو اصل قرار دیا۔

وجود و وجودیت کا تصور عہد جدید میں

فکر و فلسفہ کے عہد جدید میں وجودیت (Existentialism) مغرب میں باقاعدہ ایک نظام فکر کے طور پر ابھری ہے جن مفکرین اور فلسفیوں کو وجودی کہا جاتا ہے ان کی آراء پر گفتگو کرنے سے پہلے بہتر ہے کہ ان مغربی اہم فلاسفہ کے افکار پر بھی ایک سرسری نظر ڈالی جائے جن کی آراء نے وجودیت نو کی تشکیل میں کوئی کردار ادا کیا ہے۔ڈیکارٹ (Descartes/1596-1650) کانٹ (Kant/1724-1804) ہیگل (Hegel/1770-1831) نطشے (Nietzsche/1844-1900)، برگسان (Bergson/1859-1941) جدید فلسفہ کے بانی ڈیکارٹ نے اپنے سوا ہر موجود کے وجود میں شک کیا اور فرض کیا کہ سارا عالم واہمہ ہے، میں چونکہ پریشان ہو کر سوچنے پر مجبور ہوتا ہوں اس لئے میں کوئی وجود یقیناً رکھتا ہوں اور جب کوئی چیز ہوں تو میرے گردوپیش کی دنیا بھی کوئی وجود رکھتی ہے چونکہ انسان کے مشاعر و حواس میں تذبذب و یقین کی کیفیتیں کارفرما رہتی ہیں اور خارجی محسوسات میں بھی تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جو ایک نقص کی علامت ہے اور جب ہم نقص و ناقص کا تصور کرتے ہیں تو اس کے ساتھ کمال و کامل کا تصور خود بخود ابھرتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ کوئی کامل ہستی بھی ہو اور وہ ذات الٰہی کے سوا کون ہو سکتا ہے۔(واضح رہے کہ ڈیکارٹ کے ان خیالات کی بنیاد امام غزالی کی بعض کتابوں میں پہلے سے موجود ہے) ڈیکارٹ کے مذکورہ بالا نظریات کے زیر اثر جدید فلسفے نے متعدد کروٹیں لیں اور موجودات کی حقیقت اور ان کی معرفت و ادراک کا مسئلہ مستقل زیر بحث رہا۔ بعض فلاسفہ نے کہا کہ ہم خارجی موجودات کا اتنا ہی علم رکھتے ہیں جتنا ہمارے حواس و مدرکات ان کا تصور، تجربہ یا احاطہ کر سکتے ہیں، موجودات کی اصل حقیقت اور فی الواقع کنہ تک رسائی عقل انسانی کی دسترس میں نہیں ہے۔

اس گروہ کے سرخیل کانٹ ہیں جنھوں نے وجودی استدلال کی بھی نارسائی اور اس کا نقص

ثابت کیا اور کہا کہ کسی علت اولی یا منبع فیاض کا ہم تصور تو کر سکتے ہیں مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ فی الواقع موجود بھی ہو مثلاً اگر میں اپنی جیب میں سوڈالر کا تصور کروں تو مجھے اس سے ان کا ذہنی وجود حاصل ہو جائے گا مگر کیا واقعی سوڈالر میری جیب میں آجائیں گے؟ اس مرحلہ پر ''برگساں'' ایک قدم آگے بڑھ کر قدرے مختلف نظریہ پیش کرتے ہیں کہ عقل انسانی جن حقیقتوں کا ادراک یا احاطہ نہیں کرسکتی الہام اور وجدان (Intuition) سے ان کا عرفان ممکن ہے (یہ بات بھی امام غزالی اور دیگر متعدد اکابر صوفیہ کی تحریروں میں موجود ہے) کانٹ کے شاگرد ہیگل نے ایک عجیب فلسفہ پیش کیا جو کہ جدلیات (Dialectics) کے نام سے مشہور ہے جس کا مطلب ہے کہ موجود (Thesis) سے عدم (Antithesis) ٹکرا کر اسے آہستہ آہستہ فنا کر دیتا ہے مگر اس تصادم کے بطن سے دوسرا موجود (Synthesis) جو کہ سابقہ موجود و عدم یا مثبت و منفی کا مرکب ہوتا ہے اور پہلے موجود سے افضل ہوتا ہے، جنم لیتا ہے (جیسے مرد + عورت = بچہ) اس طرح یہ کائنات جس کی سربراہی انسانی قافلہ کر رہا ہے بہتر سے مزید بہتر کی طرف گامزن ہے یہاں تک کہ کمال کی آخری منزل سامنے آجائے۔ اس نظریہ کی رو سے کانٹ کی علت اولی و ذات کامل اگر آج موجود نہ ہو تو کل یقیناً وجود میں آجائے گی فریڈرک نطشے چونکہ لاہوت اور مذہبی علوم کے طالب علم تھے انہوں نے اس کے برعکس نظریہ قائم کیا اور کہا کہ اس کائنات کا سفر ایک مافوق انسان (Superman) کی تلاش کے لئے جاری ہے اور خالق کائنات خدا کی (نعوذ باللہ) موت واقع ہوگئی ہے۔ حیات و کائنات میں مسلسل آویزش و کش مکش دراصل مافوق انسانی ہستی کو بروئے کار لانے کے لئے جاری ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اقبال کے مرد مومن کا تصور نطشے کے مرد مافوق کے زیر اثر تشکیل پذیر ہوا جس کے لئے اقبال نے کہا ہے:

آیۂ کائنات کا معنی دیریاب تو   نکلے تری تلاش میں قافلہ ہائے رنگ و بو
لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب   گنبد آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب

(حالانکہ نطشے کے مرد مافوق اور اقبال کے مرد مومن میں زمین آسمان کا فرق ہے، نطشے کے مرد مافوق کی شکل سپرمین، ٹارزن اور کنگ کانگ جیسے عنوانات کے تحت اہل مغرب پیش کرتے رہتے ہیں جبکہ مرد مومن کا تصور خالص اخلاقی بنیادوں پر قائم ہے)۔

اہل کتاب کی لاہوتی تعلیمات کے زیر اثر حضرت عیسیٰ کی جنھیں نصاریٰ ابن اللہ کہتے ہیں

آمد (دوبارہ آمد) کے عقیدے کو نطشے نے غالباً اس فلسفیانہ رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

جدید وجودی فلسفہ کا خلاصہ

انیسویں صدی عیسوی میں جن فلسفوں نے مغربی افکار کی نمائندگی یا قیادت کی ان میں چند کافی مشہور ہیں، ہیگل کی مثالی جدلیت، کارل مارکس کی اشتراکیت اور سماجی جدلیت، بنتھام کی نفع پرستی اور لذت کوشی، ڈارون کا نظریۂ ارتقاء اور نطشے کی ملحدانہ قوت پرستی وغیرہ انہیں کے شانہ بشانہ ایک فلسفہ اور ابھرا جسے آج ہم وجودیت کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کی باقاعدہ داغ بیل ڈینمارک کی فلسفی کر کے گارڈ (Kierkegaard1813-1855) نے ڈالی جو ایک مذہبی ادیب تھا جدید وجودیت کا خلاصہ یہ ہے کہ موجود کی اپنی جگہ ایک منفرد و ممتاز حیثیت ہے۔ خدا انسان اور کائنات میں انسانی وجود، خدا کے بعد تمام موجودات سے افضل و اہم ہے۔ وجودی فلسفیوں میں دو قسم کے مفکر پائے جاتے ہیں، خدا پرست اور منکر خدا، لیکن انسانی وجود کی برتری اور اہمیت کے مسئلے میں سب متفق ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مثالیت اور کلیت کے ذریعہ ہم جزئیات تک نہیں پہنچتے بلکہ ہم جسے جانتے ہیں وہ جزئی اور فرد ہے اسی طرح جزئیات واشخاص کا وجود کلیات سے پہلے ہے۔ کلیات فرضی اشیاء ہیں جو تصورات کی حد تک موجود ہوتی ہیں ورنہ فی الواقع جزئیات واشخاص کا وجود ہی اصل ہے اور ہمیں انہیں کے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔ اس لئے وجودی فلسفہ میں انسانی مبدأ و معاد اور حاضر و مستقبل کے مسائل ہی زیادہ تر زیر بحث لائے جاتے ہیں۔ کر کیگارڈ کے بعد جن فلاسفہ نے وجودیت کو اپنا مسلک اور مطمح نظر بنایا ان میں مارٹن ہیڈیگر (Heideggar/1889-1969)، کارل یاسپرس (Jaspers/1883-1969) اور جین پال سارترے (Sartre/1905-1980Jeanpaul) زیادہ مشہور ہیں۔ ان میں ہیڈیگر اور سارترے ملحدانہ نظریات کے حامل ہیں جب کہ یاسپرس معتدل مابعد الطبیعاتی رجحان رکھتا ہے۔ انسانی وجود کی حقیقت اہمیت اور وسعت سے متعلق بحث کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مادی اور روحانی تقاضے، اس کی معیشت و معاشرت، خوشی غم، انفرادی خاندانی اور عام اجتماعی سطح پر اس کے مسائل اس کی سعادت و نکبت، آزادی و پابندی، محدودیت و لامحدودیت اس کی کنہ کے ادراک کا امکان یا عدم امکان، خدا سے اس کے رشتہ کی نوعیت و حدود، عبادت کی حقیقت وغیرہ جیسے مسائل سے وجودی فلسفہ بحث کرتا ہے۔ کر کیگارڈ اور دیگر خدا پرست وجودیوں کا کہنا ہے کہ خدا سے ہر شخص کا تعلق جداگانہ ہے،

خدا سے معروضی (Objective) تعلق ناممکن ہے بلکہ اس سے ہر شخص کا تعلق اپنی ذاتی معرفت و عقیدت اور ادراک کی وعرفانی صلاحیت وقوت کے اعتبار سے موضوعی انداز میں (Subjectively) پیدا ہوتا ہے۔ انسانی وجود کا سب سے بڑا امتیاز اس کو پسند ناپسند کی آزادی حاصل ہونا ہے دیگر مخلوقات و موجودات اپنی فطرت وجبلت کے پابند ہیں جب کہ انسان کو متعدد راہوں میں سے کوئی بھی راہ اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔ گناہ کے بارے میں وجودی فلسفیوں کا کہنا ہے کہ نیکی کا راستہ ابدی سعادت کا راستہ ہے اس پر چلنے والا جب محدودیت، تناقض، تھکن اور آگے بڑھنے کی صلاحیت سے محرومی کا شکار ہوتا ہے تو گناہ کا سہارا لیتا ہے، بعض وجودی فلاسفہ کی رائے میں ارتکاب گناہ سے کبھی کبھی نیا نشاط حاصل ہوتا ہے۔ انسانی وجود کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ روحانی، عقلی اور وجدانی مشاہدات وکمالات سے بہرہ ور ہے۔ سارترے ہیڈیگر کا شاگرد اور ملحدانہ افکار کا حامل ہے، نطشے کی طرح وہ بھی انسان کو خدا کا قائم مقام سمجھتا ہے، اس کے برخلاف جبریل مارسل (Marcel/1889-1973) کیتھولک عیسائیت کا نمائندہ فلسفی تصور کیا جاتا ہے وہ بعض امور میں یاسپرس کا ہمنوا ہے، اس کا خیال ہے کہ حقیقی آزادی سے بہرہ ور ہونے کا راستہ اخلاص اور وفا ہے جس کی بنیاد امید ورجا ہے اس کے نزدیک خدا کا عرفان عقل وادراک کے ذریعہ ممکن نہیں اس کو اخلاص پر مبنی عبادت اور آفاقی محبت کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ دراصل مغربی معاشرہ میں ایک طرف مجرد مثالیت پرستی اور دوسری طرف خالص مشینی مادی زندگی کے ماحول میں انسانی وجود کی انفرادی شخصیت گم ہوتی جارہی تھی تو ان دو انتہا پسندیوں کے بیچ میں انسان کی انفرادی اہمیت وعظمت کی طرف توجہ دی گئی جس کے نتیجہ میں وجودی فلسفہ کا ظہور عمل میں آیا۔ اسی کے لئے اقبال نے کہا تھا:

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت۔ احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

امام محمد قاسم نانوتوی کی وجودی فکر

وجود و وجودیت کے بارے میں جب ہم بانئ دارالعلوم دیوبند حضرت نانوتویؒ کی فکر کا جائزہ لیں تو یہ پیش نظر رکھیں کہ حضرت نانوتویؒ کی تمام تر فکر اسلامی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ قرآن، حدیث اور ائمہ تجدید وعرفان کے اقوال وارشادات سے الگ انہوں نے کوئی نئی چیز پیش نہیں کی، ہاں اس کی تشریح وتوضیح اور تعبیر وتنسیق میں ان کی ایک انفرادی شان ہے۔ دراصل اس تعلق سے متکلمین اور

علمائے اسلام کی آراء مغربی مفکرین وفلاسفہ کی آراء سے بنیادی طور پر کئی زاویوں سے مختلف ہیں کیونکہ اگر اسلام کی روشنی سے محرومی ہے تو پھر اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔ فرد اور جماعت کے درمیان توازن، فرد کے نفسیاتی مسائل مثلاً بیماری، بیروزگاری احساس تنہائی اور مایوسی وغیرہ کا حل اسلامی تعلیمات میں پہلے سے موجود ہے۔ اسلام میں انفرادیت و اجتماعیت، مادیت وروحانیت اور جبریت وحریت کے درمیان ایک لطیف امتزاج وتوازن اس انداز میں ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اس کی روشنی میں بالعموم وہ مشاکل ومسائل پیدا نہیں ہوتے جن سے مغربی معاشرہ دوچار رہتا ہے۔ اسلامی تعلیمات میں صالح ومومن انسان ہی اس کائنات کا خلیفہ وحاکم ہے۔ وہ دیگر تمام مخلوقات کا بادشاہ اور خلاصہ ہے وہی خالق کائنات کا مخاطب ہے (دوسرے نمبر پر جنات بھی پیام حق کے بالواسطہ مخاطب ہیں) مگر کائنات وانسان کی تخلیق کا کیا منشا ومقصد ہے انسانی معاشرہ کون سی بہتر منزل (Synthesis) کی طرف بڑھ رہا ہے اب تک اس کی راہ میں کتنے اہم موڑ اور سنگ میل آئے ہیں اور آئندہ پوری انسانی جمعیت اور پوری کائنات کا کیا انجام ہونے والا ہے؟ اس بارے میں ملحد وجودی فلسفیوں کے پاس تو کوئی مثبت فکر ہونے سے رہی، جو لاہوتی فلاسفہ ہیں ان کے پاس بھی صحیح جواب نہیں ہے۔ جبکہ اسلامی نقطہ نظر سے انبیائے کرام صفوۃ الخلائق ہیں اور انبیاء میں پانچ اولوالعزم پیغمبر سب سے بڑے ہیں جن میں حضرت خاتم الانبیاء (صلی اللہ علیہ وسلم) سب سے افضل وبرتر ہیں۔ حضرت خاتم الانبیاء پر اللہ کی نعمتوں اور اس کے دین کا اتمام واکمال ہوگیا، یعنی انسان تمام کائنات کا حاصل انبیاء تمام انسانوں کا خلاصہ اور حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کا نقطۂ کمال وعروج ہیں: آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

یہ فکر حضرت مجدد الف ثانیؒ کے یہاں بہت واضح طور پر ابھر کر آئی جب آپ نے ایک مکتوب میں لکھا کہ مقام حضرت ختم المرسلین یہ ہے کہ انسانی کمالات وامکانات اور مراتب ومعالی کا اس سے بڑھ کر تصور نہیں کیا جاسکتا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا کئے گئے ہیں یعنی اس سے زیادہ بلندی کسی مخلوق کے دائرہ امکان میں نہیں ہے[1] یہی بات متفرق مقامات پر حضرت شاہ ولی اللہ نے بیان کی ہے، شاہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ کے باب حقیقت نبوت اور اس کے خصائص میں فرماتے ہیں:

---

(۱) ملاحظہ ہو مکتوبات امام ربانی اور تذکرہ از مولانا ابوالکلام آزاد۔

''انسانوں میں سب سے اعلیٰ طبقہ مفہم کا ہوتا...... مفہمین کی بہت سی قسمیں ہیں..... جو لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر ان کے ذہنوں اور قلوب کو اور ان کی تمام طاقتوں کو اللہ کے حوالے کرا دیتے ہیں انہیں پیغمبر کہا جاتا ہے.... انسانوں کی نافرمانیوں اور مفاسد پردازی کے اعتبار سے وقتاً فوقتاً اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کو مبعوث فرماتے رہے تھے تا آں کہ نبوت کا سلسلہ سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم فرما دیا۔(۲)

حضرت نانوتوی کی فکر میں انسانی وجود ایک عالم اصغر ہے جبکہ یہ کائنات عالم اکبر ہے۔ عالم اکبر کی حیات عالم اصغر کی صلاح و فلاح پر قائم ہے۔ اگر عالم اصغر کا نظام بگڑ جائے تو عالم اکبر کا نظام بھی درہم برہم ہونے لگتا ہے، بانی آریہ سماج تحریک پنڈت دیانند سرسوتی نے جب اسلام کے عقیدۂ آخرت و قیامت پر اعتراضات کیے تو حضرت نانوتوی نے ان کے جو جوابات دیئے وہ انتصار الاسلام نامی کتاب میں جمع کر دیے گئے ہیں حضرت نانوتوی فرماتے ہیں:

''اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عالم اور کائنات چند اجزا اور اجزا کے ایک مجموعے کی حیثیت رکھتا ہے جس طرح جسم انسانی مختلف اعضاء و جوارح: آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں وغیرہ الگ الگ مقاصد اور مختلف اغراض کے کام آتے ہیں اسی طرح مجموعۂ کائنات کے اجزاء مثلاً زمین، آسمان، پہاڑ اور دریا وغیرہ بھی مختلف اغراض اور الگ الگ مقاصد کے لئے کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔۔۔اس طرح واضح ہوتا ہے کہ مجموعۂ کائنات کو انسانی جسم کے ساتھ بہت حد تک مشابہت و یکسانیت حاصل ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ صوفیہ نے اپنی خاص اصطلاح میں کائنات کو شخص اکبر یا عالم اکبر اور جسم انسانی کو اس کے مقابلے میں شخص اصغر یا عالم اصغر سے تعبیر کیا ہے۔ جس طرح ''شخص اصغر'' انسان کے جسم خاکی میں اگر کسی خلط کے باعث اس کے مزاج اصلی اور اعتدال میں کوئی تغیر و فساد رونما ہو جائے تو اسے مرض سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی طرح ''شخص اکبر'' کائنات کے مزاج و ترکیب میں کسی طرح کا تغیر و فساد رونما ہو جائے اور کوئی نئی اور انوکھی کیفیت ظاہر ہو جائے تو اسے اسلامی نقطۂ نظر سے کائنات کے مرض یا بہ الفاظ دیگر علامت قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تغیر و فساد اور مرض میں اگر اتنی شدت پیدا ہو جائے کہ اس کے نتیجے میں انسان

(۲) تلخیص حجۃ اللہ البالغہ از سید رضی الدین احمد ص ۷۶۔۷۷

کی روح جسم سے الگ ہو جائے تو اسے موت کہا جاتا ہے اسی طرح کائنات کی ترکیب میں بھی اگر ایسا خلل پیدا ہو جائے جس کے نتیجے میں اس کی روح کو اس سے الگ ہونا پڑے تو اسے اسلامی تعلیم کی رو سے قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر جیسے موت کے بعد انسانی جسم جن عناصر سے مرکب ہوتا ہے وہ الگ الگ ہو کر اپنی اپنی اصل سے جا ملتے ہیں اسی طرح ''عالم اکبر'' اور ''شخص اکبر'' کائنات کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے شیرازۂ ترکیب میں شامل ہر جز ہر عنصر اور ہر طبقہ بھی اپنی اصل سے جا ملے گا، چنانچہ نیکی اور نیکیوں کا عنصر و طبقہ جنت میں اور ہر برائی اور بروں کا عنصر و طبقہ جہنم میں پہنچ جائے گا۔ اسی عمل کو اسلام میں جزا و سزا، حساب و کتاب اور پھر جنت و جہنم میں جانے کے مرحلے سے تعبیر کیا گیا ہے''۔ (۳)

مولانا نانوتوی کے فلسفہ کی رو سے اس کائنات کی تخلیق کا مقصد خالق کائنات کے نزدیک اس کی صفات کا عرفان اور اس کی عبادت کی تکمیل ہے۔ اس لئے ایک ایسی ذات کی تخلیق پر اس کا نقطۂ کمال پہنچتا ہے جو خدا کی صفات کا عکس لئے ہوئے ہو اور عبدیت کاملہ سے متصف ہو، وہ ذات رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے، اللہ تعالیٰ کی صفات کی جامع صفت علم ہے جو ذات علم کے بھی اعلیٰ درجے پر ہو اور عبدیت کے بھی بلند ترین مقام پر ہو وہی کائنات کا نقطہ عروج ہے لیکن اب جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو گئی اور دین کی تکمیل ہو گئی تو کیا باقی رہ گیا، اس کے بارے میں حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ:

''اس دین کا عام ہونا اور عبدیت کاملہ کا عام عرفان و اتباع ہونا باقی رہ گیا ہے جب یہ کام پورا ہو جائے گا تو اس وقت یہ کارخانہ عالم لپیٹ دیا جائے گا اور قیامت قائم ہو جائے گی''۔

مولانا نانوتویؒ فرماتے ہیں:

''خاتم المراتب ہونے کا درجہ اسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس میں وہ صفت موجود ہو جسے خاتم الصفات کہا جاتا ہے یعنی صفت علم گویا نتیجہ یہ نکلا کہ جس ذات میں صفت علم بہ درجہ کمال پائی جائے گی اسی ذات کو خاتم المراتب ہونے کا شرف حاصل ہوگا اور پھر وہی عبادت کاملہ یعنی خدا کی تمام صفات کے مقابلے میں بالاجمال اظہار عجز و نیاز پر قادر ہوگی... غرض کارخانہ عالم کی تخلیق کا مقصد

(۳) انتصار الاسلام صفحہ ۵۱ بحوالہ ماہنامہ ترجمان دار العلوم مئی ۱۹۹۸

عبادت کاملہ جب پورا ہو جائے گا تو اسے ختم کر دیا جائے گا اور قیامت قائم ہو جائے گی ... پھر جب خاتم النبیین اور عبد کامل صلی اللہ علیہ وسلم کے ورود مسعود کے نتیجے میں عبادت کاملہ وجود میں آ چکی۔ اس لئے اب کائنات کے بقا کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ اب صرف ایک چیز کا انتظار ہے کہ دین خاتم النبیین پورے عالم پر ایک بار چھا جائے، اس کام کے پورا ہوتے ہی شیرازہ کائنات بکھیر دیا جائے گا اور اسلامی تعلیمات وعقائد کی رو سے قیامت قائم ہو جائے گی۔ (۴)

انسان وکائنات کے وجود کے بارے میں مذکورہ خیالات بہت واضح ہیں اور یہ منزلیں ہیں جن کا ہمارے وجودی فلسفیوں کو شاید خیال تک نہیں۔ وہ حقیقت میں جب خالق وجود تک نہیں پہنچتے تو وجود تک کیسے پہنچ سکتے ہیں کیونکہ اس راہ میں اول وآخر رہنما رسول اللہ کی ذات بابرکت ہے اس کا عرفان حاصل کئے بغیر یہ گتھی سلجھ ہی نہیں سکتی۔ وجود وموجودات کے بارے میں اور اللہ تعالیٰ کی وجودی صفات کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کے افکار تقریر دل پذیر اور دیگر متعدد کتب ورسائل میں وارد ہوئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ کہ کوئی صفت بعض اشیاء میں اصلی ہوتی ہے اور بعض میں عطائی اور بالعرض جیسے گرمی سورج اور آگ میں بالذات ہے مگر ان کے وسیلے سے جن چیزوں میں پیدا ہوتی ہے ان میں حرارت اصلی نہیں بلکہ بخشی ہوئی ہے۔ اسی طرح وجود کی صفت اللہ تعالیٰ کے لئے اصلی ہے اور دیگر تمام اشیاء وذوات کے لئے اللہ کی عطا کی ہوئی ہے، اس لئے حقیقی وجود اللہ تعالیٰ ہی کا ہے اور باقی دیگر وجود عارضی اور عطا کئے ہوئے ہیں، مولانا نانوتوی کی رائے میں صوفیہ کے وحدت الوجود کا یہی مطلب ہے کہ حقیقت میں وجود اصلی ایک ہی ہے۔ حضرت نانوتوی کے نزدیک اس معنی میں وحدت وجود تو صحیح ہے لیکن موجودات میں کثرت ہے، ان میں وحدت سمجھنا غلط ہے، فرماتے ہیں:

وحدت موجودات ایک امر مشہور ہے مگر واقعی نہیں ہے، البتہ وحدت وجود امر واقعی ہے'' (۵)

لفظ وحدت الوجود سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں مگر حضرت نانوتویؒ کی مذکورہ بالا تشریح کی روشنی میں اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے (ابھی یہ موضوع مزید بسط وشرح چاہتا ہے مگر تطویل کے خوف سے اتنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے)

---

(۱) انتصار الاسلام بحوالہ ماہنامہ ترجمان دار العلوم نئی دہلی رجون ۱۹۹۸۔ (۱) جمال قاسمی۔ (۵) جمال قاسمی۔

مولانا عبدالعلی فاروقی*

الامام محمد قاسم النانوتویؒ اور اہل تشیع

حضرت نانوتویؒ نے اہل تشیع کی اصلاح اور تشیع کے نقصانات سے امت مسلمہ کی حفاظت و صیانت کے لئے جو بار آور خدمات انجام دیں، انہیں علمی اور عملی دو عنوانوں سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ علمی سے مراد حضرت کی وہ تحریرات ہیں جن کے ذریعہ تشیع کے اسرار و رموز بیان کرتے ہوئے اسلام اور اسلامی تعلیمات سے ان کے متصادم ہونے کا حال بیان کیا گیا ہے اور عملی سے مراد وہ مساعی جلیلہ ہیں جو آپ نے اصلاح احوال کی خاطر سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے اور اپنی عزت و آبرو کو خطرہ میں ڈال کر مباحثوں اور مواعظ کے ذریعہ انجام دیں اور ایک سے زائد مرتبہ اس کے خوشگوار ثمرات ظاہر ہوئے۔

اس موضوع پر حضرت الامام کے علمی آثار میں سب سے زیادہ ضخیم، مدلل، مفصل اور مستند تصنیف ''ہدیۃ الشیعہ'' ہے، جس کے بارے میں ''مواعظ قاسمی'' کے مؤلف حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی یوں رقم طراز ہیں:

> ''تصنیفی سلسلہ میں تو میں کہہ سکتا ہوں کہ سیدنا الامام الکبیر کی کتابوں میں سب سے زیادہ ضخیم کتاب آپ کی وہی ہے جس میں انتہائی دل سوزیوں کے ساتھ شیعوں کی غلط فہمیوں کے مٹانے کی کوشش کی گئی ہے، ساڑھے تین سو صفحات سے زائد اوراق میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے۔ تقطیع متوسط اور لکھائی بھی اس کی گنجھی ہوئی ہے۔ اپنے عام طریقۂ تصنیف کے خلاف اس کتاب میں بکثرت دوسری کتابوں کے حوالوں کو بھی آپ نے پیش کیا ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی تاریخ پر آپ کی کتنی اچھی نظر تھی، اس کا نام ''ہدیۃ الشیعہ'' ہے(۱)

اس کتاب کے آغاز میں اس کے مقصد تصنیف پر روشنی ڈالتے ہوئے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

''بعد حمد و صلوۃ کے بندہ ہیچمداں گمنام محمد قاسم نام متخلص بخاکپائے علماء، ناظران اوراق کی

(۱) سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص: ۶۴ مطبوعہ دہلی

* ماہنامہ ''البدر'' کاکوری، لکھنؤ (یوپی)

خدمت میں عرض پرداز ہے کہ اواخر رجب ۱۲۸۳ھ بارہ سوتراسی ہجری میں مخدوم العلماء، مطاع الفضلاء، مجمع الکمالات، منبع الحسنات، زیب طریقت، حامی شریعت، فخر احباب، افتخار اصحاب، ملجاء انام، مرجع خاص وعام، معلم قانون اطاعت وانقیاد ومحرک سلسلۂ رشد وارشاد، جامع کمالات ظاہری وباطنی مخدومنا ومولانا مولوی رشید احمد گنگوہی دام رشدہ وارشادہ نے ایک خط متضمن بعضے خرافات شیعہ جو مولوی عمار علی صاحب کی طرف سے بنام میر نادر علی صاحب ساکن کرتھل نواح الور تھا، اس ہیچمداں کے پاس بایں غرض بھیجا کہ ان خرافات کے جوابات لکھ کر روانہ خدمت مولانا ممدوح کروں، اتفاقات سے ان ایام میں حسب ایماء بعض احباب کہ ان سے اشتراک نسبی بھی حاصل ہے، اوقات فرصت میں دربارۂ اثبات توحید ورسالت بدلائل عقلیہ اوراق سیاہ کرتا تھا، سو کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ بوجہ کاہلی طبع زاد اس کے جوابات کا لکھنا سخت دشوار معلوم ہوا اور پھر بوجہ ہیچمدانی اور بے سروسامانی اور کثرت مشاغل روزمرہ اس خیال سے اور بھی دل تنگ ہوتا تھا، القصہ بہرطور کار دشوار تھا مگر مولانا ممدوح کے ارشاد سے ناچار تھا، لہٰذا تحریر مضامین توحید ورسالت کو اور وقت پر موقوف رکھ کر خط مذکور کے پہنچنے سے دو تین روز ہی بعد تحریر سابق کے عوض میں خط مذکور کے جوابات لکھنے شروع کئے مگر کچھ تو ہیچمدانی اور بے سروسامانی اور کچھ قلت فرصت اور کچھ سرگرانی، اس لئے ایک دفعہ تو نہ بن پڑا، پر اوقات متفرقہ میں لکھ لکھ کر پانزدہم صفر ۱۲۸۴ھ بارہ سو چوراسی میں تمام کیا اور بعد اختتام ''ہدیۃ الشیعہ'' اوراق کا نام رکھا اور وجہ اس نام رکھنے کی حالانکہ یہ رسالہ بظاہر مؤید اہل سنت ہے اور اس وجہ سے ''ہدیہ اہل سنت'' کہنا مناسب تھا، یہ ہے کہ بہ نسبت اہل سنت شیعوں کے حق میں یہ رسالہ زیادہ تر مفید ہے، اہل سنت کے لئے تو اس میں اتنا فائدہ ہے کہ کچوں کے لئے مفید یقین اور پکوں کے لئے باعث اطمینان ہے، پر شیعوں کے حق میں اگر انصاف کریں ذریعہ حصول ایمان ہے۔ (۲)

واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب اسم بامسمّٰی ہے اور اس میں بڑے ہی نرم، ناصحانہ اور مشفقانہ لہجہ میں اہل تشیع کی ان خرافات کی نشان دہی کی گئی ہے جن سے عوام تو عوام، بہت سے اہل علم بھی بے خبر تھے۔ جیسا کہ پہلے تمہید میں عرض کیا جاچکا ہے کہ عام اہل علم کے ذہنوں میں یہی بات رہی کہ تشیع اور تسنن

---

(۲) ہدیۃ الشیعہ۔ ص: ۲، ۳ طبع قدیم دہلی

کے درمیان بنیادی اختلاف بس ت "تفضیل علی" کا ہے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اختلاف کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ خداوند قدوس کی ذات وصفات، پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت وعصمت اور خاتمیت، قرآن مجید اور اس کے اولین ناقلین کا اعتبار تک اسی اختلاف کی زد میں آچکے ہیں اور اہل اسلام واہل تشیع کے عقائد ان تمام امور میں بالکل جدا جدا ہیں۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ نے اپنی اس کتاب میں اس کی نشان دہی کرتے ہوئے سب سے پہلے قرآن مجید کی بحث چھیڑی ہے اور اہل تشیع کے ائمہ معصومین کی روایتوں اور ان کی کتابوں کے مضبوط ومعتبر حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ موجودہ قرآن پر شیعوں کا ایمان نہ ہے نہ ہوسکتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ان میں کوئی حافظ قرآن نہیں ہو پاتا۔ چنانچہ ایک مقام پر اہل تشیع کے "عقیدۂ تحریف قرآن" پر بحث کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

"اور کلینی (یعنی کلینی کی تصنیف اصول کافی) جو تمہارے نزدیک اصح الکتب ہے اس کی یہ روایت سراسر بہتان اور دروغ ہے: عن هشام بن سالم عن ابی عبدالله ان القران الذی جاء به جبرئیل الی محمد صلی الله علیه وعلی آله سعبة عشر الف آیات. یعنی ہشام بن سالم حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتا ہے کہ وہ قرآن جو حضرت جبرئیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائے تھے اس کی سترہ ہزار آیتیں تھیں فقط۔ اب دیکھئے کہ یہ کلام اللہ جواب موجود ہے اس میں کل قریب چھ ہزار آیتوں کے ہے، تو شیعوں کی اس روایت کے موافق کوئی دو تہائی کلام اللہ چوری گیا، اس سے بہتر تو یہی تھا کہ خداوند کریم ذمہ کش حفاظت نہ ہوتے .... (اسی سلسلۂ مضمون میں چند سطروں کے بعد) القصہ حسب مقولۂ شیعہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ باوجود اس اہتمام اور اس انتظام کے کہ قرآن مجید کی خداوند کریم نے خود حفاظت کی، قرآن مجید غیر محفوظ اور غیر معتبر ہونے میں تورات وانجیل سے بڑھ گیا، حالانکہ ان کا حافظ محافظ نہ خدا تھا نہ کوئی پیغمبر، ہاں علماء دنیا پرست کہ آیات خداوندی کا بیچ دینا اور احکام کا بدل ڈالنا اور تحریف کا کرنا، ان کا کام ہی تھا، اس کے فقط پڑھنے پڑھانے والے اور جاننے پہچاننے والے تھے، حافظ ونگہبان ہونا کجا۔ شاید اس فرقہ کے نزدیک کلام اللہ کے تورات وانجیل سے بڑھ کر ہونے کے یہی معنی ہیں کہ بے اعتباری میں ان سے بڑھا ہوا ہے۔" (۳)

(۳) حوالہ مذکورہ۔ ص: ۱۸

اسی طرح خلیفہ راشد اول سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی صحابیت پر آیت قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

تیسری آیت الا تنصروه فقد نصره الله اذ اخرجه الذین كفروا ثانی اثنین اذھما فی الغار اذ یقول لصاحبه لا تحزنْ ان الله معنا. ''یعنی تم لوگ اگر ہمارے پیغمبر کی مدد نہ کرو گے تو کیا ہوگا، اللہ اس کا مدد کرنے والا ہے۔ پہلے بھی اس کی اسی نے مدد کی ہے، جب کہ کافروں نے اسے نکال دیا تھا جبکہ وہ تھا اور ایک اس کے ساتھ اور تھا جب وہ دونوں غار میں تھے، کب؟ جس وقت وہ اپنے ساتھ دینے والے سے یوں کہتا تھا کہ تو غمگین مت ہو ہمارے ساتھ اللہ ہے۔ اس آیت میں بہ نظر انصاف غور کیجئے اور منہ زوری کو چھوڑیئے، دیکھئے یہ آیت کدھر کو لئے جاتی ہے؟ سنیوں کی طرف کھینچتی ہے یا شیعوں کے گھر کا راستہ بتلاتی ہے؟ ہمیں اس جگہ مرزا کاظم علی صاحب لکھنوی کا مقولہ، جو بڑے متبرک علماء شیعہ میں سے تھے اور قدوۃ الزمان مولوی دلدار علی صاحب مجتہد بھی ان کے معتقد تھے، یاد آتا ہے۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ اور کسی کو تو جس کسی کا جو کچھ جی چاہے سو کہے، پر خلیفہ اول کا برا کہنے والا تو ہمارے نزدیک بھی کافر ہے، اہل محفل میں سے کسی نے عرض کی کہ قبلہ آپ کیا فرماتے ہیں، مذہب تو اس کے خلاف ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میں کیا کہتا ہوں خدا کہتا ہے، صحابی اور صاحب کے معنی میں کچھ فرق نہیں، سو خدا بھی خلیفہ اول کے صحابی ہونے کا گواہ ہے کیونکہ صاحب کے لفظ سے جو اس آیت میں موجود ہے شیعوں سنیوں کے اتفاق سے ابوبکر صدیق ہی مراد ہیں۔ سبحان اللہ اہل انصاف ایسے ہوتے ہیں جیسے مرزا کاظم علی صاحب تھے اور وہ کچھ ایسے ویسے نہ تھے، علم و زہد میں شیعوں کے نزدیک وہ بھی شہرۂ آفاق تھے، کون سا عالم شیعہ مذہب ہے جو ان کو نہیں جانتا اور ان کو نہیں مانتا۔ اور ان کا بھی اس بات میں کچھ قصور نہیں، اس آیت کو جس پہلو سے پلٹ کر دیکھئے کہیں گنجائش گفت وشنود کی نہیں، ہر طرف سے سنیوں کا ہی مطلب نکلتا ہے''(۴)

ایک دوسرے مقام پر شیعوں کے امام معصوم یعنی امام باقر کی طرف سے مقام صدیق اکبرؓ کے اعتراف کا حال بیان کرتے ہوئے یوں رقم فرمایا ہے:

(۴) ہدیۃ الشیعہ ۔ص:۲۷

''حضرت امام باقرؒ بھی ابوبکر صدیقؓ کی تعریف کرتے ہیں حالانکہ موافق مذہب شیعہ وہ خدا کی طرف سے تقیہ کرنے سے ممنوع تھے اور تقیہ ان پر حرام تھا، علی بن عیسیٰ اردبیلی امامی اثنا عشری اپنی کتاب کشف الغمة عن معرفة الائمة میں نقل کرتے ہیں:

سئل الامام ابوجعفر عن حلیة السیف هل یجوز فقال نعم قد حلّی ابوبکر الصدیق سیفه فقال الراوی اتقول هکذا فوثب الامام عن مکانه فقال نعم الصدیق نعم الصدیق نعم الصدیق فمن لم یقل له الصدیق فلا صدق الله قوله فی الدنیا والاخرة۔ یعنی حضرت امام ابوجعفر یعنی امام محمد باقر رضی اللہ عنہ وعن آبا الکرام سے کسی نے پوچھا کہ تلوار کے قبضہ پر چاندی سونے کا کچھ نقش ونگار یا بوٹے وغیرہ بھی درست ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں درست ہے، اس لئے کہ ابوبکر صدیق نے اپنی تلوار پر چاندی کا جھول کرایا تھا۔ راوی نے کہا کیا آپ ابوبکر صدیق فرماتے ہیں؟ آپ غصہ میں اپنی جگہ سے اچک بیٹھے اور فرمانے لگے ہاں صدیق، ہاں صدیق ہاں صدیق۔ جو انہیں صدیق نہ کہے اللہ اس کی باتوں کو دنیا وآخرت میں سچی مت کیجیو۔ فقط

اب گوش گذار اہل انصاف یہ ہے کہ سب امامیہ اس بات پر متفق ہیں کہ علی بن عیسیٰ اردبیلی علم وفضل میں یکتا اور نقل اور روایت میں بڑے معتمد علیہ ہیں ان کی روایت پر کوئی سقم نہیں پکڑسکتا''(۵)

اسی طرح خلیفۂ دوم سیدنا عمر فاروقؓ کے سلسلہ میں شیعوں کے باطل عقائد کی تردید اور شیعہ کتابوں ہی کے بھرپور حوالوں سے ان کے فضائل ومناقب بیان کرتے ہوئے ایک مقام پر یوں تحریر فرمایا ہے:

''حضرت امیر نے حضرت عمر کو لائق فائق سمجھ کر اپنی صاجزادی مطہرہ کا نکاح کیا، نہ کہ جبراً کرہاً۔ سئل الامام محمد بن علی الباقر عن تزویجها فقال لولا انه راه اهلا لما کان یزوجها ایاه و کانت اشرف نساء العالمین جدها رسول الله صلی الله علیه وسلم و اخوها الحسن و الحسین علیهما السلام سیدا شباب اهل الجنة و ابوها علیؓ ذوالشرف والمنقبة فی الاسلام و امها فاطمة بنت محمد صلی الله

(۵) حوالہ مذکورہ۔ ص: ۱۴۲، ۱۴۳۔

علیه وسلم وجد تها خدیجة بنت خویلد رضی الله عنها۔

حاصل اس کا یہ ہے کہ حضرت امام باقر رضی اللہ عنہ سے حضرت ام کلثومؓ کے حضرت عمرؓ سے نکاح کی وجہ پوچھی گئی انہوں نے فرمایا کہ اگر حضرت علی حضرت عمر کو حضرت ام کلثومؓ کے لائق نہ سمجھتے، ہرگز ان کا نکاح ان سے نہ کرتے۔ وہ سارے جہان کی عورتوں سے زیادہ شرافت والی تھیں، اس لئے کہ نانا تو ان کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور دو بھائی ان کے حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما جو جوانان جنت کے سردار ہیں باپ ان کے حضرت علی رضی اللہ عنہ جو اسلام میں شرف ومنقبت رکھتے ہیں اور اماں ان کی حضرت فاطمہ سیدۃ النساء، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی اور نانی ان کی خدیجۃ الکبری خویلد کی بیٹی رضی اللہ عنہا۔ فقط اس روایت کو دیکھئے اور حضرت قاضی صاحب کی بناوٹ دیکھئے، زوف اسی دعوئ محبت پر کہ اس پردہ میں کیا کہتے ہیں، مشہور تو یوں کرتے ہیں کہ ہم کو اہل بیت سے محبت ہے اور اس لئے صحابہ سے عداوت ہے اور ہماری تشخیص میں یوں آتا ہے کہ آپ کو اصل صحابہ سے عداوت ہے اور اس سبب سے اہل بیت کو اپنی طرف کھینچتے ہیں"۔ (۶)

دوسری جگہ اہل بیت نبی یعنی ازواج واولاد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شیعوں کے سلوک کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"ازواج مطہرات جو امہات مومنین یعنی سب مسلمانوں کی ماں ہیں ان کی نسبت جو کچھ شیعہ ثناخواں ہیں سب ہی جانتے ہیں حالانکہ اصل اہل بیت وہی ہیں، کیونکہ اول تو اہل بیت کے معنی بعینہ اہل خانہ ہے، اتنی بات تو گو کچھ لوگ نہ جانتے ہوں مولوی عمار علی صاحب بھی جانتے ہوں گے، دوسرے لفظ اہل بیت جو کلام اللہ میں واقع ہوا ہے تو ازواج مطہرات ہی کی شان میں وارد ہوا ہے کہ حضرت علی اور حضرت زہرا اور حضرات حسنین بھی بوجہ عموم لفظ یا بہ سبب التماس حضرت رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلم اہل بیت ہونے کی فضیلت میں داخل ہو گئے ہیں۔ باقی رہی اولاد رسول، سو ان کا حال بھی سنئے کہ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی اکثر اولاد کے حضرات شیعہ دشمن جانی ہیں اور برا کہتے ہیں، منجملہ ان کے حضرت زید شہید فرزند ارجمند حضرت امام ہمام زین

---

(۶) ہدیۃ الشیعہ۔ ص:۱۶۹

العابدین رضی اللہ عنہما، جو عالم اور متقی اور متورع تھے اور مروانیوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے تھے اور ان کے بیٹے یحیٰ بن زید ہیں جو بزعم اثنا عشریہ مرتد ہیں اور ایسے ہی ابراہیم بن امام موسیٰ کاظم اور جعفر بن امام موسیٰ کاظم جن کا لقب شیعوں نے کذاب رکھ چھوڑا ہے حالانکہ وہ کبار اولیاء اللہ میں سے ہیں اور بایزید بسطامی ان ہی کے مرید ہیں اور جعفر بن علی برادر امام حسن عسکری کہ شیعوں کے عرف میں ان کا لقب بھی کذاب ہے اور حسن بن حسن مثنی اور ان کے فرزند عبداللہ محض اور ان کے فرزند محمد نام جو ملقب بہ نفس زکیہ ہیں، کافر اور مرتد سمجھتے ہیں اور ابراہیم بن عبداللہ کو اور زکریا محمد باقر کو اور محمد بن عبداللہ بن الحسین بن الحسن اور محمد بن القاسم بن الحسن اور یحیٰ بن عمر کو بھی جو حضرت زید شہید کے پوتوں میں سے تھے، کافر اور مرتد جانتے ہیں اور جماعت کی جماعت سادات حسنیہ اور حسینیہ جو حضرت زید شہید کی امامت اور بزرگی کے قائل ہیں، گمراہ اور اہل ضلالت میں سے سمجھتے ہیں.... (چند سطروں کے بعد) اور اس کی وجہ بھی ظاہر ہے، کیونکہ ان کے نزدیک دوازدہ امام میں سے کسی امام کی امامت کا منکر ایسا ہی کافر ہے جیسا کسی نبی کی نبوت کا منکر، اور سب جانتے ہیں کہ کافر ابدالآباد تک جہنم میں رہیں گے“(۷)

مختصر یہ کہ حضرت الامام النانوتویؒ کی ”ہدیۃ الشیعہ“ نامی اسی تصنیف کو آج کل کی مروج اصطلاح میں ”انسائیکلوپیڈیا آف شیعہ“ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس میں مذہب شیعہ کے عقائد مثلاً بدا، امامت، تحریف قرآن، قدح اصحاب کرام وغیرہ، پھر ان کی مذہبی عبادات مثلاً تقیہ، متعہ وغیرہ کا حال ان ہی کی معتبر کتابوں کے حوالوں سے بیان کرنے کے بعد ان کا ابطال کیا گیا ہے۔ نیز شیعوں کے معروف اعتراضات وشبہات مثلاً قصہ قرطاس اور قصہ فدک وغیرہ کا ذکر بالتفصیل کرنے کے بعد ان کے مدلل اور مسکت جوابات فراہم کر کے اہل سنت و جماعت کی حقانیت ثابت کی ہے اور اس مدلل و ضخیم کتاب کا اختتام کرتے ہوئے یوں رقم فرمایا ہے:

”اب لازم یوں ہے کہ بس کیجئے، کیونکہ کوئی بات مولوی صاحب کی خرافات میں سے باقی نہیں رہی جس کا جواب شافی بفضلہ تعالیٰ اس رسالہ میں درج نہیں ہوا“(۸)

س اہم، مدلل اور شافی کتاب کے علاوہ تقریباً چار سو ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ایک اہم اور ضخیم کتاب ”

(۷) ہدیۃ الشیعہ ص: ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶۔ (۸) حوالہ مذکورہ۔ ص: ۳۶۰

اجوبۂ اربعین' کے نام سے بھی حضرت الامامؒ کی تصانیف میں شامل ہے، یہ کتاب جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کہ شیعوں کی طرف سے اٹھائے گئے چالیس سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔

یہ جوابات حضرت نانوتویؒ نے اپنے شاگرد رشید اور استاد زادہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی فرمائش اور اصرار پر رقم فرمائے ہیں، چنانچہ کتاب کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

''بعد حمد وصلوۃ کے یہ خادم خاص محمد قاسم اپنے مخدوم ومکرم مولانا محمد یعقوب صاحب کی خدمت میں سلام و نیاز کے بعد عرض پرداز ہے کہ آج بروز چارشنبہ معلوم نہیں تاریخ ۱۶ ہے یا ۱۷ آپ کا والا نامہ راوڑ سے میرے پاس آیا، دیکھا تو ایک طومار کا طومار تھا شیطان کے وسوسوں کو بھی مات کیا، دیکھ کر دل بہت گھبرایا، جی میں کہتا کہ یہ ناگہانی بلا اوقات کھونے کے لئے کہاں سے سر پر آپڑی، پھر تسپر حاصل نہ وصول، شیعوں کے راہ پر آنے کی امید نہیں، ادھر دل کا اہل کا یہ خیال تھا کہ مولوی محمد یعقوب صاحب ہی نے ان سوالوں کی اپنی لاحول سے کیوں نہ خبر لی، میں کجا اور دیوبند کجا، مگر کچھ آپ کا خوف کچھ حاجی صاحب کا لحاظ، چار و ناچار قہر درویش بر جان درویش''(۹)

یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے، حصہ اول میں اٹھائیس سوالات اور ان کے دو جوابات ہیں۔ پہلے جوابات تو حضرت الامامؒ النانوتوی کے ہیں اور دوسرے حضرت مولانا عبداللہ صاحب انبہٹویؒ کے ہیں اور حصہ دوم میں بقیہ بارہ سوالات کے جوابات ہیں، جو صرف حضرت نانوتویؒ ہی کے قلم سے ہیں۔

حصہ اول میں جوابات کا آغاز کرتے ہوئے حضرت والا نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''مولانا! ہر چند کہ سوالات مرسلہ دیکھنے میں اٹھائیس ہیں، پر اہل فہم جانتے ہیں کہ درحقیقت وہ ایک سوال ہے، مطلب سب کا فقط اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مذمت اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بڑائی ہے............اہل عقل کے نزدیک شیعوں کی یہ دھوکہ بازی اس قابل نہیں ہے کہ فریب کھائے، پر کیا کیجئے عقل بہت دن ہوئے اٹھ گئی، کوئی کوئی صاحب عقل نظر آتا ہے ناچار بپاس خاطر ابناء روزگار، اول ایک جواب اجمالی معروض ہے، بعد ازاں تفصیل وار ہر ہر سوال کا جواب عرض کروں گا..........سوالات مذکورہ کا مطلب ہم سے پوچھئے سائل کو نہ حکم پیغمبر خدا صلی

(۹) اجوبۂ اربعین۔ ص: ۴۷ مطبوعہ لاہور ۱۹۸۱ء

اللہ علیہ وسلم سے مطلب ہے نہ کسی اجماع سے غرض، اس کو اپنے مطلب سے مطلب ہے، غرض اصلی اس کی فقط یہ ہے کہ مستحق خلافت فقط حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے اور لوگ زبردستی بن بیٹھے، ان پر ظلم کیا اور ظلم کا بار اپنی گردن پر لیا، بایں ہمہ وہ لوگ خطاوار، گنہگار، منافق، بے دین، بدآئین، بے وفا، سراپا دغا، دل کے نامرد، نیتوں کے خراب تھے۔ (معاذ اللہ)

اگر بالفرض والتقدیر حضرت علیؓ کے ہوتے اور کسی کا خلیفہ ہونا جائز بھی ہوتا، تو ایسے اوصاف والوں کا خلیفہ ہونا تو پھر بھی جائز نہ ہوتا''(۱۰)

پھر ان سوالون کا اجمالی جواب دیتے ہوئے حضرت الامامؒ نے صحابہ کرامؓ کی منقبت میں درج ذیل چار آیات قرآنیہ:

(۱) والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان الخ۔ (پ ۱۱ ع ۲)

(۲) الذين امنوا وهاجروا وجاهدوا باموالهم وانفسهم اعظم درجة عند الله الخ (پ ۱۰ التوبہ ع ۳)

(۳) اذن للذين يقاتلون بانهم ظلموا الخ (پ ۱۷ الحج ع ۵)

(٤) محمد رسول الله والذين معه اشداء على الكفار رحماء بينهم الخ. (پ ۲٦ الفتح آخری آیت)

پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ جن لوگوں کی تعریف خود خدائے ذوالجلال نے اس طرح کی ہو ان کے بارہ میں ایمان والوں کی کوئی دوسری رائے کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اور پھر کیا ایمان باقی بھی رہ سکتا ہے؟ چنانچہ رقم طراز ہیں:

''ان آیتوں کے بعد یہ عرض ہے کہ صحابہؓ نے جو کچھ کیا بجا کیا یا بے جا؟ ابوبکر صدیقؓ کو خلیفہ بنایا پھر حضرت عمرؓ کو، پھر حضرت عثمانؓ کو، پھر حضرت علیؓ کو۔ اگر یہ ترتیب حسب مرضی شیعہ ہے تو فبہا، ورنہ یہ معنی ہوئے کہ صحابہؓ نے ظلم کیا، دین محمدی میں رخنہ ڈالا، جن سے ہدایت مقصود تھی ان کو دم مارنے نہ دیا، جنھوں نے نیا دین نیا آئین کر دیا وہ مسند خلافت دبا بیٹھے، باقی ان کے معین اور

(۱۰) حوالہ مذکورہ۔ ص: ۴۹-۵۰

مددگار ہو گئے......... سو در صورتیکہ (بزعم شیعہ) ترتیب معلوم غلط، اور خلفائے ثلثہؓ ظالم اور بے دین، اور باقی صحابہؓ اُن کے مددگار، تو یہ معنی ہوں کہ نعوذ باللہ خدا نے اخوان الشیاطین کی اتنی تعریف کی جو اولیاء کو بھی نصیب نہیں۔ اب حضرات شیعہ کی خدمت میں یہ عرض ہے کہ خدا کے قول و قرار کا اعتبار ہے یا بھول چوک اور تقیہ کا احتمال ہے؟'' (۱۱)

اٹھائیس سوالوں کا اجمالی جواب دینے کے بعد پھر حضرت والا نے ہر ہر سوال کا الگ الگ تفصیلی جواب بھی لکھا ہے اور اس کے بعد مذہب شیعہ پر بیالیس سوالات قائم کئے ہیں جس میں پورے مذہب شیعہ کا احاطہ کر لیا ہے اور عقیدۂ امامت کے ثبوت، ولی بمعنی حاکم کا ثبوت، امام غائب کے عدم ظہور کے سبب، تحریف قرآن مجید، صدیق اکبرؓ کی صحابیت سے انکار، تقیہ، متعہ، فدک، عقد حضرت ام کلثومؓ، جواز لواطت، باندیوں کی شرمگاہیں عاریتاً دینے، وغیرہ جیسے اہم عقائد و مسائل شیعہ پر سوالات کر کے ان کے جوابات کا مطالبہ کیا ہے۔

اسی طرح کتاب کے حصہ دوم میں شیعہ کی طرف سے اٹھائے گئے بارہ سوالات کے مدلل جواب دینے کے بعد ''فقہ جعفریہ'' کے فحش مسائل مثل متعہ، پھر متعہ دوریہ اور وطی فی الدبر (لواطت) وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ ان جوابات اور کتاب کے مندرجات کو دیکھ کر جہاں ایک طرف حضرت الامام النانوتویؒ کی تبحر علمی، معاملہ فہمی، اور زیرکی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں یہ حیرت انگیز انکشاف بھی ہوتا ہے کہ باوجود شیعوں کی جانب سے اپنے مذہب کے اخفاء و کتمان کے حضرت والا کی اس پورے مذہب پر ایسی نگاہ اور گرفت تھی جو ان کے ہم عصر ہی نہیں ماقبل و مابعد کے اہل علم میں سے بھی گنے چنے لوگوں کو ہی حاصل ہوئی۔

اس موضوع پر حضرت الامام النانوتویؒ کے علمی آثار میں درج بالا دو مستقل کتابوں کے علاوہ ''فیوض قاسمیہ'' نامی مجموعۂ مکاتیب میں شامل وہ چند خطوط بھی ہیں جن میں مختلف استفسارات کے جواب میں حضرت والا نے اہل تشیع کے اعتراضات اور ان کے پیدا کردہ شبہات کے جوابات اپنے اہل تعلق کو مطمئن کرنے کے لئے دیئے ہیں۔ چنانچہ اس مجموعہ کے مکتوب اول میں جو فارسی زبان میں ہے بڑے لطیف انداز میں شیعہ و خوارج کے عقائد و اعمال کا جائزہ لیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ ان

(۱۱) اجوبۂ اربعین۔ ص: ۵۳-۵۴

لوگوں کی حیثیت مخنث جیسی ہے جو نہ مرد ہوتے ہیں نہ عورت، بلکہ درمیانی مخلوق ہوتے ہیں، یا ان کی مثال مشکوک پانی جیسی ہے جسے نہ مطلق پاک کہا جاسکتا ہے نہ مطلق نجس۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے کہ بعض عقائد واعمال کے لحاظ سے انہیں مؤمن سمجھا جا سکتا ہے اور بعض دوسرے عقائد واعمال کی وجہ سے ان کا شمار کافروں میں ہونا چاہئے۔ پس یہ دونوں کے درمیان ''برزخی'' لوگ ہیں۔

مکتوب دوم میں جو حکیم ضیاء الدین صاحب کے نام ہے، لکھنؤ کے ایک شیعہ عالم ومجتہد مولوی حامد حسین سے ملاقات اور پھر مختصر مباحثہ کی روداد بیان کرتے ہوئے یہ دلچسپ انکشاف کیا گیا ہے کہ مولوی صاحب موصوف سے ملاقات کرتے ہوئے حضرت والا نے اپنے کو بھی شیعہ ہی ظاہر کیا تھا اور بوقت حاضری ''السلام علیکم'' کے بجائے شیعوں کے طرز پر ''سلام علیکم'' کہا تھا اور اپنا معروف نام محمد قاسم کے بجائے تاریخی نام خورشید حسین بتایا تھا۔ اس کے بعد حضرت والا نے اپنے سوالات پیش کرتے ہوئے مولوی صاحب موصوف سے کہا کہ ہمارے اس علاقہ میں سنی اہل علم کافی تعداد میں ہیں جبکہ شیعہ میں اہل علم نہیں ہیں۔ جس کی وجہ سے شیعہ حضرات سنیوں کے اعتراضات کے جوابات دینے سے عاجز رہتے ہیں۔ آپ بتائیں کہ یہ فدک کیا ہے؟ جواب میں مولوی صاحب نے مسکرا کر کہا، ایک زمین کا نام ہے۔ پھر سوال کیا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے متعلقین نے یہ زمین خریدی تھی؟ جواب دیا، نہیں غنیمت میں ملی تھی حضرت والا نے تحریر فرمایا ہے کہ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ جواب غلط ہے، کیونکہ فدک کی زمین کا تعلق مال غنیمت سے نہیں، مال فئی سے تھا اور دونوں کے احکام جدا جدا ہیں مگر چونکہ بحث کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ مجھے پہچان کر بھڑک جائیں گے، اس لئے گھما پھرا کر سوال اس طرح کیا کہ فدک نام کا کوئی غزوہ سننے میں تو نہیں آیا اور اس نام کی زمین ہے کہاں۔ جواب دیا کہ خیبر کے نواح میں ہے۔ پھر سوال کیا کہ فئی کیا ہے؟ جواب میں کہا کہ غنیمت کو کہتے ہیں۔ پھر سوال کیا کہ حضرت! ایک لاتعلق شخص نے جو نہ سنی ہے نہ شیعہ، کہا کہ فدک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مملوکہ نہ تھی کہ اس میں میراث جاری ہوسکے اور حوالہ میں ما افاء اللہ علی رسولہ الخ پڑھا۔ جواب میں کچھ ادھر ادھر کی باتیں کہیں اور اٹھ کر چل دیئے، کوئی جواب صحیح بن نہیں پڑا مکتوب چہارم تفصیلی ہے جو مرزا قاسم علی بیگ کے نام ہے اور اس میں کئی سوالوں کے جوابات ہیں۔

پہلا جواب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذوالفقار نامی تلوار کے سلسلہ میں ہے کہ حضرت صدیق

اکبرؓ نے بعد وفات رسول صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے منقولہ اثاثہ کو بطور تبرک تقسیم کر دیا تھا اور یہ تلوار حضرت علیؓ کو دی تھی جس کا بطور وراثت ظن غالب کے مطابق حضرت زین العابدین تک پہنچنا معلوم ہے اس کے بعد کا حال معلوم نہیں۔ دوسرا جواب شیعہ کے اس عقیدہ و بیان کے سلسلہ میں ہے کہ خلفائے ثلثہؓ حضرات اہل بیتؓ کی شفاعت کے محتاج ہوں گے جواب میں کہا گیا ہے کہ یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے، کیونکہ خلفائے ثلثہؓ کا مقام و مرتبہ اور ان کے فضائل قرآن مجید کی آیات میں بیان کر دئے گئے ہیں اور ان کو اجر عظیم کی بشارت دے دی گئی ہے اس کے بعد ان کو اہل بیتؓ کی شفاعت کی کیا حاجت؟ کیا خدا کے وعدہ پر بھی اعتبار نہیں؟ تیسرا مسئلہ فدک اور میراث نبی کا ہے جس کے جواب میں دیگر باتوں کے علاوہ بنیادی بات ''عقیدۂ حیات النبی'' کی کہی گئی ہے کہ ہمارے عقیدہ کے مطابق جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں تو ان کی وراثت کا سوال ہی کیا؟ چوتھا مسئلہ حضرت علیؓ کی خلافت بلا فصل کا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث ہونے اور پھر **من کنت مولاہ فعلی مولاہ** فرما دینے کی وجہ سے خلیفہ اول حضرت علیؓ کو ہونا چاہئے تھا؟ اس کے جواب میں لفظ مولی کے معنی حقیقی اور اس ارشاد کے آخری ٹکڑے سے استدلال وغیرہ کے علاوہ ایک اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ اگر قرابت رسول ہی کو معیار خلافت قرار دے دیا جائے، تو بھی حضرت علیؓ کا نمبر چوتھا ہی رہے گا، کیونکہ قرابت کے لحاظ سے پہلا نمبر حضرت فاطمہؓ کا، دوسرا حضرت حسنؓ، کا تیسرا حضرت حسینؓ کا اور پھر چوتھا حضرت علیؓ کا ہوگا۔ اب یہ اہل تشیع سے پوچھا جائے کہ حضرت علیؓ کا پہلا نمبر کیوں کر ہوگا؟

اسی مکتوب کے آخر میں ایک جواب فارسی کے بجائے اردو زبان میں ہے جو حضرت عمرؓ پر شیعہ کے اس اعتراض کے جواب میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو سورۃ البقرۃ یاد نہ تھی۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ جس واقعہ کا حوالہ دیکر یہ بات کہی گئی ہے وہ مکی ہے اور سورۃ البقرۃ کا نزول مدینہ میں ہوا، تو جب یہ سورۃ نازل ہی نہیں ہوئی تھی تو کسی کے یاد ہونے، نہ ہونے کا کیا سوال؟ اور یہ کہ اگر قرآن مجید کا یاد نہ ہونا، باعث عار ہے تو شیعوں کو ڈوب مرنا چاہئے کہ یہ عیب انہی کے یہاں ہے، سنیوں میں تو بکثرت قرآن مجید کے حافظ ہیں۔

پھر اسی مکتوب کے آخر میں حضرت عمر فاروقؓ کی خلافت کی صحت اور ان کے ایمان پر اس سے استدلال کیا گیا ہے کہ ان ہی کے دور خلافت میں ہونے والے غزوۂ فارس سے شاہ فارس یزدگرد کی تین

بیٹیاں شہر بانو، ماہ بانو، اور مہر بانو غنیمت میں آئی تھیں اوران میں سے پہلی حضرت حسینؓ کو، دوسری حضرت محمد بن ابی بکرؓ کو، اور تیسری حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو دی گئی تھیں اوران ہی شہر بانو کے بطن سے حضرت حسینؓ کے بیٹے حضرت علی زین العابدینؒ کی ولادت ہوئی تھی، اب اگر حضرت عمرؓ کی خلافت غلط، تو ان کے ذریعہ کیا گیا جہاد اور پھر اس میں ملا ہوا مال غنیمت کیوں کر صحیح ہو سکے گا اور ایسی صورت میں حضرت حسینؓ کے شہر بانو کو قبول کرنے اور پھر حضرت زین العابدین کے ثبوت نسب کا کیا حکم ہوگا؟

مکتوب پنجم میں جو مولوی عبدالحق صاحب کے نام ہے، مسئلہ فدک اور پھر اس ذیل میں مسئلہ وراثت کی مکمل وضاحت کرتے ہوئے تمام شیعی شبہات واحتمالات کے جوابات دیئے گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس مختصر تحریر میں حضرت الامام النانوتویؒ کی تشیع اور اہل تشیع کے سلسلہ میں علمی خدمات کا احاطہ نہیں کیا جا سکا ہے، لیکن درج بالا سطور میں جو کچھ پیش کیا جا سکا ہے اس سے دو باتیں بوضاحت سمجھ میں آتی ہیں:

اول: یہ کہ حضرت والا کی مذہب شیعہ پر بہت گہری نظر تھی اور وہ اس مذہب کے عقائد، عبادات، اور رسوم، سب سے گھر کے بھیدی کی طرح باخبر تھے اور ان کی تحریروں سے یہ بات آشکار ہے کہ انہوں نے اس مذہب کا ''تقابلی مطالعہ'' مطالعہ کیا تھا۔

دوم: یہ کہ مذہب شیعہ سے اسی ''باخبری'' کی وجہ سے وہ اس مذہب سے اہل اسلام یا اہل سنت کا فاصلہ بنائے رکھنا ضروری سمجھتے تھے اور اہل تشیع کے مکائد ومزخرفات کو پوری تفصیل کے ساتھ مدلل طور پر انہوں نے اسی لئے بیان کیا کہ اہل تشیع کو ہدایت ہو نہ ہو، لیکن اہل سنت اس ''معصوم زہر'' سے واقف ہو کر اس سے حفاظت کا انتظام ضرور کر لیں۔

اب رہیں تشیع یا اہل تشیع کے سلسلہ میں حضرت الامام کی وہ خدمات جن کو راقم الحروف نے ''عملی'' سے تعبیر کیا ہے، ان کے سلسلہ میں اس بنیادی نکتہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہ حضرت الامام کا دور وہ دور تھا جب ''فکری وتہذیبی'' طور پر اہل تشیع غالب گروہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ارباب جاہ واقتدار کی پشت پناہی بھی انہیں حاصل تھی، اصلاح احوال کے سلسلہ میں حضرت الامامؒ کے مواعظ، مباحثوں اور اسفار و دیگر خدمات جلیلہ پر غور کیا جائے تو بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ ''اعلاء کلمۃ الحق'' کے لئے حق تعالیٰ نے ان کا اس طرح انتخاب فرمایا تھا کہ وہ حق پرستوں کے لئے ''سرچشمۂ قوت'' اور باطل پر

ستوں کے لئے ''دردسر'' بن گئے تھے۔

اس اجمال کی تفصیل سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ان حالات اور اس ماحول پر ایک نگاہ ڈال لینا مناسب ہوگا جن میں حضرت والا کو خدمت کرنے کا موقع ملا اور جس کا بیان ''سوانح قاسمی'' کے مؤلف نے اس طرح کیا ہے:

''مغل حکومت کے آخری دور میں ملک پر زیادہ تر شیعوں ہی کا سیاسی اثر و اقتدار مختلف وجوہ سے قائم ہوگیا تھا۔ اکثر صوبوں کے بھی وہی مطلق العنان حکمراں بن گئے تھے اور مرکز بھی ان ہی کے زیر تسلط ہو چکا تھا، اورنگ زیب عالمگیر انار اللہ برھانہ کے بعد تخت پر جن نام نہاد بادشاہوں کو ہم پاتے ہیں ان میں بعض تو علانیہ شیعہ عقائد اختیار کر چکے تھے۔ براہ راست عالمگیر کا جانشین بہادر شاہ اول آپ سن چکے کہ علماء اہل سنت والجماعت کو دربار شاہی میں بلا بلا کر خود مناظرہ کر کے تشیع کی پشت پناہی کر رہا تھا، جمعہ اور عیدین کے خطبوں سے خلفائے ثلثہؓ کے اسمائے گرامی کو خارج کرنے کا فرمان بھی اس نے صادر کیا تھا اور مغل حکومت کے ان شاہان شطرنج میں جو بظاہر شیعہ نہ تھے، بلکہ نام کی حد تک اپنے آپ کو سنی ہی کہتے اور سنی ہی سمجھتے بھی تھے، لیکن عملاً ان کی دینی زندگی میں بھی تشیع کے عناصر و اجزاء کچھ اس طرح گھل مل چکے تھے کہ ان میں اور شیعوں میں بہت کم فرق باقی رہا تھا۔ حکومت کے اسی رنگ میں، بتا چکا ہوں، کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی رنگ چکی تھی۔ خصوصاً سیدنا الامام الکبیرؒ نے جس علاقہ میں اپنی آنکھیں کھولی تھیں، مختلف شہادتیں پیش کر چکا ہوں، کہ اس علاقہ میں جو شیعہ نہیں بھی تھے، ان کی دینی زندگی بھی تقریباً تشیع کی زندگی بن چکی تھی۔ سنیوں اور شیعوں میں شادی بیاہ کے تعلقات چونکہ قائم تھے، اس لئے سیاسی اقتدار باہر سے اور معاشرتی تعلقات اندر سے اس رنگ کو پختہ سے پختہ تر کرتے چلے جا رہے تھے۔ (۱۲)

اسی رنگ کو چھڑا کر ''حقیقی اسلامی رنگ'' چڑھانے کے لئے سب سے پہلے تو حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے مبارک خانوادہ کی طرف سے ''اصلاحی مہم'' چھیڑی گئی خصوصاً حضرت شاہ صاحب کے صاحبزادۂ گرامی حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمات جلیلہ اور اس راہ میں پیش آنے والے شدائد و مصائب کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ پھر اس ولی اللہی مشن کی تکمیل کے لئے حضرت حق جل

(۱۲) سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص: ۶۱-۶۲۔

مجدہ نے حضرت الامام النانوتویؒ کا اس طرح انتخاب کیا کہ بقول حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی مؤلف سوانح قاسمی:

''جتنا زیادہ حسن قبول ولی اللہی نصب العین کو سیدنا الامام الکبیر کے ذریعہ حاصل ہوا، شاید یہ کیفیت ازل ہی سے آپ کے لئے مقدر تھی، بیوہ عورتوں کے عقد کا مسئلہ ہو یا سنت و بدعت، مقلدیت وغیر مقلدیت، تصوف و توہب، تشیع و تسنن وغیرہ کے قصے ہوں، اس سارے مسائل میں ولی اللہی مسلک اور نقطہ نظر کو ہندگیر عمومیت جیسی آپ کی بدولت میسر آئی بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ یہ کام قدرت نے آپ ہی کی ذات بابرکات سے لیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ دینی زندگی کے ولی اللہی رنگ کا نام ہی اب ''دیوبندیت'' ہو گیا ہے جو سچ پوچھئے تو ''قاسمیت'' ہی کے لفظ کی دوسری تعبیر ہے''۔ (۱۳)

حضرت الامام النانوتویؒ کی پرسوز اور مخلصانہ اصلاحی کوششوں کے نتیجوں میں بہت سے شیعہ خاندانوں کو توبہ کی توفیق ملی، مثلاً حضرت مولانا قاری طیب صاحب کے بیان کے مطابق:

''ان سادات بارہہ میں سے خانجہا پور، رتھیڑی اور منصور پور کے خاندان حضرت ہی کے ہاتھ پر تائب ہوئے اور سنی بنے اور اس قدر گرویدہ اور محبّ بن گئے کہ ان کی دیوبند آمدورفت مثل اہل بیت کی آمدورفت کے ہوگئی''(۱۴)

اسی طرح پور قاضی نامی قصبہ میں حضرت نانوتویؒ کی تشریف آوری اور پھر وہاں اہل تشیع کی ''مجلس ماتم'' میں پہنچ کر اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور وصیت: **ترکت فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی** کو عنوان کلام بنا کر تقریر فرمانے اور اس تقریر سے متاثر ہو کر بہت سے لوگوں کے شیعہ عقائد سے تائب ہو کر سنی بن جانے کی جو تفصیل ''سوانح قاسمی'' کے مؤلف نے حضرت مولانا محمد طاہر صاحبؒ بروایت حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ کے حوالہ سے بیان فرمائی ہے اس سے بھی پور قاضی کے شیعوں کی معتد بہ تعداد کے توبہ کر کے ''حقیقی اسلام'' میں داخل ہونے کا علم ہوتا ہے۔ (۱۵)

اسی طرح ایک بہت ہی عبرت ناک واقعہ اور اس کے نتیجہ میں شیعوں کے توبہ کر کے سنی ہو جانے کا حال حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے حکیم بنیاد علی صاحب مرحوم ساکن لاڈر ضلع میرٹھ سے سن کر ''سوانح قاسمی'' میں رقم فرمایا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱۳) حوالہ مذکورہ۔ ص:۷۸ (۱۴) حاشیہ سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص:۷۲ (۱۵) سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص:۶۶،۶۷

''مباحثۂ شاہجہاں پور'' کے موقع پر شاہجہان پور کے قریب کسی گاؤں کے غریب شیعوں کی دعوت پر (جو مقامی شیعوں کے اثرات میں دبے ہوئے تھے کیونکہ زمیندارہ شیعوں ہی کا تھا) حضرت نانوتویؒ نے وہاں جا کر وعظ فرمانا منظور کر لیا، جب اس کی خبر وہاں کے شیعہ زمینداروں کو ہوئی تو ان میں کھلبلی مچ گئی، چونکہ وہ لوگ حضرت کے مقام اور ان کے مواعظ کے اثرات سے واقف تھے اس لئے انہیں خطرہ تھا کہ کہیں وعظ سن کر وہاں کے شیعہ عوام متاثر نہ ہو جائیں اس کی کاٹ کے لئے انہوں نے لکھنؤ سے چار شیعہ مجتہدین کو اس پروگرام کے ساتھ بلوا لیا کہ چاروں نے مل کر چالیس سوالات تیار کئے اور طے پایا کہ دس دس سوالات چاروں الگ الگ کریں گے چنانچہ مقررہ پروگرام کے مطابق حضرت والا جب اس گاؤں میں پہنچے اور آپ کا وعظ شروع ہوا تو یہ چاروں مجتہدین چاروں کونوں پر اس تیاری کے ساتھ بیٹھ گئے کہ جوں ہی حضرت وعظ شروع کریں فوراً ایک اپنا سوال پیش کردے، جب تک اس کے جواب سے فارغ ہوں دوسرے کونے سے دوسرا اپنا سوال پیش کردے، اسی طرح تیسرا اور چوتھا اس طرح سوال و جواب میں الجھا کر سارا وقت ضائع کر دیا جائے اور حضرت نانوتویؒ کا وعظ ہو ہی نہ سکے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حضرت والا کی کرامت یوں ظاہر ہوئی کہ حضرت والا کا مفصل وعظ ہوا اور اس میں ان تمام سوالات کے جوابات خود بخود اس طرح آتے چلے گئے کہ ان مجتہدین کو کوئی سوال کرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ اب ان مجتہدین اور شیعہ زمینداروں نے اپنی کھسیاہٹ مٹانے کے لئے ایک نوجوان کا ''فرضی جنازہ'' بنایا اور حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ آپ اس کی نماز جنازہ پڑھا دیں، طے یہ تھا کہ جب حضرت والا دو تکبیر کہہ لیں تو یہ ''مصنوعی مردہ'' اٹھ کر بھاگے گا اور سب مل کر حضرت والا کا مذاق اڑائیں گے اور ان سے ٹھٹھول کریں گے، حضرت والا نے اس درخواست پر پہلے تو معذرت فرمائی، پھر شدید اصرار پر اس حال میں آمادہ ہو گئے کہ اندرونی اضطراب چہرہ سے عیاں تھا۔ بہرحال نماز جنازہ شروع ہوئی، دو تکبیروں کے بعد جب ''مردہ'' میں کوئی حرکت نہیں ہوئی تو پیچھے سے ''ہونہہ'' کہہ کر اسے متوجہ کرنے اور اپنا ''مقررہ کام'' انجام دینے کا اشارہ بھی کیا گیا مگر اس میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ حضرت نانوتوی نے نماز پوری کرنے کے بعد اسی غصہ کے لہجہ میں فرمایا ''اب یہ قیامت کی صبح سے پہلے نہیں اٹھ سکتا'' دیکھا گیا تو واقعی مر چکا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر

شیعوں میں صف ماتم بچھ گئی او بہت بڑی تعداد میں شیعہ تائب ہوکر سنی ہوگئے۔ (۱۶)

حضرت الامامؒ کی اسی اصلاحی مہم اور علمی و عملی خدمات کے ذریعہ اہل تشیع کی بڑی تعداد کو تائب ہونے کی توفیق ملنے کے علاوہ اس کا سب سے بڑا فائدہ اس ''رنگ'' کے اترنے کی صورت میں ظاہر ہوا جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے، جس میں پورا علاقہ بلکہ پورا ملک رنگا ہوا تھا۔ خود دیوبند کا یہ حال تھا کہ گھر گھر تعزیہ داری ہوتی تھی اور مسجدوں سے تعزیئے اٹھائے جاتے تھے، جس میں شیعوں سے زیادہ ''نام نہاد سنی'' دلچسپی لیتے تھے، چنانچہ ''سوانح قاسمی'' کے مؤلف کا بیان ہے:

''اور تو اور ضلع سہارن پور کا یہی قصبہ دیوبند جو آج سنیوں کا سارے ہندوستان میں ماوی و ملجاء بنا ہوا ہے۔ کسی موقع پر امیر شاہ خاں مرحوم کی اس اطلاع کا ذکر کر چکا ہوں کہ میرٹھ، ہاپوڑ، گلاوٹھی، بلند شہر کے ساتھ ساتھ وہی کہتے تھے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ: ''دیوبند میں سب تفضیلی تھے''

دیوبند کے اچھے اچھے ممتاز گھرانوں میں تفضیل کا اثر موجود تھا بلکہ ''سوانح مخطوطہ'' کے مصنف نے بجائے تفضیل کے لکھا ہے کہ:

''مادہ رفض کا غالب تھا''

اسی وجہ سے آپ کے زمانہ میں بلکہ آپ کے ساتھ کشمکش کی صورت اسی دیوبند میں جو پیش آئی وہ سننے کے قابل ہے۔ (۱۷)

حضرت الامام کی مخلصانہ اصلاحی مہم کے اثرات اس خوشگوار صورت میں ظاہر ہوئے کہ نہ صرف دیوبند اور قرب و جوار بلکہ بہت سے دور دراز مقامات میں رائج تعزیہ داری کا سنی گھرانوں سے خاتمہ ہو گیا، اور سنی رفض و تفضیلیت کے اثرات سے باہر آ گئے۔

آخر میں بطور خلاصہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ کی دینی و اصلاحی خدمات کے باب میں ''رد تشیع'' کو ایک خصوصی و امتیازی مقام حاصل ہے، جس کے ذریعہ اہل تشیع اور اہل سنت دونوں کو بھرپور فوائد حاصل ہوئے اور بہت بڑی تعداد میں بندگان خدا کو اپنے غلط عقائد اور ضلالت آمیز اعمال سے تائب ہو کر ''حقیقی اسلام'' اور اس کے عقائد و اعمال قبول کرنے کی توفیق ملی۔

فرحمة الله عليه رحمة واسعة و جزاه الله عنا وعن جميع المسلمين

---

(۱۶) حاشیہ سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص: ۷۰-۷۱۔ (۱۷) سوانح قاسمی حصہ دوم۔ ص: ۷۲-۷۳

مولانا عتیق احمد قاسمی*

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کا فقہی ذوق ومزاج

پس منظر

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ برصغیر کی ان عظیم شخصیات میں سے ہیں جنہوں نے اپنے دور پر اور بعد کے ادوار پر بڑے گہرے دیرپا اثرات چھوڑے ہیں۔ انیسویں صدی عیسوی اور تیرہویں صدی ہجری کی ممتاز ترین شخصیات کی مختصر سے مختصر فہرست بنائی جائے تو اس میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی کا اسم گرامی نمایاں ترین جگہ پائے گا۔ برصغیر ہندو پاک میں مغلیہ سلطنت کے بکھراؤ کے بعد ہندوستان کے اندلس بن جانے کا پورا خطرہ پیدا ہو گیا تھا، اسلام دشمن طاقتوں نے پوری منصوبہ بندی کرلی تھی کہ برصغیر کے مسلمان اپنا دین وایمان، تہذیب وثقافت سب کچھ بھول کر یا تو عیسائیت کی گود میں چلے جائیں یا ہندو مذہب اختیار کرلیں، ایسٹ انڈیا کمپنی اور برطانوی حکومت ہند کی سرگرم پشت پناہی میں پادریوں کی فوج یورپ کے مختلف ممالک سے آکر پورے ہندوستان میں پھیل گئی تھی اور پوری مشنری اسپرٹ کے ساتھ سرگرم عمل تھی، پادریوں کی کوششوں کا خاص نشانہ مسلمان تھے مسلمانوں کو عیسائی بنانے کے لئے دباؤ اور لالچ کا ہر طریقہ اختیار کیا جارہا تھا، پادریوں نے مناظرہ کا بازار گرم کر کے اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف تشکیلی مہم چھیڑ رکھی تھی تاکہ اسلام کے بنیادی عقائد اور تعلیمات سے مسلمانوں کا اعتماد اٹھ جائے اور ان پر تثلیث کا رنگ چڑھایا جاسکے۔ دوسری طرف آریہ سماج تحریک اپنے شباب پر تھی، اور آریہ سماجی مبلغین اسلام کے خلاف بیہودہ اعتراضات کا بازار گرم کئے ہوئے تھے، اسلامی عقائد وتعلیمات کے خلاف اعتراضات پر مشتمل چھوٹی بڑی کتابیں لکھ کر مفت تقسیم کی جارہی تھیں، کوچہ وبازار میں مسلمانوں کو مناظروں کا چیلنج دیا جارہا تھا، مسلمانوں کو بہکانے اور بھڑکانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

---

* دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (یوپی)

برطانوی سامراج کی آہنی بیڑیوں کو توڑنے کی ایک کوشش ۱۸۵۷ء میں کی گئی، لیکن مختلف اسباب سے اس میں ناکامی ہوئی، اس کے بعد برطانوی حکومت ہند نے اپنے حلقے مزید تنگ کر دیے ،مسلمانوں کو سیاسی اور معاشی طور پر کچلنے اور فنا کرنے کی کوششیں تیز تر کر دی گئیں، ہزاروں علماء اور مجاہدین آزادی تہ تیغ کر دیے گئے، بڑی بڑی املاک اور جاگیریں ضبط کر لی گئیں، مسلمانوں کے قیمتی اوقاف برباد کر دیے گئے، قدیم مدارس جو مسلم نوابوں اور امراء کی اعانت سے یا اوقاف کی آمدنی سے چلتے تھے رفتہ رفتہ موقوف ہو گئے اور مسلمانوں کا مستحکم نظام و تربیت جو نئی نسل کی تربیت اور تیاری کا ضامن تھا درہم برہم ہو گیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اپنی نور بصیرت اور فراست ایمانی سے محسوس کر لیا تھا کہ مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا چراغ گل ہونے والا ہے اور اس سلطنت سے وابستہ نظم ملت کا نظام درہم برہم ہونے والا ہے، انہوں نے برصغیر ہندوستان کے حالات کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا، مسلمانوں کے مختلف طبقات میں پائی جانے والی خامیوں، ان کی نفسیاتی کمزوریوں کا جائزہ لیا اور کتاب و سنت کی روشنی میں ان کی بیماریوں کا مداوا تجویز کیا، اپنی دعوتی، اصلاحی علمی و فکری اور تدریسی کوششوں کے ذریعہ مسلم سماج کو سنبھالنے اس کے علمی و فکری معیار کو بلند کرنے اور مسلمانوں کو سچا اور پکا مسلمان بنانے کی سعی پیہم کی، حضرت شاہ صاحب نے اپنی تصنیفی اور تدریسی کوششوں کے ذریعہ علماء اور خواص امت کے دل و دماغ میں ایک خاموش انقلاب برپا کر دیا۔

فکر قاسمی اور فکر ولی اللّٰہی

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریک کا امتداد تھے، فکر قاسمی کے بنیادی عناصر فکر ولی اللّٰہی سے مستفاد و ماخوذ ہیں فقہ اسلامی کے بارے میں حضرت مولانا نانوتویؒ کے رویہ و موقف میں فکر ولی اللّٰہی کا عکس بہت صاف نظر آتا ہے۔

الامام النانوتوی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی طرح محسوس کر رہے تھے کہ فقہاء ہند کے ایک بڑے طبقہ کا عملی رشتہ کتاب و سنت سے بہت کمزور پڑ چکا ہے، وہ لوگ اگرچہ نظریاتی طور پر اس بات کو مانتے ہیں کہ فقہ اسلامی کا ماخذ قرآن و حدیث ہے لیکن علمی صورت حال یہ ہے کہ ان کی عمر کا تقریباً تمام تر حصہ اصول فقہ کی فنی بحثوں اور فقہی جزئیات کے مطالعہ میں گزرتا ہے، کتاب و سنت کے

فہم وتدبر پران کی توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، فقہ کا قرآن وحدیث سے ربط کمزور پڑتا جارہا ہے، فقہی مجتہدات کو کتاب وسنت پر پیش کرنے کا سلسلہ ختم ہوتا جارہا ہے، صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ بعض کم نظر متعصب فقہاء فقہی جزئیہ کے مقابل میں صحیح حدیث نبوی کو برملا مسترد کرنے لگے ہیں۔ اس کا مظاہرہ حضرت نظام الدین اولیاء کے دور سے ہونے لگا جب سماع کے موضوع پر برپا مجلس مناظرہ میں اس دور کے بعض نمایاں فقہاء نے دوران بحث کہہ دیا کہ ہمیں حدیث نبوی سے سروکار نہیں، ہم امام ابوحنیفہؒ کے مقلد ہیں، ہمارے سامنے امام صاحب کا قول پیش کیجئے، اس صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

> ''قاضی ضیاء الدین برنی اپنی کتاب ''حسرت نامہ'' میں لکھتے ہیں کہ: جب حضرت خواجہ اس مجلس سے فارغ ہو کر مکان پر تشریف لائے تو آپ نے نماز ظہر کے وقت مولانا محی الدین کاشانی اور امیر خسرو کو طلب فرمایا، ارشاد ہوا کہ دہلی کے علماء عداوت وحسد سے بھرے ہوئے ہیں، انہوں نے وسیع میدان پایا اور دشمنی کی بہت سی باتیں کیں، عجیب بات یہ دیکھی کہ صحیح احادیث نبویہ کو سننا ان کو گوارا نہیں تھا، ان کے جواب میں یہی کہتے تھے کہ ہمارے شہر میں فقہ پر عمل حدیث پر مقدم ہے، یہ باتیں وہی کہہ سکتے ہیں جن کا احادیث نبویہ پر اعتقاد نہ ہو، میں جب کوئی حدیث پڑھتا تو وہ ناراض ہوتے اور کہتے تھے کہ اس حدیث سے امام شافعی استدلال کرتے ہیں اور وہ علماء کے دشمن ہیں، ہم نہیں سنیں گے، معلوم نہیں کہ یہ اعتقاد ہیں یا نہیں؟ اولوالامر کے سامنے ایسی زبردستی سے کام لیتے ہیں اور احادیث صحیح کو روکتے ہیں، میں نے کوئی عالم ایسا نہیں دیکھا نہ سنا کہ اس کے سامنے احادیث صحیحہ پڑھی جائیں اور وہ یہ کہے کہ میں نہیں سنتا، میں نہیں سمجھتا کہ یہ کیا قصہ ہے اور وہ شہر جہاں ایسی جرأت اور زبردستی کی جاتی ہے وہ کیسے آباد رہ سکتا ہے۔ (۱)

فقہ کو کتاب وسنت سے مربوط کرنے کی کوشش

حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کی اولاد واحفاد نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے صاحبزادگان اور خانوادۂ علمی کی کوششوں سے اگر چہ ہندوستان کے بہت سے علمی حلقوں میں احادیث نبویہ کی گرم بازاری ہوگئی تھی، فن حدیث کے ساتھ اعتناء بڑھ گیا تھا، معتبر کتب احادیث

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت جلد سوم ص: ۹۲-۹۳ بحوالہ سیر الاولیاء، ص: ۵۲۷ تا ۵۳۴

کے درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا لیکن ایسے علمی حلقے موجود تھے جن میں علوم عقلیہ کے بعد سب سے زیادہ توجہ فقہ اور اصول فقہ پر دی جاتی تھی اور ان کے نصاب درس میں قرآن وحدیث نبوی کا حصہ نہ ہونے کے برابر تھا۔

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنی تعلیمی تحریک میں کتاب وسنت کی تعلیم کو ان کے شایان شان مقام دیا۔ صحاح ستہ اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں کو نصاب درس میں شامل کیا، درس کا وہ انداز اختیار کیا کہ کتاب وسنت سے فقہ اسلامی کا ربط و رشتہ کھل کر لوگوں کے سامنے آجائے، اور قرآن وحدیث قندیل ہدایت کا کام دیں اور ان کی روشنی میں الجھے ہوئے مسائل کی گرہیں سلجھائی جائیں، خلافی مسائل پر الامام النانوتوی کے مکتوبات اور تحریریں اپنے اندر اجتہادی شان رکھتی ہیں، کتاب وسنت کی عطر بیزیاں قدم قدم پر نمایاں ہیں اور ایسے لطیف استنباط پائے جاتے ہیں جن کی نظیر فقہاء متقدمین کے یہاں بھی نہیں ملتی۔

اختلافی مسائل میں الامام النانوتوی کا موقف

الامام النانوتوی جن کو بجا طور پر حجۃ الاسلام کا لقب دیا گیا ہے ان کی توجہات خارجی محاذ پر زیادہ رہیں، عیسائی پادری اور آریہ سماجیوں کا مقابلہ علم واستدلال، بحث ومناظرہ کی سطح پر انہوں نے بڑی مستعدی اور بے جگری کے ساتھ کیا اور اپنی تمام تر توانائیاں ان محاذوں پر صرف کیں اور خارجی محاذ پر لڑنے والا کوشش کرتا ہے کہ داخلی لڑائی نہ لڑنی پڑے، اس لئے الامام النانوتوی مسلمانوں کے اندرونی اختلاف وانتشار کے سخت مخالف تھے، اُسے روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے، رفع یدین، قرأۃ فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر وغیرہ کے بارے میں مقلدین اور غیر مقلدین کے جھگڑوں کی خبروں سے ان کے دل پر جو قیامت گزرتی تھی اس کا کچھ اندازہ ان کے بعض مکتوبات اور تحریروں سے ہوتا ہے، ایک خط کے جواب میں جس میں چند مسائل کے بارے میں دریافت کیا تھا لکھتے ہیں:

''مخدوم من میاں جی گھیسا صاحب سلامت، بعد سلام گزارش ہے کہ میں پرسوں تیسرے روز پیر کے دن دیوبند سے یہاں اپنے وطن پہنچا، آپ کا خط ملا، دیکھ کر رنج ہوا، کیا خدا کی قدرت ہے کہ آج کل جس طرف سے صدا آتی ہے یہی آتی ہے کہ وہاں مسلمانوں میں اختلاف ہے، وہاں نزاع ہے، کہیں سے اتفاق کی خبریں نہیں آتیں، ہاں کفار کے جتنے افسانے سنے جاتے ہیں کہ

یوں اتفاق ہے، اس طرح اتحاد ہے، کہ خیر بجز انا للہ وانا الیہ راجعون کے اور کیا کہیے، آپ کی خوشنودی خاطر منظور ہے اس لیے جواب لکھتا ہوں ورنہ ایسے جھگڑوں میں دخل دینا محض فضول سمجھتا ہوں''(۲)

الامام النانوتوی کے مذکورہ بالا الفاظ پڑھ کر شاعر مشرق علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر یاد آتا ہے:

دیکھ مسجد میں شکست رشتہ تسبیح شیخ
میکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ

حضرت نانوتوی اور عدم تقلید

الامام النانوتوی ہی کے دور میں اجتہاد اور عدم تقلید کے نام پر مقلدین کو مشرک قرار دینے، فقہ کو کتاب وسنت کے مخالف اور متوازی شریعت قرار دینے کی مہم چل رہی تھی، بعض اہل قلم اور اہل زبان کی دریدہ دہنی اس قدر بڑھ گئی تھی کہ فقہاء مجتہدین کو سب وشتم کررہے تھے اور فقہ اسلامی کو کوک شاشتر قرار دے رہے تھے، برملا لکھا اور کہا جارہا تھا کہ فقہ حنفی امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کی ذاتی آراء کا مجموعہ ہے، اس کا کتاب وسنت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس موضوع پر لٹریچر کا ایک سیلاب سا آگیا تھا، تقلید کو مطلقاً حرام اور ہر کس وناکس کے لئے اجتہاد کے لازم ہونے کی بات کہی جارہی تھی۔

صورت حال کی نزاکت سے مجبور ہو کر الامام النانوتوی نے بھی اپنے مخصوص انداز میں ان موضوعات پر قلم اٹھایا اور حق یہ ہے کہ تحقیق واستدلال کا حق ادا کردیا۔

امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کا مسئلہ

امام کی اقتداء کرتے ہوئے مقتدی کے لیے سورۃ فاتحہ پڑھنے نہ پڑھنے کا مسئلہ عہد صحابہ سے معرکۃ الاراء چلا آرہا ہے، ایک فریق مقتدی کے لئے سورہ فاتحہ پڑھنے کو واجب کہتا تو دوسرا ممنوع قرار دیتا ہے، اس موضوع پر ہزاروں صفحات لکھے جاچکے ہیں۔ الامام النانوتوی کے زمانہ میں بھی یہ مسئلہ اختلاف ونزاع کا باعث بنا ہوا تھا۔ غالی غیر مقلدین کا دعوی تھا کہ اس مسئلہ میں احناف کا دامن

(۲) رسالہ درثبوت تقلید وبست رکعت تراویح ملحق بہ الدلیل المحکم، ص:۱۸

کتاب وسنت کے دلائل سے خالی ہے اور مقتدی نے اگر سورہ فاتحہ نہ پڑھی تو اس کی نماز ہرگز درست نہیں

(۲) تاریخ دعوت وعزیمت جلد سوم ص:۹۲۔۹۳ بحوالہ سیر الاولیاء، ص:۵۲۷ تا ۵۴۴

ہوگی۔الامام النانوتوی نے اس مسئلہ پرالبیلے انداز سے قلم اٹھایا اور کتاب وسنت نیز عقلی دلائل سے ثابت کردیا کہ مقتدی کو قرأت فاتحہ سے منع کرنے والوں کا موقف نہ صرف کتاب وسنت سے ثابت ہے بلکہ زیادہ مضبوط اور راجح یہی موقف ہے، حضرت نانوتوی نے پوری علمی متانت کے ساتھ بحث کرنے کے بعد رسالہ کے آخر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان اختلافی مسائل میں ان کے معتدل نقطۂ نظر کی غمازی کرتا ہے:

> ''اس پر بھی امام ابوحنیفہ پر طعن کیے جائیں اور تارکین قرأت پر عدم جواز صلوۃ کا الزام ہوا کرے تو کیا کیجئے، زبان قلم کے آگے کوئی آڑ نہیں دیوار نہیں پہاڑ نہیں۔ ہم کو دیکھئے باوجودِ تو جیہات مذکورہ اور استماع تشنیعات معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست وگریبان نہیں ہوتے۔ بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں، امام اعظم بھی باوجود عظمت وشان امکان خطا سے منزہ نہیں، کیا عجب ہے کہ امام شافعی علیہ الرحمۃ صحیح فرماتے ہوں اور ہم ہنوز ان کے قول کی وجہ نہ سمجھتے ہوں، اس امر میں زیادہ تعصب کو پسند نہیں کرتے، پر جس وقت امام علیہ الرحمۃ کی توہین سنی جاتی ہے دل جل کر خاک ہوجاتا ہے اور یوں جی میں آتا ہے کہ ان زبان درازیوں کے مقابلہ میں ہم بھی لن ترانیوں پر آجائیں اور دوچار ہم بھی سنائیں پر آیت: واذا خاطبھم الجاھلون قالوا سلاما واذا مروا باللغو مروا کراما اور احادیث منع نزاع مانع ہیں''(۳)

مسئلہ تراویح

الامام النانوتوی کے دور میں تراویح کا مسئلہ بھی جدال ونزاع کا باعث بنا ہوا تھا، امت مسلمہ کا عمل بیس ۲۰ رکعت تراویح پر چلا آرہا تھا لیکن تیرہویں صدی ہجری میں عمل بالحدیث کا مدعی گروہ اسے بدعت قرار دے رہا تھا اور اس کا اصرار تھا کہ ۸/ رکعات تراویح ہی سنت ہے، حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کی متعدد تحریروں میں اس پر اظہار خیال کیا گیا ہے، یہ تحریریں سائلین کے جواب میں لکھی گئی ہیں مولانا موصوف نے پوری تحقیق ودیانت سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ اس بات کا بھی شکوہ کیا ہے کہ کتابیں پاس میں نہیں ہیں کہ بھرپور روایتی تحقیق کی جائے۔

''لطائف قاسمیہ'' کا دوسرا خط جناب عبدالرحیم خاں صاحب کے نام تراویح کے مسئلہ پر ہے عبدالرحیم خاں صاحب کی طرف سے جو خط آیا تھا اس میں بیس رکعت تراویح کے خلاف دلائل

(۳) توثیق الکلام فی الانصات خلف الامام ص ۲۳ الدلیل المحکم علی قرأۃ الفاتحۃ للمؤتم ص:۱۷

دیے گئے تھے اور کج حجتی کے انداز کی بحثیں کی گئی تھیں، مولانا نانوتوی کا خیال ہے کہ اس خط کے مشتملات کسی ''مدعی اجتہاد'' کے تحریر کردہ ہیں، فارسی زبان میں ہے خط کے آخری حصہ میں تحریر فرماتے ہیں:

ایک عرض یہ ہے کہ بندہ کمترین عاملان حدیث کو اگر ان میں فہم ہو برا نہیں سمجھتا بلکہ عمل بالحدیث کو ایمان کا شعار جانتا ہے لیکن آپ کے گرامی نامہ کے مضامین جن لوگوں کے تحریر کردہ ہیں ایسے بدفہموں کیلئے ہرگز عمل بالحدیث کو جائز نہیں سمجھتا، ایسے لوگ تو یضل بہ کثیرا کے زمرہ میں آتے ہیں، عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہے۔ غرضیکہ ایسی راہ اختیار کرنی چاہئے جس سے اکابر صحابہ پر طعن نہ ہو، دین برہم نہ ہو، مختلف احادیث آپس میں قرآن شریف کے ساتھ منسجم ہوجائیں، جس طریقہ کو اختیار کرنے سے صحابۂ کرام مطعون ہوجائیں، احادیث میں تعارض واقع ہوجائے اور قرآنی روش اس کی تکذیب کرے ایسا طریقہ ہرگز اللہ اور رسول کا پسند کردہ نہیں ہوسکتا مجتہد صاحب نے جو طریقہ ایجاد کیا ہے وہ اسی طرح کا ہے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا (۴)

عبدالرحیم خاں کے خط میں یہ سوال اٹھایا گیا تھا کہ بیس رکعت تراویح والی موطا کی روایت مرسل ہے اور حدیث مرسل محدثین کے یہاں مقبول نہیں ہے، اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے الامام النانوتوی لکھتے ہیں: موطا کی روایت پر طعن کی بنیاد یہ ہے کہ یزید بن رومان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا، سبحان اللہ کیا دلیل ہے اور کیا دعوی ہے، طعن کا خلاصہ یہ نکلا کہ تابعین کی مرسل روایات کا اعتبار نہیں ہونا چاہئے، پہلے اس کو ثابت کرنا چاہیئے پھر یزید بن رومان کی روایت کو مسترد کرنا چاہئے، تابعین کی مرسل روایات کے معتبر نہ ہونے کا اصول اگر خود تراشیدہ ہے تو اسے کون پوچھتا ہے اور اگر دوسروں کی تقلید ہے تو امام شافعیؒ کے علاوہ کون اس طرف گیا ہے، امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک مراسیل صحابہ کی طرح مراسیل تابعین بھی معتبر ہیں بلکہ سند سے زیادہ مرسل کا اعتبار ہے کیونکہ اسناد کو ترک کرنا روایت پر اپنے اعتماد کی دلیل ہے اور اسناد کا ذکر کرنا سننے والے کے فہم پر چھوڑنا ہے گویا یہ کہہ دیا گیا کہ ذمہ داری راوی پر ہے، اگر تقلید سے عار ہے تو امام ابن صلاح کا قول دیوار پر مارنا چاہئے اور اگر ابن صلاح کی تقلید جائز ہے تو امام

---

(۴) لطائف قاسمیہ ص: ۱۴

ابو حنیفہ اور امام مالک نے کیا قصور کیا ہے''(۵)

اس مکتوب میں الامام النانوتوی نے اصول حدیث کے بعض مسائل پر بھی بڑی قیمتی بحثیں کی ہیں۔

حضرت نانوتوی کا طریقۂ اعتدال

حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی ان اختلافی مسائل میں زیادہ قیل وقال اور بحث و تمحیص کو پسند نہیں فرماتے تھے اور اگر ان موضوعات پر انہیں کبھی لکھنا پڑا تو بڑی نرمی، سنجیدگی کے ساتھ قلم اٹھایا، طعن و تشنیع کے بجائے حکمت و موعظت کا اسلوب اپنایا، مولانا مناظر احسن گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

''الغرض نئے نئے عنوانات سے معمولی معمولی جزئی باتوں کا مسلمان میں چرچا کر کے افتراق وشقاق پیدا کرنے کی عام مولویانہ عادت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیدنا الامام الکبیر فطرۃ کارہ تھے اور اس کو سخت ناپسند فرماتے تھے، اسی طرح فروعیات میں ایسے اختلافی مسائل جن میں سلفاً عن خلف نقاط نظر کا اختلاف علماء میں رہا ہے ان کے متعلق آپ کا خیال تھا اور کتنا پاکیزہ خیال تھا، اس قسم کے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے اور یہ فرماتے ہوئے کہ: ''طرفین میں بڑے بڑے اکابر ہیں''۔ اور اپنے اسی خیال کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہوئے کہ ''اگر ایک طرف ہو رہے تو کسی نہ کسی طرف والوں کو برا سمجھنا پڑے''

آگے ارقام فرماتے ہیں:

''اس لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں''(۶)

آپ کا طرز عمل اس نوعیت کے مسائل میں عموماً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اولاً ان پر بمشکل قلم اٹھاتے تھے، پوچھنے اور دریافت کرنے پر کسی نے زیادہ اصرار کیا، تب مجبوراً جو ترجیحی نقطہ نظر اس خاص مسئلہ میں آپ کا ہوتا اس کو ظاہر تو کر دیا کرتے تھے لیکن اسی کے ساتھ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات میں تقریباً بالالتزام اسی قسم کے الفاظ فرماتے چلے گئے ہیں''(۷)

الامام النانوتوی کا مذکورہ بالا طرز عمل صرف فرعی مسائل کے بارے میں نہیں تھا۔ بلکہ بعض

---

(۵) لطائف قاسمیہ ص:۹ (۶) جمال قاسمی ص:۹ (۷) سوانح قاسمی جلد ۲ ص:۹

ایسے مسائل جن کا تعلق کسی نہ کسی درجہ میں اعتقادیات سے ہے ان کے بارے میں بھی اپنی یہی روش بیان فرماتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی جسم ناسوتی کے ساتھ اپنی قبر اطہر میں زندہ ہیں یا نہیں یہ دورِ قدیم سے بڑا معرکۃ الآراء مسئلہ رہا ہے، اس مسئلہ کو حیات النبی کے عنوان سے جانا جاتا ہے، الامام النانوتوی نے اس مسئلہ پر ''آب حیات'' جیسی فکر انگیز ایمان افروز کتاب تصنیف فرمائی ہے، لیکن وہ حیات النبی کے عقیدہ کو ضروریات دین میں شامل نہیں سمجھتے، اس لئے اس کے بارے میں زیادہ بحث واصرار کو پسند نہیں فرماتے حیات النبی کے موضوع پر اپنے ایک مکتوب کے آخر میں رقم طراز ہیں:

''زیادہ کیا عرض کروں ہاں اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ گو عقیدہ یہی ہے اور میں جانتا ہوں انشاء اللہ تعالی ایسا ہی رہے گا مگر اس عقیدہ کو عقائد ضروریہ میں سے نہیں سمجھتا، نہ تعلیم ایسی باتوں کی کرتا ہوں نہ منکروں سے دست وگریباں ہوتا ہوں، خود کسی سے کہتا نہیں پھرتا، کوئی پوچھتا ہے اور اندیشۂ فساد نہیں ہوتا تو اظہار میں دریغ بھی نہیں کرتا آپ بھی اس امر کو ملحوظ رکھیں تو بہتر ہے فقط'' (۸)

فقہی ذوق ومزاج

الامام النانوتوی فقہی امور میں بڑا معتدل نقطہ نظر رکھتے تھے، درساً اور عملاً حنفی تھے بحث وتحقیق کی روشنی میں مذہب حنفی کو راجح سمجھتے تھے لیکن دوسرے ائمہ مسالک اور فقہی مذاہب کا پورا احترام ملحوظ رکھتے تھے، ان کی ذات تعصب اور جارحیت سے پاک تھی، اختلافی مسائل پر ان کا قلم بڑی احتیاط اور متانت کے ساتھ چلتا ہے، ان کے شاگرد رشید مولانا حکیم محمد منصور العلی مرادآبادی رقم طراز ہیں:

''عمل ان کا حنفی تھا، مگر ہر سنت کے اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے'' (۹)

نرے مقلد اور لکیر کے فقیر نہیں تھے، احکام کے دلائل اور مصالح وحکم پر گہری نظر تھی، احکام شریعت کے مدارج ومراتب سے بخوبی واقف تھے، اس لئے طبیعت ومزاج میں کافی توسع تھا، بعض مسائل میں ان کا نقطۂ نظر فقہ حنفی کے عمومی نقطۂ نظر سے مختلف تھا، دیہات میں نماز جمعہ کے مسئلہ میں ان کے یہاں عام علماء احناف کی سی شدت نہیں تھی، اس مسئلہ پر ان کا ایک مکتوب بڑا مجتہدانہ اور

---

(۸) لطائف قاسمیہ ص:۵ (۹) مذہب منصور جلد ۲ ص:۱۹۲۔

انتہائی فکر انگیز ہے، نماز جمعہ کے لئے شہر ہونے کی شرط پر انہوں نے تفصیلی کلام کیا ہے، ان کا یہ مکتوب اپنے ایک معاصر بزرگ مولانا شاہ عبد السلام ھسوی کے استفتاء کے جواب میں ہے، الامام النانوتوی نے اپنے ایک معاصر مولانا عبد السلام کو جن بلند الفاظ میں یاد کیا ہے، اس سے ان کے اخلاص، تواضع بلند اخلاقی کی پھواریں پھوٹتی ہیں، لکھتے ہیں:

''حضرت مجمع البحرین شریعت وطریقت، مخدوم ومطاع خاص وعام جناب مخدومنا مولانا سید عبد السلام صاحب دامت برکاتہ''(۱۰)

خلاصہ بحث

الامام النانوتوی کی خدمات کا اصل میدان علم کلام تھا، انہوں نے اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق نئے علم کلام کی بساط بچھائی، آریہ سماجیوں اور عیسائی پادریوں کی تشکیکات اور دسیسہ کاریوں کا مقابلہ کیا اسلام کی حقانیت عالم پر آشکارا کی، شیعی فتنہ کا علمی سطح پر بھر پور مقابلہ کیا، فقہ اسلامی کے موضوع پر ان کی تحریریں چند رسائل اور چند مکتوبات تک محدود ہیں لیکن ان کی یہ فقہی تحریریں بھی کافی قدر و قیمت کی حامل ہیں اور فقہ کے اختلافی موضوعات پر اظہار رائے کا ایک خاص معتدل و متوازن طریقہ سکھاتی ہیں۔

الامام النانوتوی نے دار العلوم دیو بند کا نصاب مرتب کرنے میں اس بات کا خیال رکھا کہ فقہ اسلامی کا رشتہ کتاب وسنت سے خوب مضبوط ہو اور اجتہادی مسائل کو کتاب وسنت پر پیش کرنے کا مزاج پیدا ہو فقہ کا علم محض جزئیات یاد کرنے تک محدود نہ رہ جائے بلکہ اجتہاد کے سرچشموں تک پہنچا جائے اور فقہ اسلامی کے کارواں کو آگے بڑھایا جائے۔

☆......☆......☆

---

(۱۰) لطائف قاسمیہ ص:۲۶۔

مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی*

دینی مدارس کا نصاب تعلیم
مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا نقطہ نظر

دینی مدارس، اشاعت علم اور حفاظت دین کے مراکز ہیں، اسلامی افکار اور دینی اقدار کے احیاء و بقاء میں ان درسگاہوں اور اُن کے بلند نگاہ فضلاء اور علماء نے جو بے مثال کردار ادا کیا ہے، وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو نگاہِ انصاف کے لیے مہر نیم روز سے کم نہیں، ان مدارس کا بنیادی مقصد دینی علوم کی اشاعت اور اسلامی اخلاق و اقدار کے حامل، صالح معاشرہ اور سماج کی تشکیل ہے، اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ اسلام کا رشتہ علم سے بہت گہرا اور مضبوط ہے، قرآن مجید کی سب سے پہلی وحی، اسی نسبت سے نازل ہوئی اور اس نے ظلمت و جہالت سے بھری دنیا میں علم کی اہمیت کو واضح کیا اور اس علم کے مراکز چونکہ دینی مدارس ہیں، علوم نبویؐ کی میراث یہیں سے تقسیم ہوتی ہے اور دین و شریعت کی رہنمائی انہی درسگاہوں سے ملتی ہے، اس لیے علم اور تعلیم کی نسبت سے ان مدارس سے ربط و تعلق اور ان کے تعلیمی و فکری سفر سے واقفیت، ہماری دینی و علمی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔

کسی بھی دانش گاہ کے لیے نظامِ تعلیم و تربیت کے ساتھ نصاب تعلیم کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے، اسی لیے ہر زمانہ میں تعلیم سے وابستہ افراد اور تعلیمی اداروں نے اس پہلو پر خصوصی توجہ دی ہے اور اس کی اثر انگیزی، زمانہ و حالات کے تقاضوں سے اس کی ہم آہنگی اور فعالیت کا جائزہ لیا جاتا رہا ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ نظامِ تعلیم میں نصابِ تعلیم کے علاوہ اساتذہ کے طریق تدریس اور درسگاہ کے عمومی تعلیمی و تربیتی ماحول کو بڑی اہمیت حاصل ہے، تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ نصاب تعلیم سے علمی و فکری جہت متعین ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ مختلف علوم و فنون میں طلبہ کی صلاحیتوں کو علمی و تحقیقی رُخ دیا جاسکتا ہے۔

---

* مقیم حال شکاگو، امریکا

نصاب تعلیم کا تعلق صرف درسگاہ اور اس میں پڑھنے اور پڑھانے والوں سے نہیں، بلکہ اس کا ربط اس زندگی سے ہے، جو ہمہ وقت رواں، دواں اور ہر آن تغیر پذیر ہے اور زندگی کے ان تقاضوں سے ہے، جو حالات اور زمانہ کی حکمت و مصلحت کے زیر اثر بدلتے رہتے ہیں، انبیائی دعوت اور پیغمبرانہ معجزات میں بھی زمانہ کے تقاضوں کی بھرپور رعایت ہوتی ہے، غور کیجئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سحر اور جادوگری کا فن عروج پر تھا، اسی مناسبت سے "عصاء موسوی" کو معجزانہ حیثیت حاصل ہوئی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں طب و علاج اور میڈیکل سائنس ترقی پذیر تھی، اس لحاظ سے حضرت عیسیٰ کو مطابق حال و زمانہ وہ معجزات دیئے گئے، جن سے آیت ربانی کا ظہور ہوا، نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں زبان و قلم اور عربوں کی فصاحت و بلاغت کا غلبہ تھا، چنانچہ "قرآن مبین" کو "عربی مبین" میں اتارا گیا اور دنیا قرآن مجید کے علمی و معنوی اعجاز اور اس کے کلام و بلاغت کا مقابلہ کرنے سے عاجز رہی، بلکہ حقیقت پسند عربوں نے تو اعتراف بھی کیا کہ :ماھذا قول البشر یہ انسانی کلام نہیں، ربانی کلام ہے، پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ پیغمبروں کی دعوت میں بھی حالات زمانہ کی اتنی رعایت ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی مزاجی خصوصیات، نفسیات اور عادات واطوار کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتے ہیں اور قرآن مجید میں اس کی بہ کثرت مثالیں ملتی ہیں۔ یہ وہ حقائق ہیں جن سے ہر وہ شخص واقف ہے، جو نبیوں کی دعوت کے اسلوب سے واقفیت رکھتا ہو، ایک طرف نبیؑ کا رشتہ اپنے رب سے ہوتا ہے، تو دوسری طرف اس کی نگاہ زمانہ کے احوال پر ہوتی ہے، وہ وقت کے تیور کو پہچانتا اور حالات کی نبض تھامتا ہے اور اپنی نگاہ حق شناس اور دل حکمت آشنا سے عصری تقاضوں کو محسوس کرتا ہے، پھر اپنی قوم کے سامنے "علم الٰہی" کی وہ قیمتی متاع رکھتا ہے جس سے قوم اپنے درد دل کا علاج اور اپنی ضروریات کا نسخۂ کیمیا پائے، انبیائی دعوت کے اس تذکرہ سے مقصود یہ ہے کہ ہماری درسگاہیں جب علوم نبویؐ کی محافظ و امین ہیں اور علماء میراث نبوت کے وارث ہیں، تو ان درسگاہوں کو بھی پیغمبروں ہی کی طرح اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے آگاہ اور ان سے وابستہ علماء کو زمانہ شناس اور روشن دماغ ہونا چاہیے۔

نصاب تعلیم کی اہمیت و افادیت اور اس میں تقاضائے زمانہ کی رعایت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اپنے ایک خطاب میں فرمایا تھا:

''نصاب تعلیم کے سلسلہ میں ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں، آغاز اسلام سے لے کر اس وقت تک نظام تعلیم پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ منہاج تدریس و تعلیم میں وقت کے تقاضوں اور زمانہ کی ضرورتوں کا ہمیشہ لحاظ رکھا گیا ہے، علماء سلف وقت کے سب سے بڑے نبض شناس تھے، ہر زمانہ میں اسلام کی خدمت اور امت محمدیہ کے فلاح دارین کے پیش نظر انھوں نے اپنے نصاب تعلیم میں تغیر و ترمیم کی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو عبرانی زبان سیکھنے کا حکم دیا، کیونکہ یہودیوں، عیسائیوں اور دوسری غیر مسلم قوموں سے مراسلات اور معاہدوں کے سلسلہ میں عربی زبان کے علاوہ دوسری زبان اور دوسرے رسم الخط جاننے کی ضرورت پڑتی تھی، آپؐ نے ایک مرتبہ خطوط و معاہدوں کے باب میں عیسائیوں اور یہود کے متعلق خطرہ ظاہر فرمایا کہ یہ کہیں ان میں تغیر و تبدل نہ کردیں، اسی طرح ایک مرتبہ تورات کے ایک حکم کو ایک یہودی عالم نے آپ کے سامنے اپنے ہاتھ سے چھپانے کی کوشش کی، تو آپؐ نے فرمایا کہ عبرانی زبان سیکھ لو، تاکہ یہ دین کے معاملہ میں مسلمانوں کو فریب نہ دے سکیں، خود صحابۂ کرام نے عبرانی و سریانی اور دوسری زبانیں سیکھی تھیں۔

ہر زمانہ میں علماء اسلام نے دینی علوم کے علاوہ دوسرے علوم سیکھے تھے۔ عہد عباسی میں جب منطق و فلسفہ اور طب و نجوم کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا اور مختلف عقائد رکھنے والی قوموں نے اسلام قبول کیا تو دشمنانِ اسلام اور نومسلم قوموں کے بعض ذہین افراد، اسلامی عقائد پر فلسفیانہ اعتراض کرنے لگے، مسلمانوں نے ان جدید علوم کو پڑھ کر اسی ہتھیار سے عقائد اسلام کی مدافعت شروع کردی اور اس طرح علم کلام کی بنیاد پڑی اور اس زمانہ سے لے کر آج تک منطق و فلسفہ اور علم کلام ہمارے نصاب تعلیم کا جز بن گئے۔

علماء سلف کی روشن دماغی، زمانہ شناسی اور وقت کے تقاضوں سے کامل واقفیت کی اس سے بہتر دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ یونانی منطق اور یونانی علم الاصنام (میتھالوجی) کو جسے ہمارے قدیم مدرسوں میں فلسفہ کہا جاتا ہے، دینی درسگاہوں کے نصاب تعلیم میں داخل کیا، بلاشبہ اس زمانہ میں اسلام کی خدمت کا تقاضا تھا۔ اب عقائد اسلام پر نہ وہ اعتراضات وارد کئے جاتے ہیں، نہ ان کے جوابات کی ضرورت باقی رہی، نہ آج وہ فرقے باقی ہیں، نہ ان کا ذور وشور ہے، نہ ان کے

عقائد کی اشاعت کا اب خطرہ باقی ہے، اب جدید علم کلام کی ترتیب کی ضرورت ہے، اب سیاسیات واقتصادیات کی راہ سے اسلام پر جو اعتراض کیا جارہا ہے، اس کے رد کرنے کی ضرورت ہے''۔(۱)

کسی بھی درسگاہ کے نصاب تعلیم کی ترتیب میں دقت نظری اور دور بینی کی ضرورت ہوتی ہے اور اس سلسلہ میں معمولی چوک اور غفلت سے نہایت مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہ اس قدر نازک ذمہ داری ہے کہ اس نصاب کو پڑھنے والی پوری نسل کے ذہنی ارتقاء اور فکری تعمیر کا دارومدار اسی پر ہے، چنانچہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ نے نصاب تعلیم پر اظہار خیال کرتے ہوئے بجا طور پر یہ تبصرہ فرمایا:

''نصاب تعلیم کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے، جس پر رواداری کے ساتھ کوئی رائے قائم کرلی جائے، یا کسی عجلت اور جذباتیت کے ساتھ فیصلہ صادر کردیا جائے۔ یہ بڑی ذمہ داری کا کام ہے، نہ اس کو معصوم قرار دینا صحیح ہے، نہ اس کو کاملاً ناقص اور قابل ترک ثابت کرنا آسان ہے، حقیقت میں نصاب تعلیم کسی قوم کے فکری ارتقاء، اس کے علمی تجربوں، اس کے طریق فکر اور اس کی ذہنی صلاحیت کی ہانڈی کا سرجوش ہوا کرتا ہے، نصاب تعلیم کسی قوم کے مطالعہ، اس کی فکری سطح اور اس کی ذہنی صلاحیت کا نقطۂ عروج ہوتا ہے، اس لیے کسی نصاب تعلیم پر اس قوم کے علمی تجربوں، اس ملت کی علمی نمائندگی کرنے والے گروہ کی نفسیات اور اس ملک کے ماحول سے الگ کرکے غور نہیں کیا جاسکتا، نصاب تعلیم اس ماحول کا علمی اظہار ہوتا ہے، نصاب تعلیم کا بھی ایک ضمیر ہوتا ہے اور اس کی ایک روح ہوتی ہے، جو اس کے پورے جسم میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے، نصاب تعلیم کچھ بے جوڑ چیزوں کو جمع کردینے اور پڑھائی جانے والی چند کتابوں کے بے جان مجموعہ کا نام نہیں، نصاب تعلیم کسی ملت، یا کسی علمی گروہ کی اپنی ضروریات کے احساس، اپنے زمانہ کے تقاضوں کے سمجھنے اور پچھلے تجربوں سے فائدہ اٹھانے کا ماحصل ہوتا ہے۔''

مولانا حکیم سید عبدالحئیؒ لکھنویؒ (سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے ہندوستان کے نصاب درس اور اس کے تغیرات کا باریک بینی اور دقت نظری کے ساتھ علمی اور تاریخی جائزہ لیا ہے اور قدیم

---

(۱) تعمیر حیات ۲۵/مارچ و ۲۵/اپریل ۱۹۸۴ء

ہندوستانی نصاب کے چار ادوار قرار دیئے ہیں:

دورِاول: اس کا آغاز ساتویں صدی ہجری سے سمجھنا چاہیے اور انجام دسویں صدی پر اس وقت ہوا جب کہ دوسرا دور شروع ہو گیا تھا، کم وبیش دوسو برس تک مندرجہ ذیل فنون کی تحصیل معیارِ فضیلت سمجھی جاتی تھی، صرف، نحو، بلاغت، فقہ، اصول فقہ، منطق، کلام، تصوف، تفسیر، حدیث، فقہ میں ہدایہ، اصول فقہ میں منار اور اس کے شروح اور اصول بزدوی، تفسیر میں مدارک، بیضاوی اور کشاف، حدیث میں مشارق الانوار اور مصابیح السنۃ (یعنی مشکوۃ المصابیح کا متن) ادب میں مقامات حریری، جو زبانی یاد کی جاتی تھی، اُس زمانہ میں فقہ اور اصول فقہ معیار فضیلت تھا، حدیث میں صرف مشارق الانوار کا پڑھ لینا کافی سمجھا جاتا تھا اور جس خوش نصیب کو مصابیح ہاتھ آجاتی تھی وہ ''امام الدنیا فی الحدیث'' کے لقب کا مستحق ہو جاتا تھا۔

دورِدوم: نویں صدی ہجری کے آخر میں شیخ عبداللہ اور شیخ عزیز اللہ نے سابقہ معیار فضیلت کو کسی قدر بلند کرنے کے لیے قاضی عضد کی تصانیف مطالع ومواقف اور سکاکی کی ''مفتاح العلوم'' نصاب میں داخل کیں اور بہت جلد یہ کتابیں متداول ہو گئیں، یعنی دوراول میں جو کتابیں تھیں، اس میں اس دور کی مذکورہ بالا کتابیں یعنی مطالع ومواقف اور ان کی شرحیں، مطول، مختصر، تلویح، شرح عقائد، شرح وقایہ، شرح جامی کا اضافہ کر لینے سے دورِدوم کے نصاب کی فہرست بہ آسانی مرتب ہو جاتی ہے۔

دورِسوم: دورِدوم کے نصاب درس میں جو تغیر ہوا تھا، اس سے لوگوں کی امنگیں بڑھ گئی تھیں اور وہ معیار فضیلت کو اس سے بھی زیادہ بلند کرنے کے متمنی ہو گئے تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (متوفی ۱۱۷۴ھ) جو اس دور کے سب سے آخر مگر سب سے زیادہ نامور عالم تھے نے درسیات میں مفید اضافہ کیا، شاہ صاحب اور ان کے اخلاف نے صحاح ستہ کے درس وتدریس کو اپنی سعی وکوشش سے جزو نصاب بنایا۔ شاہ صاحب نے اپنی طرز کا ایک جدید نصاب بنایا تھا، مگر چونکہ اس زمانہ میں علم کا مرکز ثقل دہلی سے لکھنؤ کو منتقل ہو چکا تھا اور تمام درسگاہوں میں منطق وحکمت کی چاشنی سے لوگوں کے کان وزبان آشنا ہو رہے تھے، نیز ہمایوں اور اکبر کے زمانہ میں ایران سے جو نیا تعلق ہوا تھا، اس نے بتدریج ہندوستان کے علمی مذاق میں ایک جدید تغیر پیدا کر دیا تھا۔ مغل دربار کے ایرانی علماء اور امراء کے ذریعہ منطق اور فلسفہ کو جو شروع ہی سے ایران میں معیار فضیلت سمجھے جاتے تھے، آہستہ آہستہ دوسرے علوم پر فوقیت

حاصل ہوتی جاتی تھی، اس لیے شاہ صاحب کے نصاب کو قبول عام حاصل نہ ہو سکا۔

دورِ چہارم: چوتھا دور بارہویں صدی ہجری میں قائم ہوا۔ اس نصاب کے بانی ملا نظام الدین سہالوی لکھنوی تھے، یہ شاہ صاحب کے ہم عصر تھے، لہٰذا ان کے زمانہ میں وہی کتابیں رائج تھیں جو شاہ صاحب کے نصاب درس میں تھیں۔ درس نظامی کے نام سے جو نصاب آج تمام مدارس عربیہ میں رائج ہے، وہ انہی کی یادگار ہے۔ انھوں نے تمام ہی فنون میں اضافے کیے، اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں امعان نظر اور قوت مطالعہ کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ طلبہ میں قوت مطالعہ، دقت نظر، احتمال آفرینی اور قوت قریبہ پیدا ہو جاتی ہے۔ (۲)

تیرہویں صدی ہجری کے وسط میں ہندوستان میں علم کے تین مراکز فکر قائم تھے۔ دہلی، لکھنؤ اور خیر آباد۔ گو نصاب تعلیم تینوں کا قدرے مشترک تھا، تاہم تینوں کے نقطہائے نظر مختلف تھے۔ دہلی میں تفسیر وحدیث پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کا خاندان کتاب وسنت کی نشر واشاعت اور تعلیم وتدریس میں ہمہ تن مشغول تھا۔ علوم معقولہ کی حیثیت ثانوی درجہ کی تھی۔ لکھنؤ میں علماء فرنگی محل پر ماوراء النہر کا ساتویں صدی والا قدیم رنگ چھایا ہوا تھا، فقہ اور اصول فقہ کو ان کے یہاں سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، تفسیر میں جلالین و بیضاوی اور حدیثؐ میں صرف مشکوۃ المصابیح کافی سمجھی جاتی تھی۔ خیر آباد مرکز کا علمی موضوع صرف منطق وفلسفہ تھا اور یہ علوم اس قدر اہتمام کے ساتھ پڑھائے جاتے تھے کہ جملہ علوم کی تعلیم ان کے سامنے ماند پڑ گئی تھی۔

دارالعلوم دیوبند جسے گزشتہ صدی سے ام المدارس کی حیثیت حاصل ہے نے ان علوم کی عظمت کو نہ صرف باقی رکھا، بلکہ ان کو ترقی دینے میں اس نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے، اس کے نصاب تعلیم میں ان تینوں مقامات کی خصوصیات کو جمع کر دیا گیا اور ان کے امتزاج سے جو نصاب تیار ہوا ہے وہی نصاب بالعموم مدارس عربیہ میں زیر درس ہے، بعض مدارس نے اپنے علاقے کے تقاضوں کے مطابق بعض فنون میں مفید کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔

دینی مدارس کے نصاب تعلیم کے بارے میں جہاں تک تعلق حضرت نانوتویؒ کی فکر کا ہے، تو جس طرح حضرت نانوتویؒ اپنے علم میں وسعت اور گہرائی رکھتے تھے، اسی طرح نصاب تعلیم کے

---

(۲) ملخصاً از رسالہ 'ہندوستان کا نصاب درس' از مولانا حکیم سید عبدالحیؒ، مطبوعہ شعبۂ تعمیر وترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

بارے میں بھی وہ وسیع الفکر اور فراخ چشم تھے، نصاب تعلیم کے سلسلہ میں حضرت نانوتویؒ کی وہ تقریر، جو انھوں نے ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کے جلسہ ''اعطاء اسناد و انعام'' میں کی تھی، نہایت اہم ہے اور اس سے ان کا نقطۂ نگاہ معلوم ہوتا ہے، ان کی وہ تقریر تاریخ دارالعلوم دیوبند (جلد اصفحہ: ۱۶۹) پر موجود ہے، آپ اگر مولانا نانوتویؒ کی اس تقریر پر ایک نظر ڈالیں تو یقیناً محسوس کریں گے کہ وہ حقائق ومعارف سے لبریز ہے اور اس کے لفظ لفظ سے ان کی جہاں بینی، باخبری، روشن دماغی، مومنانہ فراست، دینی غیرت اور اسلامی حمیت کے ساتھ اسلامی معاشرت، اسلامی تہذیب، علوم دینیہ اور مقاصد شریعت کے تحفظ کا جذبہ ظاہر ہوتا ہے، اپنے وقت کے حالات اور تقاضوں کے پس منظر میں طلبہ ونوجوانوں کو مغربی فکر وتہذیب کی یلغار سے بچانے اور ان کے قلب ونظر کو مومنانہ اور داعیانہ روح سے بھرنے کے لیے انھوں نے ایک ایسے نصاب کو اختیار فرمایا، جس سے طلبہ میں علمی رسوخ، فقہی بصیرت، ذوق حدیث اور فہم قرآن کے ساتھ ساتھ تمام علوم دین وشریعت میں گہرائی پیدا ہو اور وہ دین کی اشاعت اور اسلام کی حفاظت، دونوں محاذوں پر اولوالعزمی، حوصلہ مندی اور خود اعتمادی کے ساتھ مصروف عمل رہ سکیں۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ سابق صدر شعبۂ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، جنھیں فکر قاسمی کا شارح وترجمان کہا جاسکتا ہے، نے ''سوانح قاسمی'' میں حضرت نانوتویؒ کی اس تقریر کو نقل فرمایا ہے اور اس کے ہر ہر جملہ کی دل نشیں تشریح بھی فرمائی ہے اور اپنے قیمتی تبصرہ اور منفرد اسلوب تحریر سے اس تقریر کی معنویت اور اہمیت کو اجاگر کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس کے کچھ حصے آپ کے سامنے پیش کروں، تاکہ مولانا گیلانی کی وساطت سے مولانا نانوتوی کی نصاب تعلیم کے بارے میں جو فکر تھی، اس سے ہم واقف ہوسکیں۔

دینی درسگاہوں میں جدید وقدیم علوم کا امتزاج کیوں اور کیسے ہو؟ یہ ایک مستقل موضوع بحث ہے، مولانا نانوتویؒ نے اپنی تقریر میں اس بات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> ''اب ہم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جس سے معلوم ہوجائے کہ درباب تحصیل یہ طریقہ خاص کیوں تجویز کیا گیا اور علوم جدیدہ کو کیوں شامل نہیں کیا گیا؟''

مولانا گیلانی نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سب سے پہلی بات تو صرف اسی سوال سے یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جدید علوم وفنون کے سوال سے، جو یہ باور کرلیا گیا ہے اور اب بھی یہ باور کرایا جاتا ہے کہ ہمارے علماء قطعاً خالی الذہن تھے، افتراء یا اتہام کے سوا وہ کچھ نہیں، کم از کم دیو بندی حلقہ کے علماء کی ذمہ دار ہستیوں کا دامن تنگ خیالی اور جمود کے اس داغ سے پاک تھا۔ اس کے لیے تو یہی کافی ہے کہ اس طبقہ کے سب بڑے پیشوا سیدنا الامام الکبیر (حضرت نانوتویؒ) کے سامنے یہی نہیں کہ صرف سوال ہی تھا، بلکہ جو جواب اس سوال کا دیا گیا ہے، اسے سنئے اور انصاف سے کہئے کہ تقریباً ایک صدی پہلے حضرت والا کا ذہن جن اشتباہی پہلوؤں کو چاک کر کے نتیجہ تک پہنچ چکا تھا، کیا اس وقت تک فراخ چشمیوں کے مدعیوں کا گروہ وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہے؟''

حضرت نانوتویؒ نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''من جملہ دیگر اسباب کے بڑا سبب اس بات کا تو یہ ہے کہ تربیت عام ہو یا خاص، اس پہلو کا لحاظ چاہیے، جس کی طرف سے ان کے کمال میں رخنہ پڑا ہو۔''

مولانا گیلانیؒ نے اس کی وضاحت یوں فرمائی ہے:

''مطلب یہ ہے کہ افراد ہوں یا جماعتیں، ان کے اٹھان اور جن کمالات تک ان کو پہنچانا مقصود ہو، سب سے پہلے توجہ کے مستحق اس سلسلہ میں وہی معاملات ہوتے ہیں بلکہ چاہیے کہ وہی ہوں، جو سب سے پہلے زیادہ کسمپرسی اور لاپرواہی کا شکار ہو چکے ہوں، جس زمانہ میں یہ تقریر ہو رہی تھی، اس وقت تعلیمی راہ سے مسلمانانِ ہند کی تربیت واصلاح کے مسئلہ کی نوعیت مذکورہ اصول کی روشنی میں کیا ہونی چاہیے۔ اسی کا جواب دیتے ہوئے پہلا فقرہ یہ فرمایا گیا تھا:

''سو اہل عقل پر روشن ہے کہ آج کل تعلیم علوم جدیدہ تو بوجہ کثرت مدارس سرکاری اس ترقی پر ہے کہ علوم قدیمہ کو سلاطین کے زمانہ سابق میں بھی یہ ترقی نہ ہوئی ہوگی''۔

اس جملہ کا مطلب جیسا کہ ظاہر ہے یہی تھا کہ نہ علوم جدیدہ کی افادیت ہی کے آپ منکر تھے اور نہ آپ کا یہ خیال تھا کہ مسلمانوں کو ان علوم وفنون سے الگ تھلگ رہنا چاہیے، جن سے ملک کو نئی قائم ہونے والی حکومت نے روشناس کرایا ہے، توجہ صرف اس پر دلائی گئی کہ خود حکومت کی طرف سے جن علوم وفنون کے پڑھنے اور پڑھانے کا نظم وسیع پیمانے پر کیا جا چکا ہے اور آئندہ کیا جائے، اور کیسا

وسیع نظم؟ کہ بقول حضرت والا (مولانا گیلانی) اتنی سرپرستی قدیم علوم اور اسلامی فنون کو گزشتہ سلاطین اور مسلمان بادشاہوں کی طرف سے بھی کبھی میسر نہیں آئی تھی۔

علوم جدیدہ کی اشاعت وترقی کے اس تذکرہ کے بعد ارشاد ہوا کہ:

''ہاں! علوم نقلیہ یعنی خالص دینی واسلامی علوم کا یہ تنزل ہوا کہ ایسا بھی کسی کارخانہ میں نہ ہوا گا''

دونوں علوم کی تصویر واقعی پیش کرنے کے بعد مولانا نانوتویؒ فرماتے ہیں:

''ایسے وقت میں رعایا کو مدارس علوم جدیدہ کا بنانا، تحصیل حاصل نظر آیا''

حضرت نانوتویؒ کا خیال یہ تھا کہ مسلمان جس علم سے محروم رہ جانے کے بعد مسلمان باقی نہیں رہ سکتے اور نئی حکومت اپنے خاص حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے ان علوم کی سرپرستی سے صرف دستبردار ہی نہیں ہوگئی ہے، بلکہ واقعات بتارہے تھے کہ نئی حکومت کے پیدا کیے ہوئے ماحول میں زبونی کے آخری حدود تک وہ پہنچ چکے ہیں، ان علوم کے احیاء وبقاء کا انتظام رعایا کی مالی امداد سے کیا جائے اور یہی مطلب ہے ان الفاظ کا جو آگے اسی تقریر میں پائے جاتے ہیں (یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب میں) اسی لئے ارشاد ہوا کہ:

''صرف بجانب علوم نقلی (یعنی خالص اسلامی و دینی) اور نیز ان علوم کی طرف جن سے استعداد علوم مروجہ اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہوتی ہے (انعطاف) ضروری سمجھا گیا''۔

مولانا گیلانیؒ کی تشریح ملاحظہ فرمائیے:

''آپ دیکھ رہے ہیں دارالعلوم کے نصاب میں خالص دینی واسلامی علوم (قرآن وحدیث وفقہ وغیرہ) کے ساتھ ساتھ عقلی وذہنی فنون کی شرکت کی توجیہ کرتے ہوئے حضرت والا نے جہاں اس عام اور مشہور غرض کا تذکرہ فرمایا ہے، یعنی مسلمانوں کے ''علوم مروجہ'' کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، قیل وقال، جواب وسوال سے فکری ورزش کرا کے طلبہ میں دقیقہ سنجیوں، موشگافیوں کے ملکہ کو ابھارا جاتا ہے ''استعداد علوم مروجہ'' سے یہی مراد ہے، اس سلسلہ میں پھر حضرت نانوتویؒ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

''اور استعداد علوم جدیدہ یقیناً حاصل ہو جاتی ہے''

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ دارالعلوم کے مروجہ نصاب میں حضرت والا یہ

سمجھانا چاہتے ہیں، ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس نصاب کو پڑھ کر فارغ ہونے والوں میں ''علوم جدیدہ'' کے حاصل کرنے کی بھی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، گویا علوم جدیدہ کی تعلیم کا مقدمہ بھی دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نصاب بن سکتا ہے اور چاہا جائے تو اس سے یہ کام بھی لیا جا سکتا ہے''۔

چنانچہ آج تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ ہمارے فضلاء اپنی تعلیم سے فراغت کے بعد دین کی خدمت اور اسلام کی اشاعت کے نقطۂ نظر ہی سے جب دوسرے علوم حاصل کرتے ہیں تو ان میں اتنی لیاقت ہوتی ہے کہ اس میدان میں بھی وہ فائق رہتے ہیں۔

جدید تعلیم کے حصول سے حضرت نانوتویؒ نے منع نہیں فرمایا اور کیسے منع کرتے وہ تو باخبر، زمانہ شناس اور صاحب بصیرت عالم تھے اور تقاضائے زمانہ سے آگاہ تھے، بلکہ ایک گونہ ترغیب بھی دلائی، مگر یہ بات مخفی نہ رہے کہ مولانا چاہتے تھے کہ طلبہ جدید علوم سے اسلام کی خدمت کریں اور دین اور کارِ دین سے خود کو وابستہ رکھیں، انھوں نے فرمایا:

''اس کے بعد یعنی دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلبہ مدرسہ ہذا مدارس سرکاری میں جا کر علوم جدیدہ کو حاصل کریں، تو ان کے کمال میں یہ بات زیادہ مؤید ثابت ہوگی''

مولانا گیلانی کے مخصوص طرزِ تحریر کا لطف اٹھاتے ہوئے ان کا یہ تبصرہ ملاحظہ فرمایئے:

''ذرا سوچئے کہ غم وغصہ، بے زاری اور دل افگاری کے ان ایام کو جن میں مسلمانوں کو ہندوستان جیسے اقلیم کی شہنشاہیت سے محروم کر کے غلام بنالیا گیا تھا، جو آسمانوں پر تھے، زمین پر پٹک دیئے گئے تھے، ان کے قلوب میں جیسا کہ چاہیے تھا، قدرتاً اس قوم کی طرف سے انتقام اور نفرت کی آگ بھری ہوئی ہو، جس کے ہاتھوں اس سیاہ انجام تک وہ پہنچے تھے، ہر وہ چیز جو اس قوم کی طرف منسوب تھی، مسلمان فطرتاً اس سے بھڑکتے تھے، اسی مسموم فضاء اور غلط فہمیوں سے بھرے ہوئے ماحول میں سیدنا الامام الکبیر یہی نہیں کہ انگریزی مدارس میں داخل ہو کر تعلیم پانے کے جواز ہی کا فتویٰ دے رہے ہیں، بلکہ بغیر کسی جھجک کے مولویوں کی بھری ہوئی مجلس میں اعلان فرما رہے ہیں کہ سرکاری مدارس میں شریک ہو کر علوم جدیدہ کی تعلیم، علمی کمالات کے چمکانے اور آگے بڑھانے میں مولویوں (علماء) کے لیے مفید ثابت ہوگی، اللہ اللہ! ایک طرف اسی زمانہ میں

مولویوں کا ایک طبقہ تھا، بلکہ ان کی اکثریت یہ سمجھ بیٹھی تھی کہ جو کچھ انھوں نے پڑھ لیا ہے، اس کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی ہے نہیں جسے سیکھا جائے اور پڑھا جائے، ان ہی علماء کے درمیان پکارنے والا پکار رہا ہے کہ مولویوں میں اپنے علمی کمالات میں جو مزید فروغ اور زیادہ وزن پیدا کرنا چاہے، چاہیے کہ یوروپ کے جدید علوم وفنون کا مطالعہ کرے، ان کی علمی زبانوں کو سیکھے، جو سرکاری مدارس (عصری درسگاہوں) میں سکھائی جاتی ہیں، یوروپ کے جدید علوم وفنون کی اہمیت وضرورت کا انکار جسے اس زمانہ میں ہمارے علماء نے اپنا پیشہ بنا رکھا تھا، دیوبندی نظام تعلیم کے امام اول واکبر نے ٹھیک وقت پر ان جدید عصری علوم کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کر لیا تھا۔

گویا حضرت نانوتویؒ قدیم وجدید دونوں علوم حاصل کرنے کی فکر رکھتے تھے، لیکن جدید وقدیم علوم کا مشترک نصاب دارالعلوم میں کیوں نہیں جاری کیا گیا تو اس کا جواب انھوں نے اس طرح دیا ہے:

''زمانہ واحد میں علوم کثیرہ کی تحصیل، سب علوم کے حق میں باعث نقصان استعداد رہتی ہے''۔

ظاہر ہے کہ اسلامی ودینی علوم کی صحیح بصیرت حاصل کرنے کے لیے جن فنون کی تعلیم بطور مقدمہ دی جاتی ہے، صرف ونحو، ادب، معانی وبیان، اصول فقہ، کلام اور علوم دانش مندی جن سے ذہنی ورزش کا کام لیا جاتا ہے، ان سب کے مختصر ترین نصاب کے لیے بھی اتنی کتابوں کی ضرورت ہے کہ ان کے ساتھ علوم جدیدہ کی کتابوں کی گنجائش بہ مشکل نکل سکتی ہے اور اس بوجھ کے نتیجہ میں صحیح استعداد طلبہ میں پیدا نہیں ہو سکتی۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے گویا جدید علوم کی تعلیم کی افادیت کے اعتراف کے ساتھ دینی مدارس میں مشترکہ طور پر ان علوم کی تدریس کو خارج از بحث قرار دیا، زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ عربی مدارس سے فراغت کے بعد عصری درسگاہوں میں تعلیم حاصل کریں یا عصری علوم کی تکمیل کے بعد دینی مدارس میں آئیں، لیکن دونوں کی مخلوط تعلیم کار دانش مندی نہیں ہے، یہ بات انگریزی اور عصری علوم کی تعلیم سے نفرت اور بے زاری کی وجہ سے نہیں، بلکہ دینی واسلامی علوم میں خامی کے اندیشہ سے آپ نے یہ فیصلہ فرمایا اور صاف طور پر کہہ دیا کہ جنھیں علوم جدیدہ حاصل کرنے ہیں وہ وہاں جائیں۔

درس نظامی کے تدریسی حلقوں میں فلسفہ کے نام سے جو کچھ پڑھایا جاتا تھا، اس پر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اپنے خط کے ذریعہ توجہ دلائی کہ وہ قطعی طور پر مردہ ہو چکا ہے، اس واقعہ کا تذکرہ

کرتے ہوئے مولانا گیلانی تحریر فرماتے ہیں:

''لیکن ہمارے علماء محض موروثی روایات کے زیر اثر اسی مرحوم و مدفون فلسفہ کی کتابیں پڑھاتے چلے آرہے تھے،.... دین کے لئے فلسفہ کے مطالعہ کی ضرورت صرف اس لیے ہوتی ہے کہ فلسفہ کی راہ سے خام عقلوں کو جن مغالطوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے، ان کا ازالہ کیا جائے، اس لحاظ سے بجائے اس مسترد اور مردہ فلسفہ کے کچھ ضرورت تھی تو اس بات کی کہ اس زمانہ میں ''فلسفہ'' کے نام سے جن خیالات کو حسن قبول حاصل ہو رہا تھا جو ظاہر ہے کہ مغرب کا جدید فلسفہ ہی ہو سکتا تھا، لیکن اس کی طرف نظامی درس کے معقولی علماء نگاہ غلط انداز بھی ڈالنا پسند نہیں کرتے تھے، سیدنا الامام الکبیر قدیم علوم کا جدید علوم سے جو رشتہ قائم کرنا چاہتے تھے، حضرت والا کے منشاء کے مطابق یہ رشتہ اگر قائم ہو جاتا تو بجائے اس مردہ فلسفہ کے، یورپ کے جدید فلسفہ کے مطالعہ کا موقع ہمارے علماء کے لیے بآسانی میسر آسکتا تھا''

راقم سطور اس موقع پر اس حقیقت کا اظہار کرنا مناسب سمجھتا ہے اور اب طبقۂ علما میں اس کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے کہ اسلام کی تبلیغ و دعوت ہی کے نقطۂ نظر سے انگریزی زبان اور اپنے علاقہ کے اعتبار سے جو زیادہ رائج زبان ہو، انھیں سیکھیں، علما اگر اس طرح کی زبانوں اور بنیادی عصری معلومات سے ناواقف ہوں تو وہ صحیح طور پر دین کی خدمت اور خصوصیت کے ساتھ انگریزی داں طبقہ، جو پوری دنیا میں بہت بڑی تعداد پر مشتمل ہے، کو دین کی طرف دعوت دینے کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے، یہی نہیں بلکہ ان زبانوں میں پھیلائی جانے والی بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کی انہیں خبر تک نہیں ہوتی، ہم جو کچھ اردو زبان میں پڑھتے اور حسب توفیق و موقع لکھتے ہیں اور ہماری یہ تحریریں ملکی و بین الاقوامی رسائل و اخبارات میں شائع ہوتی ہیں، شاید آپ بھی اس سے یقیناً اتفاق کریں گے کہ ان اردو رسائل و اخبارات میں شائع ہونے والی تحریروں کو پڑھنے والے مسلمان کم اور انتہائی کم ہوتے ہیں، کام جو کچھ ہو رہا ہے، اس کے فوائد و اثرات کا مجھے پورا اعتراف ہے، لیکن جو بات میں -قدردانی اور اعتراف کے جذبات کے ساتھ- عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی ''خوش فہمی کے خول'' سے باہر نکل کر اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ مسلم دنیا کا کتنا بڑا طبقہ وہ ہے جو بدقسمتی سے اردو زبان سے ناآشنا ہے اور اس طبقہ تک ہم اپنی بات اور دینی دعوت و پیام پہنچانے سے قاصر

ہیں ـــــ نئی نسل جس نے اقتصادی ومعاشی تقاضوں کے پیش نظر انگریزی اور دیگر زبانوں کو رابطہ کی زبان کی حیثیت دی ہے، یا دوسری قومیں جب اسلام کا مطالعہ کرنا چاہتی ہیں، تو اسی زبان کے لٹریچر پڑھتی ہیں، جو اکثر مستشرقین اور اسلام دشمن مصنفین کی ہوتی ہیں اور اسلام کے بارے میں ان کے دل میں نفرت کی تخم ریزی کی جاتی ہے، اس طرح بہت سے دکھے ہوئے بے چین اور مضطرب دل ودماغ تلاش حق میں اسلام کی طرف بڑھتے ہیں، مگر سوائے بدگمانی اور نفرت کے انھیں کچھ ہاتھ نہیں آتا، ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ اس میں بڑی حد تک ہماری غفلت اور کوتاہی کو دخل ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ طبقۂ علما نے دین کی بڑی وقیع اور قابل قدر وشکر خدمت انجام دی ہیں اور ان کے فیوض وبرکات سے ایک عالم مستفیض ہورہا ہے، مگر اس پہلو سے غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مدارس کے فضلاء انگریزی زبان اور دوسری علاقائی زبانوں میں مہارت پیدا کر کے خدمتِ دین کے لیے میدان میں آئیں تو ایک زبردست انقلاب برپا ہوسکتا ہے اور علماء کا علمی وروحانی فیض دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل سکتا ہے، علما جدید چیلنج کے مقابلہ کے لئے اگر ان بین الاقوامی زبانوں پر نظر رکھیں، بے تکلف اسلام کے ناقدین کو پڑھیں اور جدید حلقہ میں داعیانہ کردار صحیح طور پر ادا کرسکیں تو یہ وقت کے اہم تقاضے کی تکمیل ہوگی، اس سلسلے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا اسوہ ہمارے سامنے موجود ہے کہ وہ چھ زبانوں کے ماہر تھے اور قرآن حکیم کی آیت: وما أرسلنا من رسول الا بلسان قومه کا مفہوم اور تقاضا بھی تو یہی ہے۔

مولانا گیلانی نے اپنی معروف کتاب ''ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت'' میں بڑی تفصیل کے ساتھ وہ واقعات نقل فرمائے ہیں، جن سے ہمارے اکابر علماء کی دیگر زبانوں سے دلچسپی معلوم ہوتی ہے، آپ ان واقعات کو ان کی مذکورہ کتاب میں پڑھیں، تاہم سیمینار کے موضوع کی مناسبت سے حجۃ الاسلام حضرت نانوتویؒ کا ایک واقعہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں، یقیناً اس میں ہم سب کے لئے عبرت کی مایہ اور نصیحت کا سامان ہے، مولانا گیلانیؒ لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلہ کی ایک دلچسپ بات وہ ہے جسے براہ راست اس فقیر نے مولانا حافظ محمد احمد مرحوم سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند سے سنی تھی، اپنے والد مرحوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کے متعلق یہ قصہ بیان کرتے تھے کہ آخری حج میں جب جارہے تھے تو کپتان

نے جو غالباً کوئی اٹالین (اٹلی کا باشندہ) تھا، عام مسلمانوں کے اس رجحان کو جسے مولانا کے ساتھ عموماً وہ دیکھ رہا تھا، یہ دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں، حجاج میں کوئی انگریزی جاننے والے مسلمان بھی تھے انھوں نے کپتان سے مولانا کے احوال بیان کیے، اس نے ملنے کی خواہش ظاہر کی، مولانا بہ خوشی کپتان سے ملے، کپتان نے اجازت چاہی کہ کیا مذہبی مسائل پر گفتگو کرسکتا ہوں، مولانا نے اسے بھی منظور فرمالیا، وہی انگریزی داں صاحب ترجمان بنے، کپتان پوچھتا تھا اور مولانا جواب دیتے تھے، تھوڑی دیر کے بعد مولانا کے خیالات کو سن کر وہ کچھ مبہوت سا ہو گیا اور مولانا کے ساتھ اس کی گرویدگی اتنی بڑھی کہ قریب تھا کہ اسلام کا اعلان کردے، اس نے شاید وعدہ بھی کیا کہ وہ ہندوستان حضرت سے ملنے کے لیے حاضر بھی ہوگا۔ اس واقعہ کا مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ پر اتنا اثر پڑا کہ آپ نے جہاز ہی پر عزم فرمالیا کہ واپس ہونے کے بعد میں انگریزی زبان خود سیکھوں گا، کیونکہ مولانا کو محسوس ہو رہا تھا کہ جتنا اثر کپتان پر براہ راست گفتگو سے پڑسکتا تھا ترجمان کے ذریعہ وہ بات نہیں حاصل ہو رہی ہے"۔

لیکن افسوس ہے کہ اجل مسمی نے واپس ہونے کے بعد فرصت نہ دی، کاش! یہ صورت پیش آجاتی تو دارالعلوم دیوبند کی علمی تحریک کا رنگ یقیناً کچھ اور ہوتا، لوگوں کو اکابر دیوبند کے خیالات سے صحیح واقفیت نہیں ہے، ورنہ جن تنگ نظریوں کا الزام ان کی طرف عائد کیا جاتا ہے، اس سے ان بزرگوں کی ذات بری ہے۔

سوانح قاسمی میں مولانا گیلانی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"جاننے والے جانتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند میں جب کبھی موقع ہمدست ہوا، ہندو دھرم کی علمی زبان سنسکرت کے سکھانے کا بھی نظم کیا گیا ہے، یا وظیفہ دے کر طلبہ کو ان زبانوں کے سیکھنے کے لیے بھیجا گیا اور آج بھی ضرورت ہے کہ کچھ نہیں تو کم از کم ہندوستان کے مروجہ مذاہب و ادیان کے متعلق صحیح معلومات سے دارالعلوم کے طلبہ کو روشناس کرانے کی ممکنہ صورتیں اختیار کی جائیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ اسلامیات کا جو ذخیرہ اردو زبان میں پایا جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ سرمایہ اسلامی تعلیمات کا ہندی میں منتقل کردیا جائے، ہمارا یہ ایک تبلیغی فرض ہے، انشاء اللہ یہ خواب پورا ہو کر رہے گا" (جلد دوم صفحہ ۴۷۹)

دارالعلوم دیو بند مولانا محمد قاسم نانوتوی کی علمی، تعلیمی اور فکری وعملی جدوجہد کا محور ومرکز تھا، اس لحاظ سے دارالعلوم کے نصاب کے سلسلہ میں انھوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، تمام دینی درسگاہوں کے سلسلہ میں ان کا نقطۂ نظر وہی تھا۔ وقت کے تقاضوں اور حالات کے پس منظر میں ایک باضابطہ دینی درسگاہ کے قیام وتاسیس کے ذریعہ ان کا مقصد یہی تھا کہ اس طرح کی درسگاہیں جگہ جگہ قائم کی جائیں اور ان سے ایسے افراد پیدا کئے جائیں جو وقت کے چیلنج کو سمجھنے اور اس کے مقابلہ کی بھرپور لیاقت وصلاحیت رکھتے ہوں۔

نصاب تعلیم کے سلسلہ میں اوپر جو کچھ عرض کیا گیا اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مروجہ نصاب تعلیم (درس نظامی) تاریخ کے مختلف ادوار میں اصلاح کے مراحل سے گزرا ہے اور اس تاریخی اعتراف سے یہ بات خود بخود ثابت ہوتی ہے کہ ہمارے اکابر واسلاف نے وقت کے تقاضے اور ملت کے مصالح سے کبھی چشم پوشی نہیں کی، دارالعلوم کی روداد بتاتی ہے کہ ۱۲۸۳ھ میں جو پہلا نصاب جاری ہوا وہ تقریباً ۱۹ سال کی مختصر عرصہ میں تین بار اصلاح وترمیم کے مراحل سے گزرا، پھر ۱۳۰۲ھ میں ایک نئی شکل اختیار کر گیا، جو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ۱۳۹۰ھ تک رہا، اس کے بعد پھر از سر نو جائزہ لیا گیا اور تقاضائے حال کے مطابق ترمیم ہوتی رہی، حال ہی میں (یعنی چند سال پیشتر) دارالعلوم کی موجودہ انتظامیہ نے نصاب تعلیم پر ایک اہم مذاکرہ منعقد کیا، جو نتیجہ خیز اور بامقصد رہا، یہ ایک خوش آئند اور حوصلہ افزا پہلو ہے اور اس سلسلہ کو جاری رکھنا چاہیے کہ وقت کے تقاضوں کی رعایت ایک زندہ قوم کی علامت ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے علماء وفضلاء دورِ جدید کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے بعض ان علوم وفنون اور زبانوں سے بھی باخبر ہوں، جن کی عملی زندگی میں ضرورت پڑتی ہے، تاکہ میدان عمل میں اجنبیت اور بے گانگی کا انھیں احساس نہ ہو، میں یہ نہیں کہتا کہ مستقل طور پر ان علوم جدیدہ کو داخل نصاب کر لیا جائے اور اپنے اصل دینی علوم کے نظام تعلیم کو متاثر یا کمزور کر دیا جائے، تاہم اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ تکمیل علوم کے بعد ان کے لیے ان جدید علوم سے واقفیت کی کوئی صورت نکالی جائے، یا پھر ایام درس ہی میں بعض علوم کی تدریس (نوٹس وغیرہ کی صورت میں) کچھ ایسے ہلکے پھلکے انداز میں کی جائے کہ اس سے تعلیمی دلچسپی میں ذرہ برابر فرق نہ آنے پائے، لیکن اس

جانب توجہ ضرور دینی چاہیے۔ موجودہ سائنسی وٹکنالوجی ترقی کے دور کا تقاضا بھی یہی ہے، میرے خیال میں فکر قاسمی کی عصری تعبیر وتشریح بھی یہی ہوسکتی ہے کہ ہم زمانہ کے تقاضوں سے آنکھیں بند نہ کریں، بلکہ فکر وجستجو اور حوصلہ مندی کا چراغ جلائے ہوئے آگے بڑھیں، آپ حضرات صاحب بصیرت علماء ہیں، ''آئین نو سے ڈرنا'' اور ''طرز کہن پر اڑنا'' دونوں کے حدود سے آپ واقف ہیں، آپ کی فراست ایمانی اور عالمانہ بصیرت کے تحت یقین ہے کہ کوئی راہ اعتدال کی ایسی ضرور نکل آئے گی جس سے دینی ودنیوی تقاضوں کی بھرپور رعایت ہوسکے۔

آپ کے منصب ومقام اور ذمہ داریوں کا مجھے احساس ہے اور ہر دانا وہوشمند اس ذمہ داری کا احساس رکھتا ہے اس لئے جی چاہتا ہے کہ حکیم ودانا اقبال کے اس حقیقت افروز، معنی خیز اور حکیمانہ شعر پر اپنی بات ختم کروں، اس میں بلاشبہ ہم سب کے لئے ایک درس اور پیغام ہے:

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی   جگر خوں ہو تو چشمِ دل سے ہوتی ہے نظر پیدا

تیسرا باب

علمی خدمات و آثار

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی*

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ

بحیثیت محدث وفقیہ

اہلِ علم دو طرح کے گذرے ہیں، کچھ لوگ وہ ہیں جن کے یہاں وسعت اور پھیلاؤ ہے اور کچھ وہ ہیں جن کے یہاں عمق اور گہرائی ہے، یہ دونوں طرح کا مذاق کچھ فرق کے ساتھ ہر عہد میں رہا ہے، علامہ سیوطیؒ اور علامہ سخاویؒ جو معاصر بھی ہیں اور اپنے اعلیٰ علمی ذوق اور تالیفات کی وجہ سے معروف بھی، ان کے بارے میں بھی بعض مقام شناس علما کا تجزیہ یہی تھا کہ ایک کے پاس وسعت ہے اور دوسرے کے پاس عمق۔

اس لحاظ سے حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں علوم اسلامی میں عمق اور گہرائی پائی جاتی تھی، اخفاءِ حال کا اتنا غلبہ تھا کہ باضابطہ تصنیف و تالیف کا کام بہت کم کیا، لیکن جو کچھ لکھا اور جو کچھ ان سے سننے والوں نے محفوظ کیا وہ ان کی بالغ نظری اور بلند نگاہی کا شاہد عدل ہے، وہ صرف تیراک نہ تھے بلکہ غواص تھے، ان کے یہاں یافت سے زیادہ دریافت ہے، آپ کی جو بھی تحریر دیکھی جائے اس میں نقل و حکایت کم ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے من جانب اللہ علوم و معارف کا ورود ہو رہا ہے، کتابوں کے حوالوں سے مواد کا اکٹھا کر لینا بھی مشکل کام ہے مگر نسبتاً آسان ہے، لیکن کسی موضوع کی تہہ تک پہونچ کر خود اپنی بات کہنا اور اپنی قوتِ فکر کا استعمال کر کے الجھی ہوئی ڈور کو سلجھانا دشوار کام ہے۔ اور یہی کام حضرت نانوتویؒ نے کیا ہے۔ انہوں نے ایسے ایسے لعل و گہر اور جواہر ریزے نکالے ہیں کہ جہاں تک بڑے بڑے اہلِ علم کی بھی رسائی نہیں ہو پاتی۔

---

* المعہد العالی الاسلامی، حیدرآباد

حضرت نانوتویؒ ان گوشہ نشیں اور عزلت گزیں اہلِ علم میں نہیں تھے جو صرف علم وتحقیق کے کام میں مصروف ہوں اور امت جن ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گذر رہی ہو، ان سے بے خبر اور بے تعلق ہوں، بلکہ وہ دقیق النظر دماغ کے ساتھ ساتھ تڑپتا ہوا بے چین اور دردمند دل بھی رکھتے تھے، امت اسلامیۂ ہند پر کفر کی جو یلغار ہو رہی تھی اس نے ان کی کروٹوں کو بے سکون کر کے رکھ دیا تھا۔ اسی لئے حضرت نانوتوی کے یہاں ''تحقیق برائے تحقیق'' کا ذوق نہیں تھا۔ بلکہ زبان جب بھی کھلتی، قلم جب بھی جنبش کرتا اور دل ودماغ جب بھی فکر ونظر کا سفر طے کرتا تو اس کا مقصد ومنشاء ایک ہی ہوتا تھا اور وہ مقصدِ جلیل تھا اسلام کی دعوت واشاعت اور دین حق کی حفاظت وحمایت۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف عیسائی اور دوسری طرف آریہ سماجی پوری قوت کے ساتھ اسلام پر حملہ زن تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا رشتہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین متین سے کٹ جائے اور ان کی ثروت ایمانی لوٹ لی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے جن عبقری شخصیتوں کو پیدا فرمایا ان میں سرفہرست حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ذات گرامی ہے، اس لئے فطرتی طور پر حضرت نانوتویؒ کا اصل موضوع علم کلام تھا، مولانا کی زیادہ تر تقریریں اور تحریریں عقلی طور پر اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے اور عیسائیت اور ہندومت کی رد میں ہیں، ان کا مواد اتنا وقیع، مخالفین کے لئے اس درجہ مؤثر اور معاندین کے لئے مسکت ہے کہ آج بھی ان کی افادیت مسلّم ہے اور اس کی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کی خداداد ذہانت وذکاوت، حدیث کی تدریس اور اس کے ساتھ ساتھ رجال کار کی تیاری اور حدیث وفقہ کے میدان میں افراد سازی اور مردم گری سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ ان فنون میں بھی یگانۂ روزگار تھے۔ لیکن کچھ تو ان فتنوں کا مقابلہ جو یقیناً اس عہد میں کفر وارتداد کے فتنہ کا مقابلہ تھا۔ اور کچھ کمال اخلاص کی وجہ سے اخفاءِ حال کا غلبہ اور نام ونمود سے دوری کی وجہ سے حدیث وفقہ بلکہ علم کلام کے علاوہ دوسرے موضوعات پر تصنیف وتالیف کی طرف یا تو آپ کی توجہ نہیں ہوئی یا موقع نہیں ملا، اس لئے اس موضوع پر بھرپور اور تفصیلی تجزیہ پیش کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

تاہم اس سلسلے میں حضرت نانوتویؒ کی تحریر میں جو اشارات ملتے ہیں، اور ضمنی طور پر حدیث وفقہ

سے متعلق جو مباحث آ گئے ہیں، ان سے آپ کے فکری نہج کا اندازہ ہوتا ہے، اس سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ اہم اور قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر علماء اصول لکھتے ہیں کہ احادیث میں احناف کا طریق یہ ہے کہ اگر روایتیں متعارض ہوں تو اولاً دیکھتے ہیں کہ کیا ایک روایت کے منسوخ اور دوسرے کے ناسخ ہونے پر کوئی دلیل موجود ہے؟ اگر نسخ کی دلیل مل جائے تو نسخ کا فیصلہ کرتے ہیں، ورنہ پھر وجوہ ترجیح میں غور کرتے ہیں، اور کوئی وجہ ترجیح ہاتھ آ جائے تو ترجیح سے کام لیتے ہیں، اگر کوئی وجہ ترجیح موجود نہ ہو تو پھر تطبیق و توفیق کی کوشش کرتے ہیں، اگر تطبیق کی کوئی راہ نہ نکل سکے، جس کی شاید ہی کوئی مثال مل پائے، تو پھر دونوں دلیلوں کو ساقط الاعتبار سمجھتے ہوئے: **اذا تعارضا تساقطا** پر عمل کرتے ہیں لیکن حضرت نانوتویؒ کا مذاق یہ ہے کہ ترجیح کے بجائے تطبیق و توفیق کا راستہ اختیار کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو کوئی حدیث عمل سے رہ نہ جائے۔ چنانچہ حضرت نانوتویؒ نے غیر مقلد حضرات کے رد میں جو رسائل لکھے ہیں جیسے ''الحق الصریح'' اور ''توثیق الکلام'' ان میں احادیث سے متعلق مباحث میں یہ فکر پوری طرح نمایاں ہے۔ یہی وہ مذاق قاسمی ہے جس کو عامتاً حلقۂ دیوبند کے اہلِ علم نے اختیار کیا ہے، اور یہ احادیث کے سلسلے میں دیوبند کی امتیازی فکر اور اس کی شناخت ہے۔

بلکہ حضرت نانوتویؒ کا ذوق تو یہ ہے کہ جو احکام منسوخ ہیں اگر فی نفسہ ان کی مشروعیت باقی ہو تو اس کو بھی مستحب کے درجہ میں رکھا جائے تا کہ ان پر بھی فی الجملہ عمل ہو جائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر قول و فعل کی فی الجملہ اتباع ہو جائے، چنانچہ آپ کی رائے ہے کہ ''گو پچاس نمازیں منسوخ ہیں لیکن استحباب کے درجہ میں ہنوز باقی ہیں''۔ پھر ایک نکتہ لکھا ہے کہ تتبع سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول شب و روز میں پچاس رکعت پڑھنے کا تھا۔

نسخ کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو نسخ کم سے کم مانا جائے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ہے۔ خود حضرت نانوتویؒ کے الفاظ میں:

''نسخ خلاف اصل ہے تا مقدور اس سے احتراز مناسب ہے''

پھر جیسا کہ امام سرخسیؒ وغیرہ عام اصولیین احناف نے لکھا ہے کہ عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید نسخ کے حکم میں ہے، یہی رائے حضرت نانوتویؒ کی بھی تھی۔ اسی طرح آپ نص کے ظاہری الفاظ پر عمل کرنے کو بمقابلہ اس کی تاویل و توجیہ کے انسب خیال کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''تاویل کرنی یا تخصیص کرنی جس کا حاصل نسخ ہے زیبا نہیں''(۱)

''قرأت فاتحہ خلف الامام'' کے مسئلہ میں حضرت نانوتویؒ کی اپنی مستقل توجیہ ہے اور وہ یہ کہ مقتدی کے سورۂ فاتحہ پڑھنے اور نہ پڑھنے کا تعلق اصل میں اس اصل سے ہے کہ امام مقتدیوں کا نائب ہوتا ہے اور اسی کی نماز اصل ہوتی ہے، امام کی یہ حیثیت نماز میں بتدریج پایۂ تکمیل کو پہونچی ہے، ابتداء میں سلام وکلام بھی جائز تھا، اسے منسوخ کیا گیا، پھر مقتدی سورۂ فاتحہ کے ساتھ ساتھ ضم سورت بھی کیا کرتے تھے تو ضم سورت کا حکم منسوخ ہوا، پھر مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم بھی منسوخ ہوگیا، تا کہ امام کی نیابت اور نماز میں اس کے ضامن ہونے کی کیفیت آہستہ آہستہ درجۂ کمال کو پہونچ جائے۔

موضوع قرآن کا ہو یا حدیث کا یا علم کلام کا، حضرت نانوتویؒ کا منہج فکر اور طریقۂ استدلال زیادہ تر اصولی ہوتا ہے، اور متکلمانہ طرز واسلوب سے خالی نہیں ہوتا، مثلاً اسی قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلے میں حضرت نانوتویؒ کا نقطۂ نظر ہے کہ نماز میں اصل حیثیت امام کی ہے مقتدی کی حیثیت محض تابع کی ہے۔ خود انہی کے الفاظ ہیں:

''امام موصوف بالذات بالصلوٰۃ ہے اور مقتدی موصوف بالعرض''

اور قاعدہ یہ ہے کہ احکام شرعیہ کے مخاطب وہ لوگ ہوتے ہیں جو اصل اور حضرت نانوتویؒ کی زبان میں موصوف بالذات ہوں، اس طرح گویا مقتدی اس آیت کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کے ذہن رسا نے: لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب کی بابت ایک اور نکتہ اخذ کیا ہے اور یقیناً وہ ان کے تفقہ پر دال ہے۔ حضرت نانوتویؒ کا خیال ہے کہ صلاۃ کا اطلاق کم سے کم ایک رکعت پر ہوتا ہے گویا صلوٰۃ کا طول ایک رکعت ہے جس کے لئے ایک سورۂ فاتحہ کافی ہے تو اسی طرح چونکہ مقتدی امام کا تابع ہے اس لئے امام کے ساتھ مل کر مقتدیوں کی نماز ایک نماز ہے لہٰذا چونکہ اس حدیث میں ایک صلوٰۃ کے لئے ایک سورۂ فاتحہ کو کافی قرار دیا گیا ہے، اس لئے ان دونوں کی مجموعی نماز کے لئے ایک ہی سورۂ فاتحہ کافی ہوجائے گی، جو امام کی قرأت سے پوری ہوجاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کتاب وسنت کے غواص ہیں اور اپنی ذہانت اور قوتِ اخذ و

---

(۱) مجموعۂ ہفت رسائل ص: ۳۳۵

استنباط سے الفاظ کی تہہ میں ایسے ایسے معانی ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ عام اہلِ علم کو شاید اس کی ہوا بھی نہ لگے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حدیث کے رجال، اس کے درجہ و مقام اور جن احادیث سے استدلال کیا جا رہا ہے، ان کے اطراف اور مختلف روایتوں میں الفاظ کا فرق اور احکام کے استنباط میں اس کے اثر پر بھی آپ کی گہری نظر تھی اور اصول حدیث میں اہل حجاز اور اہل عراق دونوں کے نقاطِ نظر اور طریقۂ فکر کو ملحوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ اپنے رسالہ ''توثیق الکلام'' اور ''الدلیل المحکم'' میں محمد بن اسحاق کے بارے میں علماء جرح و تعدیل کا اختلاف، بعض احادیث موقوفہ کا احادیث مرفوعہ کے حکم میں ہونا، مؤطا امام محمد کی ایک روایت کے علیٰ شرط الشیخین ہونے کا ذکر موجود ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ مقتدی کے لئے تتبع سکتات یا سکتۂ طویلہ بین الفاتحہ والسورۃ پر کوئی مرفوع روایت موجود نہیں۔

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کے احادیث سے استدلال میں درایت کا پہلو غالب ہے۔ جو ایک مشکل کام ہے، کیونکہ روایت کے لئے نقل و حکایت ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے اس بات کی طرف بار بار اشارہ فرمایا ہے:

''قوت روایت باعتبار درایت قوت سند سے بڑھ کر ہے''

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''قوت درایت قوت روایت سے مقدم ہے''

اسی لئے حضرت نانوتویؒ کی رائے ہے کہ ایسے روّات جو تفقہ میں فائق ہوں، ان راویوں پر ترجیح رکھتے ہیں جو صرف سند اور رجال سے تعلق رکھتے ہوں، چنانچہ فرماتے ہیں:

''اگر روایت میں فقہا کا اعتبار نہ ہو تو اوروں کا درجہ اولیٰ نہ ہوگا''

ایک اور موقعہ پر لکھتے ہیں:

''یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ فقہا کا زیادہ سند میں اعتبار ہوا اور کیوں نہ ہو روایت بالمعنی اکثر ہوتی ہے اور اس میں فہم ہی کی زیادہ ضرورت ہے''۔

تراویح کے مسئلے میں حضرت نانوتویؒ نے اپنے مکتوب میں حدیث مرسل کی حجیت پر قلم اٹھایا ہے، اس میں ایک اعتراض جو غیر مقلد عالم کی طرف سے کیا گیا ہے کہ: علیکم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدین میں سنت خلفاء راشدین سے سنت نبوی ہی مراد ہے۔ کیونکہ جب تکرار معرفہ ہو تو وہ

متحد المعنی ہوتا ہے۔ حضرت نانوتویؒ نے اس کا خوب مسکت جواب دیا ہے اور آیت قرآنی: أبناء ناو أبناؤکم وأنفسنا و أنفسکم سے استدلال کیا ہے۔ تراویح ہی کے مسئلے میں آپ کے اس مکتوب (جو الحق الصریح کے نام سے موسوم ہے) میں کئی اہم مباحث آئے ہیں کہ احکام شرعیہ کا ثبوت صرف صحاحِ ستہ ہی سے نہیں ہوتا، ضعیف اور موضوع روایتوں میں فرق ہے، فضائل اعمال میں ضعیف روایتیں معتبر ہیں اور تراویح بھی فضائل اعمال میں سے ہے، اسی طرح اس ضمن میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ خبر واحد سے اعتقادی احکام ثابت نہیں کئے جا سکتے اور عملی احکام میں واجبات وسنن اس سے ثابت ہو سکتے ہیں۔ تراویح اور تہجد کے دو علیحدہ نماز ہونے پر بھی آپ نے گفتگو کی ہے، جو اس مسئلہ میں یقیناً اصل اور بنیاد ہے۔

''فیوض قاسمیہ'' کا ایک مکتوب جو دیہات میں نماز جمعہ سے متعلق ہے، اہلِ علم کے لئے سرمۂ چشم کا درجہ رکھتا ہے۔ سورۂ جمعہ کی آیت: اذا نودي للصلوٰة من یوم الجمعة الخ کی ایسی بلیغ تفسیر ہے کہ شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ اس ایک ہی آیت سے حضرت نانوتویؒ نے جمعہ کے وجوب اور جمعہ کی صحت سے متعلق شرائط کو ثابت کیا ہے اور اس آیت سے جمعہ فی القریٰ کے مسئلہ میں حنفیہ کی طرف سے استدلال کیا ہے۔ غرض یہ مکتوب قوت استنتاج اور صلاحیت استنباط کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

فقہ وحدیث سے متعلق ایک اہم فن ''اسرارِ شریعت'' کا ہے کہ احکام شرعیہ کی حکمتیں اور ان کے مصالح کیا ہیں؟ اس موضوع پر حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں ایسی قیمتی نکتہ سنجیاں اور حکمت آفرینیاں موجود ہیں کہ شاید ہی کہیں اور اس کی مثال مل سکے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ حضرت نانوتویؒ متکلم اسلام تھے، لیکن علم کلام میں آپ کا نہج خالصتاً نظری اور معقولی بحثوں کا نہیں تھا بلکہ آپ محسوسات اور مشاہدات سے مابعد الطبعی امور پر ایسا استدلال کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ایک روشن صبح کی طرح یہ اَن دیکھی حقیقتیں نظر آنے لگیں، مثلاً خود نماز ہی کے احکام میں قیام، رکوع اور سجود، رات میں جہری اور دن میں سرّی قرأت، سلام، قبلہ کی شرعی حیثیت اور اس کی مصلحت وغیرہ پر ایسی گفتگو کی گئی ہے کہ بہت سی جگہ غالباً ایسی دل کو چھوتی اور عقل کو قائل کرتی ہوئی بات اس فن کے امام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی نہیں ہے۔ وذلك فضل الله یؤتیه من یشاء.

حضرت نانوتویؒ کو حدیث وفقہ کے موضوع پر کوئی مستقل اور مربوط کام کرنے کا موقع نہیں ملا،

لیکن بخاری شریف کے آخری پانچ اجزاء پر حواشی جو حضرت نانوتویؒ کے قلم سے ہیں، وہ خود آپ کی نگاہ کی وسعت کی دلیل ہیں۔ حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ محدث سہارن پوری جیسے صاحب علم کے کام کو پورا کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا، لیکن حضرت سہارن پوریؒ نے اس نوعمر معاصر عالم کو یہ عظیم الشان کام پورے اعتماد سے حوالہ فرمایا، یہ ایک طرف حضرت نانوتویؒ کے جوہر اور دوسری طرف حضرت سہارن پوری کی جوہر شناسی کی واضح دلیل ہے۔ مولانا سہارن پوریؒ نے جب ان اجزاء کی تعلیق کا کام آپ کے سپرد فرمایا تو بعض لوگوں کو اس پر تامل ہوا لیکن جب آپ نے اس کام کو مکمل فرمایا تو تمام ہی اہلِ علم نے اس پر آفریں کہا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حواشی حدیث کے اسنا دو رجال اور معانی و مفاہیم دونوں پہلوؤں سے حضرت نانوتویؒ کی گہری نظر پر شاہد ہیں، ان میں کئی مواقع وہ ہیں جہاں امام بخاریؒ نے احناف کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ ان مواقع پر آپ نے روایت و درایت دونوں پہلوؤں سے نہایت ہی عمدگی کے ساتھ حنفیہ کے نقطۂ نظر کو پیش فرمایا ہے اور حدیث وفقہ اور رجال کے بہت سے مراجع سے استفادہ کیا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اس فن کی نادر و نایاب کتب ہی نہیں بلکہ آج جو متون متداول ہیں وہ بھی اہلِ علم کو دستیاب نہیں تھیں اور نگاہ شوق ان کو پانے کے لئے بے چین رہتی تھی، چنانچہ خود حضرت نانوتویؒ نے بعض مواقع پر کتابوں کی کمی اور عدم دستیابی کا رونا رویا ہے۔ ان حواشی میں بہت سی مفید اور اہم بحثیں آگئی ہیں اور اگر ان کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو یہ اہلِ علم کے لئے متاع گراں مایہ ثابت ہوگا۔

قضاء قاضی ظاہراً نافذ ہوگا یا باطناً؟ (ص:۱۰۳۰، ۱۰۶۵) پڑوسی کے لئے حق شفعہ ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں احناف کا نقطۂ نظر اور امام بخاری کی تنقید کا جواب (ص:۱۰۳۲) حانث ہونے سے پہلے کفارۂ قسم کی ادائیگی (ص:۱۰۱۸) قضاء علی الغائب (ص:۱۰۶۴) غلام مدبر کی بیع (ص:۱۰۶۶) صوم وصال کی ممانعت (ص:۱۰۷۵) وغیرہ پر نہایت نفیس فقیہانہ اور محدثانہ بحث ملتی ہے، اسی طرح گوہ کے گوشت کی بابت بحث کرتے ہوئے سند اور رجال پر بھی مبسوط اور چشم کشا کلام کیا گیا ہے (ص:۱۰۷۹)

فقہ و حدیث میں ہم فرزندان قاسمی کے لئے سب سے اہم بات جو ہمارے لئے یقیناً اسوہ اور

نمونہ ہے اور جس کو آج کے حالات میں خاص طور پر پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے، یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے یہاں مسائل میں کمال اعتدال اور تمام سلف صالحین کا غایت درجہ ادب واحترام ہے، نیز استنباط واستدلال میں کبھی عدل وانصاف کا دامن آپ کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹتا ہے۔ خود قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں حضرت نانوتویؒ کے رجحان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترک قرأت اولیٰ ہے لیکن قرأت بھی ناجائز نہیں، فرماتے ہیں:

''ترک قرأت فاتحہ خلف الامام قرأت فاتحہ سے خیر اور احسن معلوم ہوتا ہے''

ایک مقام پر غیر مقلد حضرات کی بے اعتدالی پر اظہار افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''ہم کو دیکھئے باوجود توجیہات مذکورہ اور استماع تشنیعات معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست و گریباں نہیں ہوتے بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں امام اعظمؒ بھی باوجود عظمت شان امکان خطاء سے منزہ نہیں، کیا عجب ہے کہ حضرت امام شافعیؒ صحیح فرماتے ہوں گے اور ہم ہنوز ان کے قول کی وجہ کو نہ سمجھے ہوں''۔

اپنے ایک مکتوب میں دیہات میں نماز جمعہ کے مسئلہ پر نہایت ہی مدلل اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرمادیا ہے کہ چونکہ مسئلہ ظنی ہے اس لئے اگر کہیں دیہات میں جمعہ قائم کرلیا جائے تو الجھنے کی بھی ضرورت نہیں: ''اگر کسے در دیہی جمعہ قائم کند دست وگریبانش نہ زنند''۔

حضرت نانوتویؒ کا یہی وہ طریقۂ فکر ہے جو دیوبند کا اصل رنگ ہے اور جو حدیث وفقہ میں دیوبند کے محقق علماء کا اصل منہاج رہا ہے، یہی بات حضرت گنگوہیؒ کے یہاں ملتی ہے، احادیث میں تطبیق اور فقہی اختلافات میں توسیع اور تسامح کی یہی کیفیت حضرت تھانویؒ کے یہاں ملتی ہے، الحیلۃ الناجزۃ اس کا واضح ثبوت ہے اور یہی رنگ زیادہ وسعت اور عمق کے ساتھ حلقۂ دیوبند کے سب سے بڑے محدث علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے یہاں موجود ہے، فیض الباری اور العرف الشذی کو کہیں سے دس بیس صفحہ بھی پڑھ لیا جائے تو حضرت کشمیری کا یہ رنگ کسی حقیقت پسند عالم کی نظر سے مخفی نہیں رہ سکتا، افراط وتفریط سے بچتے ہوئے عدل واعتدال کی راہ اختیار کرنا، اعتقادی مسائل میں تصلب اور احکام فقہیہ میں دلائل کا اختلاف اور احوال زمانہ کی تبدیلیوں کے اعتبار سے توسع، اور کتب فقہ کی ظاہری عبارتوں پر جمود واصرار کے بجائے سلف صالحین کے مقصد ومنشاء اور ان کے استنباط واجتہاد کی روح کو

سمجھنا، اوراس کواپنے لئے چراغ راہ اور خضرِ طریق بنانا، یہ ہے بزرگان دیوبند کی اصل فکر جو میراث ہے اس خانوادۂ فکری کے مورث اعلیٰ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور فکر ولی اللہی کے خوشہ چیں اور نقیب وترجمان حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی۔

اخیر میں اس سیمینار اور سیمینار منعقد کرنے والے ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں حدیث وفقہ کی جو بحثیں جابجا بکھری ہوئی ہیں، جن میں ایسے جواہر پارے موجود ہیں جو شاید کہیں نہ مل سکیں، ان کو ایک جگہ حدیثی اور فقہی افادات کے مجموعہ کی حیثیت سے جمع کر دیا جائے اور اسے حضرت نانوتویؒ کے الفاظ میں لکھنے کے بجائے آج کی زبان اور آج کے اسلوب میں مرتب کیا جائے تو اس طرح انشاء اللہ علوم قاسمی کا احیاء ہو سکے گا اور اہلِ علم اور اصحاب فکر و نظر کے لئے نہایت قیمتی اور عظیم الشان تحفہ ہوگا۔ وباللہ التوفیق و ھو المستعان.

مولانا محمد برہان الدین قاسمی سنبھلی*

صحیح بخاری کے حواشی میں الامام محمد قاسم النانوتویؒ کا انداز

سرزمین ہند پر اگرچہ آفتاب اسلام کی کرنیں پہلی صدی ہجری کے اواخر میں ہی پڑنے لگی تھیں، لیکن ان کے ہمہ گیر ہونے اور پورے آب وتاب کے ساتھ پھیلنے میں خاصا عرصہ لگا، پھر تو یہ خطہ جو نامعلوم مدتوں سے۔قبل از تاریخ زمانہ سے۔کفر وشرک کے اندھیاروں میں ڈوبا ہوا تھا، نور اسلام سے ایسا جگمگایا کہ اس سرزمین پر وہ علاقے بھی رشک کرنے لگے جہاں اسلام کا نیر تاباں زمانہ نبوت میں ہی ضوفشاں ہو چکا تھا، یہاں ایسے ایسے علم وعمل، تقوی وخشیت کے آفتاب وماہتاب نمودار ہوئے جن کی تابانی وضیاپاشی کا دائرہ سرزمین ہند سے نکل کر عجم ہی نہیں عرب تک پھیلا، جس کا اعتراف سارے عالم نے کیا، ان گہر بار اور ضیاپاش افراد کی مختصر سے مختصر فہرست کیلئے بھی خاصا وقت درکار ہوگا، جس کا سیمیناروں میں شرکاء کو دئے گئے محدود وقت میں پیش کرنا مشکل ہے، اس لئے آج کی محفل میں صرف اسی ذات گرامی کے بارے میں کچھ عرض کرنے پر اکتفا کیا جانا ہی مناسب لگ رہا ہے، جس کا تذکرہ کرنے اور سننے کے لئے ہم سب آج جمع ہو کر ہمہ تن گوش بنے ہوئے ہیں، کیوں کہ یہاں تمام شرکاء بشمول مقالہ نگار وسامعین اسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر اور اسی کے بچھائے ہوئے خوان علم کے زلہ گیر ہیں، اسی کے تذکرہ سے لذت یاب ہونے کے لئے جمع ہوئے ہیں اور سب:

أعد ذكر نعمان لنا أن ذكره

هو المسك ما كردته يتضوع"

کا نغمہ زبان حال سے گنگنا رہے ہیں۔

مذاکرہ کے دوران اس شخصیت اور اس کی امامت کے مختلف پہلو سامنے لائے جائیں گے

---

* صدر شعبہ تفسیر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ (یوپی)

اور منتظمین کی بیدار مغزی اور دور بینی کی داد نہ دینا بے داد ہوگی کہ انہوں نے ہر مقالہ نگار کے لئے موضوع کا تعین کر کے اس علمی مذاکرہ کی افادیت بڑھانے اور ''مذکور'' کی شخصیت کے تمام اہم پہلوؤں کو سامنے لانے کا مناسب سامان کیا۔

راقم کو حضرت ممدوح کے اس اہم علمی کارنامہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا مفوض ہوا ہے جس کی اہمیت وافادیت زمان ومکان کی حد بندیوں سے ماوراء ہے، یعنی جب تک ''اصح الکتب بعد کتاب اللہ'' سے استفادہ کا سلسلہ باقی رہے گا اور امید ہے کہ انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا اس وقت تک یہ علمی کارنامہ بھی زندہ وتابندہ ——— صحیح البخاری سے استفادہ کیلئے ناگزیر ہونے کی وجہ سے ——— رہے گا، اس کارنامہ کی اہمیت میں اضافہ یوں اور ہو جاتا ہے کہ موصوف نے اسے ایسی عمر میں انجام دیا ہے کہ جس میں عموماً ——— اچھے طلبہ کو بھی ——— صحیح طریقہ پر صحیح بخاری کا پڑھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ اس وقت مولانا کی عمر ۱۷، ۱۸ سال تھی (مولانا کی ولادت ۳۲ یا ۱۸۳۳ء میں اور حواشی کی طباعت ۱۸۵۰ء میں ہوئی) [1] اور سچ پوچھئے اس کارنامہ سے بالعموم استفادہ کی بھی صلاحیت نہیں ہوتی، مگر جس کے لئے قادر وقیوم نے ''الامام'' لقب کا سزاوار ہونا مقدر کر دیا ہو اس کے ذریعہ اس قسم کے اہم کارنامے انجام پانے پر تعجب کیوں ہو۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ ہندوستان کی علمی جامع تاریخ ''نزہۃ الخواطر'' (نیا نام: الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام) کے بالغ نظر مرتب ومصنف، جو ایک ایک حرف ناپ تول کر لکھنے کے لئے مشہور ہیں، نے ہندوستان کے قریبی زمانہ کے علمائے کبار میں صرف دو شخصیتوں کے لئے ''الامام'' استعمال کیا [2] ایک شہرۂ آفاق درس نظامی کے بانی ملا نظام

---

(۱) مولانا کی ولادت ۱۸۳۲ یا ۱۸۳۳ء میں ہونا تو متعدد سوانح نگاروں نے بیان کیا ہے، لیکن حواشی بخاری، کی طباعت اولی ۱۸۵۰ء میں ہونا مولانا اسیر ادروی صاحب نے اپنی مرتب کردہ کتاب ''مولانا محمد قاسم نانوتوی'' کے صفحہ ۷۶ پر ذکر کیا ہے (اگرچہ اس بات کا ماخذ نہیں بتایا)۔

(۲) حضرت نانوتوی کی ''امامت'' (بلکہ خود ''امامت'' کی تحقیق) کے مظاہر وامتیازات کے لئے مولانا مناظر احسن گیلانی کی مرتب کردہ ''سوانح قاسمی'' دیکھنی چاہئے، مولانا گیلانیؒ نے حضرت نانوتوی کی ''امامت'' کا ایک غیبی اشارہ دینے والا ایک خواب نقل کیا ہے (ص: ۱۳۲ ج: ۱ پر) اسی طرح ایک مجذوب کی (بخاری کا نسخہ ہاتھ میں لے کر) پیشگوئی بھی کہ ''جا تو بڑا عالم ہے'' (ص: ۲۵۶ ج: اسوانح قاسمی) خواب میں امام نانوتویؒ نے حضرت ابراہیم کا نگینہ دیکھا تھا جس سے اللہ تعالی نے فرمایا ''انی جاعلک للناس اماما'' (بقرہ) اسی خواب سے حضرت نانوتوی کے غیر معمولی طور پر مہمان نواز ہونے کی بھی توجیہ مولانا گیلانی نے کی ہے (سوانح قاسمی ص: ۵۶۷ ج: ۱ حاشیہ

الدینؒ فرنگی محل کے لئے دوسرے ہم سب کے ممدوح حضرت مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی کے لئے، بلکہ دونوں شخصیتوں کا تذکرہ ایک ہی طرح کے القاب سے شروع کیا ہے، ''الشیخ الامام العالم الکبیر'' سے، حتی کہ مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ جیسے ممتاز ترین عالم دین کے لئے بھی امام کا لقب نہیں لکھا یہ لذیذ حکایت مولانا کے اولین سوانح نگار، ہم عمر اور ہم وطن و مستفید مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنئے:

''مولوی احمد علی صاحب سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری کی، کہ پانچ چھ سیپارے آخر کے باقی تھے۔ مولوی صاحب (حضرت نانوتوی) کے سپرد کیا، مولوی صاحب نے اس کو ایسا لکھا کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر کیا ہوسکتا ہے، اسی زمانہ میں بعض لوگوں نے۔ کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ تھے۔ مولوی احمد علی صاحب کو بطور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا ہے؟ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا، اسی پر مولوی احمد علی نے فرمایا تھا کہ میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں اور مولوی صاحب کا تحشیہ ان کو دکھلایا جب لوگوں نے جانا اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے،، (ص: ۷ سوانح عمری مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ از مولانا یعقوب صاحب نانوتویؒ)

حضرت مولانا نانوتویؒ کے جدید سوانح نگار، مشہور اہل قلم، رسالہ ''ترجمان الاسلام'' کے مدیر جناب اسیر ادروی صاحب مذکورہ بالا اقتباس اپنی کتاب ''مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، حیات اور کارنامے'' میں پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''مولوی احمد علی صاحب نے پہلے ہی مرحلہ میں حضرت نانوتوی کو ایسی ذمہ داری سپرد کی کہ تجربہ کار پختہ کار کے لئے بھی اس سے کماحقہ عہدہ برآ ہونا دشوار تھا، لیکن آپ نے بخاری شریف کے اس حصہ پر جو بخاری میں اہم ترین ہے حضرت نانوتوی سے حواشی لکھوا کر حضرت نانوتوی کی شخصیت پر جو ناشناسی کی دبیز چادر پڑی ہوئی تھی یک بیک اٹھادی اور اس جوہر قابل کو دنیا کی نگاہوں کے سامنے پیش کردیا'' (ص: ۷۵ ناشر ''شیخ الہند اکیڈمی'' دارالعلوم دیوبند)

مولانا ادروی صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

''حواشی بخاری کی پہلی مرتبہ اشاعت ۱۸۵۰ء میں ہوئی'' (ص: ۷۶)

اور حضرت نانوتوی کی ولادت ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء میں ہوئی اس کا مطلب ہوا کہ یہ حواشی حضرت نے

۱۷یا۱۸سال کی عمر میں لکھے (حضرت نانوتوی کا سن ولادت ۱۲۴۸ھ متعین ہے، اس سے مطابقت ۱۸۳۲ء یا ۱۸۳۳ء ہوتی ہے)۔

اہل علم جانتے ہیں کہ صحیح بخاری کا یہ حصہ (آخری پانچ چھ پارے بالخصوص تین پارے) ایک اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے (جس کی طرف خود مولانا محمد یعقوبؒ صاحب نے بھی اشارہ کیا ہے، آگے تفصیل آرہی ہے) جو دوسرے حصوں کو حاصل نہیں، کیونکہ اسی میں امام بخاری نے امام اعظم ابوحنیفہؒ کے فقہی افکار پر بڑے تیکھے انداز میں تبصرے بلکہ تنقیدیں کی ہیں جن کی شدت بسا اوقات جارحانہ محسوس ہونے لگتی ہے، اس حصہ پر کسی حنفی کا حاشیہ لکھنا گویا امام اعظم کی طرف سے پوری وکالت اور بخاری کے اعتراضات وتنقیدات کے بھرپور علمی جواب دہی کی ذمہ داری قبول کرنا ہے، جو کوئی آسان کام نہیں اوراس کے لئے کسی عالم کا۔ بالخصوص نوعمری میں۔ کمر ہمت کس لینا بدون عبقریت کے ممکن نہیں، حضرت نانوتوی۔ جن کے عبقری ہونے میں شاید ہی کسی واقف کو کلام ہو ــــ نے جب اس میدان میں قدم رکھا تو خوب سوچ سمجھ کر رکھا اور ہر باخبر کہہ سکتا ہے "حق تو یہ ہے کہ حق ادا کردیا" کہنے والے نے تو یہاں تک کہا ہے کہ امام بخاری کے "قال بعض الناس" کے پردے میں امام ابوحنیفہ پر اعتراضات کے یکجا جوابات کا مجموعہ "دفع الوسواس" (جو اصح المطابع کی مطبوعہ بخاری جلد ثانی کے بالکل شروع میں ملحق ہے) اسی قلم کا رہین منت ہے جو اپنی خودی مٹانے اور کمالات چھپانے میں ید طولی رکھتا تھا، "دفع الوسواس" کے مصنف کا تعارف کراتے ہوئے ناشر نے لکھا ہے: **الذی صنفه بعض المحققین والکملاء المدققین لم یظهر اسمه هضما لنفسه** (یہ کہنے والے ملک کے نامور اہل قلم اور تذکرۂ علماء ہند پر اتھاریٹی وسند سمجھے جانے والے محقق عالم مولانا نسیم احمد فریدی امروہویؒ تھے، یہ بات موصوف نے خود راقم الحروف کے سامنے کہی)

حاشیہ یا شرح

اگر ضروری تشریحات محض کسی کتاب کے حاشیہ (کنارہ) پر چھپنے کی وجہ سے حاشیہ کا نام پانے کی مستحق قرار پاتی ہیں تب تو یقیناً حضرت نانوتویؒ کے صحیح بخاری سے متعلق افادات کو حاشیہ کہنا درست ہے، ایسی صورت میں اہل مطابع کے سامنے پرزور طور پر یہ تجویز رکھنا شاید غلط نہ ہوگا کہ وہ اس حاشیہ کو کتاب کے حاشیہ (کنارہ) کے بجائے، حوضی میں چھاپیں کیونکہ (شرح یا شروح) کی جتنی

معنوی خصوصیات ہوتی ہیں وہ اس حاشیہ (یا حواشی) کے اندر موجود ہیں۔

شرح کے امتیازات

کسی کتاب کی شرح کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہے کہ کتاب کے فہم کو آسان بنانے، اس پروارد ہونے والے اعتراضات رفع کرنے، اجمالات کی تفصیل، مبہمات کی توضیح، مغلقات کی تشریح، اغلاط کی نشان دہی۔ ممکن ہو تو ان کی ترجیح۔ فروگذاشتوں پر تنبیہ اور فن حدیث کی کتاب ہو تو رجال کی تحقیق، مراتب رواۃ وروایات کی تعیین، متعارض روایات میں تطبیق یا ترجیح، کسی خاص مسلک کے خلاف ہو، بالخصوص شارح کے مسلک کے خلاف ہو، تو اس کا جواب یا فن حدیث کے اصولوں پر تضعیف کرنا یہ ہیں شرح کی خصوصیات ہم جب حضرت نانوتویؒ کے صحیح بخاری کے حواشی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ تمام خصوصیات ان میں نظر آتی ہیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ انہیں صرف اس لئے حواشی کہنے پر اصرار کیا جائے کہ وہ کتاب کے حاشیہ پر طبع ہوئے ہیں حوضی کے اندر نہیں۔

حواشی بخاری کی خصوصیات

جیسا کہ اجمالاً ذکر آیا، مولانا نانوتویؒ کے ان حواشی میں مذکورہ بالا تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، یہاں ان سب کی مثالیں پیش کرنے سے مضمون اتنا طویل ہو جائے گا کہ شاید پوری ایک نشست میں بھی اسے پورا پڑھنا مشکل ہو، راقم الحروف اپنے سیمیناروں میں شرکت سے حاصل ہونے والے تجربہ کی بنا پر اس اعتراف میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ اس طرح کی مجالس مذاکرہ میں کہ جس کے اندر بہت سے اہل علم اپنے قیمتی افادات پیش کرنے تشریف لائے ہوں، کسی بہتر سے بہتر طویل مقالہ کی بھی سماعت کا تحمل آسان نہیں ہوتا چہ جائے کہ احقر جیسے، ہیچ میرز کی ٹوٹی پھوٹی تحریر کا، اس لئے بس چند مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے، یہاں یہ بتا دینا شاید نامناسب نہ ہوگا کہ احقر نے مطالعہ کے بعد بہت سے مواقع کے حواشی پر نشان لگا لئے تھے تا کہ انہیں مقالہ کی زینت بنایا جائے، مگر نظر ثانی کے وقت اندازہ ہوا کہ ان سب کو مقالہ کے اندر سمونے سے مقالہ نہیں رہے گا، کتاب بن جائے گا، ظاہر ہے کہ سر دست کتاب نہیں مقالہ لکھنا پیش نظر ہے، اس لئے ان میں سے بہت سے قیمتی حواشی بادل ناخواستہ شامل نہیں کئے جا سکے اور **اذالم یدرك كله لم يترك كله** کے حکیمانہ مقولہ پر عمل پیرا ہونے میں ہی مصلحت نظر آئی۔

مثال ۱ (حدیث کا مطلب واضح کرنے کی)

بخاری، کتاب الدعوات، باب الدعاء اذا انتبه من الليل ص:۹۳۵ میں ایک طویل حدیث آئی ہے جس کے آخر میں یہ ہے ''اللهم اجعل في قلبي نورا..... واجعل لي نورا قال كريب وسبع في التابوت ......خط کشیدہ جملہ (سبع في التابوت) گویا ایک معمہ ہے جو یقیناً محتاج تشریح ہے کہ اس کے بغیر مطلب تک رسائی مشکل بلکہ ناممکن معلوم ہوتی ہے، اس کی شرح کرتے ہوئے حضرت امام نانوتوی لکھتے ہیں: قوله'' سبع في التابوت '' أي سبع أعضاء أخر في بدن الإنسان الذى كالتابوت للروح أوفي بدنه الذى ماله أن يكون في التابوت أي الجنازة وهى العصب واللحم والدم والشعر والخصلتان الأخريان لعلهما الشحم والعظم، أو المراد سبع أخر في الصحيفة مسطورة لا أذكرها أومكتوبة موضوعة في الصندوق، قال النووى يراد بالتابوت الأضلاع ومايحويه من القلب وغيره تشبيها بالتابوت الذى كا لصندوق يحرز فيه المتاع أى سبع كلمات فى قلبى ولكنى نسيتها.... وقيل المراد سبع أنوار أخر كانت مكتوبة موضوعة فى التابوت الذى كان لبنى اسرائيل فيه سكينة من ربكم وبقية مما ترك آل موسى و آل هارون''.

حضرت نے یہاں متعدد احتمالات ذکر کئے جس میں سے کسی کو اختیار کر لینے کی آزادی معلوم ہوتی ہے، لیکن بہر حال مذکورہ شرح کے بغیر مصداق تک رسائی ناممکن تھی۔

مثال ۲ (سند کے بارے میں وضاحت اور غلط فہمی دور کرنے کی)

امام بخاریؒ نے ''باب الدعاء على المشركين '' کے اندر ایک حدیث بایں سند ذکر کی (ص:۹۴۶) حدثنا محمد بن المثنى قال حدثنا الانصارى قال حدثنا هشام بن حسان الخ اس پر حاشیہ میں فرماتے ہیں: قوله حدثنا الانصارى يريد محمد بن عبدالله بن المثنى القاضى وهو من شيوخ البخارى ولكنه ربما أخرج عنه بواسطة كالذى ههنا وقوله هشام بن حسان هذا وإن تكلم فيه بعضهم من قبل حفظه لكن لم يضعفه بذلك أحد مطلقا بل بقيد بعض شيوخه، واتفقوا على أنه ثبت فى الشيخ الذى

حدث عنه بحديث الباب وهو محمد بن سيرين قال سعيد بن أبي عروبة ما كان أحد أحفظ عن ابن سيرين من هشام بن حسان".

حاشیہ بالا محشی کی اسناد ورجال پر گہری نظر کا آئینہ دار ہے۔

مثال ۳ (حل لغات کی)

قرب قیامت کی علامات میں رفع امانت بھی ہے جس کا ذکر حدیث بخاری میں بایں الفاظ آیا ہے: ص:۹۶۲ "ینام الرجل النومة فتقبض الأمانة من قلبه فيظل أثرها مثل أثر الوكت ثم ينام النومة فتقبض فيبقى أثرها مثل المجل كجمر دحرجته على رجلك فنفط فتراه منتبرا وليس فيه شيئ الخ.

اس حدیث میں کئی الفاظ 'حل' کے متقاضی ہیں، چنانچہ دیکھئے امام نے یہ ذمہ داری بطریق احسن پوری کی:

أثر الوكت بفتح الواو وسكون الكاف وبالمثناة الأثر اليسير و قيل السواد اليسير و قيل اللون المحدب المخالف للون الذى كان قبله و المجل بفتح الميم وسكون الجيم وفتحها هو النفط الذي يحصل فى اليدين من العمل بفأس ونحوه و نفط بكسر الفاء...قال ابن الفارس النفط قرح يخرج في اليدين من العمل و منتبرا مفتعلا من الانتبار وهو الارتفاع ومنه المنبر لارتفاع الخطيب عليه والأمانة: المتبادر منها إلى الذهن المعنى المشهور منها وهو ضد الخيانة وقيل المراد منها هو التكاليف الالهية. الخ.

اس تشریح سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت کی عربی لغت پر بھی گہری اور وسیع نظر تھی کہ دقائق پر بھی مطلع تھے۔

مثال ۴ (بخاری پر گرفت)

عام طور ہر شراح اور محشین جس کتاب کو شرح وحاشیہ کے لئے منتخب کرتے ہیں وہ گویا طے کر لیتے ہیں کہ صاحب کتاب اور کتاب کی ہر بات کی حتی الامکان تائید اور تصویب کریں گے اور عموما ایسا ہی کرتے بھی ہیں، خواہ مصنف کی تائید وحمایت میں دور از کار تاویلات کا ارتکاب کرنا پڑ جائے، مگر

جس کا حجتہ الاسلام بننا مقدر تھا اور حق کا علمبر دار ہونا مقدر تھا وہ بھلا یہ روش کیوں اختیار کرسکتا تھا، چنانچہ حضرت الامام نے متعدد مواقع پر صاحب کتاب (امام بخاریؒ) پر تنقید بھی کی ہے اور ان کی فرگذاشتوں کی نشاندہی بھی، ان میں سے ایک موقع کتاب الاکراہ ''باب اذا اکرہ حتی وھب عبدا أو باعہ لم یجز ''میں ہے جہاں بخاری نے امام اعظم کی طرف کی حسب عادت ''بعض الناس'' کہہ کر دو فقہی قول منسوب کئے جن میں باہم تضاد ثابت ہوتا ہے، حضرت نے بتایا کہ ان قولوں کی یہ نسبت ہی (امام اعظم کی طرف) صحیح نہیں ہے، تفصیل کے لئے باب مذکور اور اس کا حاشیہ (اصح المطابع کی مطبوعہ بخاری میں صفحہ ۱۰۲۷ حاشیہ ۱۲، ۱۳ دیکھا جائے۔

مثال ۵ (سند میں امام بخاری کی غلطی کی نشاندہی)

یہ بات بڑی ہی تعجب خیز اور بظاہر چونکا دینے والی ہے کہ امام نانوتوی، امام بخاری جیسے عظیم محدث کی سند حدیث میں غلطی پکڑیں، مگر واقعہ کو کس طرح جھٹلایا جائے کہ بخاری شریف کے اس حاشیہ کا مطالعہ کرنے والا بظاہر یہ چونکا دینے والی حقیقت اپنی آنکھوں سے (صفحہ ۱۰۴۶ پرج ۲) کتاب الفتن ''باب قول النبی صلی اللہ علیه وسلم ویل للعرب من شر قد اقترب '' میں دیکھ سکتا ہے، جہاں امام بخاریؒ نے ایک حدیث بایں سند نقل فرمائی ہے: مالك بن اسمعیل قال حدثنا ابن عیینة أنه سمع الزهری عن عروة عن زینب بنت أم سلمة عن أم حبیبة عن زینب بنت جحش ''اس پر امام نانوتوی تحریر فرماتے ہیں: قوله عن زینب بنت أم سلمة عن أم جیبة أه قالوا هذا الاسناد منقطع وصوابه کما فی صحیح مسلم زینب عن حبیبه عن ام سلمة عن ام حبیبه عن زینب بزیادة حبیبة ''اگرچہ آخر میں ایک توجیہ ایسی بھی ذکر کردی جس سے امام بخاری کے مرتبے کی لاج رہ جائے۔

مثال ۶ (امام نانوتوی کی تاریخ پر وسیع نظر کا ثبوت)

امام بخاریؒ نے کتاب الاحکام، ''باب کیف یبایع الامام الناس''صفحہ ۱۰۶۹ میں یہ حدیث موقوف ذکر فرمائی ہے:...... حدثنا عبداللہ بن دینار قال شهدت ابن عمر حیث اجتمع الناس علی عبدالملك ... الخ اس پر امام نانوتوی نے بڑا ہی مفصل حاشیہ لکھا ہے جو موصوف کی تاریخ پر وسیع نظر کا آئینہ دار ہے، یہاں اس کے جستہ جستہ حصے پیش کئے جارہے ہیں،

فرماتے ہیں: قـولـه حيـث اجتـمـع الناس على عبدالملك يريد ابن مروان بن الحكم والـمراد بالاجتماع اجتماع الكلمة وكانت قبل ذلك متفرقة وكان في الأرض قبل ذلك اثنـان كـل مـنهـما يدعى له الخلافة وهما عبدالملك بن مروان وعبدالله ابن الـزبيـر فـأمـا ابـن الـزبيـر فكان أقام بمكة .... بعد موت معاوية وامتنع من المبايعة ليـزيـد بـن مـعـاوية فـجهـز اليه يـزيد الجيوش مرة بعد أخرى فمات يزيد وجيشه مـحـاصـرون ابـن الـزبيرو لم يكن ابن الزبير ادعى الخلافة حتى مات يزيد في ربيع الأول سـنة أربـع وستيـن فبـايـعـه الـنـاس بـالـخـلافة و بايع أهل الأفاق لمعاوية بن يزيد.... فلم يعش الا نحواربعين يوما فبايع معظم الأفاق لعبد الله ابن الزبيرو انتظم لـه الـمـلك ...ولـم يتـخـلف عـن بيعته الاجميع بنى أمية ومن يهوى هواهم وكانوا بفلسطين فاجتمعوا علي مروان بن الحكم و بايعوه بالخلافة و خرج بمن أطاعه الى جهة دمشق. والـضـحـاك بـن قيـس قـد بايع فيها لابن الزبير فاقتتلوا ...؟ و غلب مـروان عـلـى الشـام ثـم ... تـوجـه الى مصرفحاصربها عامل ابن الزبير حتى غلب عـليهـا ثـم مـات فـى سـنة .... وعهد إلى ابنه عبدالملك فقام مقامه وكمل له ملك الشـام ومـصـر والـمغرب ولابن الزبير ملك الحجاز والعراق والمشرق إلا البصرة غـلـب عـليـه المختار بن عبيد ثم صار اليه مصعب بن الزبير... وانتظم أمر العراق كـله لابن الزبير فصار عبدالملك الى مصعب فقاتله و ملك العراق كله ولـم يبق مع ابن الزبير الا الحجاز واليمن فقط فجهز اليه عبدالملك الحجاج فحاصره .... إلى أن قتـل عبـدالله ابن الزبير في جمادى الأولى سنة ٧٣ وكـان عبـدالله بن عمر فى تـلك الـمـدة امتـنـع أن يبـايـع لابـن الـزبيـر و عبـدالملك كما امتنع أن يبايع لعلى ولـمـعـاوية ثم بـايـع لمعاوية لما اصطلح مع الحسن بن علي واجتمع الناس وبايع لـمـعـاوية بن يزيد بعد موت معاوية لاجتماع الناس عليه ثم امتنع من المبايعة لأحد حـال الاختـلاف إلى أن قتل ابن الزبير و انتظم الملك كله لعبد الملك فبايع حينئذ فهذا معنى قوله لما اجتمع الناس" (بحذف يسير)

حواشی کے بارے میں کچھ اور

یہاں بس ان چند نمونوں کے پیش کرنے پر اکتفا کیا جارہا ہے ہوسکتا ہے کسی کو یہ احساس ہو کہ اختلافی مسائل پر فقہ حنفی کو ترجیح دینے کی ایک بھی مثال نہیں پیش کی گئی مگر راقم نے جان بوجھ کر اس سے گریز کیا کیونکہ اس کے نمونے تو جابجا ملتے ہیں، بلکہ ان میں یہی پہلو غالب ہے جس کی طرف اشارہ خود اولین سوانح نگار مولانا کے ہمدم وہم ساز مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ نے حواشی کی خصوصیات ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

> ''اور وہ جگہ (جس پر حضرت نانوتویؒ نے قلم اٹھایا) بخاری میں سب جگہ سے زیادہ مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنیفہ کا جو اول سے التزام ہے اور اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کئے ہیں اور ان کے جواب لکھے، معلوم ہے کہ کتنے مشکل، اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھے اور سمجھے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے''۔

حضرت مولانا یعقوب صاحبؒ حاشیہ کی ایک مزید خصوصیت یہ بتاتے ہیں:

> ''اور اس حاشیہ میں یہ التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے''

ان دونوں خصوصیتوں کے اس حاشیہ میں موجود ہونے کی ہر وہ شخص شہادت دے گا جس نے ان کا تھوڑا بہت بھی حتیٰ کہ چند صفحوں کا بھی مطالعہ کیا ہے، بے سند کتاب کے (بغیر حوالہ کے) کوئی بات نہ لکھنے کا اندازہ اس فہرست سے کیا جاسکتا ہے، جو شروع کتاب میں (پہلی جلد کی ابتداء میں) اصل محشی مولانا احمد علی صاحبؒ نے درج فرمائی ہے، اس میں مختلف علوم وفنون کی ۶۴ کتابوں کے نام لکھنے کے بعد وغیر ذلك فرمایا، جس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ ان کتابوں کے علاوہ بھی دیگر کتابوں سے حاشیہ لکھتے ہوئے استفادہ کیا گیا ہے یقیناً وہ سب مراجع حضرت نانوتوی کے بھی پیش نظر رہے ہوں گے (اب سے ڈیڑھ سو سال پہلے جب کہ مطبوعہ کتابوں بالخصوص فن حدیث سے متعلق کی کمیابی بلکہ نایابی کی شکایت عام تھی کے پیش نظر فہرست میں مندرج تعداد غیر معمولی ہی سمجھی جائے گی)۔

حنفیت کی تائید

صاحب سوانح نے دوسری خصوصیت (حنفیت کی تائید) سے متعلق جو کچھ لکھا وہ بھی ہر ایک واقف پر عیاں ہے، اس کا التزام یوں تو ہندوستان کے تقریباً سبھی حنفی شارحین حدیث وحاشیہ نگاروں

نے کیا ہے، کیوں کہ ان کا مسلک یہی (فقہ حنفی) تھا، مگر حضرت الامام النانوتویؒ کے لئے ایک اور محرک بھی تھا جس کا ذکر مولانا مناظر احسن گیلانی (مفصل سوانح قاسمی کے مصنف اور نہایت ذہین اور کثیر المطالعہ والتصانیف متبحر عالم) نے سوانح قاسمی" کی جلد اول میں تفصیل سے کیا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت الامام نے ایک خواب دیکھا تھا کہ:

''کعبہ کی چھت پر کسی اونچی شے پر بیٹھا ہوں اور کوفہ کی طرف میرا منہ ہے اور ادھر سے ایک نہر آئی ہے، جو میرے پاؤں سے ٹکرا کر جاتی ہے''

اس خواب کی تعبیر مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ دی کہ:

''خواب دیکھنے والے شخص سے مذہب حنفی کو تقویت ہوگی''

(مولانا کے بارے میں مشہور ہے کہ موصوف کو تعبیر خواب کا ملکہ حاصل تھا) اس خواب کے تذکرہ کے بعد مولانا گیلانی تحریر کرتے ہیں:

میرے نزدیک اس میں اشارہ ہے... کہ تیرھویں صدی (ہجری) کے آخر میں مسلمانان ہند کی دینی زندگی کی وحدت کو جو شدید خطرہ فتنہ غیر مقلدیت کے طوفان کی وجہ سے پیش آ گیا تھا اور قریب تھا کہ یک جہتی کا شیرازہ بکھر کر پراگندہ ہو جائے، شتر بے مہاری کے اس سیلاب میں ڈر تھا کہ سلف کے سارے کارنامے شاید تہ و بالا ہو کر رہ جائیں، اس کڑے وقت اور کٹھن گھڑیوں میں درس حدیث کے قاسمی یا دیوبندی طریقہ کی خصوصیت نے کام کیا... کہ فرقہ اہل حدیث کی طرف سے امام ابوحنیفہ اور ان کے اجتہادی مسائل پر جو حملے پہلے ہوئے یا اس وقت تک ہوتے رہتے ہیں، ان حملوں کے مقابلوں میں محدثانہ تحقیقی رنگ میں جواب دینے کی جتنی اچھی صلاحیت دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتوں میں پائی جاتی ہے انصاف کی بات یہ ہے کہ اس کی نظیر ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ بیرون ہند کے اسلامی ممالک کے علماء میں بھی مشکل ہی سے مل سکتی ہے (۳)

مولانا احمد علیؒ اور امام نانوتویؒ کے حاشیے میں کیا فرق ہے؟

(۳) سوانح قاسمی جلد اول ۱۳۴، از مولانا گیلانی مطبوعہ دارالعلوم دیوبند)

حضرت مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے حواشی بخاری شریف کے تین چوتھائی سے زیادہ حصے پر ہیں، صرف آخر کے پانچ چھ پاروں (تیس پاروں میں سے) پر حضرت مولانا نانوتوی کے حاشیہ کا ذکر مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے کیا ہے، لیکن متعین اور یقینی طور پر اس کا پتہ کسی اور ذریعہ سے نہیں چلتا کہ واقعتاً کتنے پاروں پر حضرت الامام نے تحشیہ کا کام کیا، مولانا محمد یعقوب صاحبؒ نے بھی حتمی انداز میں تعیین نہیں کی (پانچ چھ پارے کی تعبیر اختیار کر کے گویا ابہام چھوڑ دیا) ہم جیسے قلیل البضاعت لوگوں کا منصب نہیں کہ دونوں میں تقابل کر سکیں، پھر بھی مطالعہ کرنے سے مولانا سہارنپوری کے یہاں نسبتاً اختصار اور حضرت نانوتوی کے یہاں تفصیل کا فرق دریافت ہوتا ہے اور یہ فرق آخر کے تین پاروں کے حواشی میں زیادہ نمایاں معلوم ہوتا ہے شاید اسی بنا پر بعض اہل بصیرت کا خیال ہے کہ حضرت نانوتوی نے آخر کے تین پاروں پر ہی حواشی لکھے (واللہ اعلم)۔

مولانا محمد ابوبکر غازی پوری*

مناظر اسلام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتویؒ

حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم النانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ایسی ہمہ جہت عبقری شخصیت کے مالک تھے کہ ان کی زندگی کا ہر کارنامہ اپنی جگہ منفرد اور بے مثال نظر آتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعد متحدہ ہندوستان میں اسلامی تعلیمات، اقدار اور تہذیب کی شمع کو کلیسا کی تیز و تند آندھی سے محفوظ رکھنے کے لئے دار العلوم دیوبند کی شکل میں جو اُنھوں نے ایمانی و عرفانی فانوس قائم کی وہ آپ کی دینی بصیرت اور ایمانی حمیت کی زندہ یادگار کے طور پر آج بھی موجود ہے۔ اور حضرت نانوتویؒ کے کارناموں میں سرفہرست ہے۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس کا اعتراف ہر خاص و عام کو ہے لیکن مولانا نانوتویؒ نے عیسائیت، آریہ سماج اور دیگر اسلام مخالف مذاہب کا جس عزیمت کے ساتھ مناظرہ و مباحثہ کے ذریعہ ردو ابطال کیا ہے اس کی تفصیلات سے عوام تو کیا علماء کرام تک پورے طور پر واقف نہیں ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا نانوتویؒ اپنے دیگر علمی کمالات کے ساتھ ایک باکمال اور کامیاب ترین مناظر بھی تھے۔ کسی اچھے مناظر کے لئے ضروری ہے کہ وہ پختہ علمی صلاحیت کا مالک ہو۔ جس حلقے کی نمائندگی کر رہا ہو اس کے نظریات، خیالات، معتقدات اور مستدلات پر بصیرت مندانہ گہری نظر کا حامل ہو۔ دوسری طرف فریق مخالف کے مذہب و عقائد سے پوری واقفیت ہو۔ اس کے استدلالات پر بھی نظر ہو۔ اور فریق مخالف کی کمزوریوں سے بھی واقفیت ہو۔ ساتھ ہی ساتھ خود اعتمادی اور عزیمت کا ایسا پیکر ہو کہ فریق مخالف کا کوئی حربہ بھی اس پر اثر انداز نہ ہو سکے اور کوئی بھی یلغار اس کے پائے استقامت میں جنبش پیدا نہ کر سکے۔ انداز بیان و تحریر ایسا مؤثر ہو جو دانشمند اور صاحب علم طبقہ کو بھی مطمئن کر سکے اور عوام پر بھی اثر انداز ہو۔

---

* قاسمی منزل، سیدواڑہ، غازی پور (یوپی)

مولانا نانوتویؒ کے مناظروں اور مباحثوں کی جو تفصیلات ہمیں سوانح نگاروں کے توسط سے ملتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ ان ساری مناظرانہ خصوصیات کے بہ درجۂ اتم پیکر و مظہر تھے۔

اور یہ بات تو انتہائی حیرت انگیز ہے کہ وہی مولانا نانوتویؒ جن کی تفصیلات کی گہرائی تک بڑے بڑے اہل علم کی رسائی دشوار معلوم ہوتی ہے۔ اور ۱۴۔۱۴ مرتبہ آب حیات کا مطالعہ کرنے کے بعد مولانا شبیر احمد عثمانی جیسا متبحر عالم یہ کہنے پر مجبور ہو کہ کتاب سے کچھ کچھ مناسبت ہو گئی ہے، وہی مولانا نانوتوی جب میلۂ خداشناسی میں پادری نولس، پادری واکر اور پنڈت دیانند سرسوتی کے خلاف مجمع عام میں گوہر فشاں ہوتے ہیں تو نہ صرف یہ کہ دانشور اور اہل علم طبقہ مولانا کے طرز بیاں اور قوت استدلال سے مسحور نظر آتا ہے بلکہ ناخواندہ عوام بھی پورے طور پر محظوظ ہوتے ہیں اور باطل کے مقابلہ میں حق کی نمایاں فتح کو محسوس کرتے ہیں۔ اس باب میں حضرت نانوتوی علیہ الرحمۃ کا ایک نمایاں کمال یہ بھی ہے کہ حضرت نے بیک وقت ایسے مختلف النوع موضوعات پر مناظرہ اور تحریر و تصنیف کا بیڑہ اٹھایا ہے جو ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں۔

ایک طرف عیسائیوں سے نبرد آزما نظر آتے ہیں تو دوسری طرف آریہ سماجیوں سے لوہا لینے میں مصروف ہیں۔ کبھی رد شیعیت کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں، کبھی غیر مقلدین کے تفردات کا رد بلیغ فرما رہے ہیں۔

اگرچہ مولانا نانوتویؒ کے دوبدو مناظروں کی تعداد زیادہ نہیں ہے لیکن اس سلسلہ کی مختصر و مفصّل تصانیف اور رسائل انتہائی وقیع ہیں۔ اس طرح آپ کی مناظرانہ کاوشوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ تقریری مناظرے۔ تحریری مباحثے۔

اس تمہید کے بعد ہم ذیل میں حضرت نانوتوی کے مناظروں کی کچھ تفصیل پیش کرنا چاہیں گے۔

پہلی گفتگو

حضرت نانوتویؒ جن دنوں مطبع مجتبائی دہلی میں تصحیح کا کام کرتے تھے اور وہیں مقیم تھے، انھیں ایام میں ایک ہندو عیسائی ماسٹر تاراچند عیسائیت کے فضائل اور مناقب کے بیان میں بڑا پر جوش تھا اور مجمع عام میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر اعتراضات کرتا تھا۔ حضرت نانوتوی نے

جب تفصیل سنی تو اپنے شاگردسے فرمایا کہ تم لوگ بھی مجمع عام میں جاؤ اور تاراچند کی باتوں کا جواب دو۔ اور اس کی باتوں کا رد کرو۔ ایک دن آپ اپنے کو نہ روک سکے خود ہی عام آدمیوں کی وضع قطع اور معمولی لباس میں تاراچند کے پاس پہنچے اور چند باتوں میں اس کو اس طرح گھیرا کہ اس کی ساری چوکڑی بھول گئی اور جواب کے لئے اس کی زبان ہی نہ کھل سکی جبکہ مجمع عام میں گفتگو ہو رہی تھی۔ وہ نہایت خفیف اور رسوا ہوا۔ وہاں سے اٹھا اور اپنی قیام گاہ کی طرف چل دیا۔

میلۂ خداشناسی

اب پادریوں نے بھی یہ طریقہ اپنایا کہ کسی مسلمان یا ہندو کا نام استعمال کرتے اور ان کے نام سے اجتماعات کرتے۔ در پردہ ساری پلاننگ پادریوں کی ہوتی تھی بس منتظم کوئی ہندوستانی ہوتا تھا۔ اس طرح کی ایک کوشش ضلع شاہجہاں پور میں ایک کبیر پنتھی ہندو کے ذریعہ کی گئی۔ اور اجتماع کا نام ''میلۂ خداشناسی'' رکھا گیا۔

اس کے داعی منشی پیارے لال چاند پور ضلع شاہجہاں پور کے ایک جاگیردار تھے۔ شاہجہاں پور میں ایک مشن اسکول تھا اس کا ہیڈ ماسٹر ایک انگریز پادری تھا، جس کا نام مسٹر نولس تھا، دونوں میں رسم و راہ تھی۔ مسٹر نولس نے پیارے لال کو تیار کیا کہ وہ اپنی مملوکہ زمین اور باغ موضع سربانگ پور ملحق سوانہ چاند پور ضلع شاہجہاں پور میں ایک میلہ کا انتظام کریں، اس میلے کا نام ''میلۂ خداشناسی'' ہو۔ اس میلہ میں ہندو اور مسلمان دونوں کو جمع کرو اور کوشش کرو کہ اطراف و جوانب کے عوام بڑی تعداد میں شریک میلہ ہوں۔ پادری نولس کا مقصد یہ تھا کہ اس دیار کے مسلم وغیر مسلم جمع ہوں گے اور اس مجمع میں سوال و جواب اور اعتراضات کا ایک دفتر کھول کر مسلمان علماء کی زبان اگر بند کر دی گئی تو تبلیغ عیسائیت کی راہ کی ساری دشواریاں ایک دن میں ختم ہو جائیں گی۔ پادری نولس کو کچھ تو اپنی قابلیت پر زیادہ بھروسہ تھا دوسرے چند بڑے بڑے پادریوں سے بھی اس کا رابطہ تھا اور ان کو میلے میں لانے کا منصوبہ تھا، اس لئے اس کو یقین تھا کہ سارے پادری مل کر اپنے زور بیاں، زور دلائل اور حاکمانہ رعب داب سے مسلمانوں کی زبان بند کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اس میلہ کو خوب شہرت دی گئی، اس میں یوروپین پادریوں کے علاوہ دیسی پادریوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی اور سناتن دھرم کے نمائندوں کے ساتھ حضرت نانوتویؒ

اور بعض دیگر علماء کو بھی دعوت نامے بھیجے گئے۔

اس مباحثہ کی تفصیلی روداد حضرت نانوتویؒ کے تلمیذ رشید مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ نے ''مباحثہ شاہجہاں پور'' کے نام سے مرتب کی اور اسی زمانہ میں وہ شائع بھی ہوگئی۔

مباحثہ شاہجہاں پور کے اقتباسات کی روشنی میں مولانا اسیر ادروی نے اپنی کتاب ''مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے'' میں مباحثہ کا نقشہ بڑے ہی دلچسپ انداز میں کھینچا ہے۔

اس مباحثہ میں اہل اسلام کو کھلی فتح نصیب ہوئی۔ پادریوں کا منہ کالا ہوا اور موافق ومخالف ہر ایک کو اس کا اعتراف تھا کہ میدان نیلی لنگی والے (حضرت نانوتویؒ) کے ہاتھ رہا۔

اس میلہ کے پس پردہ پادریوں اور سناتن دھرمیوں کی جو سازش تھی وہ بری طرح ناکام ہوگئی۔

اس موقعہ پر اسلام کی حقانیت اور عیسائیت کی تردید میں حضرت نانوتوی نے جو مفصل اور برجستہ تقریریں فرمائی ہیں ان میں تعلّی اور خودستائی کی معمولی سی بو بھی نہیں ہے۔

اس مباحثہ میں اہل اسلام کو ایک نمایاں کامیابی یہ حاصل ہوئی کہ حضرت نانوتویؒ اور ان کے معاونین نے تمام دیسی اور یوروپین پادریوں سے برملا یہ اقرار کرالیا کہ موجودہ انجیل محرف ہے۔ اور انجیل کا وہ نسخہ بھی پیش کردیا جس میں موجود ایک عبارت کے بارے میں کئی سرکردہ پادریوں کا یہ حاشیہ موجود ہے کہ ''یہ الفاظ کسی قدیم نسخے میں نہیں پائے جاتے''۔ پادریوں کی اسی شرمناک شکست سے ان کا وہ خواب چکنا چور ہوگیا جو ہندوستان میں بے روک ٹوک عیسائیت کے فروغ کے لئے انہوں نے دیکھا تھا۔

اس مباحثہ کے دوران ایک مرحلہ وہ بھی آیا جب بانی آریہ سماج پنڈت دیانند سرسوتی نے بھی اسلام کے خلاف اپنے خودساختہ مذہب کی حقانیت کو ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی اور اس طرح اسلام کے خلاف پادری اور پنڈت جی ایک دوسرے کے ہمنوا ہو گئے۔ ان دونوں کے جواب میں حضرت نانوتویؒ نے جو تقریر فرمائی وہ بھی ایک شاہکار تقریر ہے۔ اور اس کے بعد پھر مخالفین میں گفتگو کی سکت باقی نہیں رہی۔

رڑکی کا محاذ

ہندوؤں میں ایک نیا مذہب آریہ سماج کے نام سے پیدا ہوا جس کا بانی پنڈت دیانند سرسوتی تھا جو بظاہر مورتی پوجا کے خلاف تھا اور خود کو وحدانیت کا علمبردار کہتا تھا۔ بے حد گستاخ اور بدزبان انسان

تھا۔ اسلام، شعائر اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف زہر افشانی اس کا خاص مشغلہ تھا۔ اس نے ستیارتھ پرکاش نامی ایک کتاب بھی لکھی تھی۔ دیانند سرسوتی کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی۔

یہ شخص شہروں شہروں گھوم کر اسلام کے خلاف دل آزار اور زہر آلود تقریریں کرتا تھا۔ ۱۸۷۸ء ۱۲۹۵ھ میں دیانند سرسوتی رڑکی پہنچا اور وہاں بھی تقریروں کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کا لب ولہجہ انتہائی دل آزار اور جارحانہ ہوتا تھا۔ ان تقریروں کی وجہ سے رڑکی کے مسلمانوں میں بے چینی اور غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی۔ رڑکی کے ذمہ دار مسلمانوں نے حضرت نانوتویؒ کو صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے گذارش کی کہ آپ رڑکی تشریف لائیں تا کہ اس کی ہفوات کا سلسلہ بند ہو۔ حضرت نانوتویؒ کی صحت ان دنوں ٹھیک نہیں تھی۔ طبیعت مسلسل ناساز چل رہی تھی۔ حضرت نانوتوی نے اپنے تلامذہ میں سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحبؒ، مولانا فخر الحسن صاحب گنگوہیؒ اور عبدالعدل صاحبؒ کو رڑکی روانہ کیا اور کہا کہ اگر ضرورت سمجھیں تو پنڈت جی سے بالمشافہ گفتگو کرلیں اور ان سے سوال وجواب کر لیں اور پھر مجمع عام میں پنڈت جی کے اعتراضات کے جوابات دے دیں۔ ان حضرات نے راستہ میں جوالا پور سے مولانا منظور احمد رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ساتھ لے لیا اور چاروں حضرات رڑکی پہونچے۔ ادھر صورت حال یہ تھی کہ پنڈت جی تقریریں تو رڑکی کے شہری علاقہ میں کرتے تھے مگر ان کا قیام فوجی چھاؤنی کے علاقہ میں تھا۔ فوجی ایریا ہونے کی وجہ سے کسی کا وہاں تک پہونچ پانا بہت دشوار تھا۔ پھر بھی کسی طرح یہ علماء کرام وہاں کے چند معزز مسلمانوں کو لیکر پنڈت جی کی قیام گاہ پر پہونچ ہی گئے۔ اور پنڈت جی سے مطالبہ کیا کہ یہ علماء کرام تشریف لائے ہیں آپ کے جتنے اعتراضات ہیں پیش کیجئے یہ سب کا جواب دیں گے۔ لیکن پنڈت جی کسی قیمت پر گفتگو کے لئے تیار نہیں ہوئے اور بڑی ہٹ دھرمی سے جواب دیا کہ مجھے آپ لوگوں سے کوئی بات نہیں کرنی ہے نہ میں نے چیلنج کیا ہے۔ ہاں اگر مولانا قاسم صاحب آجائیں گے تو ان سے گفتگو کے لئے تیار ہوں، مجبوراً یہ لوگ واپس آگئے اور حضرت کو صورت حال سے آگاہ کیا۔

ادھر پنڈت جی کی زہر افشانی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ اہل رڑکی کی طرف سے حضرت نانوتویؒ سے دوبارہ گذارش کی گئی کہ جناب تشریف لائیں تا کہ اس فتنہ کا قلع قمع ہو۔

حضرت نانوتویؒ نے سمجھ لیا کہ بغیر سفر کے چارۂ کار نہیں ہے۔ صحت سفر کے لائق نہیں تھی لیکن اپنے مذکورہ بالا چاروں شاگردوں کے ساتھ حضرت نانوتوی رڑکی پہونچے۔

حضرت نانوتویؒ کے رڑکی پہنچتے ہی ہر طرف سے مسلمانوں کے وفود آنے لگے اور آپ کی قیام گاہ پر ایک جم غفیر جمع ہو گیا۔ آپ شہری علاقہ میں قیام پذیر تھے اور پنڈت جی وہاں سے ڈیڑھ میل کی مسافت پر فوجی ایریا میں براجمان تھے۔ آپ نے ایک تحریر لکھی کہ میں آ گیا ہوں وقت متعین کر کے فوراً مطلع کیجئے، مناظرہ کی جو شرائط ہوں اور جس موضوع پر بھی مناظرہ منظور ہو وہ سب ہم کو تسلیم ہے، ہماری طرف سے کوئی شرط نہیں۔ یہاں آپ کے جواب کے انتظار میں بیٹھا ہوں۔ چونکہ ان میں مناظرہ کی ہمت تو تھی نہیں اس لئے ہزاروں بہانے کئے، نہ تاریخ مقرر کی، نہ آنے کا وعدہ کیا۔

مولانا نے دوسری اور پھر تیسری تحریر بھیجی لیکن پنڈت جی کسی طرح قابو میں نہیں آئے۔ واقعات میں تفصیل بہت ہے مختصر یہ کہ حضرت نانوتویؒ نے تدبیر سے کسی طرح پنڈت جی کو گھیر لیا اور ان کو کسی بھی قیمت پر گفتگو کرنے کے لئے مجبور کیا مگر وہاں تو معاملہ دوسرا تھا۔ پنڈت جی نے راتوں رات رڑکی سے راہ فرار اختیار کر لی۔

حضرت نانوتویؒ نے اپنے چاروں شاگردوں سے فرمایا کہ شہر کے مختلف علاقوں میں روزانہ جلسے کرو اور آریہ سماجیوں کے ایک ایک عقیدہ کو کھول کر رکھ دو، اور انکے اعتراضات کے مفصّل جواب دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا یہ حضرات پندرہ دن رڑکی میں مقیم رہے۔

آخر میں حضرت نانوتویؒ نے خود تین دنوں تک مسلسل وعظ فرمایا۔ آپ نے مذہب اسلام کی حقانیت پر ایسے ایسے عقلی، تجرباتی اور مشاہداتی دلائل و براہین بیان فرمائے کہ غیر مسلم بھی کچھ دیر کے لئے حیرت زدہ رہ گئے۔

پنڈت جی میرٹھ میں

رڑکی کا طوفان تھمنے کے کچھ ہی مہینوں کے بعد پنڈت جی میرٹھ پہونچے اور وہاں بھی وہی طوفان بدتمیزی اٹھانا شروع کیا۔ حضرت نانوتویؒ کو اطلاع ہوئی اور اپنی شدید علالت کے باوجود میرٹھ تشریف لے گئے۔ یہاں بھی پنڈت جی کو گھیر گھار کر گفتگو کے لئے آمادہ کرنا چاہا مگر وہ کسی طرح تیار نہیں ہوئے اور آخر کار چپکے سے میرٹھ سے بھی بھاگ کھڑے ہوئے۔

آریہ سماجیوں کا فتنہ جس تیور کے ساتھ اٹھا تھا اگر حضرت نانوتویؒ اور ان کے تلامذہ نے اس پامردی اور اولوالعزمی کیساتھ اس کا تعاقب نہ کیا ہوتا تو معلوم نہیں حالات کا کیا رُخ ہوتا۔

حضرت نانوتویؒ نے آریہ سماجیوں کا تعاقب صرف بالمشافہہ گفتگو اور تقریروں ہی کے ذریعہ نہیں کیا بلکہ پنڈت دیانند اور اس کے ٹولہ کی طرف سے اسلام پر کئے جانے والے تمام اعتراضات کے جواب میں متعدد وقیع علمی کتابیں اور رسائل بھی تصنیف فرمائے۔

تحفۂ لحمیہ، انتصار الاسلام، جواب ترکی بہ ترکی، قبلہ نما، حجۃ الاسلام اور تقریر دل پذیر، حضرت نانوتویؒ کی اسی سلسلہ کی تصانیف ہیں۔

ردشیعیت

شیعہ نوابوں اور امراء کی سرپرستی اور عوام الناس کی جہالت کی وجہ سے بہت سے شیعی عقائد سنی مسلمانوں میں بھی پھیل گئے تھے۔ اور بہت سی خالص شیعی رسومات ان میں رائج ہو گئی تھیں۔ علاوہ ازیں شیعہ اپنے مزعومات کو اسلامی تعلیمات کا رنگ دینے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے تھے۔

حضرت نانوتویؒ رحمۃ اللہ علیہ نے ردشیعت کے سلسلہؒ میں کئی رسائل لکھے اور اپنے مکاتیب میں بھی ان موضوعات پر متعدد خطوط تحریر فرمائے ہیں۔

شیعہ مجتہد سے مباحثہ

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام جن دنوں میرٹھ میں تھا اسی زمانہ میں ایک شیعہ مجتہد سے حضرت نانوتویؒ کا ایک بہت ہی دلچسپ مباحثہ ہوا۔ یہ مجتہد صاحب شیعوں کے بہت بڑے عالم سمجھے جاتے تھے اور اہل سنت کے لئے شمشیر برہنہ مانے جاتے تھے۔ مگر حضرت نانوتویؒ سے انکی ملاقات ان کے لئے حادثہ بن گئی۔

اس ملاقات کی داستان خود حضرت نانوتویؒ نے اپنے ایک دوست حکیم ضیاء الدین رامپوریؒ کے نام خط میں بہ زبان فارسی تحریر فرمائی ہے۔

حضرت نانوتویؒ نے عام وضع قطع میں مجتہد صاحب سے ملاقات کی اور اُن کے استفسار پر اپنا تعارف تاریخی نام خورشید حسن کے ذریعہ کرایا۔ گفتگو زیادہ طویل نہیں ہوئی لیکن تھوڑی ہی دیر میں مجتہد

صاحب کی ہمہ دانی کا راز کھل گیا اور ان کے لئے خاموشی کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں بچا۔

غیر مقلدین کے بالمقابل

غیر مقلدیت کا فتنہ ابھی جلد ہی شروع ہوا تھا، اوران کی طرف سے چھیڑ چھاڑ جاری تھی، حضرت نانوتویؒ نے غیر مقلدین کے رد میں مختلف فیہ مسائل میں متعدد رسائل تصنیف فرمائے اور اپنے مکتوبات میں بھی ان مسائل پر کلام فرمایا۔ جمعہ فی القریٰ، رکعات تراویح، قرأت فاتحہ خلف الامام اور حیاۃ النبی کے مسائل پر حضرت کے رسائل ومکاتیب اہل علم کے لئے سرمۂ بصیرت ہیں۔

اس کے علاوہ بدعات اور جاہلانہ رسومات ومعتقدات کے خلاف بھی متعدد رسائل اور مکاتیب تحریر فرمائے۔

مختصر یہ کہ حضرت نانوتویؒ نے پرچم اسلام کی سربلندی اورحریم سنت کی پاسبانی کے لئے ہر محاذ پر لوہا لیا اور تقریر وتحریر، مناظرہ مباحثہ کے ذریعہ وہ بے مثال کارنامہ انجام دیا جو ایک جماعت سے بھی ممکن نہ تھا۔ (۱)

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھیں۔ حضرت نانوتوی کے رسائل۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی حیات اور کارنامے، تالیف: مولانا اسیر ادروی۔ سوانح قاسمی، تالیف: مولانا مناظر احسن گیلانی۔

مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی*

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مکتوبات گرامی، ان کے مضامین اور مکتوب الیہ

(مختصر تعارف)

قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعہ کی ذات گرامی سے علم کے جو دھارے بلکہ دریا جاری ہوئے ان کی وسعت وثروت اور ثمرات ومنافع کا جائزہ لینا اور اندازہ کرنا کسی ایک آدمی کے بس کی بات نہیں، آج برصغیر بلکہ دنیا کے تمام ملکوں اور براعظموں کا کون ساخطہ ایسا ہے جہاں حضرت مولانا کی ذات عالی سے جاری فیضان کے چشمے نہیں ابل رہے اور خصوصاً برصغیر ہندو پاکستان میں علم نافع یعنی علوم دین وشریعت کی کون سی شاخ اور کون سا چمنستان ایسا ہے جو فیضان قاسمی سے منور اور کسی نہ کسی راستہ اور واسطہ سے علوم قاسمی سے فیضاب وبہرہ ور نہیں ہے؟

مگر یہ بات اہم اور حیرت انگیز ہے کہ حضرت مولانا کا یہ فیضان ''دارالعلوم دیوبند'' کے علاوہ آپ کی صرف چند تصانیف کی برکت اور آپ کے ان علوم کا ایک پرتو ہے، جن کا بہت کم حصہ قلم بند ہوا اور جو قلم بند ہوا اس میں سے خاصا حصہ محفوظ نہیں رہ سکا اور جو محفوظ اور باقی رہا وہ بھی پورا کا پورا نہیں چھپا اور اس کا تقریباً ایک تہائی حصہ یا کچھ کم ابھی تک اشاعت سے محروم ہے، لیکن حضرت کے علوم کا جس قدر بھی سرمایہ محفوظ ہے اس میں حضرت کا اپنا لکھا ہوا بڑا حصہ وہ ہے جو حضرت کے مکتوبات میں محفوظ ہوگیا ہے۔ حضرت کی تصانیف بہت کم ہیں، کیوں کہ حضرت مولانا کی تصنیف کی طرف توجہ کم تھی، لیکن جس قدر بھی ہیں ان میں سے کم ایسی ہیں جو شروع سے آخر تک حضرت نے تحریر فرمائی ہوں، بے شک کچھ تصانیف تو ایسی ضرور ہیں جو حضرت مولانا نے خود لکھی ہیں، مگر حضرت کے نام سے معروف کتابوں میں زیادہ تر وہ ہیں جو حضرت مولانا نے لکھنی شروع کی تھیں مگر ان کو پورا کرنے کا موقع

* محلہ مولویان، کاندھلہ، مظفر نگر (یوپی)

نہیں ملا۔ مولانا کے کسی شاگرد نے اس کو پورا کیا، یا کوئی تقریر تھی جس کو کسی نے لکھ لیا اور ایسا بھی ہے کہ حضرت کے افادات کو کسی شاگرد نے مرتب کیا اور وہ کتاب حضرت کے نام سے چھپی اور اسی حیثیت سے مشہور ہوئی، لیکن حضرت مولانا کے مکتوبات کا معاملہ اس سے مختلف ہے، حضرت مولانا کے جو مکتوبات چھپے ہوئے ہیں یا معلوم ہیں حضرت مولانا سے ان کی نسبت ہر پہلو سے مستند ہے، خطوط کا بہت بڑا حصہ خود مولانا کے اپنے قلم کا لکھا ہوا ہے اور جو خطوط املاء کرائے ہیں ان کا حرف حرف حضرت مولانا کی زبان سے نکلا ہوا یا مولانا کی ہدایت کے مطابق لکھا ہوا ہے اور ان مکتوبات میں جو کچھ بھی علمی افادات، ذاتی احوال اور دوسری معلومات ہیں اس میں کسی دوسرے کی شرکت کا سوال ہی نہیں۔ اس پہلو سے قطع نظر اگر بحیثیت مجموعی بھی دیکھا جائے تو بھی مکتوبات کا حصہ اپنی معنویت اور علمی افادی پہلو میں اگر تصانیف کے ذخیرہ سے زیادہ نہیں تو کچھ کم بھی نہیں ہے۔

حضرت مولانا کے مکتوبات کی جمع و ترتیب کا کام سب سے پہلے کب شروع ہوا اور کس نے انجام دیا اس کی تحقیق نہیں، مگر جو مجموعہ سب سے پہلے شائع ہوا وہ قاسم العلوم ہے، جس کے جامع، مرتب اور ناشر مطبع مجتبائی کے بانی و مالک منشی ممتاز علی میرٹھی تھے، اس کے بعد اور متعدد حضرات نے مختلف حیثیتوں سے مختلف عنوانات کے تحت اپنی اپنی پسند یا دستیاب مکتوبات کے مطابق علیحدہ علیحدہ مجموعے مرتب کئے۔

پھر ان مجموعوں کی الگ الگ کیفیت ہے، کچھ ان میں سے آج تک شائع نہیں ہوئے، کچھ ایک مرتبہ چھپے ہیں، چند کی بار بار اشاعت ہوئی اور بعض ایسے بھی ہیں کہ جن کا کوئی حصہ چھپا کوئی نہیں چھپا اور کئی مجموعے ایسے ہیں جو ایک مرتبہ چھپ کر گمنام ہو گئے، اسی میں ایک مجموعہ ایسا بھی ہے (فرائد قاسمیہ) جو تقریباً بیس سال پہلے بڑی جدوجہد کے بعد پہلی بار چھپا تھا، غالباً اب وہ بھی کم یاب ہے، نیز حضرت کے مکتوبات کے کم از کم تین مجموعے ایسے ہیں جو اب تک نہیں چھپے بلکہ ان کا عموماً علم اور تعارف بھی نہیں اور حضرت کے تقریباً پچیس گرامی نامے ایسے بھی ہیں جو کم از کم ایک مرتبہ چھپے ہیں، لیکن وہ ایسی کتابوں یا مجموعوں میں شامل ہیں کہ ان کتابوں کے نام یا عمومی تعارف سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس میں حضرت مولانا کے گرامی نامے شامل ہوں گے، لہذا یہاں ان سب کا تذکرہ بھی کیا جا رہا ہے۔ سب سے پہلے حضرت مولانا کے مکتوبات کے ان مجموعوں کا ذکر آئے گا جو چھپے ہوئے اور

نسبتاً متعارف ہیں، اس کے بعد ان مکتوبات کا جو اور کتابوں اور مجموعوں میں چھپے ہوئے ہیں، آخر میں میں ان گرامی ناموں اور مکتوبات کے مجموعوں کا ذکر ہوگا جن کا صرف ایک ایک نسخہ معلوم ہے اور وہ بھی غیر متعارف ہے۔

حضرت مولانا کا علمی موضوعات پر لکھنے کا بہت کم معمول تھا، خاص طور سے متنازعہ یا اختلافی موضوعات پر لکھنے سے خاص احتیاط کرتے تھے، لیکن اگر حضرت مولانا سے بطور خاص کسی مسئلہ کے متعلق دریافت کیا جاتا تھا، اور حضرت مولانا کے جواب یا تحقیق سے اس الجھن کے دور ہونے یا مسئلہ کی تحقیق پر اطمینان کی امید ہوتی تھی، یا کسی دینی شرعی مسئلہ کی عقلی وجہ معلوم کی جاتی، اس وقت حضرت مولانا کا قلم حرکت میں آجاتا تھا، ورنہ عموماً حضرت مولانا خاموش رہتے تھے اور اختلافی مباحث و مسائل سے کنارہ کش رہنے کی پوری کوشش فرماتے تھے۔ حضرت مولانا نے اپنے اس مزاج و مذاق اور معمول کا ایک خط میں اس طرح ذکر فرمایا ہے:

"یہاں تک نوبت پہونچی کہ ترجمہ کرنے والے بلکہ ترجمہ پڑھنے والے اپنے فہم کے پیرو ہوئے ۔مولانا صاحب! یہ نوبت پہونچی تو ایسے وقت استفتاء اور فتوی کس مرض کی دوا ہے، بجز اس کے اختلاف سابق میں ایک اور شاخ نکل آئے۔

اب دہریہ اور جہنیہ جدا جدا ہوگئے، ہر کوئی اپنے وضع کی سنتا ہے، مولویوں کی بات اگر سنتے ہیں تو اس کان سے آئی دوسرے کان سے نکل گئی۔ ایسے وقت میں اس حدیث پر عمل کا وقت ہے:

اذا رأيت هوى متبعا و شحا مطا عا و دنيا مؤثرة و إعجاب كل ذى رأى برأيه فعليك بخاصة نفسك و دع امر العوام ، او كما قال.

علاوہ بریں اپنی کم علمی اور بے سروسامانی سے اب تک مسائل ضروریہ مشہورہ میں بھی مجھ کو جواب دینے کا اتفاق نہیں ہوتا، ہاں اتنی بات ہے کہ اگر مسئلہ معلوم ہوتا ہے اور احباب کو اس کی وجہ کی تلاش ہوتی ہے اور مجھ تک مشورہ کی نوبت آتی ہے تو اگر بذریعہ خطوط استفسار کی نوبت آتی ہے تو کبھی کبھی بہت سے تقاضاؤں کے بعد تحریر کا اتفاق ہو جاتا ہے"۔(۱)

مگر آخر میں اس سے بھی احتیاط فرمانے لگے تھے، اس کی وجہ بھی حضرت مولانا کے اسی خط

(۱) مکتوب بنام نصر اللہ خاں صاحب۔ فرائد قاسمی ص: ۹۵-۹۶ (دہلی: ۱۴۰۰ھ)

سے معلوم ہورہی ہے، تحریر فرماتے ہیں:

''اب اس سے بھی احتراز ہی اولیٰ معلوم ہوتا ہے، ہدایت کی کوئی صورت نہیں۔ البتہ فتنہ برپا ہوجاتے ہیں، اس لئے مجھ کو ان سوالوں کے جواب میں کچھ عرض معروض کرنا بھی دشوار ہے''۔ (۲)

مگر یہ خطوط بھی جو حضرت مولانا عموماً دوستوں اور علماء کے سخت اصرار پر لکھتے تھے ہمیشہ قلم برداشتہ تحریر فرماتے تھے اور نازک سے نازک موضوع پر طویل سے طویل تحریر یا خط عموماً ایک دونشستوں میں مکمل فرمالیتے تھے اور جو کچھ تحریر فرماتے وہ خزینۂ دماغ میں محفوظ ہوتا تھا، اس کے لئے کسی کتاب سے رجوع کرنے کی، مطالعہ کی، مراجعت کی یا یادداشت دیکھنے کی کبھی (شاید ایک مرتبہ بھی) ضرورت پیش نہیں آتی۔ جو سینہ میں ہوتا کاغذ کے سفینہ کی نذر کردیا جاتا تھا، علمی مکتوبات کی تحریر میں یہی طریقہ کار رہا جس کا ذکر حضرت مولانا نے متعدد خطوط میں بار بار کیا ہے۔

ناچیز کو حضرت مولانا کے ایک سو بارہ (۱۱۲) مکتوبات کا علم ہے، یہ گرامی نامے حضرت مولانا کی نو تالیفات و مکتوبات کے مجموعوں اور دیگر اصحاب کی نو کتابوں اور مصنفات، کل اٹھارہ کتابوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ مکتوبات علمائے ہند میں مقبول تینوں زبانوں اردو، فارسی اور عربی میں ہیں، جس میں سے آدھے چھپن (۵۶) اردو میں، آدھے سے کچھ کم چون (۵۴) فارسی میں اور صرف دو خط عربی میں ہیں، ان تمام مکتوبات کو مجموعی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: علمی، ذاتی اور مشترک۔ حضرت مولانا کے علمی بیشتر خطوط کئی سوال کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ مگر ان میں سے اکثر وہ ہیں جو کسی ایک بحث یا موضوع پر مشتمل ہیں اور ان میں سے اپنے مکتوبات الیہ یا طرفین کے متعلقین کے ذاتی احوال کا کچھ ذکر نہیں۔ دوسری قسم ان خطوط کی ہے جو ذاتی نوعیت کے ہیں، ان میں صرف اپنے یا مکتوب الیہ کے حالات اور گھریلو باتوں پر توجہ مرکوز ہے۔ ایک قسم اور بھی ہے، یہ وہ خطوط ہیں کہ جو اگرچہ ذاتی نوعیت کے ہیں، مگر ان میں کوئی بحث یا اختلافی مسئلہ بھی موضوع گفتگو ہے، تینوں قسم کے خطوط کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ مناسب ہے۔

علمی موضوعات پر جو گرامی نامے تحریر فرمائے ہیں ان کے موضوع میں بڑا تنوع اور وسعت

---

(۲) ایضاً

ہے، ان میں اسرار دین وشریعت کی گفتگو ہے، تفسیر وحدیث کے نکات کی گرہ کشائی فرمائی گئی ہے، فقہی مسائل بھی زیر قلم آئے ہیں، تراویح وقرآت ضاد، جمعہ اور اس دور میں موضوع بحث مسائل پر بھی توجہ فرمائی گئی ہے، ہندوستان کی شرعی حیثیت اور اس کے دار الحرب ہونے نہ ہونے اور یہاں عقود فاسدہ پر بھی اظہار خیال فرمایا گیا ہے، شرک و بدعت کے کلیدی مباحث کو بھی واضح کیا گیا ہے، مختلف دینی فرقوں کے نظریات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے، امکان نظیر کے واضح دلائل تفصیل سے لکھے ہیں، امتناع نظیر کے ماننے والوں کے دلائل کا علمی تجزیہ فرمایا ہے، ردشیعت پر بھی خاص توجہ ہے، خلافت وامامت اور باغ فدک وغیرہ کے مشہور اختلافی موضوعات کا علمی عقلی جائزہ لیا گیا ہے، مسلمانوں کے بگاڑ و زوال کے اسباب کا ذکر آیا ہے، اپنوں کی اندرونی کمزوریوں پر بھی کہیں کہیں احتساب کیا ہے، غرض بیسیوں موضوعات ومباحث ہیں جو ان مکتوبات میں زیر قلم آئے ہیں، لیکن ہر ایک میں جامعیت کی فراوانی اور دلائل کی گہرائی وگیرائی کا یہ عالم ہے کہ ہر تحریر منفرد اور ہر بحث حرف آخر معلوم ہوتی ہے۔

ان مکتوبات میں حضرت کا خاص اسلوب بیان ہے جو بڑی حد تک فلسفیانہ ہوتا ہے اور بعض تعبیرات بھی ایسی ہیں جو کہیں اور نظر نہیں آتیں اور بعض جگہ فکر ایسی عمیق اور پرواز ایسی بلند ہے کہ اس کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا، مجھ بے علم وصلاحیت کا تو ذکر ہی فضول ہے، کئی بڑے بڑے اہل علم بھی اس وسعت پرواز کے سامنے خود کو عاجز ودرماندہ پاتے ہیں، حالاں کہ ایسے کئی موقعوں پر زبان اردو ہے، مگر مفہوم مشکل سے گرفت میں آتا ہے، ہر لفظ مخزن اسرار ہے اور ہر فقرہ معدن معانی۔

مکتوبات کی دوسری قسم ذاتی خطوط کی ہے، جن میں اپنے ذاتی، گھریلو یا خاندانی معاملات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان خطوط میں بھی ایک قسم ان مکتوبات کی ہے کہ جو اگرچہ ذاتی حیثیت میں لکھے گئے مگر یہ خطوط ملی اجتماعی معاملات کے متعلق ہیں، اس لئے ان کی حیثیت نجی ذاتی خطوط سے کسی قدر مختلف ہے، دینی علمی اختلافی موضوعات پر جو خط لکھے گئے ہیں ان کی الگ الگ نوعیتیں ہیں، ان کا کسی قدر تفصیلی ذکر آرہا ہے۔ اس سے پہلے ذاتی خطوط کا اجمالی ذکر مناسب ہے۔ ان خطوط میں سب سے اہم وہ مکتوبات ہیں جو حضرت مولانا نے اپنے پیر ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ کے نام تحریر کئے ہیں۔ نجی خطوط کی دوسری قسم ان مکتوبات کی ہے جو مولانا نے اپنے قریبی متعلقین یا اہل خانہ کو لکھے تھے اور تیسرے خطوط وہ ہیں جن کو مشترک کہا جاسکتا ہے، یہ خطوط سرسید احمد خاں اور آریہ سماج

کے بانی سوامی دیانند سرسوتی کو لکھے گئے تھے۔

حضرت حاجی امداداللہ صاحب کے نام جملہ گرامی نامے فارسی میں ہیں، ان میں سے ایک خط بھی اردو میں نہیں ہے۔ یہ خطوط خاصے مفصل ہیں اور ان کے ذریعے سے حضرت مولانا کے ذاتی حالات ومعاملات، اعزاء واقارب اور دوسری بعض ایسی تفصیلات واطلاعات مل جاتی ہیں جن کا اور ذرائع سے علم نہیں ہوتا۔ پنڈت دیانند سرسوتی کے نام تمام خط اردو میں ہیں اور اس میں دوتین خط بہت مفصل بلکہ ایک رسالہ کے قائم مقام ہیں۔

حضرت حاجی صاحب کے نام خطوط سراپا عجز وانکسار ہیں، ان میں ذاتی احوال، خاندان اور اعزاء کی کیفیات، نانوتہ، رام پور، تھانہ بھون، کاندھلہ کے رہنے والے اور حضرت حاجی صاحب کے اقرباء ومتوسلین کا مختصر ذکر ہے۔ کسی کی بیماری کا، کسی کی وفات کا، کسی کی نالائقی کا، کسی کی لیاقت کا۔ نیز ان خطوط میں اپنی ذات کی نفی اور عجز وانکسار کا عنصر نمایاں ہے، ان خطوط کی زبان بالکل سادہ ہے، علم کی تراوش، زبان وبیان کا زور، بے تکلفی کا انداز ان میں مفقود ہے، لیکن جو خطوط اپنے خاص دوستوں یا ممتاز شاگردوں کو لکھے ہیں ان کا طرز تحریر مذکورہ خطوط سے بہت مختلف ہے، ان میں قلم کی روانی اور علم کا فیضان جوش پر ہے، کہیں کہیں بے تکلفی کا خاص انداز ہے اور بعض خطوط میں مزاح کی چاشنی بھی ہے اور طنز کی نشتریت بھی۔

تیسری قسم مشترک خطوط کی ہے، ان کو اس پہلو سے مشترک کہا جاسکتا ہے کہ یہ اگرچہ اہم دینی معاملات سے تعلق رکھتے ہیں، مگر ذاتی حیثیت سے لکھے گئے ہیں اور یہ اسلوب تحریر کے لحاظ سے بھی پہلے دونوں قسم کے خطوط سے کسی قدر مختلف ہیں، ان کی زبان اور علمی خطوط کی نسبت سادہ وپروقار ہے، جس میں نہ حضرت حاجی صاحب کے نام تحریر مکتوبات کی سی تواضع ہے اور نہ دیگر علمی خطوطو کا فلسفیانہ انداز اور دقیق فنی ومنطقی تعبیرات واصطلاحات، سرسید احمد کے نام تحریر گرامی نامہ (جو تصفیہ العقائد میں شامل ہے) اور سوامی دیانند سرسوتی سے مباحثہ رڑکی کے موقع پر خط وکتابت اسی اسلوب کی نمائندہ اور یادگار ہے۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس ذخیرہ میں سے متعدد مکتوب یا مکتوبات کے مجموعے حضرت مولانا کی مستقل تصانیف کی حیثیت سے متعارف ہیں، حالاں کہ یہ تصنیف نہیں ہیں بلکہ مکتوبات ہیں۔

حضرت مولانا کی تصانیف میں سے مصابیح التراویح واحد تالیف ہے کہ جو ایک خط تھا اور اس کو خود حضرت مولانا نے تصنیف کی حیثیت سے مرتب کر دیا تھا، حضرت مولانا نے ۱۲۸۸ھ میں مولانا سید احمد حسن امروہوی کے سوال کے جواب میں مفصل خط لکھا تھا پھر اس پر ایک تمہید لکھ کر اور جزوی اضافے فرما کر اس کو مصابیح التراویح کے نام سے موسوم کر دیا تھا، یہ مکتوب یا تالیف اسی نام سے شائع اور متعارف ہے۔

اس کے علاوہ بھی حضرت مولانا کے چند خط (یا کسی ایک موضوع پر لکھے گئے خطوط) ایسے ہیں جو حضرت مولانا کی زندگی میں یا وفات کے بعد مستقل تالیف کی صورت میں شائع کئے گئے اور وہ سب حضرت مولانا کی تالیف میں شمار کئے جاتے ہیں، مگر ان کی موجودہ ترتیب و اشاعت سے مکتوب نگار (حضرت مولانا) کا کچھ تعلق نہیں۔ مولانا کے تلامذہ، مکتوب الیہ، اصحاب یا ناشرین نے ان خطوط کی افادیت کی خاطر ان کو کتابی شکل میں حضرت مولانا کی تالیف کی حیثیت سے شائع کر دیا تھا۔

حضرت مولانا کی ایسی تصانیف جو مکتوبات پر مبنی ہیں مگر حضرت مولانا نے ان کو اس حیثیت سے مرتب نہیں کیا تھا، یہ کل چھ کتابیں ہیں: انتباہ المومنین، اجوبۂ اربعین، تحذیر الناس، تصفیۃ العقائد، مناظرہ عجیبہ اور اسرار قرآنی، یہ سب دراصل کسی ایک خط پر مشتمل یا متعدد مکتوبات کے مجموعے ہیں، ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ پہلی تینوں کتابیں یا مجموعے حضرت مولانا کی زندگی میں (وفات ۱۲۹۷ھ) مستقل نام سے کتابی صورت میں علیحدہ چھپ گئے تھے اور اسی وقت سے حضرت مولانا کی تالیفات شمار کئے جاتے ہیں۔ مگر ان کے نام اور کتابی صورت میں اشاعت ناشرین یا مکتوب الیہ اصحاب کی قدردانی کا ثمرہ ہے۔ حضرت مولانا کو (غالباً) ان تینوں خصوصاً مؤخر الذکر کے چھپنے کا اشاعت کے بعد علم ہوا۔ مذکورہ مؤلفات یا مجموعوں میں ترتیب اور اشاعت کے لحاظ سے انتباہ المومنین کو اولیت حاصل ہے۔

الف: انتباہ المومنین مولوی الٰہی بخش کے نام خط ہے، جس میں مناقب شیخین و حضرت علی رضی اللہ عنہم میں ایک حدیث کی وضاحت و شرح کی گئی ہے۔ یہ خط حضرت مولانا نے غالباً میرٹھ کے قیام کے زمانہ میں تحریر فرمایا تھا، یہ مفصل مکتوب جو فارسی میں اٹھارہ صفحات پر مشتمل ہے (حضرت مولانا کے استادزادے) مولانا حبیب الرحمان (خلف حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری) نے

اپنے مطبع احمدی میرٹھ سے شعبان ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں شائع کیا تھا۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انتباہ المؤمنین حضرت مولانا کی پہلی مستقل تحریر ہے جو مولانا کے نام سے چھپی ہے، اس سے پہلے حواشی صحیح بخاری میں حضرت مولانا کی شرکت ہوئی تھی، مگر اس پر حضرت مولانا کا نام درج نہیں تھا اور مطبع مجتبائی میرٹھ سے شائع قرآن شریف اور حمائل کی تصحیح فرمائی تھی وہ بھی چھپی تھیں، ان کے مصحح کی حیثیت سے حضرت مولانا کا نام درج ہے، مگر ظاہر ہے کہ تصحیح کی اس خدمت کو تصانیف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔

ب: اجوبۂ اربعین کا پہلا حصہ مولانا محمد یعقوب کے نام مفصل خط اور مولانا کی فرمائش کی تعمیل میں شیعوں کے تیس سوالات کا جواب ہے۔ ان خطوط کو شیعوں کے ان ہی اعتراضات کے حضرت مولانا کے خویش مولانا عبداللہ انصاری انبہٹوی [۳] کے لکھے ہوئے جوابات کے ساتھ یک جا مرتب کر کے منشی محمد حیات نے ۱۲۹۱ء میں مطبع ضیائی میرٹھ سے اجوبۂ اربعین کے نام سے شائع کر دیا تھا۔ [۴]

ج: تحذیر الناس بھی ایک خط کی کتابی شکل ہے، یہ خط مولانا محمد احسن نانوتوی کے ایک سوال یا مکتوب کے جواب میں لکھا گیا تھا، مولانا احسن نے اس جواب کو حضرت مولانا کی اجازت و اطلاع کے بغیر مطبع صدیقی بریلی سے تحذیر الناس کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا تھا۔ (طبع اول ۱۲۹۱ھ)۔

حضرت مولانا کی تالیفات میں شمار تین اور کتابیں: تصفیۃ العقائد، مناظرۂ عجیبہ اور اسرار قرآنی بھی کسی ایک موضوع پر لکھے گئے خطوط (یا خط) ہیں، مگر یہ مذکورہ تینوں تالیفات سے اس وجہ سے مختلف ہیں کہ پہلی تینوں کتابیں حضرت مولانا کی حیات میں مرتب ہو کر شائع ہو گئی تھیں اور مؤخرا

(۳) مولانا عبداللہ انصاری خلف مولانا انصار علی انبہٹوی (وفات ۱۳۴۲ھ) مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد تھے۔ مفصل تعارف کے لیے ملاحظہ ہو راقم سطور کا مضمون: مشمولہ مجلہ فکر و نظر علی گڑھ کا نامورانِ علی گڑھ نمبر جلد دوم (۱۹۸۶ء)

(۴) اجوبہ اربعین کا دوسرا حصہ بھی شیعوں کے سوالات و نظریات کے جواب اور تردید پر مشتمل حضرت مولانا کی مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے، مگر اول تو یہ مجموعہ حضرت مولانا کی وفات کے بعد مرتب اور شائع ہوا ہے جیسا کہ اس کے خاتمۃ الطبع سے ظاہر ہے۔ دوسرے اس میں کچھ اور فروگذاشتیں بھی رہ گئیں تھیں، تین سوالات اور ان کے جوابات اور درمیان سے چار صفحات جو تمام حضرت مولانا محمد قاسم کی تالیفات تھے، ضائع ہو گئے تھے، دوبارہ یہ جوابات حضرت کے شاگرد رشید (شیخ الہند) مولانا محمود حسن سے مکمل کرائے گئے تھے یہ حصہ مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوا تھا۔

لذکر حضرت مولانا کی وفات کے بعد مرتب اور شائع ہوئیں۔ تصفیۃ العقائد میں سرسید احمد کے نام خطوط اور وہ تحریریں ہیں جس میں سرسید احمد کے مذہبی خیالات ونظریات پر بحث وگفتگو فرمائی گئی ہے۔ یہ خطوط حضرت مولانا کی کتابوں کے ایک اہم ناشر منشی محمد حیات نے مرتب کر کے مطبع ضیائی میرٹھ سے ۱۲۹۸ھ میں شائع کئے تھے۔

مناظرۂ عجیبہ: حضرت مولانا نے تحذیر الناس میں خاتمیت زمانی، مکانی کی بحث فرمائی تھی، مولانا عبدالعزیز امروہی نے اس پر کچھ شبہات کئے اور حضرت مولانا سے ان کا حل چاہا، حضرت مولانا نے مولانا عبدالعزیز کے اعتراضات کے جو جوابات دئے اور طرفین میں اس موضوع پر جو خط وکتابت ہوئی تھی مولانا محمد حسن (خلف مولانا احمد حسن مرادآبادی) نے اس کو مناظرہ عجیبہ کے نام سے مرتب کر دیا تھا، پہلی مرتبہ مطبع گلزار ابراہیم مرادآباد سے شائع ہوا تھا، اس پر سن طباعت درج نہیں، مگر یہ صراحت ہے کہ اس مجموعہ کی ترتیب واشاعت کی خدمت حضرت مولانا کی وفات کے بعد انجام پائی تھی۔

اسرار قرآنی: قرآن شریف کی آیات وکلمات اور مثنوی مولانا روم وغیرہ کے بعض اشعار کے حل اور تحقیق میں متعدد خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ خطوط مولانا محمد صدیق مرادآبادی، مولانا احمد حسن امروہوی، مرزا عبدالقادر بیگ وغیرہ کے نام ہیں، یہ مجموعہ مولانا مفتی محمد ابراہیم شاہجہاں پوری نے مرتب کیا تھا، جو پہلی بار ۱۳۰۴ھ میں مرادآباد سے شائع ہوا۔

مکتوبات کے مندرجہ بالا مجموعے وہ ہیں جو حضرت مولانا کی تصانیف کی حیثیت سے شائع ہو چکے ہیں، ان کے علاوہ بھی حضرت مولانا کے مکتوبات کے کم از کم چھ مجموعے اور معلوم ہیں جس میں سب سے پہلا اور اہم ترین مکتوبات کا مجموعہ سلسلہ قاسم العلوم ہے۔

(۱) قاسم العلوم: مطبع مجتبائی میرٹھ دہلی کے مالک منشی ممتاز علی کی یادگار ہے، منشی ممتاز علی حضرت مولانا کے علوم وکمالات کے قدر شناس تھے، منشی جی نے حضرت مولانا کے مکتوبات رسالہ کی صورت میں قسط وار شائع کرنا شروع کئے تھے اور اس کا نام قاسم العلوم رکھا تھا، قاسم العلوم کی پہلی تین قسطیں پندرہ پندرہ دن کے وقفہ سے شائع ہوئیں، [۵] چوتھی اور آخری قسط دو مہینہ کے بعد چھپی، غالباً دقیق علمی مضامین کی

---

(۵) پہلی قسط پندرہ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ کو چھپی، تیسری ۱۵/ ربیع الثانی ۱۲۹۲ھ کو اور چوتھی ۱۵/ جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ (۱۹/ جولائی ۱۸۷۵ء) کو طبع ہوئی۔

وجہ سے اس سلسلہ کو زیادہ فروغ نہیں ہوا، اس لئے اس مفید مجلّہ کی چار قسطوں پر اشاعت ختم ہوگئی۔

(۲) فیوض قاسمی: یہ مجموعۂ مکتوبات حضرت مولانا کے شاگرد اور خادم مولانا عبدالعدل (خلف منشی عنایت علی) پھلتی نے مرتب کیا تھا۔ ۱۳۰۳ھ میں اس کی ترتیب عمل میں آئی تھی، ناشر کی صراحت کے مطابق اس میں چھتیس گرامی نامے شامل ہونے تھے، پہلے حصہ میں اکیس، دوسرے میں پندرہ مگر اس کا پہلا حصہ چھپا ہے، دوسرا حصہ (غالباً) شائع نہیں ہوا، راقم سطور کو دوسرے حصہ کے (قلمی یا مطبوعہ) نسخہ کا سراغ بلکہ کہیں حوالہ بھی نہیں ملا۔

(۳) جمال قاسمی: اس مختصر مجموعے میں حضرت مولانا کے وہ دو خط شامل ہیں جو حضرت مولانا نے اپنے بچپن کے ایک دوست، مولانا جمال الدین قاسمی دہلوی کو ۱۲۹۵ھ میں لکھے تھے، یہ مجموعہ ۱۳۰۹ھ (۹۲۔۱۸۹۱ء) میں مرتب ہوا اور اسی وقت مرتب کی تصحیح سے مطبع مجتبائی دہلی سے چھپا۔

(۴) لطائف قاسمی: اس مجموعہ میں حضرت مولانا کے آٹھ مکتوبات شامل ہیں، اس کے مرتب کا نام راقم سطور کو معلوم نہیں۔ یہ مجموعہ بھی ۱۳۰۹ھ (۹۲۔۱۸۹۱ء) میں مطبع مجتبائی دہلی سے چھپا۔

(۵) فرائد قاسمی: یہ مجموعہ مولانا کے ایک اور شاگرد مولانا عبدالغنی (پھلاودہ ضلع میرٹھ) نے مرتب کیا، اس میں سولہ گرامی نامے اور چند افادات شامل ہیں، یہ مجموعہ عرصۂ دراز تک غیر متعارف اور غیر مطبوعہ رہا، پہلی بار ۱۴۰۰ھ (۱۹۸۰ء) میں مولانا مفتی نسیم احمد فریدی کی توجہ سے دہلی سے چھپا، یہ اصل نسخہ کا عکس ہے۔

(۶) مکتوبات قاسمی: یہ مجموعہ ہنوز غیر مطبوعہ اور غیر متعارف ہے، یہ مجموعہ بھی مولانا عبدالغنی پھلاودی نے مرتب کیا تھا، اس کا واحد معلوم نسخہ جو محرم ۱۳۲۲ھ (۹/اپریل ۱۹۰۴ء) کو مولوی محمد ابراہیم صاحب پھلاودہ کے قلم سے مکمل ہوا ہے، ہمارے ذخیرہ میں ہے۔

حضرت مولانا کے مکتوبات کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس کا ایک خط بھی مذکورہ بالا مجموعوں میں شامل نہیں، یہ خطوط اکابر سلسلۂ دیوبند حضرت حاجی امداداللہ تھانویؒ، محدث جلیل حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا یعقوب نانوتوی کے مکتوبات کے مشترک مجموعوں میں درج ہیں، اس قسم کے بھی متعدد مجموعے ہیں۔

(الف) سب سے بڑا مجموعہ وہ ہے جس میں حضرت حاجی امداداللہ کے ممتاز خلفاء (حضرت مولانا

محمد قاسم نانوتویؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا محمد یعقوب نانوتوی) کے خطوط حضرت حاجی امداد اللہؒ کے نام، نیز مولانا خلیل احمد انبہٹوی (شارح ابوداؤد رحمہم اللہ تعالیٰ) کے نام حضرت مولانا گنگوہیؒ کے مکتوبات شامل ہیں، اس مجموعے کے جامع کا نام اور سنہ کتابت وغیرہ محقق نہیں، مگر اس نسخہ اور مکتوبات کی اصلیت میں شک نہیں، اس مجموعہ میں حضرت حاجی امداد اللہ کے نام حضرت مولانا کے گیارہ مکتوبات درج ہیں اور یہ تمام خطوط فارسی میں ہیں اور ۹۲۔۱۲۹۱ھ (۷۵۔۱۸۷۴ء) کے لکھے ہوئے ہیں۔ راقم سطور نے اس مجموعے کا تعارف اور پہلے چار خطوط کا متن سہ ماہی احوال و آثار، کاندھلہ، شوال، ذی الحجہ ۱۴۱۵ھ (اپریل جون ۱۹۹۵ء) میں اردو ترجمہ کے ساتھ شائع کر دیا تھا، باقی خطوط کے ترجمے اور حواشی کا کام بھی بفضلہ تعالیٰ مکمل ہو گیا ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ جلد ہی شائع ہوگا۔

(ب) ایسا ہی دوسرا مجموعہ، مکتوبات قاسمیہ ہے، اس کے نام سے خیال ہوتا ہے کہ اس میں صرف حضرت مولانا محمد قاسم کے مکتوبات ہوں گے، مگر یہ خیال صحیح نہیں، یہ مجموعہ تین بزرگوں حضرت حاجی امداد اللہ، حضرت مولانا گنگوہی اور حضرت مولانا محمد قاسم رحمہم اللہ کے خلیفہ بشیر احمد دیوبندیؒ کے نام سترہ خطوط پر مشتمل ہے، جس میں سے آٹھ گرامی نامے حضرت مولانا محمد قاسمؒ کے ہیں، اس مجموعہ کو قدیم دار المؤلفین (۶) دیوبند نے شائع کیا تھا اس پر سن ترتیب و طباعت درج نہیں۔

(ج) مکتوبات اکابر دیوبند: حضرت مولانا عبدالغنی مجددی مہاجر مدنیؒ، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور اکابر علمائے دیوبند کے چوّن مکتوبات کا مجموعہ ہے، جس میں مولانا رفیع الدین مہتمم مدرسہ دیوبند اور شیخ ضیاء الحق دیوبند کے نام حضرت مولانا کے گرامی نامے بھی شامل ہیں۔ یہ مجموعہ دفتری نور الحق دیوبند نے مرتب کیا تھا، مولانا نسیم احمد فریدی نے اس پر مقدمہ لکھا اور یہ مجموعہ ۱۹۸۰ء کے آغاز میں دیوبند سے چھپا تھا۔

یہ ان مکتوبات کا ذکر تھا جو حضرت مولانا کے مکتوبات کے خاص مجموعوں یا مشترک مجموعوں

---

(۶) قدیم دار المؤلفین ریاست حیدرآباد (دکن) کے عطیہ سے دار العلوم دیوبند میں غالباً مولانا حبیب الرحمان (مہتمم دار العلوم) کی نگرانی میں قائم ہوا تھا، اس ادارہ نے کئی کتابیں شائع کیں، اس کا معیار کتابت و طباعت عموماً نہایت عمدہ اور اعلیٰ ہوتا تھا۔ دیوبند میں دار المؤلفین کے نام سے ایک تالیفی اشاعتی ادارہ مولانا وحید الزماں کیرانوی نے بھی قائم کیا تھا، حال میں وہی معروف تھا، اس لئے پرانے ادارے کے نام کے ساتھ قدیم کا اضافہ کر دیا ہے۔

میں شامل ہیں، لیکن حضرت مولانا کے ان کے علاوہ بھی مکتوبات مطبوعہ و معلوم ہیں اور ان کی بھی دو قسمیں ہیں: وہ مکتوبات جو مختلف مضامین میں ضمناً یا مستقل چھپے ہیں اور وہ خطوط جو کسی غیر متعلق کتاب میں ضمناً درج ہیں، پہلی قسم کے مکتوبات میں:

(۱) مکتوب جو جنگ بلقان کے وقت خلافت اسلامیہ (ترکی) کی حمایت میں ۱۰/شعبان ۱۲۹۴ھ (۲۰/اگست ۱۸۷۷ء) کو لکھا تھا، یہ خط جو کسی مجموعہ میں شامل نہیں تقریباً ۱۳۳۹ھ میں حضرت مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا دریافت ہوا تھا۔ اس وقت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا حبیب الرحمانؒ وغیرہ نے تصدیق کی تھی کہ یہ حضرت مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اسی وقت اس کا عکس اور متن ترجمہ کے ساتھ اور بلا ترجمہ علیحدہ علیحدہ چھپے تھے، اس خط کی نقل جو غالباً کسی مطبوعہ متن سے لی گئی ہے، مولانا محمد ابراہیم پھلاودہ کے قلم سے مکتوبات قاسمی قلمی کے آخر میں شامل ہے۔ (مکتوبہ ۲۶/ربیع الآخر ۱۳۳۹ھ/۶/جنوری ۱۹۲۱ء)

(۲) مکتوب بنام منشی ممتاز علی: یہ خط بھی مکتوبات قاسمی مرتبہ مولانا عبدالغنی پھلاودہ کے آخر میں درج ہے اور بعد میں اضافہ کیا گیا ہے، یہ خط مولانا نسیم احمد فریدی امروہوی نے اردو ترجمہ کے ساتھ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ (اگست ۱۹۵۴ء) میں شائع کرادیا تھا۔

(۳) مکتوبات بنام مولانا صدیق احمد مرادآبادی (مولانا صدیق احمد حضرت مولانا کے شاگرد تھے) مولانا صدیق کے نام حضرت مولانا کے چند مکتوبات اسرار قرآنی میں شامل ہیں، یہ دو مکتوبات جو مولانا کے ذاتی کاغذات میں محفوظ تھے مولانا نسیم احمد فریدی کے مضمون ''مولانا حکیم محمد صدیق قاسمی مرادآبادی اور ان سے متعلق حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی نادر تحریرات'' میں شامل ہے جو ماہنامہ الفرقان لکھنؤ مارچ ۱۹۷۶ء (ربیع الاول ۱۳۹۶ھ) میں چھپا تھا، حضرت مولانا کے درج بالا مکتوبات کا راقم سطور کو علم ہے، ممکن ہے ان کے علاوہ اور بھی کچھ خطوط کسی مجموعۂ مکتوبات میں یا علیحدہ چھپے ہوئے ہوں، مگر راقم سطور کو ان کا علم نہیں۔

دوسری قسم کا اہم ترین ذخیرۂ مکتوبات وہ خطوط ہیں جو سوامی دیانند سرسوتی کے نام سوامی جی کے رڑکی کے قیام کے وقت لکھے تھے جن میں سوامی جی کو مجمع عام میں مناظرہ یا بالمشافہ گفتگو پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، مگر طویل خط و کتابت کے باوجود سوامی جی اس پر تیار نہیں ہوئے تھے، یہ

مراسلت جو ۹/ اگست ۱۸۷۸ء (۹/ شعبان ۱۲۹۵ھ) کو شروع ہو کر ۱۸/ اگست ۱۸۷۸ء (۸/ شعبان ۱۲۹۵ھ) کو ختم ہوئی تھی، اس میں حضرت مولانا کے مفصل ومختصر دس خطوط اور سوامی دیانند کے جوابات اور طرفین کے اشتہارات واعلانات شامل ہیں، یہ اہم مراسلت سوامی دیانند کی سوانح حیات میں درج ہے، مگر حضرت مولانا کے احوال وسوانح پر لکھی گئی کتابوں اور مضامین میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔

یہ حضرت مولانا کے مکتوبات کے قدیم ترین نسخوں اور اشاعتوں اور متعلقہ کتابوں کا مختصر تعارف ہے، جس میں مکتوبات کے اردو ترجموں، شروحات اور ان پر مبنی کتابوں کا ذکر نہیں کیا گیا، مذکورہ تفصیلات ایک مستقل مقالہ کا موضوع ہیں، یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مکتوبات کے مجموعوں اور متعلقہ کتابوں کی

فہرست

(۱)

حضرت مولانا کے مکتوبات اور تالیفات پر مشتمل مکتوبات کے قلمی مجموعے جو ابھی تک چھپے نہیں

مکتوبات بنام حضرت حاجی امداد اللہ

مرتب	تالیف	کاتب	سنہ کتابت
مولانا عبداللہ گنگوہی وفات ۱۳۳۹ھ ومولانا عاشق الٰہی میرٹھی	ندارد	نسخہ بہ ظاہر نقل مؤلفین	مکتوبہ قبل از ۱۳۲۲ھ

مکتوبات قاسمی قلمی

مرتب	تالیف	کاتب	سنہ کتابت
مولانا عبدالغنی پھلاودہ	ندارد	بقلم محمد ابراہیم پھلاودہ	مکتوبہ ۱۳۲۲ھ

تنویر النبراس

مرتب	تالیف	کاتب	سنہ کتابت
مولانا عبدالغنی پھلاودہ	۱۲۹۱ھ	بقلم محمد ابراہیم پھلاودہ	مکتوب ۱۳۴۳ھ

(ب)

حضرت مولانا کی وہ تالیفات یا فہرست تالیفات میں شامل وہ کتابیں جو مکتوبات پر مشتمل ہیں یا ان میں مکتوب بھی شامل ہیں

☜ **انتباہ المومنین**

مرتب	تالیف	ناشر	سنہ طباعت
مولانا حبیب الرحمٰن سہارنپوری	۱۲۸۴ھ	مطبع احمدی میرٹھ	۱۲۸۴ھ

☜ **مصابیح التراویح**

حضرت مصنف	۱۲۸۸ھ	مطبع ضیائی میرٹھ	۱۲۹۰ھ

☜ **اجوبۂ اربعین**

منشی محمد حیات میرٹھی	۱۲۹۱ھ	مطبع ضیائی میرٹھ	۱۲۹۱ھ

☜ **تصفیۃ العقائد**

مرتب کی تحقیق نہیں	۱۲۹۸ھ	مطبع ضیائی ہاشمی میرٹھ	شعبان ۱۲۹۸ھ

☜ **اسرار قرآنی**

مفتی محمد ابراہیم شاہجہاں پوری	۱۳۰۴ھ	مطبع گلزار احمدی مرادآباد	۲۵/ رجب ۱۳۰۴ھ

☜ **مناظرۂ عجیبہ**

مولانا محمد حسن ابن احمد حسن الہ آبادی	ندارد	گلزار ابراہیم مرادآباد	

☜ **الحظ المقسوم من قاسم العلوم**

مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری	۱۳۲۰ھ	مطبع مشرق العلوم بجنور	۱۳۲۰ھ شوال

(ج)

مکتوبات وافادات کے مجموعے

☜ **قاسم العلوم** کل چار شمارے (جس میں خطوط وافادات ہیں)

منشی ممتاز علی میرٹھی دہلوی	۱۲۹۲ھ	مطبع مجتبائی دہلی	۱۵/ ربیع الاول ۱۲۹۲ھ سے ۱۵/ جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ تک

☜ فیوض قاسمیہ

مولانا عبدالعدل پھلتی	۱۳۰۳ھ	مطبع ہاشمی میرٹھ	صفر ۱۳۰۴ھ

☜ جمال قاسمی

مولانا جمال الدین بجنوری دہلوی	۱۳۰۹ھ	مطبع مجتبائی دہلی	۱۳۰۹ھ

☜ لطائف قاسمیہ

معلوم نہیں	۱۳۰۹ھ	مطبع مجتبائی دہلی	۱۳۰۹ھ

☜ فرائد قاسمیہ

مولانا عبدالغنی پھلاودی	۱۳۱۳ھ	ادارہ ادبیات دہلی	۱۴۰۰ھ

(د)

مکتوبات کے وہ مجموعے یا وہ کتابیں جن میں حضرتؒ مولانا کے مکتوبات بھی شامل ہیں

☜ مکتوبات قاسمیہ

مرتب کا نام درج نہیں	ندارد	دارالمؤلفین مطبع قاسمی دیوبند	ندارد

☜ مکتوبات اکابر دیوبند

منشی نورالحق عثمانی دیوبندی	۱۳۶۹ھ	معراج بک ڈپو دیوبند	۱۴۰۰ھ

☜ جیون چرتر سوامی دیانند سرسوتی

جامع لیکھرام آریہ مسافر مرتبہ لکشمن		اسٹیم پریس، لاہور	۱۸۹۷ء

حضرت مولانا کے مکتوب الیہ اصحاب اوران کے نام خطوط کے مندرجات کی فہرست

۱	۱	سرسید احمد خان	تصفیۃ العقائد	سرسید کے عقائد ونظریات کا رد	ص ۳۲ تا ۳۶

۲	۱	مولانا سید ابوالمنصور دہلوی (امام فن مناظرہ)	تذکرہ مولانا احسن نانوتوی	محمد ایوب قادری بحوالہ عین الیقین مرتبہ سید مہدی حسن ص ۴۲ تا ۴۳ مطبع فاروقی دہلی	ص ۶۱ تا ۶۲ کراچی (۱۹۶۱ء)
۳	۲	مولانا احمد حسن امروہوی	قاسم العلوم مکتوب ۵ شمارہ ۲	دو حدیثوں کی تطبیق میں	ص ۱ تا ۳۲
۴	۳	ایضاً	مکتوب ۸ شمارہ ۳	سود اور اراضی مرہونہ کا مسئلہ	ص ۱ تا ۳۵
۵	۴	ایضاً	فرائد قاسمیہ	تحقیق مختصر در بیان حدیث متشابہ	ص ۱۶۰ تا ۱۶۴
۶	۵	ایضاً	ایضاً	ما بہ الفرق حقیقت سرقہ وغصب وتعذر احکام آں	ص ۱۶۹ تا ۱۷۲
۷	۷	ایضاً	اسرار قرآنی	تفسیر وهل نجازی الا الكفور	ص ۱۸ تا ۲۵
۸	۸	ایضا	مصابیح التراویح	در اثبات بست رکعات تراویح	ص ۴ تا ۸۴
۹	۱	حافظ مولوی احمد سعید	مکتوبات قاسمی قلمی	بسلسلہ جنگ روس وترکی اور ضرورت حمایت ترکی	
۱۰	۱	مولوی الٰہی بخش	انتباہ المؤمنین	تحقیق حدیث عن علی: قيل يا رسول الله من نؤمر بعدك قال ان تؤمروا ابابكر	ص ۳ تا ۲۱
۱۱	۱	حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ		ذاتی حالات نیز اپنے اور حضرت حاجی صاحب کے رشتہ داروں متعلقین نیز اپنے حالات اور اپنے قصبات کا تذکرہ اور اپنے بعض تلامذہ کا تعارف	
۱۲	۲	ایضاً		ذاتی حالات وغیرہ	

۱۳	۳	ایضاً		ایضاً	
۱۴	۴	ایضاً		ایضاً	
۱۵	۵	ایضاً		ایضاً	
۱۶	۶	ایضاً		ایضاً	
۱۷	۷	ایضاً		ایضاً	
۱۸	۸	ایضاً		ایضاً	
۱۹	۹	ایضاً		ایضاً	
۲۰	۱۰	ایضاً		ایضاً	
۲۱	۱۱	ایضاً		ایضاً	
۲۲	۱	خلیفہ بشیر احمد دیوبندی	مکتوبات قاسمیہ	ذاتی حالات اور تربیت مکتوب الیہ	ص۲تا۳
۲۳	۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۳
۲۴	۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۴
۲۵	۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۴تا۵
۲۶	۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵تا۶
۲۷	۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۶
۲۸	۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۷
۲۹	۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۸
۳۰	۱	مولوی بشیر احمد مرآدابادی	لطائف قاسمیہ	رہن کی زمین سے جو فائدہ اٹھایا وہ سود ہے یا نہیں	ص۱۹تا۲۰
۳۱	۱	مولوی جمال الدین	جمال قاسمی	تحقیق وحدت الوجود والشہود	ص۳تا۸
۳۲	۲	ایضاً	ایضاً	سماع موتی کی تحقیق	ص۸تا۱۶

۳۳	ا	مولوی حمید الدین	فرائد قاسمیہ	ممانعت مباشرت بازن حائضہ تحقیق وتر بجماعت در رمضان	ص۱۶۴ تا ۱۶۹
۳۴	ا	مولوی حکیم رحیم اللہ بجنوری	الحظ المقسوم من قاسم العلوم	تحقیق المرکب والاجزاء	ص۶ تا ۲۳
۳۵	۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۲۵ تا ۲۷
۳۶	ا	شاہ رفیع الدین دیوبندی	ایضاً	ذاتی	ص۵۲
۳۷	ا	سوامی دیانند سرسوتی	بعنوان تحریر سوامی دیانند سرسوتی	بسلسلہ مناظرہ رڑکی	ص۵۲۱ تا ۵۲۲
۳۸	۲	ایضاً		ایضاً	ص۵۲۸
۳۹	۳	ایضاً		ایضاً	ص۵۲۹ تا ۵۳۳
۴۰	۴	ایضاً۔ مع ضمیمہ		ایضاً	ص۵۳۵ تا ۵۴۰
۴۱	۵	ایضاً		ایضاً	ص۵۴۹ تا ۵۵۰
۴۲	۶	ایضاً		ایضاً	ص۵۵۰
۴۳	۷	ایضاً		ایضاً	ص۵۵۱ تا ۵۵۲
۴۴	۸	ایضاً		ایضاً	ص۵۵۴
۴۵	۹	سوامی دیانند کے جواب میں مناظرہ کا اشتہار		ایضاً	ص۵۲۰ تا ۵۲۱
۴۶	ا	شیخ ضیاء الحق دیوبندی	مکتوبات اکابر دیوبند	ارشاد تربیت وسلوک	ص۵۳
۴۷	۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۳ تا ۵۴
۴۸	۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۴ تا ۵۵
۴۹	ا	حکیم ضیاء الدین رامپوری	فرائد قاسمیہ	تقوی علم اور عمل کی تحقیق و ترتیب	ص۶۵ تا ۹۳

۵۰	۲	ایضاً	فیوض قاسمیہ	دربیان کیفیت مباحثہ با حامد حسن	ص۴تا۶
۵۱	۳	ایضاً	ایضاً	درتحقیق معنی بدعت وسنت	ص۴۳تا۴۹
۵۲	۴	ایضاً	ایضاً	تحقیق نفس	ص۵۳تا۵۹
۵۳	۱	مرزاعالم بیگ مرادآبادی	لطائف قاسمیہ	درباب عمل کشائش رزق و ادائے دین	ص۲۱
۵۴	۲	ایضاً	ایضاً	درباب علاج ہوس دنیا	ص۲۱تا۲۲
۵۵	۱	مولوی عبدالحق (مظفرنگری)	فیوض قاسمیہ	درجواب تحقیق وراثت	ص۱۷تا۲۵
۵۶	۲	عبدالرحیم	لطائف قاسمیہ	دراثبات تراویح بدلائل عقلی وبراہین نقلی	ص۶تا۱۳
۵۷	۳	ایضاً	مکتوب قاسمی قلمی	اللہ تعالیٰ کے نظام میں تقسیم کار کی ایک وجہ	ص۳۴تا۳۸
۵۸	۱	حکیم عبدالصمد	فیوض قاسمیہ	اپنے مشائخ کو اپنے قریب جاننا اوران کا تصور کرنا غلط ہے	ص۵۱تا۵۲
۵۹	۱	حافظ عبدالعدل پھلتی	مکتوبات قاسمی قلمی	افضلیت محمدی از آیت ولکن رسول الله	ص۳۸تا۴۸
۶۰	۱	مولاناعبدالعزیزامروہوی	فرائد قاسمیہ	بسلسلۂ مناظرہ	ص۱۹۷تا۱۹۹
۶۱	۲	ایضاً	مناظرۂ عجیبہ	بسلسلۂ تحقیق مباحث تحذیر الناس	ص۴۵تا۷۰
۶۲	۳	ایضاً	ایضاً	بسلسلۂ تحقیق مباحث	ص۷۶تا۸۶
۶۳	۴	ایضاً	ایضاً	تحذیرالناس	ص۹۲تا۱۰۵
۶۴	۵	ایضاً	ایضاً		ص۱۰۵تا۱۰۶

نمبر		نام	کتاب	موضوع	صفحات
۶۵	۱	مرزا عبدالقادر مرادآبادی	لطائف قاسمیہ	ذاتی، بموقع سفرحج درخواست دعاء	ص۲۰ تا ۲۱
۶۶	۲	ایضاً	اسرار قرآنی	دربیان معنی بیت مثنوی شریف	ص۲۵ تا ۲۹
۶۷	۱	مولوی عبدالقادر بدایونی	تنویر النبراس قلمی	تحذیر الناس پر اعتراض کے جواب	ص۳۹ تا ۹۸
۶۸	۱	مولوی عبداللطیف	فیوض قاسمیہ	مسئلہ علم غیب	ص۵۰ تا ۵۱
۶۹	۱	مولوی عبداللہ	فیوض قاسمیہ	قلب کو بائیں رکھنے کی حکمت	ص۳۳ تا ۳۴
۷۰	۱	مولانا فخرالحسن گنگوہی	قاسم العلوم مکتوب ۹ شمارہ ۴	در تحقیق و اثبات شہادت حسینؓ	ص۱ تا ۱۷
۷۱	۲	ایضاً	ایضاً، مکتوب ۱۰ شمارہ ۴	جواب استدلات علامہ طوسی دربیان امامت	ص۱ تا ۱۹
۷۲	۳	ایضاً	ایضاً، مکتوب ۱۱ شمارہ ۴ فرائد قاسمیہ	دربیان معنی حدیث: من یعرف امام زمانه فقد مات	ص۱ تا ص۱۷
۷۳	۴	ایضاً	ایضاً	تحقیق کلی متکرر النوع ومثنات بالتکریر	ص۱۵۴ تا ۱۵۷
۷۴	۵	ایضاً	ایضاً	در تحقیق واسطہ فی العروض	ص۱۵۷ تا ۱۶۱
۷۵	۱	مولانا فدا حسین	ایضاً، مکتوب ۳ شمارہ ۲	در تحقیق ما اهل به لغیر الله وایضاح معنی قید عندالذبح	ص۱ تا ۴۵
۷۶	۱	مولوی قاسم علی بیگ	فیوض قاسمیہ	درجواب بعض شبہات شیعان	ص۱۰ تا ۱۷
۷۷	۱	میانجی گھسا	تصفیۃ العقائد	عقائد نظریات سرسید احمد	ص۳۶ تا ۳۹

۷۸	۱	قاضی محمد اسماعیل منگلوری	فرائد قاسمیہ	امکان وامتناع نظیر	ص۱۲۳تا۱۲۷
۷۹	۱	مولانا محمد حسین بٹالوی	قاسم العلوم مکتوب ۷ شمارہ ۳	در جواب شبہات ملحدان بر معجزہ	ص۱تا۲
۸۰	۱	مولوی محمد دائم مرادآبادی	فیوض قاسمیہ	تصور شیخ	ص۳۲تا۳۳
۸۱	۱	مولوی محمد صدیق مرادآبادی	لطائف قاسمیہ	در اثبات حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ص۲تا۵
۸۲	۲	ایضاً	ایضاً	در فضیلت علم	ص۱۸تا۱۹
۸۳	۳	ایضاً	اسرار قرآنی	در معنی بعض آیات شریفہ	ص۲تا۱۰
۸۴	۴	ایضاً	ایضاً		ص۱۰تا۱۲
۸۵	۱	مولوی محمد صدیق و مولوی شمس الدین	ماہنامہ الفرقان مارچ ۱۹۷۶		ص۳۵
۸۶	۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۳۶
۸۷	۱	میر محمد صادق مدراسی	فیوض قاسمیہ	تحقیق حکم جمعہ	ص۲۵تا۳۲
	۲	ایضاً	لطائف قاسمیہ	در باب تحقیق حکم جمعہ	ص۲۲تا۲۸
۸۸	۱	حاجی محمد عابد دیوبندی	فرائد قاسمیہ	در جواب اعتراض اہل تشیع	ص۱۷۲تا۱۷۹
۸۹	۱	پیر جی محمد عارف	تصفیۃ العقائد	عقائد و نظریات سرسید احمد خاں	ص۵تا۳۲
۹۰	۱	مولانا محمد فاضل پھلتی	قاسم العلوم مکتوب ۱ شمارہ ۱	در جواب شبہ بعض فضلا کہ در بارہ عدم مملوکیت فدک در رسالہ ہدیۃ الشیعہ	ص ۱تا۳۸
۹۱	۱	مولانا محمد علی چاند پوری	تنویر النبراس قلمی	تحذیر الناس پر اعتراضات کے جوابات	ص۱تا۸

۹۲	۱	مولانا محی الدین خاں مرادآبادی	قاسم العلوم مکتوب نمبر۲، شمارہ نمبر۱	درشرح حدیث ابی رزین قال قلت یا رسول اللہ این کان ربنا قبل ان یخلق	ص۱تا۴۶
۹۳	۱	منشی ممتاز علی میرٹھی	مکتوبات قاسمی قلمی	ذاتی بسلسلہ جوابات مولانا محمد علی وغیرہ	ص۴۸تا ۵۲(۱)
۹۴	۱	مولانا منصور علی خاں مرادآبادی	فرائد قاسمیہ	درمعنی شعر: من آں وقت	ص۱۷۹تا۱۸۳
۹۵	۱	مولانا نصراللہ خویشگی	فرائد قاسمیہ	تقلید کی بحث	ص۹۳تا۹۶
۹۶	۲	ایضاً	فیوض قاسمیہ	حکم ایمان کفریذیر	ص۳۴تا۳۵
۹۷	۱	مولانا محمد یعقوب نانوتوی	اجوبۂ اربعین	شیعوں کے اٹھائیس سوالات کے جوابات	ص۱تا۱۰
۹۸	۱	مولانا محبوب علی مرادآبادی	مکتوبہ ۲۶/ جمادی الثانی ۱۲۸۵ھ مطبوعہ ماہنامہ الفرقان مارچ ۱۹۷۶ء	ذاتی احوال ومتعلقات	ص۳۳تا۳۵

وہ خطوط جن پر مکتوب الیہ کا نام درج نہیں اور دوسرے ذرائع سے بھی ان کی تحقیق نہیں ہوتی

۹۹	۱	بلانام مکتوب الیہ	مکتوبات قاسمی قلمی	قرآن کی آیت المومنین کی تحقیق	ص۱تا۳
۱۰۰	۲	ایضاً	فرائد قاسمیہ	(جواب اعتراضات پادریان) برتعدد نکاح کی حکمت	ص۱۰۴تا۱۲۳
۱۰۱	۳	ایضاً	ایضاً	تحقیق مال حرام وکراہت آں	

۱۰۲	۴	ایضاً	ایضاً	در تحقیق قرأت فاتحہ خلف الامام	ص۱۴۷ تا ۱۵۴
۱۰۳	۵	ایضاً	ایضاً	اشارات اجمالیہ بحث امکان نظیر	ص۱۸۴ تا ۱۹۵
۱۰۴	۶	ایضاً	ایضاً	مناظرہ نہ کرنے پر تبصرہ	ص۱۹۵ تا ۱۹۷
۱۰۵	۷	ایضاً	فیوض قاسمیہ	تحقیق آنکہ شیعہ وخوارج مومن اندنہ کافر	ص۱ تا ۴
۱۰۶	۸	ایضاً	ایضاً	متعلقہ نذر بتاں وغیرہ	ص۳۵ تا ۴۰
۱۰۷	۹	ایضاً	ایضاً	وجہ جہر قرأت درسہ نماز	ص۴۰ تا ۴۳
۱۰۸	۱۰	ایضاً	اسرار قرآنی	در جواب بعض شبہات بر آیت خالدین فیہا ما دامت السموات والارض	ص۱۲ تا ۱۸
۱۰۹	۱۱	ایضاً	مکتوبات قاسمی قلمی	احکام وضو پر پادریوں کے اعتراضات کے جوابات	ص۴ تا ۳۴
۱۱۰	۱۲	ایضاً	قاسم العلوم مکتوب ۴ شمارہ ۲	در معصومیت انبیاء علیہم السلام	ص۱ تا ۱۰

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مطبوعہ مکتوبات کی فہرست حسب ترتیب مضامین

چند آیات کی تفسیر اور متعلقات مباحث

نمبر شمار	مضمون مکتوب	کتاب	زبان	صفحات
۱	در معنی بعض آیات شریفہ	اسرار قرآنی	فارسی	ص۲ تا ص۱۰

۲	درجوابات بعض شبہات برخالدین فیہا مادامت السموات والارض	ایضاً	ایضاً	ص۱۰ تا ۱۸
۳	تفسیر فھل نجازی الاالکفور	ایضاً	ایضاً	ص۱۸ تا ۲۵
۴	المومنین کی تحقیق	مکتوبات قاسمی قلمی	اردو	ص۱ تا ۳۰
۵	ولکن رسول اللہ سے افضلیت محمدی کا ثبوت	ایضاً	فارسی	ص۳۸ تا ۴۸

چند احادیث شریفہ کے متعلق سوالات کے جوابات اور تحقیق

۱	تحقیق ومطالب حدیث قیل یارسول اللہ من نومر بعدك	انتباہ المومنین	فارسی	ص۲ تا ۲۱
۲	شرح مطالب حدیث این کان ربنا قبل ان یخلق الخلق	قاسم العلوم مکتوب ۲، شمارہ ۱	فارسی	ص۱ تا ۴۶
۳	تحقیق ومطالب من لم یعرف امام زمانہ مات	قاسم العلوم مکتوب ۱ شمارہ ۴	فارسی	ص۱ تا ۷
۴	دوحدیثوں میں تطبیق: المکاتب عبد مابقی علیہ من مکاتبۃ درھم (ابوداؤد) اذا اصاب المکاتب حدا او میراثا ورث بحساب ماعتق (ابوداؤد)	قاسم العلوم مکتوب ۵ شمارہ ۲	فارسی	ص۱ تا ۳۲
۵	تحقیق حدیث متشابہ کان فی عماء	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۶۱ تا ۱۶۴

فقہی مباحث اور متعلقات فقہ

۱	وضو کی حکمتیں (اسرار الطہارۃ)	مکتوبات قاسمی قلمی	اردو	ص۴ تا ۳۴
۲	تحقیق قرأت فاتحہ خلف الامام	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۴۷ تا ۱۵۴
۳	وجہ جہر قرأت در سہ نماز	فیوض قاسمیہ	فارسی	ص۴۰ تا ۴۳

۴	جمعہ کے احکام اور تحقیق	لطائف قاسمیہ	فارسی	ص۲۲تا۲۸
۵	اثبات بست رکعات تراویح	مصابیح التراویح	فارسی	ص۲تا۸۴
۶	اثبات تراویح بدلائل عقلی ونقلی	لطائف قاسمیہ	فارسی	ص۶تا۱۳
۷	تحقیق وتر بجماعت در رمضان	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۶۶تا۱۶۹
۸	مابہ الفرق حقیقت سرقہ وغضب	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۶۹تا۱۷۲
۹	وجہ ممانعت مباشرت بازن حائضہ	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۶۴تا۱۶۵
۱۰	رہن کی زمین سے جو فائدہ اٹھایا جائے وہ سود ہے یا نہیں	لطائف قاسمیہ	اردو	ص ۱۹تا۲۰
۱۱	عدم جواز سود گرفتن در ہندوستان	قاسم العلوم مکتوب ۸ شمارہ ۳	فارسی	ص۱تا۳۵
۱۲	مال حرام اور اس کی گندگی	فرائد قاسمیہ	اردو	ص۱۰۴تا۱۲۳
۱۳	اللہ تعالیٰ کے نظام میں تقسیم کار کی حکمت	مکتوبات قاسمیہ	اردو	ص۳۴تا۳۸
۱۴	تقوی علم اور عمل کی تربیت اور مدارج	فرائد قاسمیہ	اردو	ص۶۵تا۹۳
۱۵	در فضیلت علم	لطائف قاسمیہ	فارسی	ص۱۸تا۱۹
۱۶	روس اور ترکی کے جنگ کے وقت مسلمانوں کی ذمہ داری اور ملی دینی فریضہ	مکتوبات قاسمی قلمی	فارسی	آخر میں

تصوف

۱	تحقیق وحدت الوجود والشہود	جمال قاسمی	اردو	ص۳تا۸
۲	مسئلہ تصور شیخ	فیوض قاسمیہ	فارسی	ص۳۲تا۳۳
۳	قلب کو بائیں طرف رکھنے کی حکمت	فیوض قاسمیہ	اردو	ص۳۳تا۳۴

عقائد اور متعلقہ مباحث

۱	متعلقہ نذر بتاں وغیرہ	فیوض قاسمیہ	اردو	ص۳۵تا۴۰

ص	زبان	ماخذ	عنوان	نمبر
ص ۱ تا ۴۵	فارسی	قاسم العلوم مکتوب ۳ شمارہ ۲	تحقیق ما اھل بہ لغیر اللہ	۲
ص ۲ تا ۵	اردو	لطائف قاسمیہ	در اثبات حیات النبی صلی اللہ علیہ وسلم	۳
ص ۴۵ تا ۷۰	اردو	مناظرہ عجیبہ	تحقیق مباحث تحذیر الناس (امکان نظیر) (جوابات مکتوب مولانا عبدالعزیز امروہوی)	۴
ص ۷۶ تا ۸۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۵
ص ۹۲ تا ۱۰۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۶
ص ۱۰۵ تا ۱۰۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	۷
ص ۱۸۴ تا ۱۹۵	فارسی	فرائد قاسمیہ	اشارات اجمالیہ بحث امکان نظیر	۸
ص ۱ تا ۳۸	اردو	تنویر النبر اس	تحذیر الناس پر مولانا محمد علی چاند پوری کے اعتراضات کے جوابات	۹
ص ۳۹ تا ۹۸	اردو	تنویر النبر اس	تحذیر الناس پر مولوی عبدالقادر بدایونی کے اعتراضات کے جوابات	۱۰
ص ۱ تا ۳۲	فارسی	قاسم العلوم مکتوب ۴ شمارہ ۲	معصومیت انبیاء اور تحقیق کلی طبعی	۱۱
ص ۱ تا ۳۲	فارسی	قاسم العلوم مکتوب ۷ شمارہ ۳	در جواب شبہات ثبوت نبوت از معجزات	۱۲
ص ۵۰ تا ۵۱	فارسی	فیوض قاسمیہ	مسئلہ علم غیب	۱۳
ص ۵۱ تا ۵۲	اردو	فیوض قاسمیہ	اپنے مشائخ کو اپنے قریب جاننا غلط ہے حاضر وناظر جاننا صحیح نہیں	۱۴
ص ۸ تا ۱۶	اردو	جمال قاسمی	تحقیق مزید بر سماع موتی	۱۵
ص ۳۴ تا ۳۵	اردو	فیوض قاسمیہ	ایمان وکفر یزید	۱۶

شیعوں کے عقائد اور اعتراضات کی تردید

ص	زبان	ماخذ	عنوان	نمبر
ص ۱ تا ۴	فارسی	فیوض قاسمیہ	در تحقیق آں کہ شیعی وخوارج مومن اندنہ کافر	۱
ص ۴ تا ۶	فارسی	ایضاً	کیفیت مباحثہ با مولوی حامد حسین لکھنوی	۲

۳	در جواب اعتراضات اہل تشنیع	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص ۱۷۲ تا ۱۷۹
۴	در جواب شبہ شیعان	فیوض قاسمیہ	فارسی	ص ۶ تا ۱۰
۵	در جواب بعض شبہات شیعہ	ایضاً	فارسی	ص ۱۰ تا ۱۷
۶	در تحقیق وراثت	ایضاً	فارسی	ص ۱۷ تا ۲۵
۷	جواب شبہ بعض فضلا وعدم ملوکیت فدک	قاسم العلوم مکتوب اشارہ ۱	فارسی	ص ۱ تا ۱۸
۸	جواب استدلالات علامہ طوسی ، درباره امامت وبیان معنی اختلاف امتی	قاسم العلوم مکتوب ۱۰ اشارہ ۴	فارسی	ص ۱ تا ۱۹
۹	شیعوں کے ۲۸ سوالات کے جوابات	اجوبۂ اربعین حصہ اول	اردو	ص ۱۰ تا ۹۸
۱۰	شیعہ علماء سے بیالیس سوالات (حضرت مولانا نانوتوی کی طرف سے)	ایضاً	ایضاً	ص ۱۰۱ تا ۱۰۸
۱۱	جوابات اعتراضات پادریاں	فرائد قاسمیہ	ایضاً	ص ۹۷ تا ۱۰۴

تقلید اور بدعت کی تحقیق

۱	تقلید کی بحث	فرائد قاسمیہ	اردو	ص ۹۳ تا ۹۷
۲	تحقیق تقلید وتراویح اور ضاد کا مخرج	تصفیۃ العقائد	ایضاً	ص ۳۳ تا ۳۶
۳	در تحقیق بدعت وسنت	فیوض قاسمیہ	اردو	ص ۴۳ تا ۴۹

سر سید احمد کے دینی خیالات اور مذہبی تفردات پر نظر

۱	مکتوب بنام پیر جی محمد عارف	تصفیۃ العقائد	اردو	ص ۵ تا ۲۹
۲	مکتوب بنام سر سید احمد خاں	ایضاً	اردو	ص ۲۹ تا ۳۳

متفرقات

۱	در تحقیق نفس	فیوض قاسمیہ	فارسی	۵۳تا۵۹

ادب

۱	در معنی شعر: من آں وقت	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۷۹تا۱۸۴
۲	در معنی بیت مثنوی: زندہ معشوق است وعاشق مردہ	اسرار قرآنی	فارسی	ص۱۶تا۱۸
۳	در معنی بیت مثنوی شریف	اسرار قرآنی	ایضاً	ص۲۵تا۲۹

علمی فنی اصطلاحات اور مباحث

۱	تحقیق کلی متکرر النوع ومثنات بالتکریر	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۵۴تا۱۵۷
۲	در تحقیق واسطہ فی العروض	ایضاً	فارسی	ص۱۵۷تا۱۶۱
۳	تحقیق المرکب والاجزاء	الخط المقسوم	عربی	ص۶تا۲۳

ذاتی

۱	بنام حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ	مجموعہ مکتوبات	فارسی	کل ۹ صفحات
۲	ایضاً	اکابر	ایضاً	ایضاً
۳	ایضاً	قلمی	ایضاً	ایضاً
۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۹	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً

۱۰	ایضاً	مجموعہ مکتوبات اکابر (قلمی)	ایضاً	ایضاً
۱۱	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۱۲	ممتاز علی میرٹھی	مکتوبات قاسمی قلمی	اردو	ص۴۸ تا ۵۲
۱	مرزا عبدالقادر بیگ مرادآبادی (بموقع سفر حج موصوف)	لطائف قاسمیہ	اردو	ص۲۰ تا ۲۱
۱	شاہ رفیع الدین مہتمم مدرسہ (دیوبند)	مکتوبات اکابر دیوبند	اردو	ص۵۲ تا ۵۳
۱	مولانا حکیم رحیم اللہ بجنوری	الحظ المقسوم	عربی	ص۲۵ تا ۲۷
۱	شیخ ضیاء الحق دیوبندی	مکتوبات اکابر دیوبند	اردو	۵۳
۲	شیخ ضیاء الحق دیوبندی	مکتوبات اکابر دیوبند	اردو	ص۵۳ تا ۵۴
۳	ایضاً	مکتوبات اکابر دیوبند	اردو	ص۵۴ تا ۵۵
۴	درباب عمل کشائش رزق وادائے دین	لطائف قاسمیہ	اردو	ص۲۱ تا ۲۲
۵	درعلاج ہوس دنیا	لطائف قاسمیہ	اردو	ص۲۱
۱	خلیفہ بشیر احمد صاحب دیوبند	مکتوبات قاسمیہ	فارسی	ص۲ تا ۳
۲	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۳ تا ۴
۳	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۴
۴	ایضاً	ایضاً	اردو	ص۴ تا ۵
۵	ایضاً	ایضاً	فارسی	ص ۵ تا ۶
۶	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۶ تا ۷
۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۷
۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۷ تا ۸
۹	مولانا سید ابوالمنصور دہلوی امام فن مناظرہ	تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی از محمد ایوب قادری	اردو	ص۶۱ تا ۶۲

۹	مولانا سید ابوالمنصور دہلوی امام فن مناظرہ	تذکرہ مولانا محمد احسن نانوتوی از محمد ایوب قادری	اردو	ص۶۱ تا ۶۲
۱۰	مولانا محمد صدیق احمد مرآدابادی وشمس مرادآبادی	ماہنامہ الفرقام لکھنؤ مارچ ۷۶ء	فارسی مع اردو ترجمہ	

ذاتی مگر مباحثہ و مناظرہ سے متعلق

۱	مناظرہ کرنے سے انکار کا تذکرہ و شکریہ	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۹۵ تا ۱۹۷
۲	بسلسلۂ مناظرہ مولانا عبدالعزیز امروہوی	فرائد قاسمیہ	فارسی	ص۱۹۷ تا ۱۹۹
۳	بنام سوامی دیانند سرسوتی بسلسلۂ مناظرہ رڑکی	جیون چرتر سوامی دیانند	اردو	ص۵۲۱ تا ۵۲۲
۴	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۲۸
۵	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۲۲۹ تا ۵۳۳
۶	ایضاً مع ضمیمہ	ایضاً	ایضاً	ص۵۳۵ تا ۵۴۰
۷	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۴۹ تا ۵۵۰
۸	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۵۰
۹	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۵۱ تا ۵۵۲
۱۰	ایضاً	ایضاً	ایضاً	ص۵۵۴
۱۱	سوامی دیانند سرسوتی کے جواب میں مناظرہ کا اشتہار	ایضاً	ایضاً	ص۵۲۰ تا ۵۲۱

☆......☆......☆

مولانا اسیر ادروی*

حضرت نانوتویؒ کا قصیدۂ بہاریہ

در نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

محسن کاکوروی کا قصیدہ ''سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل'' کافی مشہور ہے کیونکہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت کے سلسلہ میں یہ ایک نیا تجربہ تھا، لیکن اس قصیدہ پر ہندو مذہبیات کی اتنی گہری چھاپ ہے کہ دیر تک رہوار فکر کاشی اور متھرا کی فضاؤں میں دوڑتا ہوا نظر آتا ہے جبکہ وحدانیت اور توحید کا پیغام لے کر آنے والے شہنشاہ کونین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال ایسے ماحول اور ایسی فضا میں کیا جانا چاہیے تھا جو آپ کے منصب نبوت کے شایان شان ہے۔

اس کے برخلاف الامام محمد قاسم نانوتوی کے قصیدۂ بہاریہ میں ایک ایسی لطیف و پاکیزہ، عشق و محبت کے جذبات میں آگ لگادینے والی فضا کی منظر کشی اور مناظر فطرت کی عکاسی کی گئی ہے جو دلوں کو بدمست اور سرشار کردیتی ہے، احساسات پر بے خودی طاری ہوجاتی ہے، شوریدگی و آشفتگی اور ایسی بیتابی کا ماحول بن جاتا ہے جو محبوب رب العالمین کے استقبال اور خیر مقدم کے شایان شان ہے عشق میں دیوانگی کا ظہور بہار کی آمد سے وابستہ ہے، گریبان کے چاک کرنے اور دامن کو تار تار کرنے کا یہی موسم ہے، پوری اردو شاعری اس کی عکاس ہے اس لئے حضرت نانوتوی کا یہ نعتیہ قصیدہ بہاریہ ہونے کی وجہ سے بڑا وجد آفریں اور احساسات کو مہمیز کرنے والا ہے اور جب بہار کی منظر کشی کے بعد سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل آتا ہے تو روح عشق و محبت کے جذبات سے سرشار ہوجاتی ہے۔

حضرت نانوتوی شاعر تھے؟ میرے ذہن میں اس کا تصور بھی نہیں تھا، کیونکہ میں ان کو شاملی کے محاذ پر تلوار چلاتے ہوئے دیکھتا ہوں، میلہ خداشناسی میں پادریوں اور آریہ سماجیوں کو ایسے

---

* جامعہ اسلامیہ، ریوڑی تالاب، وارانسی

گھاٹ پر مارتے ہوئے پاتا ہوں جہاں ان کو پانی بھی نہ مل سکا، رڑکی میں دیانند سرسوتی کی پناہ گاہ میں گھس کر ان کی چرب زبانی کے لبادہ کو تار تار کرتے ہوئے دیکھتا ہوں، وہ فرسودہ اور بوسیدہ علم کلام کی جگہ ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈال کر اس پر ایک شاندار محل تعمیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، مسلمانوں کا مستقبل محفوظ کرنے کے لئے دارالعلوم دیوبند کا نقشہ بنانے میں مصروف ہیں آخر انھوں نے شعر وشاعری سے کب دلچسپی لی؟ ان کی شخصیت اور ان کے گردوپیش کے ماحول سے شاعری کا کوئی جوڑ اور ربط نظر نہیں آتا، وہ تنہائی پسند، تقشّف کی حد تک زاہد مرتاض نظر آتے ہیں لیکن ان کے کاغذات میں یہ قصیدہ بہاریہ نعتیہ ملا تو یقین کرنا پڑا کہ یہ کلام انھیں کا ہے اور یہ جوہر بھی ان کی تہ در تہ شخصیت میں کہیں پوشیدہ تھا جس کا ظہور بعد میں ہوا۔

حضرت نانوتوی غالب، مومن اور میر کے ہم عصر ہیں یہ تینوں اردو شاعری کے اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں ہیں، اقلیم سخن پر ان کی حکمرانی تھی، حضرت نانوتوی اس حکمراں طبقہ میں نہیں تھے وہ تو عبدالحق محدث دہلوی، شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ عبدالعزیز محدث کی صف میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں، لیکن ذہین وفطین انسان اپنے گردوپیش پر ناقدانہ نظر رکھتا ہے اپنے گردوپیش کے حالات سے بے تعلق ہو کر بھی اس کا مزاج شناس ہوتا ہے، شاعری بھی اس دور میں ذریعۂ اظہار کا بہت موثر وسیلہ تھا اگر علماء کی صفوں میں بھی اس ذریعۂ اظہار کو اپنانے والے کچھ لوگ ملتے ہیں تو یہ کوئی حیرت ناک بات نہیں ہے حضرت نانوتوی کا شمار بھی انھیں علماء میں تھا جن کی فطرت میں جوہر شاعری پوشیدہ تھا اور اس کا کبھی کبھی ظہور بھی ہوا۔

حضرت نانوتوی کا یہ قصیدہ ۱۵۱ر اشعار پر مشتمل ہے، اس کو دیکھ کر یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ آپ کہنہ مشق اور ایک قادر الکلام شاعر تھے لیکن اس کمال کا ظہور اس لئے نہیں ہوا کہ آپ کے سامنے ایک طوفانی زندگی اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ موجود تھی جو آپ کے شاعرانہ جذبات کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی، اس سے نبرد آزمائی وقت کا پہلا اور بڑا فریضہ تھا، اس طوفانی دور میں شاعری: تیز آندھی میں چراغوں کا سفر ہو جیسے، لیکن یہ حیرت انگیز حقیقت کیسے تسلیم کی جائے، اتنے طویل قصیدہ کے کہنے میں کامیابی اسی وقت مل سکتی ہے جب سالہا سال مشق سخن کا سلسلہ رہا ہو، یک بیک اتنا مرصع کلام تخلیق کرنا تجربات کی دنیا میں قابل تسلیم نہیں معلوم ہوتا لیکن حضرت نانوتوی کا کلام

ہم کو کہیں نظر نہیں آتا سوائے اردو فارسی کی چند نظموں کے، اس لئے یہی کہا جاسکتا ہے آپ نے نظمیں لکھی ہوں گی لیکن نہ کسی کو سنایا نہ اس کی اشاعت ہونے دی ہوگی پھر وہ ضائع ہوگئیں اس کی حفاظت آپ نے مناسب نہیں سمجھی ہوگی لیکن ان تمام شکوک وشبہات کے باوجود یہ قصیدہ بہاریہ آپ کی تخلیق ہے اور اس کو تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت نانوتوی میں قوت تخیل وہبی تھی، ہر ذہین وفطین انسان کی فطرت میں یہ جوہر موجود رہتا ہے اور اس کا ظہور مختلف شکلوں میں ہوتا ہے لیکن طائر تخیل کی بلند پروازی کو اپنی حدود میں رکھنے کے لئے قوت ممیّزہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ بے سمت پرواز کو روک سکے اور یہ جوہر تجربات ومشاہدات پر گہری نظر رکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور یہ کسبی ہوتا ہے، میں سمجھتا ہوں حضرت نانوتوی میں یہ دونوں قوتیں بدرجہ اتم موجود تھیں، صرف الفاظ کا صحیح استعمال جو تخیل کی بنائی ہوئی تصویر مشکّل کرکے دوسروں کے سامنے پیش کرسکے اسی کا نام شاعری ہے۔ حضرت نانوتوی کو فارسی اور اردو دونوں زبانوں پر پوری قدرت حاصل تھی اس لئے وہ اس طویل قصیدہ کے لکھنے میں کامیاب ہوئے، قصیدہ پر غائرانہ نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ الفاظ کی گہری معنویت اور ان کی وسعتوں پر آپ کی نگاہ تھی آپ کی نثری کتابوں سے بھی اس کی تائید ہوتی اس لئے یہ طویل قصیدہ آپ کے قلم کا شاہکار بن کر ظاہر ہوا تو کوئی تعجب خیز انکشاف نہیں بلکہ ایک صداقت تھی جو دیر میں ظاہر ہوئی۔ ایک بات اور، حضرت نانوتوی کا ابتدائی دور اردو کے عنفوان شباب کا دور تھا ابھی اس میں پختگی نہیں آئی تھی، بہت سے الفاظ اس زمانہ میں مستعمل تھے جو بعد میں متروک ہوگئے، یہ الفاظ اردو شاعری میں ہر شاعر کے یہاں ملتے ہیں اسی طرح بہت سے الفاظ کا تلفظ اور لب ولہجہ بھی آج سے مختلف تھا بعد کے دور میں اس کی بھی اصلاح کردی گئی، اس لئے حضرت نانوتوی کے اس قصیدے میں بھی ایسے الفاظ، تلفظ اور لب ولہجہ کو اختیار کیا گیا ہے جو بعد کے دور میں متروک ہوئے اس قصیدہ کا مطالعہ اسی دور کے چوکھٹے میں رکھ کر کرنا چاہیے۔

قصیدہ میں تخیل کی بلند پروازی، تجربات ومشاہدات کی خوبصورت منظر کشی، مظاہرِ فطرت کا مطالعہ اور اس کی تصویر کشی اتنے دلکش انداز میں ہے کہ پڑھتے ہوئے طبیعت پھڑک اٹھتی ہے، قصیدہ کا عنوان ہے: ''قصیدۂ بہاریہ درنعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

نہووے نغمہ سرا کس طرح سے بلبل زار ۔۔۔ کہ آئی ہے نئے سر سے چمن چمن میں بہار

ہر اک کو حسب لیاقت بہار دیتی ہے — کسی کو برگ، کسی کو گل اور کسی کو بار
کیا ہے بھیج کے سیل آب چاہ کو معزول — بجائے باد صبا، بوے گل ہے کارگزار
کریں ہیں مرغ چمن سارے مشق موسیقی — کہ گانے ہیں انھیں اس سال شکر حق میں ملار

حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ بہار کی آمد آمد کا شہرہ ہے، آسمان سے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے، پھولوں کی خوشبو فضا میں ہر طرف اڑتی پھرتی ہے جیسے باد صبا کے ہاتھ سے چمن کی آرائش کا انتظام خود اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور بوے گل چمن کو سنوارنے اور سجانے میں لگی ہوئی ہے، تمام مرغان چمن نے جو خوش الحان ہیں ابھی سے موسیقی کی مشق شروع کر دی ہے، کیونکہ جب بہار کی سواری اس سال آئے گی تو اس کے استقبال میں استقبالیہ ترانے گانے ہیں۔ اس کے بعد حضرت نانوتوی کہتے ہیں:

بہار گل کی خبر سن کے چھڑکے ہے پانی — سحاب، سبزۂ پژمردہ پر کہ ہو ہوشیار
پھریں ہیں کھیلتے آب رواں و باد صبا — کھلیں ہیں غنچے، ہنسیں ہیں گل و خوش ہے ہزار
خوشی سے مرغ چمن ناچ ناچ گاتے ہیں — کفِ ورق سے بجاتے ہیں تالیاں اشجار
اچھلتے ہیں کہیں دیکھ اک طرف کو فوارے — کہیں ہیں کودتے اونچے سے آب پر ابشار
چمن کو دیکھ کے پھولا پھلا ہوا قمری — کرے ہے سرو پہ تسبیح حق پکار پکار

آدمی کی آنکھیں جب نیند سے بوجھل ہونے لگتی ہیں تو پانی کے چھینٹے مار کر اس کو ہوشیار کیا جاتا ہے، اس تجربہ سے کام لے کر حضرت نانوتوی نے کہا دھوپ کی شدت کی وجہ سے سبزے مرجھا جاتے ہیں جو چمن چمن اداسی پیدا کرتے ہیں بادل کو خیال آیا کہ موسم گل کی آمد آمد کا شہرہ ہے اور کائنات کی ہر چیز کو سنوارنا سجانا اور اس کو استقبال کے لئے چاق و چوبند کرنا مری ذمہ داری ہے، اس لئے اس نے اونگھتے ہوئے پودوں پر پانی چھڑک کر ان کو ہوشیار کر دیا، یہ ہر شخص کا مشاہدہ ہے کہ جوں ہی پہلی بارش ہوتی ہے سبزوں میں تازگی آجاتی ہے، سکڑے سمٹے ہوئے سبزے پانی پی کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر حضرت نانوتوی بتاتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر کائنات میں پھیلی ہوئی ہے، اس لئے ہر طرف بہجت و مسرت کے نظارے نظر آتے ہیں، جب کہیں خوشی کی کوئی تقریب ہوتی ہے تو بچے بچیاں رنگ برنگ کے کپڑے پہنے ہر طرف بے مقصد دوڑتے پھرتے ہیں، ہنستے کھیلتے نظر آتے ہیں، ہر دیکھنے والا سمجھ جاتا ہے کہ یہاں کوئی جشن، خوشی کی کوئی تقریب ہونے والی ہے، اسی

طرح کائنات کی ہر چیز فرطِ مسرت سے کھیل کود رہی ہے آب رواں اور بادِ صبا خوشی سے دوڑ بھاگ کرر ہے ہیں، چمن میں غنچوں اور پھولوں کے ہونٹوں پر ہنسی کھیل رہی ہے، بلبل ہزار داستان اپنی خوشی کا اظہار کرر ہا ہے کہ اب جلد ہی بہار کا روح افزا دور آنیوالا ہے جب اس کو نغمہ سرائیوں کا سنہرا موقعہ ہاتھ آئے گا۔

باغوں میں چڑیوں کی چہچہاہٹ ان کا گانا ہے، ادھر ادھر پھدکتے پھرنا ان کا رقص مسرت ہے، اس محفل طرب میں درختوں کے پتے ہوا کے جھونکوں سے تالیاں بجاتے ہیں، پانی کے فوارے وفور مسرت سے اچھل رہے ہیں، آبشار کا پانی پچاسوں فٹ کی بلندی سے نیچے پانی کی سطح پر کود کر اپنی مسرت کا اظہار کرر ہا ہے، قمری سرو کے اونچے اونچے درختوں پر بیٹھ کر بہجت ومسرت کے موقعہ پر ''سبحان تری قدرت'' کے نغمے الاپ رہی ہے، گویا پوری کائنات فرط مسرت سے جھوم رہی ہے، ہر طرف خوشی کے شادیانے بج رہے ہیں، ہر چیز سے مسرت نمایاں ہے، حضرت نانوتوی کا طائر فکر کن کن وادیوں کی خبر رکھتا ہے درج ذیل اشعار دیکھئے:

ہوا ہے چرخ کا سب اب کے صَرف، بارشِ آب	زمین سے اُسے ہووے گی حاجت امطار
چمن میں کثرت گل سے رہی نہ گنجائش	پھرے ہے چار طرف بوئے گل، خدائی خوار
عجب نہیں جو جمیں آب تیغ سے پھر سر	کہ نام آب ہی نشوونما کو ہے درکار
سمجھ کے تخم بشر، کیا عجب جو مردوں کو	قوای نامیہ دیں اب کی بار، برگ وبار

استقبال بہار کے اہتمام میں پورے چمنستان عالم کو سرسبز وشاداب رکھنے کے لئے آسمان نے اتنی فیاضی سے بارش کی ہے کہ اس کا سارا خزانہ اب ختم ہو گیا ہے، اگر اتفاقاً آسمان کو بھی پانی کی ضرورت پیش آ گئی تو اس کو زمین سے پانی مانگنا پڑے گا، اسی وجہ سے چمن میں ہر طرف پھولوں کا انبار لگ گیا ہے اور اتنا اژدہام ہے کہ صحن چمن میں پاؤں رکھنے کی بھی گنجائش نہیں رہ گئی، انتہا یہ ہے کہ جو خوشبو ہمیشہ پھولوں کے ساتھ رہی جہاں پھول رہا وہیں خوشبو بھی رہی مگر پھولوں کے اژدہام کی وجہ سے خوشبو کو پھولوں کی صحبت نصیب نہیں، کیونکہ چمن میں پاؤں رکھنے کی گنجائش ہی نہیں ہے، اس لئے خوشبو ہر طرف آوارہ وسرگشتہ گھوم پھر رہی ہے، شاعر کو صرف یہ کہنا ہے کہ ہر طرف خوشبو پھیلی ہوئی ہے لیکن اس انداز بیان نے کتنا خوبصورت اور محسوس منظر پیش کر دیا ہے۔ پھر حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ

بہار کی آمد آمد کی خبر سے نشو ونما کی قوت اتنی بڑھ گئی ہے کہ آب تیغ (تلوار کی دھار) جو انسان سے حیات چھین لیتی ہے اس کا وجود لٹا دیتی ہے لیکن اب بہار کی قوت نمو اتنی طاقتور ہے کہ آب تیغ میں چونکہ پانی (آب) کا ذکر ہے اور اب صرف پانی کا نام لینا نشو ونما کے لیے کافی ہے اس لیے آب تیغ سے انسان مرنے کے بجائے زندگی پا جائے گا، اس زبردست قوت نمو کی وجہ سے مردوں اور لاشوں میں جان پڑ جائے گی کیوں کہ قوت نمو اس کو تخلیق انسان کے لیے بیج سمجھ لے گی اور بیج سے پیداوار ہوتی ہے اس لیے انھیں لاشوں سے انسان از سر نو وجود میں آجائیں گے، یہ بہار کی پیدا کردہ زبردست قوت نمو کا تعین ہوگا، اس کے بعد اشعار ہیں:

یقیں ہے اب کے تروتازگی کے باعث سے — بغیر آگ کے پکنا ہو کشت کا دشوار
جو بوئیں ہاتھ سے اپنے ہی زاہدان خشک — تو نکلے شجرۂ طوبیٰ زدانہ ہائے شمار
شرار دانۂ بارود کو لگیں ہیں پھول — عموم فیض بہاری سے آگ ہے گلزار

کھیتوں میں گندم کی بالیوں میں دانے اس وقت پکتے ہیں جب ان کو دھوپ کی تمازت ملتی ہے کھیتوں کو سورج کی حرارت کی ضرورت ہوتی ہے، اس سال موسم بہار کی شادابی اور تروتازگی کا یہ عالم ہے کہ سورج کی حرارت ناکام ہوگئی ہے اور کھیتوں میں دانوں کو پکانے کی صلاحیت اس سے ختم ہوگئی ہے اس لیے آگ جلا کر کھیتوں کو حرارت پہونچانے کا نظم کرنا ہوگا تبھی کھیتوں میں دانے پختہ ہوں گے، ''زاہدان خشک'' میں لفظ خشک سے کام لیتے ہوئے حضرت نانوتوی نے کہا کہ خشکی اور طراوت تو دونوں متضاد ہیں، سوکھی زمین میں کوئی پودا جم نہیں سکتا اگر دھول اڑاتی ہوئی زمین میں پودے گاڑ بھی دیے جائیں تو چند گھنٹوں میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو جائیں گے، لیکن اب کے موسم بہار کی طراوت، تروتازگی اور شادابی کا حال یہ ہے کہ خشک زمین میں بھی پودے لگا دیے جائیں وہ شجرہ طوبیٰ کی طرح ہرے بھرے ہوں گے۔ ''زاہدانِ خشک'' کی مناسبت سے یہاں شجرۂ طوبی کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت نانوتوی پھر کہتے ہیں کہ موسم بہار کی شدت طراوت اس درجہ کی ہے کہ بارود کا ذرہ ذرہ جو ایک چنگاری ہوتا ہے وہ پھول بن گیا ہے، بارود ایک آتش کدہ اور آگ کا خزانہ ہے، وہ موسم بہار کے صدقے میں گل وگلزار ہوگئی ہے جیسے حضرت ابراہیم پر آگ گلزار بن گئی تھی۔

یہ فیض عام ہے سر پر ہرن کی شاخیں ہیں — بدن میں شیر کے گل، اور دم میں سیہہ کے خار

بجھائی ہے دل آتش کی بھی تپش، یارب کرم میں آپ کو دشمن سے بھی نہیں انکار
بساط سبزہ مشجر بنا ہے صحن چمن پڑا جو سطح پہ سبزہ کے سایۂ اشجار

بارہ سنگھا کے ہرن کے سر پر شاخ در شاخ سینگیں ہوں یا شیر کے بدن پر بالوں کے گچھے جو پھول کی شکل اختیار کر گئے ہیں یا ساہی کے بدن پر جو لمبے لمبے کانٹے ہیں وہ سب اس بہار کا صدقہ ہے اور شدت طراوت کا یہ عالم ہے کہ آگ کے سینے میں جو تپش اور جلن ہے وہ بھی بجھ گئی ہے حالاں کہ آگ اور پانی میں ازلی بیر ہے اور ایک دوسرے کے دشمن ہیں، لیکن پانی کی شرافت اور فیاضی کا یہ عالم ہے کہ اپنے دشمنوں سے بھی حسنِ سلوک کرنے سے اس کو انکار نہیں ہوتا، اس نے آگ کے دل میں جو تپش تھی اس کو ختم کر کے آگ کو راحت پہنچائی۔ آخری شعر میں جو خیال پیش کیا گیا ہے اس پر شاعر کی قوت مشاہدہ دادو تحسین کی مستحق ہے کتنا خوبصورت اور محسوس منظر پیش کیا ہے، کہتے ہیں کہ صحن چمن میں سبزے کا ہرا ہرا فرش بچھا ہوا تھا وہ شطرنجی یعنی پھولدار فرش بن گیا ہے، کیوں کہ درختوں کے سائے جب سبزے کے ہرے ہرے فرش پر پڑتے ہیں تو دھوپ چھاؤں کی وجہ سے یہ سبز فرش معلوم ہوتا ہے کہ صحن چمن میں شطرنجی بچھادی گئی ہے اور بہت پُر تکلف فرش کا اہتمام نظر آتا ہے۔ حضرت نانوتوی کہتے ہیں:

ہوا کو غنچۂ دل بستہ کی ہے دلجوئی ادھر ہے آب تلک شاخ و برگ سب پہ نثار
کرے ہے سبزۂ نو خاستہ پہ گل سایہ اوڑھاتی آب رواں کی ہیں چادریں انہار
یہ قدر خاک ہے، ہیں باغ باغ وہ عاشق کبھی رہے تھا سدا جن کے دل کے بیچ غبار

فطرت نے چمن کی آرائش میں ہوا اور پانی سب کو لگا رکھا ہے تا کہ کوئی آزردہ خاطر نہ رہے غنچہ یا گل جب تک پھول نہ بنے اس کی پتیاں سمٹی رہتی ہیں اس کو دل بستہ بجھے ہوئے دل سے تعبیر کیا گیا اور چمن میں کوئی آزردہ خاطر نہ رہے اس لیے ہوا غنچہ دل بستہ کی خوشامدیں کر رہی ہے، اس کو جھولا جھلا رہی ہے تا کہ اس کے ہونٹوں پر ہنسی کھیلنے لگے، پانی کی پھواریں تمام درختوں، پودوں اور پھول پتیوں کو نہلا رہی ہیں، پانی ان پر نچھاور اور قربان ہو کر ان کی شادابی میں اضافہ کر رہا ہے۔ چمن میں جو سبزے نئے نئے اگ رہے ہیں اس کو نومولود بچے کی حیثیت میں رکھا گیا ہے جس طرح مائیں بچوں کو دھوپ کی تپش سے بچاتی ہیں، ٹھنڈے سائے میں رکھتی ہیں اور ان کے اوپر کوئی باریک کپڑا اڑھا دیتی ہیں

اسی طرح یہ مولود سبزے اور پودے ہیں ان کی راحت کے لیے پھولوں نے ان پر سایہ کر رکھا ہے کہ دھوپ کی تمازت سے مرجھا نہ جائیں، نہروں نے آب رواں بھیج کر اُن کو پانی کی چادر اڑھا دی ہے، آب رواں اپنے لغوی معنی میں بھی ہے اور آب رواں ململ اور تن زیب کی طرح باریک کپڑا ہوتا ہے، گرمیوں میں اس کے کرتے اور انگرکھے پہنے جاتے ہیں، یہ مفہوم بھی یہاں مراد ہے یعنی نہروں نے بہت باریک کپڑے نومولود سبزوں کو اڑھا دیئے ہیں۔ آگے شعر میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ سارے پودے زمین سے اُگتے ہیں، باغوں میں درختوں کی جڑیں اسی زمین ہی میں پیوست ہوتی ہیں جب باغ زمین کا مرہون منت ہے عاشقوں کا دل ''باغ باغ'' اور خوش کیوں نہ ہو جائے، رقیبوں کی طرف سے جو دل میں غبار ہے وہ غبار زمین کا ہی حصہ ہے، اس لیے اس میں باغ پیدا ہو گیا تو غبار اس باغ کے درختوں کی جڑوں کی خوراک بن گیا اور تب عاشق کے دل میں اغیار کی طرف سے جو غبار تھا ختم ہو گیا اور دل صاف ہو گیا، حضرت نانوتوی پھر کہتے ہیں:

نہ ہووے رشک سے لالہ کے دل پہ کب تک داغ	کہ گل ہے سوختہ جاں، تھی جو شمع آتشبار
نہ ہووے رنگ کوئی کب تلک کہ لالہ وگل	نکالیں سبز شجر سبزہ سرخ گل سے عذار
جلائے گر کہیں ہم شکل شاخ شمع کو بھی	دھوئیں بکھیر دے آتش کے دم میں باد بہار
یہ ربط ہے گل وبو میں، اگر جدا ہو بو	تو جان کھونے کو ہو اپنی، گل رہیں تیار

لالہ کا رنگ خوب سرخ ہوتا ہے اور پنکھڑیوں میں کہیں کہیں سیاہ داغ ہوتے ہیں اس کو لالہ کے دل کا داغ کہا گیا، یہ داغ پھول اور شمع سے رشک کیوجہ سے پڑے کہ وہ سب دل جلے ہیں مرے دل میں عشق ومحبت کی وہ آگ نہیں اس لیے مارے رشک کے اس کے دل میں داغ پڑ گئے۔ پھر کہتے ہیں کہ چمن میں سرسبز وشاداب درختوں کو دیکھا جاتا ہے کہ سب کا رنگ ہرا اور سبز ہے لیکن ان سے جو پھول نکلتے ہیں وہ معشوق کے رخساروں کی طرح سرخ نہیں، حیرت ہوتی ہے کہ آخر سبز درختوں کی شاخوں میں یہ سرخ پھول کیسے پیدا ہو گئے، جوش بہار کا عالم یہ ہے کہ شمع جو ایک شاخ کے مانند ہوتی ہے اس کو جلایا جائے تو باد بہاری شمع کو شاخ سمجھ کر آگ کی حلق میں دھواں بھر کر اس کا وجود مٹا دے، پھول اور خوشبو دونوں کے عشق ومحبت کا یہ عالم ہے کہ اگر پھول سے خوشبو جدا ہو کر کہیں چلی جائے تو پھول خوشبو کی جدائی برداشت نہیں کر سکے گا وہیں دم توڑ دے گا، کیونکہ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہنا چاہتا، یہ

بالکل مشاہدہ کی بات ہے۔

لگائے منہ بھی نہ گلدم، خدا کی قدرت ہے ۔۔۔ اوراس کی دم سے لگا یوں پھرے گل بے خار
چنور سنہری بنائے ہیں ہر شجر کے لیے ۔۔۔ شعاع کی مہ وخور میں لگا کے چرخ نے تار
سمجھ کے غنچۂ لالہ کرے ہے گل ورنہ ۔۔۔ نسیم تیز کو کچھ شمع سے نہیں پیکار
بہ شکل شاخ بنا کر کے شمع کچھ مانگے ۔۔۔ تو منصب شجر طور ہی دلائے بہار
یہ سبزہ زار کا رتبہ ہے شجرۂ موسیٰ ۔۔۔ بنا ہے خاص تجلی کا مطلع انوار
اسی لیے چمنستان میں رنگ مہندی نے ۔۔۔ کیا ظہور، ورق ہائے سبز میں ناچار

گلدم ولایتی بلبل کو کہتے ہیں جس کا رنگ سیاہ اور سر پر چوٹی ہوتی ہے اوراس کی دُم کے نیچے کے پر سرخ ہوتے ہیں اس کو پھول کہتے ہیں، وہ پھولوں کی عاشق کہی جاتی ہے، حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ اب کے موسم بہار میں پھولوں کی اتنی کثرت ہے کہ بلبل پھولوں کو منہ تک نہیں لگاتی، الٹے پھول ہی اس کی دم کے پیچھے لگا ہوا ہے، جب انسان کے پاس دولت کا انبار ہو جاتا ہے تو اس میں ایک طرح کی بے اعتنائی آجاتی ہے۔ ''چنور'' دیہاتی لفظ ''چنری'' دلہنوں کا لباس ہوتا ہے جس میں سلمہ ستارا اور چمکدار تار ٹانکے جاتے ہیں، تمام درختوں اور پودوں کو دلہن کا لباس تیار کرنے کے لیے آسمان کو ذمہ داری دی گئی ہے وہ چاند سورج کی کرنوں میں تار ڈال کر سنہری چنری بنا کر چمن کے سارے درختوں اور پودوں کو دلہن کی طرح سجا رہا ہے۔

جوش بہار کا یہ عالم ہے کہ اگر شمع جل رہی ہے اور بادنسیم کا ادھر سے گزر ہو جاتا ہے تو شمع اس لیے بجھ جاتی ہے کہ نسیم بہار یہ سمجھتی ہے کہ شمع کی لو جو نظر آرہی ہے وہ گل لالہ کی سرخ سرخ کلی ہے، اس لیے وہ بے تکلف گزر جاتی ہے اور شمع بجھ جاتی ہے، کیوں کہ بادنسیم کو شمع سے کوئی عداوت نہیں ہے وہ کیوں بجھائے گی مگر غلط فہمی کیوجہ سے ایسا ہو جاتا ہے۔

موسم بہار کی فیاضی اس درجہ کو پہنچی ہوئی ہے کہ اگر شمع کہدے کہ میں درخت کی شاخ ہوں مجھ کو بھی فیضان بہار سے حصہ ملنا چاہیے تو شجر طور جس زمین پر ہے وہ زمین سفارش کرے گی کہ جب اس بہار کا فیض سب کو پہونچ رہا ہے، زمین کا ہر پودہ اس سے فیضیاب ہو رہا ہے تو شمع جو خود کو شاخ کہہ رہی ہے تو اس شاخ کو پھول پتیوں کی سوغات ملنی چاہیے تو شمع میں بھی پھول پتیاں پیدا ہو جائیں

گی، حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ کائنات میں سب سے بڑا رتبہ تو سبزہ زار ہی کا ہے، کیونکہ شجر طور بھی اسی میں سے ہے، اس پر تجلی ربانی ہوئی جبکہ کائنات کی کسی اور چیز پر تجلی نہیں ظاہر ہوئی۔

مہندی کی پتیاں جب پیس کر نرم و نازک ہتھیلیوں پر لگائی جاتی ہیں تو ان کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے جبکہ پتیوں کا رنگ سبز ہوتا ہے، چونکہ پتیوں کا ہرا رنگ تجلی گاہ ربانی ہے اس لیے مہندی کے رنگ نے ہری ہری پتیوں میں حلول کر کے ظہور کیا، سبز پتیوں کا احترام کیا اور ان کا رنگ نہیں بدلا۔

حضرت نانوتوی پھر فرماتے ہیں:

ہنود کو ہے گماں دیکھ کر یہ اعجوبے — کہ اب کے لیں ہیں جنم سبزہ زار میں اوتار

یعنی یہ قوم تو ہر حیرتناک چیز کو دیکھ کر اس کی پرستش کرنے لگتی ہے، اس سال موسم بہار نے وہ حیرتناک جلوے دکھائے ہیں کہ یہ توہم پرست قوم کہے گی کہ اب کے اوتار نے سبزہ زاروں میں جنم لیا ہے اور پھر اس کی پرستش کرنے لگے گی۔

نزاکتِ چمنستاں بیان کیا کیجے — کہ صُنع حق کے تئیں دیکھ عقل ہے بیکار
نہ شاخ گل کے تئیں تاب بارِ شبنم ہے — نہ کوئی لحہ ہے شبنم کو دھوپ ہی کی سہار
ہوا کی ایک ٹھسک سے ہے چور چور حباب — رگڑ سے آب کی، دھانگیں ہیں آبجو کی فگار
پڑے پھپھولے حبابوں کی نرمی تن سے — بندھا جو بوندوں کی کثرت سے تن پہ اُن کے تار
گرا دیا ہے تلے، گل نے بار سایہ کو — کہ رنگ و بو کا اٹھانا بھی تھا اُسے دشوار
نہ ہو کہاں تئیں آب رواں کا پتلا حال — خراش سبزہ بہ پا، سر پہ سایۂ گل بار
پچھاڑ کھا کے گرے ہے چمن میں چادر آب — ہوا ہے کثرت لغزش سے آب بھی ناچار
کمر پہ بار گراں بوئے گل، تلے پھسلن — نہ لڑکھڑائے کہاں تک ہوا دم رفتار
جو گر پڑے تو اٹھا جا نہ سایۂ گل سے — نہ تھم سکے جو پھسل جائے موجۂ جوئبار

جب آدمی ناز و نعمت میں پلا ہوا ہوتا ہے تو معمولی چوٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا، چھوٹی چھوٹی مصیبتیں اس کے لیے پہاڑ بن جاتی ہیں، بہار نے چمن کو بڑے ناز و نعم سے پالا ہے، اس لیے اس کی ہر چیز میں نزاکت آ گئی ہے، اس نزاکت کی کیا کیفیت ہے حضرت نانوتوی نے محسوس اور مشاہداتی مناظر دکھائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پھول تو پھول اس کی شاخیں اور پتیاں اتنی نرم و نازک ہیں کہ وہ شبنم کے

قطروں کو بھی اپنے اوپر برداشت نہیں کرسکتیں اور خود شبنم جو اسی چمن کے ہم نشینوں میں شامل ہے اتنی نازک اندام ہے کہ سورج کی معمولی حرارت بھی اس کے تن نازک کا وجود مٹا دیتی ہے، چمن کی نہروں میں جو حبابوں کے تاج محل کھڑے ہیں ان کو ہوا کی ذراسی بھی ٹھیس لگی تو وہ چور چور ہو جاتے ہیں، نہروں میں پانی چلتا ہے تو نہر کے کناروں سے رگڑ کھا کر اس کے پاؤں زخمی ہو جاتے ہیں، نہر کے حبابوں کا بدن اتنا نازک ہے کہ بارش کی بوندوں کا تار بھی ان کے بدن کو چھو جاتا ہے تو ان کے بدن میں چھالے پڑ جاتے ہیں، پھولوں کا عالم یہ ہے کہ ان پر رنگ و بو کا اتنا بڑا بوجھ ہے کہ اسی کو اٹھانا ان کے لیے دشوار ہے، اس پر شاخوں کے سائے کا مزید باران کے لیے ناقابل برداشت ہو گیا تو سر سے سایہ کے بوجھ کو اتار کر زمین پر ڈال دیا ہے، ظاہر ہے کہ سایہ زمین پر ہی پڑتا ہے مگر اس کی یہ تعبیر کتنی خوبصورت اور رومان انگیز ہے۔

چمن کی نہروں میں جو پانی رواں دواں ہے اس کا بھی حال بہت پتلا ہے یعنی بڑی مصیبتوں میں گرفتار ہے، کیوں کہ جب وہ چلتا ہے تو سبزے اس کے پاؤں تلے آتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے پاؤں میں خراش آ جاتی ہے اور قدم زخمی ہو جاتے ہیں، پھر اس پر پھولوں کے سایہ کا بوجھ خود بار گراں، پاؤں زخمی اور اتنے بڑے بوجھ کو لے کر چلنا بہت دقت طلب کام ہے، اس لیے اس کا حال بہت پتلا ہو گیا۔

پانی آسمان سے اُترتا ہے تو ہوا کے تھپیڑے کھا کر زمین پر گرتا ہے تو ایک دھما کا سا ہوتا ہے، پانی بھی چمن میں پھسل کر بے تحاشا گرتا ہے، کیونکہ بار بار اس کو ٹھوکر لگتی ہے اور پاؤں میں لغزش ہوتی ہے، اس لیے برسات کی پھسلن میں جیسے آدمی بے تحاشا گرتا ہے اسی طرح پانی بھی چمن میں بار بار گر جاتا ہے، چمن میں ہوا بھی لڑکھڑاتی ہوئی چلتی ہے، ایک تو اپنی کمر پر خوشبو کا بھاری بوجھ لاد رکھا ہے دوسرے زمین پر بارش کی وجہ سے پھسلن ہو گئی ہے بھاری بوجھ کی وجہ سے ہر ہر قدم پر پھسل جاتی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب گری اور تب گری، خوشبو کے بوجھ کا تصور بڑا شاعرانہ تصور ہے۔ آگے کہتے ہیں کہ پھولوں کا سایہ اگر زمین پر گر پڑے تو پھولوں کے لیے سائے کا اٹھانا بھی دشوار ہو جاتا ہے۔ نہر میں چلنے والے پانی کی موج کو اگر ٹھوکر لگ گئی اور وہ پھسل گئی تو پھر اس کا سنبھلنا دشوار ہو جائے گا وہ پھسلتی ہوئی دور تک چلی جائے گی۔ حضرت نانوتوی کہتے ہیں:

کہاں زمین، کہاں یاسمین ولالہ ودرو — فلک بھی گرد ہوا دیکھ کر چمن کی بہار
زمیں سے چرخ ہے ہر طرح اب کے شرمندہ — زمیں میں گڑ جا اگر چرخ کی بسے کچھ چار
دکھائے چرخ اگر اپنے چاند سورج کو — مقابلہ پہ ہر اک حوضِ باغ ہو تیار
کئے ہیں آپ زمیں نے جواب بارش میں — بجائے بوندوں کے فوارے اس طرف تیار

اب کی بار موسم گل نے زمین کو انتہائی حسین اور خوبصورت بنا دیا ہے، ہر طرف چمبیلی، گلاب اور گل لالہ اپنی بہار دکھا رہے ہیں جن کو دیکھ کر آسمان شرمندہ ہے کہ زمین کی آرائش وزیبائش کے مقابلہ میں میری آرائش وزیبائش گرد ہوگئی ہے، مارے شرم کے وہ زمین میں گڑا جا رہا ہے اگر رفع خجالت کے لیے آسمان اپنے چاند سورج دکھائے کہ ہمارے پاس نور کا خزانہ ہے تو زمین بھی مقابلہ پر آجائے گی اور چمن کے حوض کو اس کے مقابلہ میں پیش کر دے گی جس میں پانی سیال چاندی کی طرح ہلوریں لے رہا ہے جس سے چاند سورج خود شرمندہ ہو جائیں، آسمان اگر بارش برسا کر اپنی برتری کا مظاہرہ کر سکتا ہے تو زمین اپنے فوارے اس کے جواب میں پیش کر دے گی کہ تم ننھی ننھی بوندیں برسا کر مغرور ہو اس کے مقابلہ میں یہ فوارے پورے جوش وخروش سے برستے ہیں۔

حضرات نانوتوی نے زمین وآسمان کے تقابل میں زمین کی برتری دکھائی ہے، زمین کو یہ برتری اسی موسم بہار میں ملی ہے، یہاں ماضی کا کوئی ذکر نہیں، زمین وآسمان کے اسی تقابل سے گریز کے اشعار شروع ہوتے ہیں، پھر اس کے بعد مدحیہ اشعار کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت نانوتوی نے گریز کے یہ دو شعر کتنے معنی خیز کہے ہیں، ملاحظہ ہو:

پہونچ سکے شجر طور کو کہیں طوبیٰ — مقام یار کو کب پہونچے مسکن اغیار
زمین وچرخ میں ہو کیوں نہ فرق چرخ وزمین — یہ سب کا بار اٹھائے وہ سب کے سر پہ سوار

زمین کی فضیلت وبرتری کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ شجر طور زمین پر اور شجر طوبیٰ آسمان پر، مگر زمین کا یہ درخت آسمان کے درخت سے کہیں زیادہ باعظمت اور بلند رتبہ ہے، کیوں کہ شجر طور پر تجلی ربانی ہوئی اور وہ محبوب حقیقی کی جلوہ گاہ ہے اور طوبیٰ کو یہ شرف حاصل نہیں، اس پر فرشتے رہتے ہیں، ان کی حیثیت رقیب اور اغیار کی ہے، رقیب اور غیر کا گھر محبوب کے گھر سے افضل کیسے ہو سکتا ہے، اسی لیے شجر طور کو شجر طوبیٰ پر فضیلت حاصل ہے، آخر میں ایک مشاہداتی دلیل پیش کرتے ہیں کہ زمین آسمان میں تو

زمین آسمان کا فرق ہے یعنی بہت بڑا فرق ہے کیونکہ زمین سب کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور آسمان سب کے سر کا بوجھ بنا ہوا ہے کیوں کہ وہ اوپر ہے سب کے سر پر چھایا ہوا ہے۔

حضرت نانوتوی اب تک کائنات کی چمن بندی کرتے رہے اس کے بعد مدح کے اشعار گائیں گے قصیدہ عربی زبان سے فارسی کے راستہ سے اردو میں آیا ہے اس لیے اس صنف سخن میں عربی شاعری کا انداز بیان پایا جاتا ہے، عربی زبان کے شعراء قصیدہ کے آغاز میں عشق ومحبت کے اشعار کہتے تھے اور پورا زور قلم صرف کرتے تھے اسی کو تشبیب کہتے ہیں، فارسی زبان میں جب قصیدہ آیا تو عشق ومحبت کے بجائے مناظر فطرت کی تصویر کشی، بہار اور مؤسم گل کی دلفریبیوں اور رعنائیوں کا ذکر تشبیب کی جگہ کہنے لگے، اردو قصیدہ نگاری میں بھی یہی طریقہ رہا، محسن کاکوروی کے قصیدہ نعتیہ میں یہی مناظر فطرت کی عکاسی ہے۔ حضرت نانوتوی نے فارسی شعرا سے متاثر ہوکر بہاریہ کہنے کو ترجیح دی، تشبیب درحقیقت قصیدہ کی تمہید ہوتی ہے اور جب اصل مدح شروع ہوتی ہے اس سے پہلے گریز کا ایک یا دو شعر لکھ کر تشبیب اور مدح میں مکمل رابطہ پیدا کر دیتے ہیں گریز کا شعر تشبیب اور مدح کا نقطۂ اتصال ہوتا ہے، حضرت نانوتوی نے بھی گریز کے شعروں میں اس نکتہ کو ملحوظ رکھا ہے۔ حضرت نانوتوی کا کمال فن ''بہاریہ'' میں پوری طرح عروج پر ہے جو ایک قادرالکلام شاعر ہونے کی سند ہے، قوت تخئیل انتہائی بلند پرواز، قوت مشاہدہ بہت ژرف بیں اور دقیقہ رس۔ ضرب الامثال اور خوبصورت محاورے بہ کثرت استعمال کیے ہیں، صفت تجنیس کی رعایت نے اشعار کو حسین وجمیل بنانے میں اہم کردار انجام دیا ہے، جوش بہار کے خوبصورت مناظر کی عکاسی ہی کے سلسلہ میں زمین وآسمان کا تقابل کیا گیا اور زمین کی آسمان پر برتری دکھائی گئی، اس کے بعد نعت کا آغاز ہوجاتا ہے:

کرے ہے ذرۂ کوے محمدی سے خجل　　　فلک کے شمس وقمر کو زمینِ لیل ونہار

وہی زمین وآسمان کا تقابل، اگر آسمان کے چاند سورج اپنی روشنی اور آب وتاب پر فخر کرتے ہیں تو زمین سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گلی کوچوں اور گزرگاہوں کی خاک کے ذرے کو فضا میں اُچھال دیتی ہے کہ ان خاک کے ذروں کی آب وتاب اور چمک دمک کو تمہاری آب وتاب کہاں پہونچ سکتی ہے، چاند سورج کو سوائے ندامت کے کوئی چارۂ کار نہیں رہ جاتا:

فلک پہ عیسیٰ وادریس ہیں تو خیر سہی　　　زمیں پہ جلوہ نما ہیں محمد مختارؐ

فلک پہ سب سہی پر ہے نہ ثانیِ احمدؐ زمیں پہ کچھ نہ ہو، پر ہے محمدی سرکار

کئی پیغمبروں کا آسمان پر ہونا فلک کے لیے باعث افتخار ضرور ہے لیکن افضل الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کا زمین پر ہونا ہی اس کی افضلیت و برتری کے لیے کافی ہے۔

نثار کیا کروں، مفلس ہوں، نام پر اس کے فلک سے عقد ثریالوں دلے اگر وہ اُدھار

ثنا کر اس کی فقط قاسم اور سب کو چھوڑ کہاں کا سبزہ، کہاں کا چمن، کہاں کی بہار

ثنا کر اس کی، اگر حق سے کچھ لیا چاہے تو اس سے کہہ، اگر اللہ سے ہے کچھ درکار

الٰہی! کس سے بیاں ہوسکے ثنا اس کی کہ جس پہ ایسا تری ذات خاص کا ہے پیار

جو تو اُسے نہ بناتا تو سارے عالم کو نصیب ہوتی نہ دولت وجود کی زنہار

کہاں وہ رتبہ کہاں عقل نارسا اپنی کہاں وہ نور خدا، اور کہاں یہ دیدۂ زار

چراغ عقل ہے گل، اس کے نور کے آگے زباں کا منہ نہیں جو مدح میں کرے گفتار

جہاں کہ جلتے ہوں پر عقل کل کے بھی پھر کیا لگی ہے جان، جو پہونچیں وہاں میرے افکار

مگر کرے میری روح القدس مددگاری تو اس کی مدح میں، میں بھی کروں رقم اشعار

جو جبرئیل مدد پر ہو فکر کی میرے تو آگے بڑھ کے کہوں، اے جہان کے سردار

حضرت نانوتوی نے ان اشعار میں حضورؐ کے مرتبہ بلند اور شان رفیع کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جس کے وجود کے صدقے میں ساری کائنات نے خلعت وجود پایا جس خالق کائنات کے حضور میں کائنات کی ہر چیز سر بہ سجود ہے وہی ذات عالی جس ذات مقدس کو اپنا محبوب بنالے تو اس عظیم المرتبت شخصیت کی مدح وثنا میں زبان کا منہ ہے کہ گفتگو کرے جبکہ:

ہزار بار بشویم دہاں زمشک وگلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

ہاں اگر حضرت جبرئیل مدد کریں تو میں زباں کھولوں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مداح رسول حسانؓ بن ثابت کے لیے دعا فرمائی تھی اللھم ایدہ بروح القدس اے اللہ جبریل کے ذریعہ ان کی مدد فرما، پھر آگے حضرت نانوتوی خالص نعت کے اشعار کہتے ہیں:

تو فخرِ کون ومکاں زبدۂ زمین وزماں امیر لشکر پیغمبراں، شہِ ابرار

خدا ترا، تو خدا کا حبیب اور محبوب خدا ہے آپ کا عاشق تم اس کے عاشق زار

تو بوئے گل ہے اگر مثل گل ہیں اور نبی — تو نورِ شمس گر اور انبیاء ہیں شمسِ نہار
حیات جان ہے تو ہیں اگر وہ جان جہاں — تو نور دیدہ ہے گر ہیں وہ دیدۂ بیدار
طفیل آپ کے ہے کائنات کی ہستی — بجا ہے کہئے اگر تم کو مبدء الآثار
جلو میں تیرے سب آئے عدم سے تابہ وجود — قیامت آپ کی تھی دیکھئے تو اک رفتار
جہاں کے سارے کمالات ایک تجھ میں ہیں — ترے کمال کسی میں نہیں مگر دوچار
گرفت ہوتو تیرے ایک بندہ ہونے میں — جو ہوسکے تو خدائی کا اک تیرے انکار

مشرکین مکہ کہا کرتے تھے کہ ہم میں ان میں کیا فرق ہے، ہماری طرح وہ کھاتے پیتے ہیں، بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، جیسے ہم ویسے وہ بھی ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا ایک بندہ کہنے اور آپ کے رسول ہونے سے انکار کرتے تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جہنم رسید ہوئے، رسالت سے انکار اور صرف بندہ کہنے پر گرفت ہوئی، حضور سے اگر کسی کمال کی نفی کی جاسکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ آپ خدا نہیں ہیں بقیہ سارے کمالات آپ کی ذات میں موجود ہیں:

بجز خدائی نہیں چھوٹا تجھ سے کوئی کمال — بغیر بندگی کیا ہے، لگے جو تجھ کو عار
جو دیکھیں اتنے کمالوں پہ تیری یکتائی — رہے کسی کو نہ وحدت وجود کا انکار

صوفیا کا ایک طبقہ وحدت الوجود کا قائل ہے، وجود کا اطلاق صرف ایک ذات واجب الوجود پر کہا جاسکتا ہے، باقی ساری کائنات اس وجود کا پرتو اور اس کے مظاہر ہیں، کائنات کے ذرہ ذرہ میں اسی کی جلوہ گری ہے، بذات خود کائنات کا اپنا کوئی حقیقی وجود نہیں، صوفیا کا ایک طبقہ اس سے انکار کرتا ہے، حضرت نانوتوی کہتے ہیں کہ اس نظریہ کا انکار کرنے والے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمالات میں یکتائی و بے مثالی کو دیکھ لیں کہ آپ کے کمالات کے سامنے کسی کمال کی کوئی حقیقت نہیں، دنیا کے سارے کمالات آپ کے کمالات کے سامنے گرد ہیں، کائنات میں صرف آپ کا کمال ہی حقیقی کمال ہے، جب آپ کی یکتائی اور بے مثالی اس درجہ کی ہے تو خالق کائنات کے بارے میں وحدت الوجود کے نظریئے کی وہ خود تائید کرنے لگیں گے، آگے کہتے ہیں:

یہ اجتماع کمالات کا تجھے اعجاز — دیا تھا تانہ کریں انبیاء کہیں تکرار
تو آئینہ ہے کمالاتِ کبریائی کا — وہ آپ دیکھتے ہیں اپنا جلوۂ دیدار

پہونچ سکا تیرے رتبہ تلک نہ کوئی نبی
ہوئے ہیں معجزہ والے بھی اس جگہ ناچار
جو انبیاء ہیں وہ آگے تری نبوت کے
کریں ہیں امتی ہونے کا یا نبی اقرار
لگا ہاتھ نہ پتلے کو بوالبشر کے خدا
اگر ظہور نہ ہوتا تمہارا آخر کار
خدا کے طالبِ دیدار حضرت موسیٰ
تمہارا لیجے خدا آپ طالب دیدار
کہاں بلندی طور اور کہاں تری معراج
کہیں ہوئے ہیں زمیں آسمان بھی ہموار
جمال کو ترے کب پہونچے حسن یوسف کا
وہ دلربائے زلیخا، تو شاہدِ ستار
اگر قمر میں کچھ آجائے تیرے چہرے کا نور
تو رات دن ہو، اور آگے ہو اس کے دن شب تار

یہاں شاعرانہ تخیل پورے عروج پر ہے اور طائر فکر کی پرواز انتہائی بلند نظر آتی ہے، کہتے ہیں کہ اگر رات میں چودہویں رات کا چاند نکلا ہوا ہو اور وہ آپ کے چہرے کا نور، آب و تاب اور اس کی روشنی پا جائے تو چاند کی روشنی کا یہ عالم ہوگا کہ رات دن سے اتنی زیادہ روشن اور تابناک ہو جائے گی کہ جب صبح کو سورج طلوع ہوگا تو اس کی روشنی اس چاند کی روشنی کے مقابلہ میں جس میں حضور کے چہرۂ زیبا کا نور شامل ہو گیا ہے اتنی کمزور اور مدھم معلوم ہوگی کہ لوگ کہیں گے کہ دن نہیں بلکہ تاریک ترین رات ہے، اب چاند طلوع ہوگا تو دن ہوگا اور سورج نکلے گا تو رات ہوگی وہ بھی تاریک ترین رات، اس کے بعد حضرت نانوتوی نے استعارات، کنایات، تشبیہات و تمثیلات کا مینا بازار لگا دیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

جمال ہے ترا معنی حسن ظاہر میں
کیا ہے معجزہ سے تو نے آپ کو اظہار
رہا جمال پہ تیرے حجاب بشریت
نہ جانا کون ہے، کچھ بھی، کسی نے جز ستار
سوا خدا کے، بھلا تجھ کو کوئی کیا جانے
تو شمس نور ہے، شپر نمط اولوا الابصار
سما سکے تیری خلوت میں کب نبی و ملک
خدا غیور، تو اس کا حبیب اور اغیار
جو آئینہ میں پڑے عکس خال کا تیرے
تو رشک مہر کا ہو جائے مطلع الانوار
تمہارا خالِ قدم دیکھ رشک سے مہ کے
جگر پہ داغ ہے، سورج کو ہے عذاب النار
نہ بن پڑا وہ جمال آپ کا سا اک شب بھی
قمر نے گو کہ کروڑوں کیے چڑھاؤ اتار
اگر پڑے ترے تلوے میں عکس سورج کا
تو آگے نور قدم کے ہو تیرے خال شمار
سفید دیدۂ بے نور سا ہے دیدۂ نور
بصیر ہونے کو تلوے کا تل ہے تیرے بکار

بنا شعاعوں کی جاروب تیرے کوچہ سے مہر — کرے ہے دور اندھیرے کا روز گرد وغبار

کتنا خوبصورت شعر ہے، قوت مشاہدہ کی یہ معراج ہے کہ وہ دیکھتی ہے کہ سورج روز جب طلوع ہوتا ہے تو اس کی لنبی لنبی کرنیں جھاڑو کے تنکے کی طرح معلوم ہوتی ہیں، اس سے خیال پیدا ہوا کہ شاید سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ سولم کی بابرکت مقدس گلیوں، کوچوں اور گزرگاہوں کی صفائی کے لیے سورج نے شعاعوں کا جھاڑو بنایا ہے اور اس سے اندھیرے کے گرد وغبار کو صاف کررہا ہے۔ مقام کی عظمت واہمیت کے پیش نظر اسی کے شایان شان ہر چیز استعمال ہوتی ہے اس لیے مدینہ کی گلیوں کی صفائی کے لیے تنکوں کا نہیں شعاعوں کا ہی جھاڑو زیادہ مناسب اور اس کی شایان شان ہے، پھر کہتے ہیں:

اگر ترے رخِ روشن سے گل کو دوں تشبیہ — شعاعِ مہر کو ہو آرزوے منصبِ خار
مُربی مہ وخور ذرے ذرے کوچے کے — معلم الملکوت آپ کا سگِ دربار
خوشا نصیب، یہ نسبت کہاں نصیب مرے — تو جس قدر ہے بھلا، میں بُرا اسی مقدار
نہ پہونچیں گنتی میں ہرگز ترے کمالوں کی — میرے بھی عیب شہ دوسرا، شہِ ابرار
قبول جرم سے اُمت کے تیری کھا دھوکا — عجب نہیں ہے جو شیطان بھی ہو نیکو کار
جو چھو بھی دیوے سگِ کوچہ تیرا اس کی نعش — تو پھر تو خلد میں ابلیس کا بنائیں مزار
عجب نہیں، تیری خاطر سے تیری امت کے — گناہ ہوویں قیامت کو طاعتوں میں شمار
بکیں گے آپ کی اُمت کے جرم ایسے گراں — کہ لاکھوں مغفرتیں کم سے کم پہ ہوں گی شمار
کفیل جرم اگر آپ کی شفاعت ہو — تو قاسمی بھی طریقہ ہو، صوفیوں میں شمار
ترے بھروسے پہ رکھتا ہے غرّۂ طاعت — گناہِ قاسم برگشتہ بخت، بداطوار
گناہ کیا ہے، اگر کچھ گنہ کئے میں نے — تجھے شفیع کہے کون؟ گر نہ ہوں بدکار
تمہارے حرف شفاعت پہ عفو ہے عاشق — اگر گناہ کو ہے خوفِ غصۂ قہار
یہ سن کے، آپ شفیعِ گناہ گاراں ہیں — کئے ہیں میں نے اکٹھے گناہ کے انبار
ترے لحاظ سے اتنی تو ہوگئی تخفیف — بشر گناہ کریں اور ملائک استغفار
دعا تری مرے مطلب کی ہو اگر حامی — تو بخت بد کو ملے حق کے گھر سے بھی پھٹکار
یہ ہے اجابت حق کو تری دعا کا لحاظ — قضاء مبرم ومشروط کی سنیں نہ پکار

خدا ترا، تو جہاں کا ہے واجب الطاعۃ | جہاں کو تجھ سے، تجھے اپنے حق سے ہے سروکار
قضاء کو تیری یہ خاطر، مگر تجھے وہ ہے | قضاء حق سے نیاز اور نیاز کا اقرار
اگر جواب دیا بیکسوں کو تو نے بھی | تو کوئی اتنا نہیں جو کرے کچھ استفسار
کروڑوں جرموں کے آگے یہ نام کا اسلام | کرے گا یا نبی اللہ! کیا مرے پہ پکار
دکھائیے، دیکھئے کیا اپنا طالع بد بیں | نگاہ لطف تری ہو نہ گر مری غم خوار
بُرا ہوں، بد ہوں، گنہگار ہوں پہ تیرا ہوں | ترا کہیں ہیں مجھے، گو کہ ہوں میں نابکار
لگے ہے سگ کو ترے، میرے نام سے گو عیب | پہ تیرے نام کا لگنا مجھے ہے عزّ و وقار
تو بہترین خلائق میں بد ترین جہاں | تو سرور دو جہاں، میں کمینہ خدمت گار

اس کے بعد آٹھ دس شعروں میں حضرت نانوتوی نے جو کچھ کہا ہے اس سے میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ قصیدہ حضرت نانوتوی نے اس دور میں لکھا ہے جب ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد آپ کے خلاف وارنٹ گرفتاری تھا اور آپ روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے، انگریزوں نے ہر طرف مخبروں کا جال پھیلا رکھا تھا، آپ کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی اور آپ پولیس سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے کیوں کہ گرفتاری کا مطلب پھانسی یا کالے پانی کی سزا تھی اس سے ہلکی سزا کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ روپوشی کا یہ دور ایک سال سے کم نہیں تھا، سارا کاروبار زندگی معطل تھا، عزیز و اقارب سے رشتہ کٹا ہوا تھا سخت ذہنی اذیت میں آپ گرفتار تھے، انھیں حالات میں قصیدہ لکھا گیا۔ ممکن ہے مرا خیال صحیح نہ ہو کیونکہ حضرت نانوتوی کے اس قصیدہ کے اشعار میں تہ در تہ معنویت ہے اور درج ذیل اشعار سے ان کی منشا اور ہی ہو بہر حال اشعار حاضر ہیں:

بہت دنوں سے تمنا ہے کیجیے عرضِ حال | اگر ہو اپنا کسی طرح تیرے در تک بار
وہ آرزوئیں جو ہیں مدتوں سے دل میں بھری | کہوں میں کھول کے دل اور نکالوں دل کا غبار
مگر جہاں ہو فلک آستاں سے بھی نیچا | وہاں ہو قاسم بے بال و پر کا کیونکہ گزار
نہ جبرئیل کے پَر ہیں، نہ ہے براق کوئی | جو اُڑ کے در تیئں پہونچوں تمہارے، یا ہو سوار
کشش پہ تیری لیے اپنا بار بیٹھے ہیں | تکے ہے تیری طرف کو، یہ اپنا دیدۂ زار
یہ میری جان نکمی سی تھی سو اس کے بھی | پڑے ہیں چرخ و زماں پیچھے باندھ کر ہتھیار

مدد کر، اے کرمِ احمدی کہ تیرے سوا — نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار
دیا ہے حق نے تجھے سب سے مرتبہ عالی — کیا ہے سارے بڑے چھوٹوں کا تجھے سردار
جو تو ہی ہم کو نہ پوچھے تو کون پوچھے گا — بنے گا کون ہمارا، ترے سوا غم خوار
کیا ہے سگ نمط ابلیس نے میرا پیچھا — ہوا ہے نفس، موا سانپ سا گلے کا ہار

پھر اس کے بعد اپنی بیکسی اور اپنے درد وکرب کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے اپنی دلی تمناؤں اور جذبات کا اظہار کیا ہے۔ چونکہ وہ تصوف وسلوک کی راہ کے راہی تھے، ان کا رہوار فکر اسی جانب مڑ گیا ہے پھر دیر تک چلتا رہا عشق نبوی کا سوز، دیار مدینہ پہونچنے کی تڑپ اور اس مقدس سرزمین میں اپنے وجود کو تحلیل ہو جانے کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں، یہ ساری باتیں اندرونی کرب کی وجہ سے بہت ہی موثر الفاظ میں کہی ہیں، اشعار دیکھئے:

وہ عقل بے خرد اپنی، بہ زور حرص و ہوا — اُسے بجھاؤں میں یا اُن سے آکے ہوں دوچار
دکھائے ہے مرے دل کو لبھانے کو ہر دم — ہزار طرح کے دنیائے کہنہ سالؔ سنگار
ادھر ہجوم تمنا، ادھر نصیبوں سے — کرے ہے بخت زبوں، ہر امید سے انکار
رجاء وخوف کی موجوں میں ہے امید کی ناؤ — جو تو ہی ہاتھ لگائے تو ہووے بیڑا پار
امیدیں لاکھوں ہیں لیکن بڑی امید ہے یہ — کہ ہو سگانِ مدینہ میں مرا نام شمار
جیوں تو ساتھ سگانِ حرم کے تیرے، پھروں — مروں تو کھائیں مدینہ کے مجھ کو مور ومار
جو یہ نصیب نہ ہو، اور کہاں نصیب مرے — کہ میں ہوں اور سگان حرم کی تیرے قطار
اُڑا کے باد مری مشت خاک کو پس مرگ — کرے حضورؐ کے روضہ کے آس پاس نثار
ولے یہ رتبہ کہاں مشتِ خاکِ قاسم کا — کہ جائے کوچۂ اطہر میں تیرے بن کے غبار
مگر نسیم مدینہ ہے، گردباد بنا — کشاں کشاں مجھے لے جا جہاں ہے تیرا مزار
ہوس نہیں مجھے اس سے بھی کچھ رہی لیکن — خدا کی اور تری الفت سے میرا سینہ فگار
لگے وہ تیر غم عشق کا مرے دل میں — ہزار پارہ ہو دل، خون دل میں ہو سرشار
لگے وہ آتش عشق اپنی جان میں جس کی — جلادے چرخ ستمگر کو ایک ہی جھونکار
صدائے صور قیامت ہو اپنا اک نالہ — بجائے برق ہو اپنی ہی آہ آتش بار

پُچھے کچھ ایسے مرے نوک خار غم دل میں — کہ پھوٹے آنکھوں کے رستہ سے اک لہو کی فوار
یہ ناتواں ہوں، غم عشق میں کہ جائے نکل — ذرا بھی جان کو اوپر کا سانس لے جو سہار
تمہارے عشق میں رو رو کے ہوں نحیف اتنا — کہ آنکھیں چشمۂ آبی سے ہوں درونِ غبار
یہ لاغری ہو کہ جان ضعیف کو دم نقل — نہ ہووے ساتھ اٹھانا بدن کا کچھ دشوار
رہے نہ منصب شیخ المشائخی کی طلب — نہ جی کو بھائے یہ دنیا کا کچھ بناؤ سنگھار
ہوا اشارہ میں دو ٹکڑے جوں قمر کا جگر — کوئی اشارہ ہمارے بھی دل کے ہو جا پار

دل کی آرزوئیں اور تمنائیں عشق کی تڑپ اور محبت کے سوز و گداز دلی اضطراب کے ساتھ دربار رسالت میں پیش کرنے کے بعد یہ خیال آتا ہے کہ کہاں میں اور کہاں وہ دربار عالی تبار جہاں فرشتے قدم رکھتے ہوئے پاس ادب کرتے ہیں۔ درخواست اور فریاد کا یہ لب ولہجہ اس عظیم بارگاہ کی شایاں نہیں، اس لیے وہ اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، دل اور زباں کو سرزنش کرتے ہیں اور درود وسلام پر بات ختم کرتے ہیں:

یہ کیا ہے شور و غل؟ اتنا سمجھ تو کچھ قاسم — نہ کچھ ترا بڑا رتبہ، نہ کچھ بلند تبار
تو تھام اپنے تئیں حد سے پا نہ دھر باہر — سنبھال اپنے تئیں اور سنبھل کے کر گفتار
ادب کی جا ہے یہ، چپ ہو تو اور زباں کر بند — وہ جائے، چھوڑ اُسے پر نہ کر تو کچھ اصرار
دلِ شکستہ ضروری ہے جوشِ رحمت کو — گرے ہے باز کہیں، جب تلک نہ دیکھے شکار
وہ آپ رحم کریں گے، مگر سنیں تو سہی — شکستِ شیشۂ دل کی ترے کبھی جھنکار
بس اب درود پڑھ اس پر اور اس کے آل پر پہ تو — جو خوش ہو تجھ سے وہ اور اس کی عزت اظہار
الٰہی! اس پہ اور اس کی تمام آل پہ بھیج — وہ رحمتیں کہ عدد کر سکے نہ ان کو شمار

یہ قصیدہ آج سے ڈیڑھ سو سال قبل اس وقت لکھا گیا جب اردو زبان تراش خراش کے مرحلے سے گزر رہی تھی، اس دور میں ایسے الفاظ کی بہتات تھی جو بعد میں متروک ہو گئے، اس دور کا تلفظ اور لب ولہجہ بھی کہیں ثقیل تھا، اسی تلفظ کی ادائیگی کے لیے املا بھی اسی کے مطابق تھا جو اب قطعاً متروک ہے، ہم نے اس قصیدہ میں جو املا تھا ہو بہو ٹھیک وہی لکھا ہے تاکہ اس عہد کی زبان سے مطابقت باقی رہے، قصیدہ میں تعقید لفظی بہت نظر آئے گی لیکن یہ حضرت نانوتوی کی مجبوری تھی، وہ بہت ہی وسیع مفہوم کو

صرف دو مصرعوں میں سمیٹ لینا چاہتے ہیں، اس لیے الفاظ اپنے مقام پر اکثر جگہ نہیں رہے، یہ مجبوری ہر اس شاعر کو پیش آتی ہے جو دقیق مضامین کو شعروں میں پیش کرتا ہے، مگر بہر حال اس کی وجہ سے اشعار ثقیل اور بوجھل ہو جاتے ہیں۔

یہ قصیدہ اپنی معنوی وسعت، فکر کی گہرائی، ژرف بینی، بے مثال قوت مشاہدہ کا غماز اور مناظر فطرت کی خوبصورت عکاسی، روح نواز تصویر کشی میں ایک مثالی اور لاجواب قصیدہ ہے، حضرت نانوتوی کے ہر قصیدہ کو شعر و شاعری سے ظاہری بے تعلقی اور ان کی کم سخنی کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی کرامت ہی کہا جا سکتا ہے، یہ قصیدہ پڑھ کر دل کسی طرح یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس سے پہلے آپ کو شعر و شاعری سے کوئی سروکار نہیں رہا ہوگا، قصیدہ صاف بتاتا ہے کہ وہ ایک قادر الکلام اور کہنہ مشق استاذ فن کے قلم کا رہین منت ہے، اب یہ طویل قصیدہ اردو ادب کی تاریخ اور اس کے تدریجی ارتقاء سے بحث کرنے والے ادیبوں اور نقادوں کی خدمت میں پیش ہے تا کہ وہ اس کی صحیح قدر و قیمت متعین کر سکیں۔

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ*

۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں تحریک دیوبند کی اہمیت

ہر تحریک اپنے زمانے اور حالات کی پیداوار ہوتی ہے۔ تحریک دیوبند کو بھی اسی پس منظر میں دیکھنا چاہئے اور یہ معلوم کرنا چاہئے کہ یہ تحریک جب عالم وجود میں آئی تو اس وقت کے حالات کیا تھے؟

اس سوال کا جواب جب ہم تاریخ کے صفحات میں تلاش کرتے ہیں تو چند باتیں نہایت نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں:

۱۔ سلطان ظہیر الدین بابر نے ابراہم لودھی کو پانی پت کے میدان میں شکست دے کر ۱۵۲۶ء میں ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد ڈالی تھی۔ درمیان میں اس خاندان کے مختلف فرماں روا آتے رہے اور جاتے رہے۔ آخری زمانہ بہادر شاہ ظفر کا ہے۔ اس خاندان اور اس کی سلطنت کا مکمل زوال بہادر شاہ ظفر ہی کے دور میں آیا۔

۲۔ سلطنت کے زوال میں سلطان وقت کی غیر ضروری چیزوں میں مشغولیت اور مختلف انداز کی کمزوری، اپنوں کی فریب دہی اور مکاری اور غیروں کی عیاری اور چالاکی کا ہمیشہ دخل رہا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی بعض خوبیوں کے باوجود یہ عوامل کسی نہ کسی انداز میں یہاں بھی کام کرتے رہے ہیں۔

بے موقع نہیں ہوگا، اگر اسباب زوال سلطنت کے سلسلہ میں شاہان دہلی کے ایک ممتاز عہدہ دار بخشی محمود کے تجزیہ پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اس تجزیہ کو اردو کی ایک قدیم کتاب میں حکیم مؤمن خاں مؤمن کے ایک شاگرد نے درج کیا ہے، جو اٹھارہویں صدی کے طور طریقوں کی ایک دل آویز

* سابق ناظم دار العلوم سبیل السلام، سبیل نگر، حیدر آباد (اے پی)

تصویر پیش کرتا ہے۔ نتائج المعانی میں آغا محمود بیگ راحت لکھتے ہیں:

''ایک روز ابونصر محمد اکبر شاہ ثانی کے دربار میں ذکر زوال سلطنت آ گیا۔ بخشی محمود خاں نے عرض کی، چار آدمیوں نے مملکت کو تباہ کر دیا۔ اول حکیموں نے فرمان روایان بیدار مغز کو وہ مقویات کھلائیں کہ تاب تحمل نہ ہو سکی، مزاج عشرت طلب ہو گیا۔ دوسرے کلاونتوں نے، ان کے گھر میں جو نو خیز ہوئی، اس کو پیش کیا اور اس میں اپنا افتخار پیدا کیا۔ سلاطین کو رقص و سرور میں مائل رکھا، ڈوم ڈھاڑی مدار المہام ہوئے، انتظام فرمان روائی میں خلل واقع ہوا، دشمنوں نے سر اٹھایا، بدخواہوں نے پیر پھیلائے، جابجا خودسر ہو گئے، شرفاء کو دربار میں مداخلت نہ ہوئی، ان کی بات کسی نے نہ سنی، وقت پر ان لوگوں نے طرح دی، غنیم کی بن آئی۔ تیسرے کثرت عیال نے، ادھر ازواج کی کثرت ہوئی، ادھر اولاد کی ترقی ہوئی، نزاع خانگی سے خلش ہوئی۔

چوتھے مشائخ و پیرزادوں نے، جب کبھی حاضر ہوئے اور کچھ ذکر سلطنت آیا، اپنے تئیں عرش پر پہنچایا، مسائل تصوف بیان کرنے لگے، کنج عزلت کی خوبیاں عرض کرنے لگے، خون بندگان خدا سے ڈرانے لگے۔ جب شیخ جی یہ شیخی بگھار چکے، پھر اپنی کرامت جتانے لگے، ہم دعا کرتے ہیں، دعاؤں کا لشکر حضور کی فتح و نصرت کو کافی ہے، دشمن ادھر منہ بھی نہیں کرنے کا، خود پامال سم سمندان لشکر دعائے دولت و اقبال ہوگا۔ فرماں رواں ان کے دام میں آ گئے، پیر جی کی دعا پر تکیہ کیا، چار بالش عشرت پر تکیہ نشین ہوئے۔ اراکین گوشہ گزیں ہوئے، غنیم نے قابو پایا، اقلیم پر زور لایا، دعا کی فوج آتی رہی، حکومت جاتی رہی، لیکن زوال حکومت سے علوم اسلامی کی اشاعت میں ضعف نہ آیا، بلکہ ان کا زیادہ فروغ ہوا''(۱)۔

۳۔ بہادر شاہ ظفر کی حکومت کے زوال کے جو بھی اسباب ہوں، ان پر تفصیلی اور تحقیقی تبصرہ کے بغیر زوال کے اس نتیجہ پر نگاہ رکھ لی جائے کہ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں انگریزی تسلط و اقتدار اپنی کامل شکل میں آ گیا اور حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضہ سے نکل کر براہ راست ملکہ وکٹوریہ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ لال قلعہ پر یونین جیک لہرانے لگا، یہ جھنڈا اس بات کا اعلان تھا کہ اب اقتدار ہندوستانیوں کے ہاتھوں سے نکل کر غیر معین مدت کے لئے دوسروں کے فولادی ہاتھوں میں جا چکا ہے

(۱) نتائج المعانی، صفحہ ۱۷۶، ۱۷۵

اور اب ہندوستان جنت نشاں کی بہاروں پر ایک سفید فام قوم کی اجارہ داری قائم ہو چکی ہے، یہی وہ وقت ہے جب مسلمانوں نے ہندوستان میں جنگ آزادی کا باضابطہ آغاز کیا۔

۴۔ ہندوستان میں جب انگریز مکمل طور پر اقتدار میں آ گئے اور زمام حکومت انہوں نے اپنے ہاتھ میں تھام لی، تو گویا انہوں نے ہندوستانی باشندوں کو بلا امتیاز مذہب وملت اپنا ''غلام'' بنالیا۔ باشندگان ملک کی ایسی کسی غلامی کے خلاف آزادی کی جدوجہد ایک فطری تھی اور یہ انسانی فطرت سامنے آئی، مگر یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے برسر اقتدار آنے کے بعد یہاں کی دوسری قوموں کے مقابلہ میں مسلمانوں نے اپنے غم وغصہ کا اظہار زیادہ کیا اور انہوں نے ہی آگے بڑھ چڑھ کر آزادی کا نعرہ لگایا، وجہ اس کی یہ تھی کہ اقتدار انہی سے چھینا گیا تھا، اس لئے فطری طور پر انہیں زیادہ رنج وملال تھا اور برطانوی حکومت کے خلاف یہ زیادہ جوش وخروش میں تھے۔ اس تاریخی حقیقت کو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنے الفاظ میں اس طرح اجاگر کیا ہے:

''ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا حصہ قدرتی طور پر بہت ممتاز ونمایاں رہا ہے، انہوں نے جنگ آزادی میں قائد اور رہنما کا پارٹ ادا کیا، اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزوں نے جب ہندوستان پر قبضہ کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ ایک ایک صوبہ اور ریاست ان کے زیر نگیں آنے لگی اس وقت مسلمان ہی ہندوستان کے فرمان روا تھے، سب سے پہلا شخص جس کو اس خطرہ کا احساس ہوا وہ میسور کا بلند ہمت اور غیور فرمان روا فتح علی خاں ٹیپو سلطان (۱۲۱۳ھ م ۱۷۹۹ء) تھا، جس نے اپنی بالغ نظری اور غیر معمولی ذہانت سے یہ بات محسوس کر لی کہ انگریز اسی طرح ایک ایک صوبہ اور ایک ایک ریاست ہضم کرتے رہیں گے اور اگر کوئی منظم طاقت ان کے مقابلہ پر نہ آئی تو آخر کار پورا ملک ان کا لقمہ تر بن جائے گا۔ چنانچہ انہوں نے انگریزوں سے جنگ کا فیصلہ کیا اور اپنے پورے سازوسامان، وسائل اور فوجی تیاریوں کے ساتھ ان کے مقابلہ میں میدان میں آ گئے''(۲)

مولانا علی میاںؒ نے اپنی اس بات کو اسی کتاب میں دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے:

''باوجود اس کے کہ یہ جنگ آزادی صحیح معنی میں عوامی اور قومی تھی اور ہندو مسلمان سب اس میں شریک تھے اور ہندوستان نے وطن دوستی، اتحاد اور گرمجوشی اور ولولہ کا ایسا منظر کبھی نہ دیکھا تھا

---

(۲) ہندوستانی مسلمان، ایک تاریخی جائزہ، صفحہ ۱۵۵

جیسا کہ اس وقت دیکھنے میں آیا، پھر بھی قیادت ورہنمائی کے میدان میں مسلمانوں کا پلڑا بھاری تھا، چنانچہ اکثر قائد مسلمان ہی تھے۔" (۴)

۵۔ باہر سے آئے ہوئے انگریز اور ان کی قائم کردہ برطانوی حکومت کے خلاف مسلمانوں کی اس جدوجہد آزادی اور فطری "جذبۂ حریت" کو ان لوگوں نے "بغاوت" کا نام دیا اور دیگر باشندگان وطن کے مقابلے میں اس بغاوت کا اصل مجرم مسلمانوں کو قرار دیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب مسلمانوں کی طرف سے "بغاوت" کی لہر تیز تر ہوئی تو انگریزوں نے مسلمانوں سے اس کا مختلف انداز سے انتقام لینا شروع کر دیا، یہ انتقام جانی و مالی تو تھا ہی، اس کے علاوہ ان کی آبرو پر حملے کئے گئے، عورتوں کے ساتھ بدسلوکی کی گئی، بچے یتیم کئے گئے، انہیں بھی گولیوں کا نشانہ بنایا گیا، بوڑھے بھی بخشے نہیں گئے تہذیبی شناخت مٹانے اور دین وایمان سے رشتے کو کاٹنے کی مہم تیز تر کر دی گئی، نصاب تعلیم اور نظام تعلیم کے ذریعہ مسلم بچوں کے ذہن ودماغ کو بدلنے، عیسائیت کی طرف لانے، الحاد، دہریت اور ارتداد کی سمت ڈھکیلنے کی منظم کوششیں شروع کر دی گئیں اور چاہتے تھے کہ اسلامی عادات وعقائد کو خس وخاشاک کی طرح بہا دیا جائے۔ سکھوں اور ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کے خلاف ورغلانے اور بھڑکایا جانے لگا، عیسائیت کو پھیلانے کے لئے دیسی اور بدیسی پوپ پادری کو ملک کے مختلف حصوں میں بڑی تعداد میں پھیلا دیا گیا، مسلمانوں کے درمیان ان کے مسلکی اختلافات کو بھی ابھارنے کی سازش کی جانے لگی، ان پر ملازمت کے دروازے بند کئے گئے، صلاحیتوں کو کچلنے اور اپنے راستے سے ہٹانے کے لئے مسلم رہنماؤں، رہبروں، نوجوانوں، ذی وجاہت، ذی حیثیت اور باضمیر افراد کو مختلف قسم کی جسمانی اذیتیں پہنچائی جانے لگیں، انہیں جیل کی تنگ وتاریک کوٹھریوں میں بند کیا جانے لگا، ایسے لوگوں سے پھانسی کے تختوں کو سجایا گیا، ملک بدر کر کے جزائر انڈومان اور ایسے تکلیف دہ علاقوں میں بھیجا جانے لگا کہ وہ اپنے وطن اور اپنے لوگ سے جیتے جی کٹ جائیں اور گھٹ گھٹ کر مر جائیں اور یہی مرضی صیاد کی تھی، یہی وہ زمانہ ہے جبکہ آریہ سماج کے فتنے بھی تیزی کے ساتھ اپنے بال وپر نکالنے لگے تھے۔

اوپر کی سطروں میں ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے حالات کا جو اجمالی نقشہ پیش کیا گیا ہے اس کی پوری تفصیلات تحریک آزادی سے متعلق کتابوں میں موجود ہیں۔ تاہم درج ذیل اقتباسات سے

(۴) ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ صفحہ ۱۵۸

آپ کو حالت کی نزاکت اور سنگینی کا اندازہ بیک نظر ہو سکے گا:

''۲۴/ستمبر ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے، جبکہ انگریزی فوجیں دہلی پر قابض ہو چکی تھیں اور لال قلعہ فتح ہو گیا تھا۔ اس وقت کی تصویر ایک انگریز کمانڈر Lord Roberts نے جو کانپور سے فوج لے کر دہلی، بغاوت کو کچلنے گیا ہوا تھا، ان الفاظ میں کھینچی ہے:

''صبح کی ابتدائی روشنی میں دہلی سے کوچ کا وہ مرحلہ بڑا ہی دردناک تھا، (لال قلعہ کے) لاہوری دروازہ سے نکل کر ہم چاندنی چوک میں سے گزرے، دہلی حقیقتاً شہر خموشاں معلوم ہوتا تھا، ہمارے اپنے گھوڑوں کی سموں کی آواز کے سوا کوئی اور آواز کسی سمت سے نہ آتی تھی، ایک بھی زندہ مخلوق ہماری نظر سے نہ گزری، ہر طرف نعشیں بکھری پڑی تھیں، ہم چپ چاپ چلے جا رہے تھے یا سمجھ لیجئے کہ بے ارادہ زیر لب باتیں کر رہے تھے تا کہ انسانیت کے ان دردناک باقیات کی استراحت میں خلل نہ پڑ جائے، جن مناظر سے ہماری آنکھیں دوچار ہوئیں، وہ بڑے ہی رنج افزا تھے۔ کہیں کوئی کتا کسی نعش کا برہنہ عضو بھنبھوڑ کر کھا رہا تھا، کہیں کوئی گدھ ہمارے قریب پہنچنے پر اپنی گھناؤنی غذا چھوڑ کر پھڑ پھڑاتے پروں سے ذرا دور چلا جاتا، لیکن اس کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اڑ نہ سکتا تھا۔ اکثر حالتوں میں مرے ہوئے زندہ معلوم ہوتے تھے، کسی کے ہاتھ اوپر اٹھے ہوئے تھے جیسے کوئی کسی کو اشارہ کر رہا ہو، دراصل یہ پورا منظر اس درجہ ہیبت ناک اور وحشت انگیز تھا کہ بیان میں نہیں آ سکتا۔ معلوم ہوتا ہے ہماری طرح گھوڑوں پر بھی خوف طاری تھا، اس لئے کہ وہ بھی بدک رہے تھے اور نتھنے پھلا رہے تھے، پوری فضا ناقابل تصور حد تک بھیانک تھی جو بڑی مضر اور بیماری و بدبو سے لبریز تھی''۔ (۴)

یہ ایک قتل عام تھا، لیکن مسلمان خاص طور سے اس کا نشانہ تھے، اس لئے کہ بہت سے ذمہ دار انگریز یہ سمجھتے تھے کہ یہ اسلامی جہاد تھا اور مسلمان اس بغاوت کے بانی، قائد اور رہنما ہیں، ایک انگریز مصنف Henry Mead کہتا ہے:

---

(۴) ہندوستانی مسلمان: ایک تاریخی جائزہ، صفحہ ۱۶۲، ۱۶۱

بحوالہ Lord Roberts Forty one yerars in India p 152

''اس سرکشی کو موجودہ مرحلہ میں سپاہیوں کی بغاوت کا نام نہیں دیا جاسکتا، یقیناً اس کا آغاز سپاہیوں سے ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت آشکارا ہوگئی، یعنی یہ اسلامی بغاوت تھی۔''(۵)

ایک دوسرا مورخ لکھتا ہے:

''ایک انگریز کا شیوہ یہ ہوگیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا، ہر ایک سے پوچھتا ہندو ہے یا مسلمان جواب میں مسلمان، سنتے ہی گولی مار دیتا''(۶)

ایک اور مورخ نے لکھا ہے:

''ستائیس ہزار (۲۷۰۰۰) اہل اسلام نے پھانسی پائی، سات دن برابر قتل عام رہا، اس کا حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسل تیموری کو نہ رکھا، مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورتوں سے جو سلوک کیا، بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے'' (۷)

ایک باخبر صاحب قلم نے حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''جب معرکہ ۱۸۵۷ء میں اپنوں کی بے وفائیوں اور غداریوں اور دشمن کی فریب کارانہ چالوں کی وجہ سے مسلمانوں کو ناکامی ہوئی اور دہلی پر انگریزوں کا پورا قبضہ ہوگیا تو اب انہوں نے دل کھول کر انتقامی کارروائیاں کیں، ۵ لاکھ ہندوستانی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ دہلی میں جہاں کوئی مقامی باشندہ نظر آتا، اسے گولی کا نشانہ بنایا جاتا، صرف ایک دن میں ۲۴ مغل شہزادوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا بہادروں کو توپ کے دہانے سے باندھ کر ان کے پرخچے اڑا دیئے جاتے، بعض لوگوں کو سور کی کھال میں سی کر دریا میں پھینک دیا گیا لال قلعہ کے قریب شاندار عمارتوں اور بازاروں کو مسمار کر کے چٹیل میدان بنا دیا گیا۔ دہلی کے علاوہ بھی ہر بڑے شہر میں عارضی پھانسی گھر بنائے گئے۔ پانچ سو بلند پایہ علماء سولیوں پر لٹکائے گئے۔ پاکباز خواتین کی آبرو اس طرح برباد ہوئی، جیسے قصاب کی دکان کے آگے کتے چھیچھڑوں کو نوچتے پھرتے ہیں، صدیوں میں جمع کئے ہوئے سلاطین دہلی کے علمی خزانے آگ کی نذر ہوئے یا دریائے جمنا میں بہا دیئے گئے''۔

مسلمانوں کے ''جسمانی قتل'' کے ساتھ ''ذہنی اور تہذیبی قتل'' کا منصوبہ جس انداز میں بنایا گیا تھا، اس کا اندازہ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر کی دارالعوام میں کی گئی اس تقریر سے ہوسکے گا۔

---

(۵) حوالہ سابق (۶) عروج سلطنت انگلشیہ، صفحہ ۱۲۷ (۷) قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۴۵۴

”خداوند تعالیٰ نے یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگیں ہے، تاکہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرائے۔ ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنا چاہئے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہیں کرنا چاہئے۔“

ایک مورخ کا بیان ہے:

دیسی پادریوں کے علاوہ جن کا کوئی شمار نہیں، نو سو صرف ولایتی پادری تھے جو تندہی کے ساتھ تبلیغ عیسائیت میں مصروف تھے۔ اس کے علاوہ ایک مکتی؟ فوج تھی، جس کے اسّی دستے ان کی پشت پناہی اور امداد کرتے تھے اور ان کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے“(۸)

انگریز ماہر تعلیم میکالے نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا:

”ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے، جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق، رجحان، رائے الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو“۔

۱۲/ اکتوبر ۱۸۳۶ء کو میکالے نے ایک خط اپنی والدہ کے نام ہندوستان سے لندن بھیجا جس میں لکھا تھا کہ:

”اگر میرے تعلیمی منصوبے پر پوری طرح عمل کیا گیا تو مجھے یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ تیس سال کے بعد یہاں ایک بھی بت پرست غیر عیسائی نہیں رہے گا۔“

ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے لکھا تھا:

”ہمارے طریق تعلیم میں مسلمان نوجوانوں کے لئے مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہیں ہے، بلکہ وہ قطعی طور پر مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہے“(۹)

مغربی قوم حکمراں بنی تو یوروپ کی مغربی تہذیب اپنے تمام آثار ہمراہ لائی، عریانی، فحاشی، شراب نوشی اور تمام وہ غلاظتیں، جو یوروپ کی گندی تہذیب کے لازمی اجزاء ہیں، پھیلنے لگیں الغرض مسلمان سیاست اور حکومت سے محروم ہوئے، جان و مال عزت و آبرو کے ساتھ ان کا مذہب بھی خطرے میں پڑا، ان کی معیشت متاثر ہوئی، آداب معاشرت بدلے، افکار و عقائد میں بھی بگاڑ آیا۔

(۸) سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ صفحہ ۴۲ (۹) ہمارے ہندوستانی مسلمان ص: ۲۵۲

اندرونی طور پر بدعات وخرافات بھی فروغ پارہی تھیں، مختلف قسم کے رسم ورواج نے مسلم معاشرے کو جکڑنا شروع کردیا تھا، مسلمانوں کے دین ومذہب پر آریوں کے رکیک حملے بھی ہورہے تھے، اکثریتی طبقے کے بعض مذہبی نمائندے بھی انگریزی حکومت کا ایما پاکر ایک جماعت کے ساتھ اپنے آپ کو اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ کے لئے وقف کرچکے تھے اور سہارنپور، رڑکی، میرٹھ وغیرہ میں اپنی تحریک کا جال بچھا رکھا تھا۔ یہ وہ پرآشوب حالات تھے جو معرکہ ۱۸۵۷ء کے بعد رونما ہوئے۔ ان حالات میں سخت اندیشہ تھا کہ دین وایمان اور اسلامی تہذیب ومعاشرت سے رشتہ کم یا ختم نہ ہوجائے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ کوئی تحریک چلائی جائے، تاکہ مسلمانوں کو اس تباہ کن صورت حال سے بچایا جاسکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء وقت میں اس خطرے کی شدت کا سب سے زیادہ احساس الامام محمد قاسم النانوتویؒ کو تھا۔ حضرت نانوتویؒ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں برطانوی اقتدار پر ایک زبردست ضرب لگا چکے تھے، جو معرکۂ شاملی کے نام سے تاریخ کا ایک روشن عنوان ہے، انگریز کی زبردست قوت کے مقابلہ میں اگرچہ یہ مہم ناکامی پر منتج ہوئی اور ہندوستان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا گیا، مگر حضرت نانوتویؒ کے دل ودماغ اور فکر ونظرؒ نے ہمت نہیں ہاری، انہوں نے اس سپاہی کی طرح جو میدان جنگ سے ہٹ کر نئے مورچہ کی تیاری میں مصروف ہوجاتا ہے، اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے تعلیمی میدان کا انتخاب کیا، اس انتخاب کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد برطانوی سامراج کا ہندوستان سے انخلاء، دوسرا مقصد ایک دینی مدرسہ کے قیام سے مسلمانوں کو ان کے دین وایمان اور اسلامی تہذیب ومعاشرت سے جوڑے رکھنا اور باہر کی مسموم ہوا سے ان کی روح اور ذہن ودماغ کو متاثر نہ ہونے دینا۔

تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مرتب جناب سید محبوب رضوی مرحوم ۱۸۵۷ء کے حالات کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''چنانچہ اس وقت بنیادی طور پر اس نقطۂ نظر کو اپنایا گیا کہ مسلمانوں کے دینی شعور کو بیدار رکھنے اور ان کی ملی شیرازہ بندی کے لئے ایک دینی وعلمی درس گاہ کا قیام ضروری ہے، اس مرکزی فکر کی روشنی میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے رفقاء خاص مولانا ذوالفقار علی صاحب، مولانا

فضل الرحمٰن صاحب اور حاجی محمد عابد صاحب نے یہ طے کیا کہ اب دہلی کے بجائے دیوبند میں یہ دینی درسگاہ قائم ہونا چاہئے''۔ (۱۰)

اس تاریخی فیصلہ کے بعد اس تاریخی، دینی درسگاہ کا قیام ۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰/مئی ۱۸۶۶ء پنجشنبہ کو چھتے کی مسجد کے کھلے صحن میں انار کے ایک چھوٹے سے درخت کے سایہ میں نہایت سادگی کے ساتھ کسی رسمی تقریب یا نمائش کے بغیر عمل میں آیا۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مرشد اور جماعت دیوبند کے روحانی پیشوا حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کو مکہ مکرمہ میں اس مدرسہ کے قیام کی اطلاع دی گئی تو فرمایا:

''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربسجود ہوکر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوند ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر یہ مدرسہ انہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے''(۱۱)

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نے قیام مدرسہ کی خبر سن کر یہ دعا بھی فرمائی تھی:

''اے اللہ اس ادارے کو اسلام اور علم دین کی حفاظت کا ذریعہ بنا''۔

دیوبند کا یہ مدرسہ، جو عالم میں دارالعلوم کے نام سے معروف و مشہور ہے، اس کی فکری نسبت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے قائم ہے اور اس کے مقاصد میں تنوع، پھیلاؤ اور ہمہ گیری ہے جس کا اندازہ دارالعلوم کے لئے متعین کردہ مطبوعہ اغراض و مقاصد اور گزشتہ سطروں سے ہوسکے گا، جب ہم تحریک دیوبند کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں تو علانیہ طور پر محسوس ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات پر تحریک دیوبند کی گہری چھاپ رہی ہے، چونکہ یہ ایک روایتی مدرسہ نہیں تھا، بلکہ اس مدرسہ کے پس پشت بہت سے اغراض و مقاصد تھے جن کی تکمیل وقت اور حالت کے مطابق ہوتی رہی، پھر تحریک دیوبند کے اثرات برصغیر ہند ہی میں مرتب نہیں ہوئے، بلکہ عالم اسلام اور دنیائے انسانیت کو بھی اس کا فیض بالواسطہ یا بلاواسطہ پہنچا ہے۔ تفصیل میں جائے بغیر چند نکات لائق توجہ اور قابل غور ہیں:

۱۔ تحریک دیوبند نے آزادئ ہند کی جنگ کو کامیاب کیا ہے۔ انگریزوں کے خلاف اس نے جو جذبۂ

(۱۰) سوانح قاسمی ۲۲۳ (۱۱) تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول صفحہ ۱۴۹

جہاد پیدا کیا ہے، اس سے سرشار علمائے وقت نے اس جنگ میں حرارت اور گرمی پیدا کی، اس نے مجاہدین آزادی کا ایسا قافلہ تیار کیا کہ اس سے نئے نئے قافلے پیدا ہوتے رہے، طوالت کے خوف سے ہم ان علماء کے نام بھی یہاں چھوڑ رہے ہیں (۱۲) جنہوں نے نہایت حوصلہ مندی، بے جگری اور سر فروشی کے ساتھ، تحریک دیوبند سے متاثر ہوکر جنگ آزادی میں حصہ لیا، یہ جنگ جیتی نہیں جاسکتی تھی اگر علماء دیوبند کا تدبر اور ان کی فکر وفراست قائدانہ رول ادا نہ کرتی۔

۲۔ملک وقوم کو فائدہ پہنچانے اور باشندگان ہند کے گلے سے طوق غلامی کو اتارنے کے ساتھ اندرون خانہ مسلمانوں کو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد مایوسی اور احساس شکستگی سے نکال کر امید کی کرن روشن کی اور انہیں خوف و ہراس کی نفسیات سے نکال کر اولوالعزمی، بلند حوصلگی اور عالی ظرفی کی قدروں سے روشناس کرایا، اس حقیقت کی اہمیت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کی اس وقت کے حالات پر گہری نظر ہے۔

۳۔انگریزوں نے عیسائیت کے جال میں پھانسنے کی جو گہری سازش کی تھی، تحریک دیوبند سے اس جال کے پورے تار و پود بکھر گئے۔ باطل فرقے، مسلمان اور ان کی نئی نسل کو اپنے دام میں لانا چاہتے تھے ان کی تدبیر خود الٹ گئی۔ دینی تعلیم کا ایسا باوقار مستحکم نظام فراہم کیا گیا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کی سوچ اور فکر کے دھارے کو بدل دیا، پہلے زمانہ میں امراء اور رؤساء اپنے وسیع وعریض مکانات کے ایک حصہ میں دینی تعلیم کا نظم کیا کرتے تھے۔ سلاطین وقت کی مدد سے چھوٹے چھوٹے دینی مدارس ومکاتب کے لئے جاگیریں وقف تھیں، مگر وقت کے نباض اور بالغ نظر عالم مولانا محمد قاسم نانانوتوی علیہ الرحمۃ نے اپنے قائم کردہ مدرسہ اور دیگر دینی مدارس کے لئے جو اصول ہشتگانہ مرتب فرمائے اسے ''الہامی'' کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس کی چھٹی دفعہ میں دینی مدارس کے چلانے کے لئے شاہانہ اور جاگیردارانہ نظام سے ہٹا کر ''عوامی چندہ'' سے مربوط کر دیا۔ ایک شاہ اور جاگیردار کو زوال تو آسکتا ہے، مگر عوامی دور ہمیشہ سدا بہار رہتا ہے، یہ اصول ہشتگانہ (۱۳) جو حد درجہ عارفانہ اور حکیمانہ ہیں۔ ان کا مطالعہ آنکھیں کھول دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد علی جوہر مرحوم

---

(۱۲) تفصیلی معلومات کے لئے تحریک آزادی سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

(۱۳) مولانا نانوتویؒ کے ترتیب دئے ہوان آٹھ اصولوں کو تاریخ دار العلوم دیوبند، جلد اول، ص: ۱۵۲ تا ۱۵۴ پر دیکھا جاسکتا ہے

تحریک خلافت کے زمانہ میں جب دارالعلوم تشریف لے آئے تو بے ساختہ فرمایا کہ:

''ان اصول کا عقل سے کیا تعلق؟ یہ تو الہامی ہیں، پھر فرمایا، حیرت ہے کہ سو برس دھکے کھا کر ہم آج اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اپنے اجتماعی اداروں کو انگریز کی کسی امداد پر ہرگز معلق نہ رکھیں، بلکہ خود اعتمادی کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑے ہوں۔ حیرت ہے کہ یہ بزرگ سو برس پہلے ہی اس نتیجہ تک پہنچ چکے تھے''(۱۴)

۴۔ دیوبند کے مدرسہ کے علاوہ مولانا نانوتویؒ نے اپنے رفقاء کی اس عظیم تحریک ہی کے پیش نظر گلاؤٹھی، میرٹھ اور مراد آباد میں مدرسے قائم کئے اور اپنے اثر ورسوخ سے دوسرے مقامات پر بھی مدرسے قائم کرائے۔ اس طرح ہندوستان میں ان کے جلائے ہوئے ایک چراغ سے سینکڑوں چراغ روشن ہوتے گئے۔ اس لحاظ سے برصغیر میں علمی ودینی نشاۃ ثانیہ کی نقیب، مولانا نانوتویؒ کی شخصیت قرار پاتی ہے۔ قیام دارالعلوم دیوبند سے پہلے لکھنؤ میں دو تین دینی مدرسے ضرور تھے مگر ان کی حیثیت روایتی تھی، تحریکی خوبو ان کے اندر نہیں تھی۔

۵۔ شادی بیاہ کے سلسلہ میں جو رسوم ورواج مسلم معاشرہ میں راہ پا گئے تھے، عقد بیوگان کو جس طرح معیوب سمجھا جا رہا تھا، وراثت کی تقسیم میں جس طرح کی ناہمواریاں تھیں، بدعات وخرافات جس طرح معاشرہ میں جڑ پکڑ رہی تھیں، سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کرنے کا ذوق جس انداز سے کم ہو رہا تھا، ارتداد، بے دینی اور اخلاقی انارکی جس طرح فروغ پا رہی تھی۔ تحریک دیوبند نے اس مورچہ کو بھی سنبھالا اور دین وشریعت کی روشنی میں مناسب حال رخ دیا۔ خود مولانا نانوتویؒ نے ان معاشرتی مسائل میں اپنے کردار کے ایسے جگمگاتے نقوش چھوڑے کہ جن کی چمک دمک اب بھی باقی اور قائم ہے۔ اسی طرح تحریک دیوبند اور اس سے ذمہ دارانہ طور پر وابستہ افراد نے وحدت امت اور اتحاد ملت کا پیغام بھی مستحکم بنیادوں پر خلوص دل کے ساتھ دیا ہے، جس سے واقفیت کیلئے مفتی اعظم مولانا محمد شفیع صاحبؒ کے رسالہ ''وحدت امت'' کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ تحریک دیوبند سے دعوتی، اخلاقی اور روحانی نظام کو بھی فروغ ملا۔ اس موقع پر اس کا اظہار بھی ضروری ہے کہ تحریک دیوبند کو جن علماء دیوبند نے مختلف نوعیتوں اور حیثیتوں سے پروان چڑھایا اور آگے بڑھایا، ان میں شیخ الہند مولانا محمود حسن

---

(۱۴) تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اول صفحہ ۴۸۔

دیوبندیؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا عبیداللہ سندھی، مولانا محمد میاں منصور انصاریؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا خلیل احمد محدث سہارنپوریؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ، مولانا سید محمد میاں دیوبندیؒ، مولانا مفتی محمد شفیعؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ اور مولانا قاری محمد طیبؒ کے اسمائے گرامی شامل ہیں، مشاہیر علمائے دیوبند اور ان کے کارناموں پر مختلف کتابیں موجود ہیں، ان کے مطالعہ سے ان کا کام اور پیغام سامنے آسکتا ہے اور یہ معلوم کیا جاسکتا ہے کہ ان حضرات نے دیوبند کے مسلک، فکر اور اس کی تحریک کو کس قدر تقویت پہنچائی۔

تحریک دیوبند کا فیض اور اس کی برکت یہ بھی رہی ہے کہ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کے حق میں ہندوستان کو اسپین بننے نہیں دیا اور یہ مسلمان ہندوستان میں اسلامی ورثہ سے جڑے رہے، بعد کے حالات میں جب مسلمانوں پر مختلف گوشوں سے مسلسل تہذیبی یلغار کی جاتی رہی تو ۱۹۷۲ء میں بلا امتیاز مسلک ومشرب آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کے نام سے ہندوستانی مسلمانوں کا متحدہ اور مشترکہ پلیٹ فارم بنا، اس کی تشکیل میں بھی فضلاء دیوبند، بالخصوص حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) اور مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ (امیر شریعت بہار واڑیسہ) کا کلیدی کردار رہا ہے، ہندوستان کے پس منظر میں مسلم پرسنل لاء کی اس اہم اور عظیم تحریک کو بعد میں دیوبند اور ندوہ، دونوں سے نسبت رکھنے والے ''نجیب السندین'' فاضل مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے آگے بڑھایا۔

۶۔ غور کی نظر اس نکتہ کو بھی پوری طرح کھول دے گی کہ اگر ہندوستان میں دیوبند کے اس مدرسہ کی بنیادی حیثیت جو ''دارالعلوم'' کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے ''ام المدارس'' کی ہے، تو ۱۸۵۷ء کے بعد جتنی دینی، تعلیمی، ملی جماعتی اور رفاہی تحریکیں ہندوستان سے اٹھیں، ان سب میں تحریک دیوبند کا حصہ ہے۔ اس اعتبار سے دارالعلوم دیوبند کو ''ام المدارس'' ہی نہیں بلکہ ''ام التحریکات'' بھی کہا جاسکتا ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ تحریک علی گڑھ، تحریک ندوہ، اور تحریک جامعہ ملیہ پر بھی تحریک دیوبند

کے اثرات رہے ہیں۔ خلافت، امارت شرعیہ، ریشمی رومال، جمعیۃ علماء، تبلیغی جماعت، جماعت اسلامی اور اس طرح کی دوسری تحریکیں، جو ہندوستان سے اٹھیں یا بعض تحریکیں جو عالم اسلام میں برپا ہوئیں، ان میں تحریک دیوبند کی کسی نہ کسی اعتبار سے شمولیت محسوس ہوتی ہے، میرے پیش نظر اس وقت اختصار ہے، اس لئے تاریخی شواہد کو جمع کر کے اس کی توثیق وتصدیق ضروری نہیں سمجھ رہا ہوں۔ تاہم باخبر حضرات ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں تحریک دیوبند (جس نے تحریک حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور تحریک حضرت سید احمد شہیدؒ سے اکتساب نور کیا ہے) کی عظمت، اہمیت، وسعت اور ہمہ گیری سے بے خبر نہیں ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کے فضلاء ملک اور بیرون ملک میں جس حیثیت اور شان کے ساتھ رہے، وہ تحریک دیوبند کے نمائندہ بن کر رہے، امید یہی ہے کہ تحریک دیوبند کے یہ اثرات ماضی اور حال کی طرح مستقبل میں بھی پھیلتے رہیں گے اور جو شخص ۱۸۶۶ء میں تنہا منزل کی جانب چلا تھا، اس کے بعد کارواں بنا، یہ کارواں در کارواں اسی منزل کی طرف ہمیشہ رواں دواں رہے گا۔

معلوم نہیں ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے کس پس منظر میں یہ شعر کہا تھا، مگر تحریک دیوبند اور اس کے اثرات اور فیوض وبرکات پر یہ شعر پورے طور پر منطبق ہو رہا ہے کہ:

اٹھائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

☆☆☆

مولانا ابوالقاسم نعمانی*

بانئ دارالعلوم دیو بند

تاریخ ساز اور عظیم شخصیتوں کی زندگی کا ہر پہلو روش عام سے جداگانہ ہوتا ہے، ہر ایک کی ایک امتیازی شان ہوتی ہے ان کے غور وفکر کی سطح ہمیشہ بلند ہوتی ہے اس لئے ان کا ہر کارنامہ دوسروں کے لئے حیرتناک ہوتا ہے، مگر ان کے کارناموں میں کوئی ایک ہی کارنامہ ایسا ہوتا ہے جس کو اس کی زندگی کا نصب العین یا اس کی شخصیت کا عکس جمیل کہا جا سکتا ہے، وہی حاصل زندگی ہوتا ہے حضرت نانوتوی کی عملی زندگی کے جس رخ کو دیکھئے وہ آفتاب و ماہتاب سے چشمک زنی کرتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن دارالعلوم دیو بند کی شکل میں جو کارنامہ ظاہر ہوا میں اسی کو حضرت نانوتوی کی زندگی کا نصب العین اور حاصل زندگی سمجھتا ہوں، وہ شاملی کے محاذ پر تلوار چلاتے ہوئے ہوں یا میلۂ خداشناسی میں عیسائیوں اور پادریوں سے مناظرہ کرتے ہوئے ہوں یا دیانند سرسوتی کے اعتراضات کے جواب میں تصنیف و تالیف میں مصروف ہوں یہ سب حضرت نانوتوی کے کاروانِ زندگی کے راہ کی خارزار وادیاں ہیں جن کو طے کرنا ان کے لئے حالات اور وقت کی مجبوری تھی لیکن ان کی منزل اس سے کہیں آگے تھی، وہ منزل تھی برطانوی استعمار کے ظالمانہ و جابرانہ دور میں اسلام کا تحفظ و بقاء اس اجمال کی تفصیل یہ ہے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد انگریزی حکومت کی انتقامی کاروائیوں نے مسلمانوں میں وہ خوف و ہراس پیدا کر دیا کہ رؤساء، امراء، جاگیردار اور علماء اپنے گھروں میں بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتے تھے، چن چن کر مسلمان رؤساء کو یا تو پھانسی پر چڑھا دیا گیا یا کالا پانی بھیج دیا گیا، یہی لوگ دینی علوم کے مدارس قائم کرتے تھے جن سے دینی علوم کے ماہرین پیدا ہوتے تھے اور مسلم معاشرے کو صراط مستقیم سے بھٹکنے نہیں دیتے تھے، اب وہ مدارس کھنڈر ہو گئے، کیوں کہ اب اُن کے اوقاف رہے نہ وہ لوگ

---

* رکن مجلس شوری دارالعلوم، دیو بند

رہے جوان مدارس کے اخراجات پورے کرتے تھے، دوسرے ۱۸۵۷ء کے پہلے ہی سے ایسٹ انڈیا کمپنی دہلی اور اس کے اطراف پر قابض ہو چکی تھی، اس لئے عیسائیت کی تبلیغ طاقت کے بل بوتے پر کی جاتی تھی، تمام سرکاری ملازمین کو یقین تھا کہ مستقبل میں ہر شخص کو بہ جبر واکراہ عیسائی بنا دیا جائے گا، اس صورت حال نے مسلمانوں میں یہ خوف وہراس پیدا کر دیا کہ حکومت کے ساتھ ساتھ اسلام بھی اس سرزمین سے رخصت ہو جائے گا، ساری صورت حال اس اندیشے کو تقویت پہونچاتی تھی۔

سر سید جیسے مقرب بارگاہ سلطانی نے رسالہ ''اسبابِ بغاوت ہند'' میں حکومت سے کہہ دیا تھا کہ جب تمام مسلمان سرکاری ملازموں کو لاٹ پادری کی تقریر سننا لازم کر دیا گیا تو ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ آج نہیں تو کل ہم سب لوگوں کو عیسائی مذہب اختیار کرنا ضروری ہو جائے گا، ان حالات میں یہ یقین کرنا پڑا کہ ہندوستان میں آئندہ اسلام کو اپنے وجود و بقاء کے لئے موت وزیست کی جنگ کرنی پڑے گی، بس یہ وہ غم تھا جو حضرت نانوتوی کو کھائے جا رہا تھا، غور وفکر کے بعد اُنھوں نے اس کا واحد حل یہی تجویز کیا کہ ہندوستان میں دینی مدارس کا جال پھیلا دیا جائے۔

لیکن حالات اتنے نازک اور خطرناک تھے کہ حضرت نانوتوی کو ایک ایک قدم پھونک کر رکھنا ضروری تھا وہ برطانوی استعمار کے ''مفرور مجرم'' اور حکومت کے ''باغیوں'' میں سے تھے حکومت کی نگاہ میں انکا جرم بغاوت ثابت ہو چکا تھا گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا تھا تقریباً ایک سال تک آپ کو انڈر گراؤنڈ زندگی گذارنے پر مجبور ہونا پڑا تھا، انگریزی حکومت کے مخبر آپ کے گرد وپیش منڈلاتے پھرتے تھے، آپ کی گرفتاری کے لئے مختلف مقامات پر بار بار پولیس کے چھاپے پڑتے تھے، یہ تو حضرت نانوتوی کے بخت بلند کا کرشمہ تھا کہ قاتل سر پر آ کر بھی وار کرنے سے مجبور رہا، اس کا ہر نشانہ خطا کر گیا، اس کا ہر جال کمزور ثابت ہوا، انگریزی پولیس نے گرفتاری کی جدوجہد کی لیکن قضا وقدرت ان کی حرکاتِ مذبوحی پر مسکرا کر کہہ رہی تھی۔

عنقاء شکارِ کس نہ شود دام باز چیں

جب دوسرے سال ۱۸۵۸ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ سے حکومت چھین کر ملکۂ وکٹوریہ کے ہاتھ میں دے دی تو عام معافی کا اعلان کیا گیا اور مجرمین کی ساری فائلیں داخل دفتر کر دی گئیں، لیکن خوف وہراس کا یہ عالم تھا کہ اس اعلان معافی پر بھی مسلمانوں کو بھروسہ نہیں

تھا، اور جن کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکا تھا وہ اعلان معافی کے بعد بھی برسوں انتہائی محتاط زندگی بسر کر رہے تھے، کیونکہ ہر ایک کو یہ یقین تھا کہ اس عام معافی کے اعلان کے باوجود ان کی سرگرمیوں پر برابر نظر رکھی جارہی ہے۔

شکوک وشبہات اور اندیشوں میں زندگی کے کئی بیش قیمت سال گذر گئے کہ حضرت نانوتوی کو سکون کا لمحہ میسر نہیں آیا، نہ اپنے ذہنی خاکے میں کوئی رنگ بھر سکے، حضرت نانوتوی کی دلی کیفیات کی ترجمانی تاریخ کے اوراق میں صراحتاً نہیں ملتی لیکن اس بند محل میں کچھ روزن ضرور ایسے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے ہندوستان میں اسلام کے تحفظ وبقا کے لئے مدارس دینیہ کے قیام کو بنیادی حیثیت دی تھی۔

دارالعلوم کی تاریخ بتاتی ہے کہ دارالعلوم کے قیام کا نقطۂ آغاز حضرت حاجی عابد حسین صاحب کا یک بیک فراہمی سرمایہ کے لئے اٹھ کھڑا ہونا ہے اور جب مالی اعتبار سے یہ اعتماد ہوا کہ اس سے ایک سال تک ایک چھوٹا سا دینی مدرسہ چلایا جا سکتا ہے تب حضرت نانوتوی کو مطلع کیا گیا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان جو دینی مدرسہ قائم کرنے کے سلسلے میں گفتگو ہوا کرتی تھی اب اس کی ایک شکل ہوگئی ہے آپ فوراً کسی عالم کو بھیج دیں کہ مدرسہ کا کام شروع کر دیا جائے، آپ نے ملا محمود دیوبندی کو پندرہ روپیہ تنخواہ مقرر کر کے بھیج دیا اور چھتہ مسجد میں دیوبند کے معززین کی موجودگی میں ایک استاد اور ایک طالب علم سے ایک دینی مدرسہ کا افتتاح کر دیا گیا اور حضرت حاجی عابد حسین صاحب برسہا برس اس کے ناظم یا مہتمم رہے، جب دارالعلوم کی شہرت ہوئی اور پورے ملک سے طلبہ آنے لگے تو اس مدرسہ کو چھتہ مسجد سے جامع مسجد میں منتقل کر دیا گیا اور جب کچھ سالون بعد طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوا تو مسجد کی تین سمتوں میں کمروں کی مزید تعمیر ہوئی، اس تمام عرصے میں حضرت حاجی صاحب ہی اس کے منتظم اور نگراں وذمہ دار رہے، حضرت نانوتوی ظاہری طور پر اس سے بے تعلق رہے اور میرٹھ میں قیام پذیر رہے۔

لیکن کیا یہ ظاہری بے تعلقی حقیقت تھی؟ واقعات اِس کی نفی کرتے ہیں، دارالعلوم کی اس ابتداء پر ایک مدت گزر جانے کے بعد ایک موقع جلسۂ دستار بندی کا آیا جس میں مشاہیر اہل علم کو مدعو کیا گیا عوام وخواص کا ایک بڑا مجمع ہو گیا، یہ سب کچھ حضرت نانوتوی کے مشورے سے ہوا تھا اور جلسہ کے

انعقاد سے پہلے آپ نے ایک بڑی زمین خریدی تھی، یہ خریداری اس خاکے کے مطابق تھی جو حضرت نانوتوی نے اپنے ذہن میں بنا رکھا تھا، دستار بندی کے اس جلسے کے روح رواں حضرت نانوتوی تھے آپ نے اس جلسے میں تقریر فرمائی اور ان لوگوں کے سوال کا جواب بھی دیا جو یہ کہہ رہے تھے کہ اس مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے سے نوکری مل نہیں سکتی اس لئے کیوں نہ اس مدرسہ میں سرکاری نصاب بھی پڑھایا جائے تاکہ سرکاری نوکری کا دروازہ انکے لئے کھلا رہے، آپ نے اعلان فرمایا جن کو سرکاری نوکریاں حاصل کرنی ہوں وہ سرکاری اسکولوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلائیں مگر ہم اپنے مدرسہ میں دینی و دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم جمع نہیں کر سکتے، اس جلسے کے دوران حضرت نانوتوی نے اعلان فرمایا کہ مدرسہ کی اپنی عمارت کا سنگ بنیاد آج ہی رکھ دیا جائے کیونکہ اتنے اکابر کا مجمع پھر میسر آئے یا نہ آئے سب لوگ اس زمین پر چلیں جہاں بنیاد کھودی گئی ہے، علما و صلحا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے چلے اور حضرت نانوتوی کے ساتھ سنگ بنیاد کی جگہ پر آئے پہلی اینٹ حضرت نانوتوی نے اپنے استاد اور مشہور محدث حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری سے رکھوائی اور دوسری اینٹ بنیاد میں اتر کر خود حاجی عابد حسین صاحب نے رکھی۔

اس واقعہ کے بعد حضرت نانوتوی نے ساری وہ ذمہ داریاں جو حضرت حاجی صاحب ادارہ کے تئیں انجام دیتے تھے پھر انھیں کو سپرد کر دیں اور خود اپنی ذات کو اس سے عملاً علیحدہ رکھا جب کہ اب دارالعلوم ٹھیک حضرت نانوتوی کی منشاء کے مطابق ایک عالمی دینی یونیورسٹی ہونے کے پہلے اسٹیج پر آچکا تھا، اب آپ کو خود اس کی سرگرمیوں میں پوری طرح شریک ہو جانا چاہئے تھا۔ تاکہ آئندہ ہر کام جو دارالعلوم کی توسیع و ترقی کے لئے ضروری ہے اپنے خاکے کے مطابق بروئے کار آئے۔ لیکن آپ نے عجلت پسندی سے کام نہیں لیا ان کے سامنے وہ تمام مصلحتیں تھیں جو سادہ دل حضرت حاجی صاحب کی دنیاوی تعلقات سے یکسوئی کی وجہ سے ان کے سامنے نہیں تھیں، خود حضرت نانوتوی نے ان مصلحتوں کی طرف کسی مجلس میں کوئی اشارہ نہیں کیا، لیکن دارالعلوم کے خاکے میں آپ کی منشاء ہی کے مطابق رنگ بھرا جاتا رہا، آخر دور میں دارالعلوم سے قربت کچھ زیادہ بڑھی لیکن ایسی قربت نہیں کہ عام طور پر لوگ سمجھنے لگیں کہ اس ادارہ کے روح رواں حضرت نانوتوی ہیں، کبھی کوئی سبق بھی پڑھا دیا کبھی اس کے دفتر میں بیٹھے اور دارالعلوم کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے قلم سے اصول ہشتگانہ قلم بند فرما

کر دار العلوم کو دے گئے، لیکن باضابطہ نہ وہاں فرائض تدریس انجام دئے نہ اس کے صدر اور سر پرست ہوئے اور نہ مہتمم اور ناظم، کوئی باضابطہ تعلق دار العلوم سے نہیں رکھا جبکہ سارے امور آپ کی صواب دید کے مطابق ہی انجام دیئے جاتے رہے، زندگی کے اخیر لمحے تک دار العلوم سے متعلق آپ کا یہی رویہ رہا، یہاں تک کہ آپ ۱۲۹۷ھ میں اس دنیائے فانی سے چل بسے، لیکن دار العلوم کی مکمل حفاظت کا بندوبست کر کے گئے، اپنے مخلص دوستوں اور شاگردوں اور قدرشناسوں کو دار العلوم کے نظم ونسق اور تعلیم و تدریس کا ذمہ دار بنا کر گئے کسی بھی ایسے شخص کی دار العلوم میں گنجائش نہیں تھی جو دار العلوم کے کاز کے برخلاف ایک قدم بھی چل سکے اس لئے دار العلوم ہر طرح کی آفتوں سے محفوظ رہا اور حضرت نانوتوی کے دل میں جو کھٹکا تھا وہ وجود میں نہیں آیا۔

حضرت نانوتوی کی فراست اور مصلحت دینی کا راز بہت دنوں بعد کھلا جب ابتدائی دور کے صدر المدرسین مولانا محمد یعقوب نانوتوی انتقال کر گئے اور مولانا سید احمد دہلوی صدارت سے استعفا دے کر بھوپال چلے گئے اور حضرت نانوتوی کے شاگرد خاص مولانا محمود حسن دیوبندی جو تاریخ میں شیخ الہند کے خطاب سے مشہور ہوئے صدر مدرس بنائے گئے۔

۱۸۵۷ء کی عام بغاوت کے بعد حضرت نانوتوی پر وارنٹ ایک مدت تک رہا اور آپ انڈر گراؤنڈ زندگی گذارنے پر مجبور تھے دیوبند جب بھی اس مدت میں آئے انگریزوں کے مخبر فوراً مقامی پولیس کو مطلع کر دیتے، یہ مخبر قصبہ ہی کے تھے اور حضرت نانوتوی کی ہر ہر نقل وحرکت کی جستجو میں رہتے تھے، گھر پر چھاپہ پڑا آپ بچ گئے، چھتہ مسجد پر چھاپہ پڑا آپ محفوظ رہے، شیخ نہال احمد کی دیہات میں جو کوٹھی تھی اس پر چھاپہ پڑا اللہ نے بچالیا، یعنی دیوبند اور قرب وجوار میں آپ کا محفوظ رہنا ممکن نہیں رہا کیوں کہ مخبر غیر نہیں اپنے ہی جیسے لوگ تھے، ایک سال بعد خدا خدا کر کے عام معافی کے اعلان کے بعد گرفتاری کا خطرہ دور ہوا وارنٹ تو منسوخ ہو گیا لیکن پولیس کے ریکارڈ میں یہ نام محفوظ رہ گیا، پولیس ایسے لوگوں کی نقل وحرکت پر ہمیشہ نظر رکھتی تھی اس لئے ایسے تمام حضرات پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے، یہی وہ راز تھا جس کی وجہ سے دار العلوم میں ایک ایسی شخصیت کو سامنے رکھا گیا جو ہر طرح کے شک وشبہہ سے ماوراء تھی، اور آخر تک انہی کی نگرانی اور سرپرستی میں سارے امور انجام پاتے رہے اور ظاہری طور پر بطور مہمان یا عالم دین کے حضرت نانوتوی دار العلوم کی تقریبات میں شریک ہو جاتے۔

تھے، کیونکہ اگر حکومت کو ذرا بھی شبہہ ہو جاتا کہ یہ ادارہ حضرت نانوتوی کی جدوجہد کا ثمرہ ہے اور مقامی مخبر پولیس کو مطلع کر دیتے تو شاید اپنے وجود کے دوسرے ہی دن دارالعلوم کا وجود مٹ جاتا کیونکہ اس سے حکومت کو بغاوت کی بو آنے لگتی، حکومت کے کاسہ لیس اور پولیس سے رابطہ رکھنے والے کچھ معزز افراد نے یہ زہریلا تیر چلایا لیکن انھوں نے دیر کر دی اور تیر نشانہ سے خطا کر گیا۔

حضرت نانوتوی کا ۱۲۹۷ھ میں انتقال ہو گیا اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوسرے ملزم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی دارالعلوم کے سرپرست بنائے گئے، صدر المدرسین اور شیخ الحدیث حضرت نانوتوی کے شاگرد رشید حضرت شیخ الہند ہوئے، وہ لابی دارالعلوم پر قبضہ کرنا چاہتی تھی جب وہ اس میں ناکام ہو گئی تب اس نے حکومت کو درخواست دی، یہ وہی لوگ تھے جو کبھی حضرت نانوتوی کی گرفتاری کے لئے مخبری کرتے تھے، انھوں نے حکومت کو یقین دلانا چاہا کہ یہ مدرسہ حکومت کے باغیوں نے قائم کیا ہے اور یہاں بغاوت کی تعلیم دی جاتی ہے یہ سارا واقعہ حکیم عبدالحی رائے بریلوی نے اپنی کتاب ''دہلی اور اسکے اطراف'' میں لکھا ہے، یہ ان کا سفرنامہ ہے یہ سفر دیوبند ۱۳۱۲ھ میں کیا تھا اور شیخ الہند سے تفصیلی ملاقات کی تھی انھوں نے حضرت شیخ الہند سے سارے واقعات سن کر اپنی کتاب میں درج کئے ہیں، وہ کہتے ہیں:

> ''جب مخالفین عاجز آگئے تو انھوں نے گورنمنٹ کو درخواست دی کہ مدرسہ نہایت خراب اصول پر چل رہا ہے، ان لوگوں کے خیالات بغاوت آمیز ہیں، اسی واسطے مدرسہ میں ولایتی کثرت سے رکھے گئے ہیں، ایک زمانے میں مولوی رشید احمد نے تھانہ بھون کی بغاوت میں شرکت کی تھی، یہ ہمیشہ کے باغی ہیں، انکی مسل نکالی جائے بہتر تو یہ ہے کہ مدرسہ کو گورنمنٹ اپنے ہاتھ میں لے لے اور اگر یہ منظور نہ ہو تو حاجی محمد عابد اس کے سرپرست مقرر کئے جائیں جن کو جشن جوبلی میں شمس العلماء کا خطاب دیا گیا ہے''(۱)

اس تاریخی حقیقت سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر انگریزی حکومت کے ہوا خواہوں نے حضرت نانوتوی کے دور میں یہ حربہ اختیار کیا ہوتا تو اس کا انجام کیا ہوتا؟ کہا نہیں جا سکتا، یہی وہ خطرہ تھا جسکو حضرت نانوتوی چشم بصیرت سے دیکھ رہے تھے مگر دارالعلوم کا قیام بھی وقت کا اہم ترین فریضہ تھا اور

(۱) دہلی اور اس کے اطراف از حکیم عبدالحی صاحب ص ۱۰۰۔ حیات خلیل از محمد ثانی حسنی ص ۱۶۴۔

اس سے زیادہ اس کا تحفظ اور بقا ضروری تھا، اس لئے حضرت نانوتوی نے اپنے منصوبے کے مطابق دارالعلوم قائم کیا لیکن ظاہری بے تعلقی بھی قائم رکھی تا کہ دارالعلوم کے نوخیز پودے کو برطانوی استعمار کے ہواخواہوں کی بادسموم سے بچایا جاسکے۔

یہ حضرت نانوتوی کی فراست ایمانی کی دلیل ہے جس کو زبان رسالت سے "اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر بنور اللّٰہ" کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے، آج وہ پوری دنیا میں اپنی نوعیت کی واحد اسلامی یونیورسٹی ہے جو کسی حکومت یا سیاست کی مالی امداد کی احسانمند نہیں ہے، یہ احسان لینا اس کو منظور بھی نہیں کیوں کہ اس کے بانی حضرت نانوتوی کے مرتب کردہ اصولوں میں سے یہ ایک بنیادی اصول ہے، آج دارالعلوم کی عمر ۱۳۸ سال کی ہو چکی ہے ہر طرح کے حالات آئے اور گذر گئے:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں ، زندگی دشوار ہو جائے

☆......☆......☆

مولانا قاری محمد عبداللہ سلیم*

الامام محمد قاسم النانوتویؒ

تاریخ اسلام کے تسلسل میں آبدار موتی، نظام مدارس کے مجدد اعظم

سیمینار وقت کی اہم ضرورت

اس سیمینار کا اس وقت کیا جانا اس لحاظ سے بہت قیمتی ہے کہ سیاسی الجھاؤ اور نفسانی آفتوں نے ملت کو ایسے مقام پر پہونچادیا ہے جہاں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ماضی اور اس کی عظمت سے رشتہ کٹ چکا ہو، وہ تو کہئے کہ عجیب اتفاق ہے کہ ہر جماعت اور فرقہ معرضِ انحطاط میں سرگرداں ہے۔ ورنہ جو مخالفین پہلے جماعت دیوبند کی طرف انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کرتے تھے وہ اس وقت پورے ہاتھ اٹھادیئے۔ اس بناء پر شاید میں یہ عرض کرنے میں حق بجانب ہوں کہ آپ حضرات یہ سیمینار کرکے ہر علمی دینی تحریک کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔

زمانہ خیر اور خیر کا تسلسل

اگر ایک طرف حدیث پاک: **خیر امتی قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم** سے، اگر چہ غلط ہی ہو، یہ احساس دل میں پیدا ہوتا ہے کہ ہم شر القرون میں ہیں جس میں ایسی صالح اور صاحب خیر شخصیتیں نہیں ہوں گی جن سے ہم اکتساب فیض کرسکیں تو دوسری حدیث میں بارگاہ نبوت سے یہ خوش خبری مروی ہوکر اس احساس کو باطل کر دیتی ہے کہ: **مثل اُمّتی مثل المطر لایُدری اوّلہ خیرٌ ام اخرہ.**

صدیق اکبر و فاروق اعظم

چنانچہ دور صحابہ میں یوں تو **اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم** کے مطابق ہر

---

* معہد تعلیم الاسلام، ایلجن، ایلے نائے، یو.ایس.اے

ہستی مجسم نورِ ہدایت ہے لیکن ان میں بھی حضرات شیخین رضی اللہ عنہم کی شخصیتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان مقدسین کی شخصیتیں تہ بہ تہ ہیں اور ہر تہ سونے کے ورق کی ہے، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات ظاہری اور باطنی کا شخصی مظہر یہ دونوں بزرگ نظر آتے ہیں، علم میں گہرائی، اخلاق میں گیرائی، اخلاص میں قوت، نظر میں دوررسی، ارادوں میں شجاعت، فکر میں پاکبازی، فیصلوں میں بے نفسی، غرض خیرالامم میں: وما خلقت بیدی کا اگر کسی پر اطلاق ممکن ہے تو یہی دو ہستیاں اس کا اولین حق رکھتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوۃ والسلام جو جامع اور محکم و مستحکم دین دے کر دنیا سے رخصت ہوئے تھے اس کی جامعیت اور استحکام کو ان دو ہستیوں نے عروج کامل عطا کر دیا۔

یوں تو ان میں کی ہر ایک شخصیت منفرد اور ہر ایک کا تشخص مستقل اور جداگانہ تھا لیکن مزاجوں کے فرق اور ان کے اثرات پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کے اجتماع سے ہی وہ کارنامہ انجام پایا جس کی نظیر تاریخ عالم میں مفقود ہے، چنانچہ اگر ایک میں نرمی اور رافت اور دوسرے میں سختی اور شدت مشاہد ہوتی تھی تو نرمی والا سختی والے کو یہ کہتا بھی نظر آیا: اجبار في الجاهلية وخوار في الاسلام اور نرمی والے نے شدت والے کو اپنی جانشینی کے لئے نامزد کیا تو یہ وجہ بتلا کر لوگوں کو مطمئن کرتا بھی دکھائی دیا کہ ان کی سختی میری نرمی کے سامنے تھی اور واقعہ بھی یہ ہے کہ نرمی میں اعتدال سختی کی آمیزش سے ہی ہوسکتا ہے جو معاملات کے لئے نہایت مفید و کارگر ہوتا ہے، اسی مزاج کے اور اضداد کو بھی قیاس کر سکتے ہیں۔

غرض صدیقیت اور فاروقیت کے اس اجتماع نے جسم اسلامی کو وہ صالح غذا مہیا کر دی جس کے نتیجے میں یہ جسم نہایت تندرست، پرشکوہ اور متحرک نظر آنے لگا، جس میں بدنمائی یا اضمحلال کا کوئی شائبہ بھی گرد و پیش میں نہ رہا۔ اور ظاہر ہے کہ ہر دو شخصیتوں کے کمالات کا مرکز و مبدأ ذاتِ نبوی علیہ الصلوۃ والسلام ہی تھی صاف نظر آتا ہے کہ تجلی رسالت کا ایک پرتو صدیقیت ہے تو دوسرا فاروقیت، لسانِ نبوت نے ہر دو کے بارے میں جو ارشاد فرمایا تھا ہو بہو اس کی مجسم تشریح و تعبیر دنیا نے دیکھ لی:

عن عبدالله بن حنطب ان النبی صلی الله علیه وسلم رای ابابکر و عمر فقال هذان السمع والبصر (رواه الترمذی مرسلا) وعن ابی سعید الخدری قال قال رسول الله

صلی اللہ علیہ وسلم ما من نبی إلا وله وزيران من اهل السماء وزير ان من اهل الارض فأما وزير ای من اهل السماء فجبرئيل وميكائيل وأما وزير ای من اهل الارض فابوبكر وعمر (رواه ترمذی)

پھر دیکھ لیا جائے کہ جہاں مبدا تھا وہیں معاد ہوا، کل شی یرجع الی اصله، اس لئے مدفن بھی دونوں کا وہی حجرہ مبارکہ ہوا جو قیامت تک خلوت کدۂ رسالت ہے اور وہیں جسم عنبریں استراحت فرما ہے، اسی لئے حضرت علی مرتضیٰ نے حضرت عمر کے جنازہ پر یہ اظہار حقیقت کر دیا تھا:

يرحمك الله انی لارجو ان يجعلك الله مع صاحبك لانی كثيرا ما كنتُ اسمع رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول كنتُ وابوبكر وعمر وفعلتُ وابوبكر وعمر وانطلقت و ابوبكر وعمر ودخلتُ وابوبكر وعمر وخرجتُ وابوبكر وعمر (عن ابن عباس، متفق عليه)

دور تابعین میں خیر و شر

بہر حال یہ تو ذکر ہوا سرتا سر زمانہ خیر اور بطور خاص دو شخصیتوں کا، جس کا حاصل یہی ہے کہ بلاشبہ تمام صحابہ شرف وسعادت کے بلند مرتبہ پر فائز تھے مگر ان سب میں حضرات شیخین نہایت ممتاز اور کمالاتِ نبوت کے سب سے نمایاں عکس تھے۔

اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دور دیکھا جائے تو بھی ایمانی حرارت اور اسلام کے پھیلاؤ کی عام جدوجہد نظر آتی ہے، اسلامی تاریخ کی بھاری بھرکم شخصیتوں سے یہ زمانہ بھرا ہوا ہے، فتوحات اسلامی چہاردانگ میں پھیلتی جارہی ہیں۔ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ مجاہدین جہاد کے میدانوں میں تو سرفروشی دکھارہے تھے ان کی کامیابیاں دورِ صحابہ کی کامیابیوں کے ہمرنگ ہی تھیں لیکن اندرونی معاشرہ اس بگاڑ میں دور تک چلا گیا تھا جس کو نابود کرنے کے لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رات دن ایک کیا تھا اور ہر تکلیف اور مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کر کے ایسا معاشرہ ترتیب دیا تھا جس کا مشاہدہ چشم فلک پہلی مرتبہ کر رہی تھی، پھر وصال نبوی کے بعد زخم خوردہ بگاڑ نے تاک جھانک کرنی چاہی تھی، لیکن حضرات شیخین کی ایمانی قوت اور فیصلوں کی مضبوطی نے اس کو بے جان کر دیا تھا لیکن خلافتِ راشدہ کا مقدس دور پورا ہوا بھی نہیں تھا کہ بگاڑ نے پھر جھرجھری لے کر رجعت قہقری

کرلی تھی، جس معاشرہ پر کچھ عرصہ تک صبغۃ اللہ کی جلوہ فرمائی تھی، امیر ہو کہ مامور، غنی ہو کہ محتاج، حکومتی نظم ونسق ہو کہ بازار کا لین دین، خلوت کدے ہوں کہ اجتماعات ہر جگہ شریعت غراء کی نور افشانی تھی، اب اسی معاشرے کے ایک معتد بہ حصہ نے معاملات اور فکر ونظر کا زاویہ بدل لیا تھا، سیاست دنیوی، نفسانی اغراض نیز خاندانی عصبیتوں اور قبائلی تحدیدات کے ظلماتی سایہ میں ایک طبقہ پہنچ چکا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس بگاڑ کی تلخی اندورنِ معاشرہ تک محدود نہیں رہ سکتی تھی، اگر اس پر فوری اور مضبوط روک نہ لگتی تو پھر جان جانِ آفریں کے سپرد کرنے کے شوق سے سرشار مجاہدین اس تعفن سے محفوظ نہ رہتے، پھر خواہ وہ تلواروں نیزوں کے کرتب کیسے ہی دکھلاتے رہتے لیکن جہاد کی اسپرٹ ان میں سے نکل چکی ہوتی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز اور رجوع الی الخیر

پھر یہ ہوا کہ مؤرخ کا قلم جو اس وقت کے المناک احوال کو دکھ درد کی روشنائی سے رقم کر رہا تھا اس کو بریک لگی اور یہ دکھائی دیا کہ بگاڑ کے ذمہ دار درباروں اور محلات کے اندر سے اچانک ایک رجلِ رشید کو کھڑا کر دیا گیا اور اس نے اس بگاڑ کو لگام دے دی، خلافت راشدہ کے پانچویں منصب دار حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جیسے ہی صلاح وتقوی کے ساتھ قیادت سنبھالی تو لوگوں نے ہی نہیں بلکہ درندوں اور چرندوں نے بھی موافقت کا مخلصانہ مظاہرہ کیا اور اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ لوگوں نے خوشی اور پسند سے بگاڑ کو نہیں اپنایا تھا بلکہ: فانی تصرفون کا مصداق بن گئے تھے، نیز یہ بھی واضح ہوا کہ زمین میں صلاح اصل ہے فساد تو مفسدین کی کارستانی سے ہوتا ہے، قرآن حکیم کی پکار بالکل صحیح ہے: لا تُفسدوا في الأرض بعد اصلاحها.

امام زہری اور جمع احادیث

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مبارک دور میں اعمال واخلاق کی اصلاح کا کام نامکمل رہ جاتا اگر اس دور میں علوم شریعہ کی حفاظت واشاعت اور دستوری اصول اور قانونی فروع کی ترتیب وتدوین کا کام نہ کیا جاتا کیونکہ اعمال واخلاق علم کے تابع ہوتے ہیں، پھر یہ کہ دنیا کا تین چوتھائی آباد حصہ امت مسلمہ ہی کی دنیا بنا ہوا تھا۔ آب وہوا کے فرق، رسم ورواج کے اختلاف، عادت واخلاق کی نیرنگیوں سے کتنے سوالات نہ پیدا ہوئے ہوں گے۔

حضرت عمر بن الخطاب کو جس طرح جمع قرآن کی ابتداء کا شرف حاصل ہو چکا تھا کہ ان ہی

نے اس عظیم کام کا مشورہ خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق کو دے کر باصرار اس کے لئے ان کو راضی کیا تھا اب ان ہی کے نواسے حضرت عمر بن عبد العزیز نے جمع احادیث کی واجبی اور عظیم المرتبت ضرورت کی طرف توجہ کی اور وقت کے مسلم امام حدیث ابن شہاب زہری کو اس جلیل القدر کام پر مامور کیا، پھر اس بلند مرتبہ کام نے وہ پھیلاؤ اور عروج حاصل کیا جس کی مثال نوع انسانی کی تاریخ میں نہ پہلے تھی اور نہ بعد میں ہوئی، احادیث کی جانچ پڑتال کے اصول وضع کئے گئے، راویوں کی چھان بین میں بے نظیر محنتیں کر کے علم اسماء الرجال وضع کیا گیا پھر ان سب چیزوں کی روشنی میں احادیث کی درجہ بندی کی گئی، بلاشبہ محدثین نے اس باب میں بے مثال کارنامہ انجام دیا۔

امام ابوحنیفہ اور فقہ

بہر حال ایک طرف ابن شہاب زہری اور ان کے تلامذہ ورفقاء اپنی زندگیاں اس بلند و بالا کام میں لگائے ہوئے تھے اور یہ کام بام عروج کو پہونچ چکا تھا، ٹھیک اسی دور میں دوسری طرف امام ابوحنیفہ نے نادرہ روزگار علم الفقہ کے کام کی داغ بیل ڈالی ہوئی تھی، اس کام کی نوعیت یہ تھی کہ تمام ذخیرہ احادیث کو اور قرآن پاک کو سامنے رکھ کر عمیق غور وفکر سے منشأ شریعت کا تعین کیا جارہا تھا، پھر اس روشنی میں احکام وہدایات کی درجہ بندی، عموم وخصوص، اطلاق وتقیید کی تشخیص کرتے ہوئے حلال وحرام، فرض وواجب، مستحب ومباح، ناجائز اور مکروہ کی تقسیم وتحدید کی جارہی تھی، پھر احوال کی موجودہ اور ممکنہ تبدیلیوں سے پیدا شدہ مسائل میں حکم شرعی کے استخراج کے لئے علت احکام، مصالح عامہ، مصالح خاصہ، اجماع اور قیاس وغیرہ امور کی تعیین وتشخیص کر کے اجتہاد میں ان سے کام لیا جارہا تھا۔

چونکہ سینکڑوں محدثین کے درمیان ابن شہاب زہری کا امتیازی مقام تھا اس وجہ سے حضرت عمر بن عبد العزیز نے ان ہی کا انتخاب جمع احادیث کے عظیم الشان کام کے لئے کیا اسی طرح متعدد فقہاء اور ائمہ مجتہدین کے درمیان امام ابوحنیفہ کی نہایت ممتاز حیثیت تھی۔ نیز اخلاق وعادات، زہد وتقوی، استغنا وتواضع، کثرت عبادت، ذہانت وفطانت، ایثار وہمدردی اور شفقت وسخاوت میں بھی آپ کی شخصیت نمایاں تھیں۔

وہ دور ایسے تو ایسی ایسی عظیم شخصیتوں سے بھرا ہوا تھا جن کے احسان سے امت سبکدوش نہیں ہوسکتی، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ بگاڑ پر قدغن لگانے اور پھر اصلاح اور علوم شریعہ کو مرتب شکل دینے

میں تین شخصیتوں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، امام زہریؒ اور امام ابوحنیفہؒ کی حیثیت اساطین ثلاثہ کی ہے۔ رحم اللہ رحمۃ واسعۃ.

بعد کے ادوار میں بلاشبہ نہایت عظیم الشان کام ہوئے، بڑی بڑی شخصیتوں کی موجودگی رہی، زبردست علمی اور تحقیقی کام کئے گئے، علمی اور تحقیقی کتابوں سے کتب خانے وجود میں آئے، ہر صدی نئے رنگ سے شروع ہوئی اور انوکھے روپ میں ختم ہوگئی۔

لیکن تیرہویں صدی میں عجیب بات یہ دکھائی دیتی ہے کہ اس میں بھی اساطین ثلاثہ (تین شخصیتوں) کا انقلاب احوال، اور خدمت علم و اصلاح اعمال پر مشتمل ایک ایسا کارنامہ نظر آتا ہے جس کے اثرات عالمگیر بھی ہیں اور دوامی بھی۔

تاتاری فتنہ عالمگیر نہ تھا

سب کو معلوم ہے کہ فتنہ تاتار نہایت ہولناک تھا، جو اس کی زد میں آیا وہ نیست و نابود ہوا، کتنے ہی ملک اس کی درندگی اور وحشت و بربریت کی بھینٹ چڑھ گئے، مگر پھر بھی اس فتنہ کی براہِ راست زد ساری دنیا پر نہ تھی۔ تیرھویں صدی ہجری یا انیسویں صدی عیسوی میں یورپ و امریکہ اور برطانیہ کی سفید اقوام نے اپنی تہذیب اور سلطنت و سطوت کا جال جس طرح ساری دنیا پر پھیلایا تھا، یہ فتنہ یقیناً عالمگیر تھا، پورا عالم اس کی لپیٹ میں تھا، ایک طرف مسیحیت اس کے زیر سایہ اپنی جڑیں پھیلا رہی تھی تو دوسری طرف وہ گوری تہذیب اپنا جال پھیلا چکی تھی جس کا شعار عریانیت و بے حیائی ہے۔

ہندوستان کی حالت یہ تھی کہ یہاں لگ بھگ نو سو سال سے مسلمانوں کے ہاتھ میں اقتدار تھا جو کمزوری کی اس انتہا کو پہونچ گیا تھا یا پہونچا دیا گیا تھا کہ برطانیہ کے لئے قبضہ آسان ہوگیا تھا، آخری مغلیہ تاجدار اور ان کے شہزادوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا اس کے ذکر کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کی پوزیشن یہ تھی کہ اس پر قبضہ کے نتیجہ میں برصغیر بلکہ مشرقِ وسطیٰ پر بھی یورپ اور برطانیہ کے پنجے مضبوطی سے پیوست ہو رہے تھے، اس لئے ہندوستان میں اس خطرناک بگاڑ پر روک لگانا ضروری تھا تاکہ نزدیک والے بھی اس شر سے محفوظ رہیں اور دور والے بھی۔

تیرھویں صدی کے اساطین ثلاثہ

چنانچہ ہمت مردانہ کے ساتھ تڑپ کر اٹھنے والا اگر کوئی تھا تو وہ ایک مرد درویش تھا، حضرت

حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو چند نوجوان ایسے ملے جن میں یہی تڑپ موجود تھی، ان میں بھی دو زیادہ ممتاز تھے حضرت الامام محمد قاسم النانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ۔

جہاد شاملی

اس گورے اقتدار کے ظلم وجور کو دیکھتے ہوئے ان حضرات نے برطانیہ کے دعوائے حکومت کو رد کردیا اور جہاد کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ خیال یہ رہا ہوگا کہ اپنے اس اقدام سے ہندوستانی باشندوں خاص طور سے مسلمانوں میں بلند ہمتی پیدا ہوگی اور وہ بھی حوصلہ کے ساتھ ملتے جائیں گے، بالآخر ایسی قوت بن جائے گی کہ دہلی پر قبضہ کرلینے والے برطانوی آسانی سے قابو نہ پاسکیں گے بلکہ اس سے مغلیہ حکومت کے بچے کھچے سپاہیوں اور اس حکومت کے ہمدردوں کو سہارا مل جائے گا تو وہ بھی ان قابضوں کے مقابلہ پر اکٹھے ہوجائیں گے، لیکن افسوس کہ اس میں کامیابی نہیں ہوئی، قبل اس کے کہ بات وہاں تک پہونچے، دہلی سے زبردست طاقت نے پہونچ کر اس جہاد کو ناکام کردیا اور یہ اساطین ثلاثہ برطانوی قابضین کے مجرم قرار دیئے گئے، صورتِ حال سے مایوس ہوکر حضرت حاجی صاحبؒ البلد الامین مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت کر گئے۔

ادھر برطانوی قبضہ کاروں نے اپنے تباہ کن منصوبوں کو بروئے کار لانے کے لئے کسی مزید انتظار کو بھی گوارہ نہیں کیا، مسیحی مشنریاں اور ماہرین تعلیم حرکت میں آگئے، مشنریوں کا کام اس کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا کہ مسیحیت کی ترویج واشاعت ہو لیکن ظاہر ہے تبدیلی مذہب آسان نہیں ہے، سوائے ایسے چند بیچاروں کے جن کا کوئی والی ووارث نہ ہو اور مذہب نام کی کسی چیز کا علم نہ ہو، مذہبی لحاظ سے وہ پہلے بھی کچھ نہیں ہیں ان کو عیسائی بنالیا جائے تو بنالیا جائے ورنہ لکھے پڑھے بلکہ تھوڑی سی بھی سمجھ رکھنے والے کے لئے مذہب کا بدلنا نہایت دشوار اور کٹھن ہے، اس لئے ماہرین تعلیم کے فرائض یہ طے پائے کہ ایسا نصاب تعلیم بنا کر رواج دیا جائے جس کے نتیجے میں ایسی کھیپ نکلے جس کا رنگ وروغن ہندوستانی رہے تو رہے مگر دماغ برطانوی ہوجائے۔

حضرت نانوتویؒ اور تحریک دیوبند

جہاد میں ناکامی اور بدیسی حکومت کے اس فریب نے حضرت نانوتویؒ کو (بالخصوص) تڑپادیا، جوش اور جذبہ میں کوئی حرکت کی جاتی تو اس کا مقدر بھی ناکامی کے سوا کچھ نہ ہوتا، ضرورت تھی

طویل المدت حکیمانہ منصوبہ اور اس پر عمل درآمد کی۔ حضرت نانوتویؒ نے اپنے درویشانہ طرزِ زندگی کے باوجود نقشہ کار بنا کر بڑی سادگی کے ساتھ جس طرح چند مخلصین کے ذریعے اس کو عملی جامہ پہنایا اس کے پس پشت حضرت کی گہری فکر، ایمانی بصیرت، دوررس نگاہ، قوت اخلاص، وسعت علم، تقویٰ وللّٰہیت، اسلام اور امت مسلمہ سے سچی محبت اور حلم وتدبر کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ اوصاف کسی عبقری اور نادرۂ روزگار شخصیت کا جو تصور دماغ میں قائم کرتے ہیں حضرت اپنی سوانح کے آئینہ میں بالکل ایسے ہی نظر آتے ہیں۔

دیو بند جو مغربی یوپی کے قصبوں میں کا بس ایک قصبہ تھا اس میں ایک مدرسہ کی ابتدا کی، لیکن یہ مدرسہ کیا تھا علم وعمل، نظریہ وعقیدہ اور اصلاحِ معاشرہ کے باب میں ایک ہمہ گیر انقلاب تعلیم وتعلم کی ایک ہی صورت برسوں سے چلی آ رہی تھی، یا تو کوئی عالم دین خود سے کسی جگہ (عام طور سے مسجد میں) بیٹھ گیا اور اس کی ذات یا خوش قسمتی سے اس کے بعد اس کے کسی شاگرد کے بیٹھنے سے وہ مدرسہ کہلایا گیا، یا پھر کسی امیر کبیر کی علم نوازی یا تشہیر ذات کی خاطر کسی مدرسہ کی نمود ہوگئی، اور اخراجات کی مسلسل کفالت امیر کے خزانے سے ہوتی رہی یا کوئی وقف قائم کر دیا گیا اور اسے اخراجات کی پابجائی ہوتی رہی۔

اس نہج کے دو نقصانات تھے جس کی تلافی کے لئے کبھی نہیں سوچا گیا، ایک تو پورا نظام تعلیم ایک فرد کا مرہونِ منت ہو گیا، خواہ وہ خود معلم ہو یا کفیل، دوسرے نظام تعلیم کی تشکیل اس ڈھنگ پر نہیں ہو پائی، جس کی وجہ سے عوام اور علماء باہم مربوط ہوتے ہوں، ذاتی شوق اور لگن کے تحت کوئی ربط قائم کر لے تو بات الگ ہے۔

نظام المدارس اور حکمت قاسمیہ

اس طرز کار میں حکمتِ قاسمیہ کا تجزیہ کیا جائے تو عظیم فوائد نظر آتے ہیں، اور تجربہ ان کا شاہد عدل ہے۔

طبعی بات یہ ہے کہ کسی کام میں جب کوئی مدد کرتا ہے تو اس کام سے اس کو تعلق اور ہمدردی ہو جاتی ہے، لہٰذا جس نے مدرسہ کی اعانت کی اس کا مدرسہ سے ربط ہو گیا۔

ہر زمانے میں اور ہر جگہ غریبوں کی کثرت ہوتی ہے، رئساء اور امراء کم ہوا کرتے ہیں، لہٰذا

مدرسہ کی ضروریات کی تکمیل کے لئے اگر امراء کی طرف ہی توجہ کی گئی تو مدرسہ کے ساتھ ربط کم لوگوں کا ہوگا معاشرے کا بڑا حصہ مدرسہ سے بے تعلق رہ جائے گا۔

غریب اپنی محنت کی کمائی میں سے جو کچھ دیتا ہے اس میں عام طور پر اور نسبتاً اخلاص زیادہ ہوتا ہے، اور اخلاص ہی سرچشمہ قوت اور خیر و برکات ہے، مدرسہ کے کام میں اس سے خیر و برکت ہوگی۔

غریب زیادہ نہیں دے پاتا، جو کچھ دیتا ہے وہ چونکہ مقدار میں تھوڑا ہوتا ہے اس لئے احسان کا خیال بھی دل میں نہیں آتا جس کو جتلانے کی نوبت آئے، نیز مدرسہ کے نظام میں مداخلت کی ہمت اس کو نہیں ہوتی برخلاف امراء یا حکام کے، ان کی مدد لی جائے گی تو ان کی مداخلت کو گوارا کرنا پڑے گا، اس طرح مدرسہ اپنے نظام اور مقاصد میں آزاد نہ رہے گا۔

مدرسہ کی ضروریات جس قدر بڑھتی جائیں گی اسی کے بقدر مالی مدد کی بھی ضرورت ہوتی جائے گی جس کے لئے ارباب مدرسہ کو زیادہ مسلمانوں (غریبوں) تک جانا ہوگا، جو محنت کو چاہتا ہے، اس محنت کے نتیجے میں جو مدد وصول ہوگی اس کو قیمتی سمجھا جائے گا اور صحیح مصرف میں احتیاط کے ساتھ خرچ کیا جائے گا۔

منتظمین مدرسہ کو امراء و حکام کی خوشامد نہیں کرنی پڑے گی، اس کی وجہ سے ان میں استغناء کا وصف برقرار رہے گا۔

چونکہ مدرسہ کی لگی بندھی اور مستقل آمدنی نہیں ہوگی، اللہ کے بھروسہ پر آمدنی کی امید رکھنی ہوگی، جس سے ان میں توکل اور قناعت کے اوصاف پیدا ہو کر ترقی پذیر رہیں گے۔

چونکہ مالی تعاون کرنے والے اپنے اختیار اور رغبت سے تعاون دیں گے کوئی قانونی ٹیکس کی شکل نہیں ہے کہ جس کو خواہی نخواہی ادا کرنا ہی ہو، اس لئے علماء (ارباب مدرسہ) معاونین کے احسان مند اور ان کے حق میں دعا گو رہیں گے۔

علما اور عوام ایک دوسرے کے قدردان رہیں گے، علماء تو اس لئے کہ عوام نے ان کی بتوسط مدرسہ مدد کی ہے اور عوام اس لئے علماء کے قدردان ہوں گے کہ ان کے نزدیک علماء کی خدمت کا مقدس کام یہ حضرات انجام دے رہے ہیں جس کے فوائد و برکات سب کے لئے عام ہیں۔

اس طریقِ کار سے علماء اور عوام مسلمین میں باہمی ربط بلکہ مضبوط تعلق قائم رہے گا، جس کی وجہ سے کوئی طبقہ بگڑنے نہیں پائے گا، علماء عوام کی اصلاح و تربیت سے خود کو بے تعلق نہ کرسکیں گے، اور خود کو بھی بگاڑ سے دور رکھیں گے اس لئے کہ عوام کی نظریں ان پر جمی ہوئی ہیں اور ان کا ان کے اوپر حق ہے۔

یہ ہیں حکمتِ قاسمیہ کے وہ دور رس فوائد اور ثمرات، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دیوبند کا مدرسہ اسلامیہ ہی اکیلا دارالعلوم بن کر نہ رہ گیا، بلکہ حکمتوں پر مبنی اس نظام کے کامیاب تجربہ نے کثیر تعداد میں مدارس قائم کرادیئے، جس کے نتیجے میں لوگوں کے عقیدے بھی محفوظ ہوگئے اور اخلاق واعمال کی اصلاح بھی ہوئی، پھر مدارس اور علماء میں تلازم کی وجہ سے مدارس بھی بڑھتے گئے اور علماء کی تعداد بھی روز افزوں ہوتی رہی، ان علمانے محض درس وتدریس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بے شمار دینی علمی کتابیں تصنیف کیں جس سے علم محفوظ بھی ہوا اور شائع بھی۔

نانوتوی نظام کی مقبولیت

اور اب تو حالت یہ ہے کہ صرف ہندوستان میں ہی اس کثرت سے مدارس قائم ہیں کہ ان کی تعداد کوئی بھی بتلا نہیں سکتا، پھر اس سلسلہ نے وہ قبولیت اور وسعت حاصل کی کہ برصغیر ہی نہیں بلکہ افریقہ، یورپ، برطانیہ اور امریکہ تک میں اسی نہج پر علماء وعوام نے مدارس قائم کردیئے جو نہایت مضبوط پیانہ پر خدمتِ دین وعلم کررہے ہیں، بلکہ مسلک ومشرب کے اختلاف کی دیواریں بھی اس نہج کی قبولیت کو نہ روک سکیں، سب ہی نے اس نظام کو اپنایا خواہ اس کا احساس واعتراف کریں یا نہ کریں۔

بہرحال ہندوستان میں گوری تہذیب واقتدار نے جس عالمی تخریب کو یہاں مسلط کیا تھا اس کا دفاع اور مقابلہ اس انداز میں کیا گیا کہ اسے اپنے ارادوں میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔

دارالعلوم دیوبند اور اس تحریری وتقریری جدوجہد نے جو نتائج برآمد کئے تھے اس سے ایک طرف لوگوں کے عقائد میں پختگی آئی تھی جس کی وجہ سے نصرانیت اپنے بال وپر نہ پھیلاسکی اور پادریوں کو ناکامی ہی دیکھنے کو ملی، دوسری طرف اخلاق واعمال درست ہوئے، تیسری طرف جذبہ جہاد اور استخلاص وطن کے فکر کی آبیاری ہوئی، تحریک آزادی اور اس کے لئے ہمہ قسم کی قربانیاں دی گئیں، آخر کار ہندوستان آزاد ہوا، پھر تو دنیا شاہد ہے کہ جس برطانوی اقتدار کی وسعتوں کا حال یہ تھا کہ

سورج تمام علاقوں میں سے کسی نہ کسی جگہ چمکتا ہی رہتا تھا وہ اقتدار سمٹ کر صرف انگلینڈ میں محدود ہوکر رہ گیا: وتلك الايام نداولها بين الناس.

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، دورِ صحابہ کے بعد سے چودہ صدیوں میں محدثین ومفسرین فقہاء ومورخین اور دیگر علوم اسلامیہ کے اندر لاتعداد مسلم ماہرین گزرے اور ان سب نے علوم نبویہ کی جس طرح خدمت انجام دی ہے ان کی افادیت وعظمت لازوال ہے، حدیث پاک ان الله يبعث لهذه الامة على رأس كل مائة سنة من يجدد لها دينها . کے مطابق ہر صدی میں مجددین بھی یقیناً گزرے ہیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں جو کارنامہ تحریک دیوبند کے توسط سے انجام پذیر ہوا اسے بلاشبہ ہم اس صدی کا تجدیدی کارنامہ کہہ سکتے ہیں۔ (لیکن اسی کے ساتھ یہ ناقابل انکار حقیقت بھی ہے کہ حدیث کے باب میں اولیت کے لحاظ سے امام زہری اور حجیت کے لحاظ سے امام بخاری اور فقہ کے میدان میں بہر لحاظ امام ابوحنیفہ امام الائمہ ہوئے ہیں)

شاہ ولی اللہ کا تجدیدی کارنامہ

اس کے تحت دیکھا جائے تو حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کی شخصیت اور خدمات اس بات کو باور کراتی ہیں کہ وہ اپنی صدی کے بلاشبہ عظیم مجدد ہوئے ہیں اور ان کے تجدیدی کام کے اثرات لازوال ہیں، حکمت شرعیہ میں ان کو امام تسلیم کیا ہی جاتا ہے، کتبِ حدیث کا ہندوستان میں تعارف اور پھر ان کو مروج کرنا بھی ان کا زبردست احسان ہے، لیکن ترجمہ قرآن کا جو شرف انھیں حاصل ہوا وہ اور کسی کو حاصل نہ ہوسکا۔ یہ ان کا ایسا زبردست کارنامہ ہے کہ امتِ مسلمہ خواہ وہ کسی بھی خطے میں ہو، کوئی بھی زمانہ ہو اور کسی بھی مسلک سے وابستہ ہو الامام ولی اللہ الدہلوی کے اس احسان سے سبکدوش نہیں ہوسکتی۔

تیرھویں صدی کا مجدد

حضرت شاہ صاحب کے بعد ماننا ہوگا کہ حضرت نانوتوی ہی کی شخصیت ایسی گزری ہے کہ ان کے کاموں کے اثرات رہتی دنیا تک تابندہ وپائندہ رہنے والے ہیں، بزرگوں میں سے کسی کا یہ قول منقول ہے کہ جماعت دیوبند من حیث الجماعت مجدد ہوئی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ جماعت کے لئے مجددیت کی راہ بنانے والی جو ذات تھی اس کو مجدد کیوں نہ سمجھا جائے۔

دیوبند ختم ہوگیا؟

۱۹۸۱ء میں جو کچھ دیوبند میں ہوا اکثر لوگ اس کے حوالہ سے یہ لفظ بولتے ہیں کہ دیوبند تو ختم ہوگیا... ظاہر ہے کہ ایسا کہنے والوں کی مراد دیوبند بستی نہیں ہے، وہ یہ لفظ لازماً دارالعلوم کے بارے میں بولتے ہیں جو دیوبند میں ہے، مگر میں گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ دارالعلوم ایک مدرسہ کا نام تو نہیں ہے، وہ تو تعلیم واصلاح کے باب میں ایک انقلابی عالمی تحریک ہے، دیوبند میں واقع مدرسہ اس کی اولین شکل ہے۔ دیوبند کی یہ تحریک اگر صرف دیوبند کے اندر محدود ہوتی اور اس پر آئی ہوئی افتاد کے بعد یہ الفاظ کہے جاتے تو شاید درست ہوجاتا مگر دیوبند تحریک جب عالمی ہے کہ بے شمار مدارس، لاکھوں کتابیں اور ہزاروں علماء دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور وہ اس مقصد کی آج بھی تکمیل کر رہے ہیں تو دیوبند ختم کیسے ہوگیا؟

دیوبند کا کام تا ابد

مثلاً ہندوستان میں فقہ اکیڈمی نے جس طرح علماء موجودین کو اپنی بہترین علمی وفقہی صلاحیتوں کے نہایت مفید مقصد میں استعمال کرنے کی راہ پر لگایا ہوا ہے اور مقصد اور کام کی وحدت نے جس طرح ان اہل علم کی شیرازہ بندی کی ہوئی ہے یہ دیوبند تحریک کا زندہ کارنامہ ہی تو ہے، اور کون جانے ابھی مزید کیا ہوتا رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ دیوبند تحریک بے شمار علمی ودینی تحریکات کی موجد اور مجدد ہے اور حضرت نانوتوی کا کارنامہ کسی بھی مجدد وقت سے ہرگز کم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس تحریک کو مزید بارآور کرے اور حضرت نانوتوی کو بہترین جزا دے اور ان کے علوم سے مستفید ہونے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

☆......☆......☆
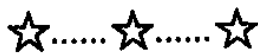
ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی *

الامام محمد قاسم النانوتوی کی تصنیفات
ایک مختصر جائزہ

حضرت الامام محمد قاسم نانوتوی نے مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ آپ کا انداز بیان جدا ہے، بحث کا انداز عالمانہ اور محققانہ ہے لیکن علم کلام کی گہری چھاپ ہے، اس لئے زیر بحث موضوع اور علم کلام سے واقفیت کے بغیر آپ کی بہت سی تحریروں کو سمجھنا آسان نہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے آپ کی اکثر تصانیف اور مکتوبات اردو میں ہیں لیکن وہ آج کی اردو سے بہت مختلف ہے، دور حاضر میں اردو کے سہل سے سہل تر رجحان کی وجہ سے ایک سو سال پرانی قدیم زبان تقریباً متروک ہو چکی ہے بلکہ بہت سے لوگ اس سے نا آشنا ہو گئے ہیں اس لئے حضرت نانوتوی کی زبان اور اس میں جابجا علم کلام کی اصطلاحات اور مخصوص الفاظ کی وجہ سے آپ کی بہت سی عبارتوں کا مطلب سمجھنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

حضرت نانوتوی کی تصنیفات کا ایک بڑا حصہ شائع بھی ہو گیا ہے جن کے نام حجۃ الاسلام، تحفۂ لحمیہ، جواب ترکی بترکی یا براہین قاسمیہ، قبلہ نما، تقریر دل پذیر، آب حیات اور رسائل میں ہدیۃ الشیعہ اور توثیق الکلام وغیرہ ہیں۔

آپ کی دوسری تحریروں کا تعلق مکتوبات سے ہے...... لیکن آپ کے یہ مکتوبات رسمی خطوط نہیں بلکہ اس زمانے میں آپ سے جو مسائل دریافت کئے گئے آپ نے ان کا علمی و تحقیقی جواب دیا جو چھوٹے بڑے مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان مکتوبات کا موضوع: سماع موتی، زیارت قبور، نذر لغیر اللہ، مسئلہ علم غیب، سنت وبدعت، شیعوں کا اسلام، اہل بیت پر رونا، شفاعت اہل بیت، فدک کا

---

* لکچرر شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مسئلہ، یزید کا کفر وایمان، حیات نبویؐ کی حقیقت، سرسید اور ان کے عقائد، تعداد رکعات تراویح، قرأت خلف الامام وغیرہ ہیں۔ حضرت نانوتوی نے ان سوالات پر نہایت مدلل اور تشفی بخش جوابات لکھے۔

جبکہ آپ کی مستقل تصنیفات کا موضوع ردِّ عیسائیت اور ہندو مذہب اور ان کے مقابلہ میں اسلام کی حقانیت ہے۔ اس باب میں اہم موضوعات وجود باری تعالیٰ، توحید، صفات باری تعالیٰ، عقیدۂ تثلیث و آواگون واوتار کارد، انبیاء کی ضرورت، دین محمدی کے بعد دوسری تمام شریعتوں کی منسوخی، معراج، معجزات نبوی، بیت اللہ بحیثیت قبلہ، حدوث عالم، ثبوت عالم برزخ، جنت دوزخ، ملائکہ اور شیاطین کا وجود، روح کی حقیقت، تقدیر، جانوروں کی حلت وحرمت، مردے کو دفن کرنا اور جلانے کے فائدے ونقصانات وغیرہ۔ ان سب چیزوں کو ایسے عقلی اور منطقی انداز میں ثابت کیا گیا کہ کسی کو انکار کی گنجائش نہیں ہوسکتی، انداز بیان کچھ اس طرح ہے کہ کسی بات کو ثابت کرنے سے پہلے بالعموم ایسا مقدمہ وتمہید بیان کرتے ہیں جو مشاہدات اور روزمرہ کے حالات کے روشنی میں مرتب ہوتا ہے پھر جب نتیجہ نکلتا ہے تو فریق مخالف کے لئے راہ فرار باقی نہیں رہتی۔ یعنی جب صغریٰ کبریٰ کو تسلیم کرلیا تو نتیجہ سے کیسے انکار ہوسکتا ہے۔ جیسے ایک جگہ آپ اثبات قیامت کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ:

''جو اشیا مختلف الاغراض چیزوں سے مرکب ہوا کرتی ہیں جیسے کھیتی کہ اس میں غلہ آدمیوں کے لئے اور بھس گھاس جانوروں کے لئے تو ایسی چیزوں کو انجام کار توڑ پھوڑ کر جدا جدا کر کے اپنے اپنے ٹھکانے پر پہنچا دیتے ہیں اور اسی کے مناسب اس کو کام میں لاتے ہیں مثلاً کھیتی کو ایک روز کاٹ چھانٹ، توڑ پھوڑ کر بھس اور غلہ کو جدا جدا کر کے بھس کو کوپوں میں اکٹھا کر دیتے ہیں اور غلہ کو کوٹھیوں اور برتنوں وغیرہ میں جمع کر لیتے ہیں اور اس کو وقتاً فوقتاً جانوروں کو کھلاتے رہتے ہیں اور غلہ کو بقدر ضرورت آپ کھاتے رہتے ہیں، پر اپنے کھانے میں بھی یہ تفریق کہ چھان پچھوڑ کر اچھے اچھے غلہ کو اپنے لئے رکھتے ہیں اور ناقص کو خدام اور شاگرد پیشوں اور جانوروں کو کھلاتے ہیں۔ غور سے دیکھا تو اس عالم اجسام کو بھی مختلف الاغراض اجزاء سے بنا ہوا پایا، چنانچہ اس کے ہر ہر رکن اور ہر ہر طبقہ سے نمایاں ہے کہ یہ اور کام کا وہ اور کام کا، اس میں کچھ خاصیت، اُس میں کچھ، زمین کی کچھ خوبیاں اور پانی کے کچھ دوسرے فوائد۔ مجموعۂ عالم کو دیکھئے تو ایسا لگتا ہے جیسے آدمی یا کسی جانور کا جسم ہو، جیسے گوشت ودست وپا وغیرہ جدا جدا کام کے ہیں ایسے ہی اس مجموعہ

عالم میں زمین وآسمان وغیرہ ارکان جدا جدا مصرف کے ہیں، جیسے اس جسم خاکی میں عناصر اربعہ (آگ، ہوا، پانی، مٹی) کی جدا جدا خاصیت ہے ایسے ہی اس عالم ناپائیدار میں علویات اور سفلیات کی جدا جدا طبیعت اور خواہشات نفسانی کی جدا جدا تاثیر ہے، جسم خاکی میں اگر کسی خلط کے غلبہ کے باعث مزاج اصلی میں تغیر آجاتا ہے تو اس کا نام مرض ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے اگر روح کو جسم سے مفارقت کرنی پڑے تو اس کا نام موت ہے، ایسے ہی اس عالم ناپائیدار میں کسی رُکن جس کا مجموعۂ عالم کی ترکیب میں دخل ہے اگر ترکیب اصل میں فرق آجائے اور کوئی کیفیت تازہ ظہور میں آئے تو اس کا نام علامات قیامت ہے، اگر اس مجموعہ سے مفارقت کا اتفاق ہوجائے تو اس کا نام قیامت ہے اور پھر جس طرح انسان کا جسم مرنے کے بعد اس کے مختلف عناصر اپنی اپنی اصل سے جا ملتے ہیں یعنی حرارت آگ سے، رطوبت پانی کے ساتھ اور ہوا ہوا کے ساتھ اور خاک خاک کے ساتھ، اسی طرح ایک وقت آئے گا مجموعہ عالم بھی جسم انسانی کے مانند ایک ایک جز الگ ہوکر اپنی اصل کے ساتھ مل جائے گا یعنی مٹی مٹی میں اور پانی پانی میں، حرارت آگ میں وغیرہ وغیرہ۔ اسی کا نام قیامت ہے۔"

حضرت نانوتوی کی کم وبیش تمام تحریروں کا یہی انداز ہے، آپ کی تصنیفات اور مکتوبات پڑھنے کے بعد علوم شریعہ کے بہت سے اسرار وحکم تک رسائی ہوتی ہے اور عقل بھی ان کی تائید کرتی ہے ذیل میں آپ کی تصنیفات ومکتوبات کا اجمالی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

حجۃ الاسلام

کتب خانہ اعزازیہ دیوبند نے اسے شائع کیا، ۴۸ صفحات پر مشتمل ہے لیکن دریا بکوزہ ہے۔ اس تحریر کا پس منظر یہ ہے کہ ضلع شاہجہانپور میں ایک جلسہ بنام میلہ خداشناسی ہونا طے پایا اور اطراف وجوانب میں اس مضمون کے اشتہار بھجوا کر ہر مذہب کے علماء کو اپنے اپنے مذہب پر تقریر کے لئے دعوت دی گئی، حضرت نانوتوی کو اسلام کے نمائندے اور وکیل کی حیثیت سے شرکت کی دعوت دی گئی۔ چونکہ پہلے سے یہ امر بالکل نامعلوم تھا کہ مباحثہ کا موضوع کیا ہوگا اور یہ کہ اعتراضات و جوابات کی نوبت آئے گی یا زبانی ہی اپنے اپنے مذہب کی حقانیت ہر کسی کو پیش کرنی پڑے گی تو اس نظریہ کے تحت حضرت نانوتوی کے دل میں خیال آیا کہ ایک تحریر لکھ لی جائے جو اصول اسلام وفروع

ضروریہ پر مشتمل ہو۔ چونکہ وقت بہت تنگ تھا اس لئے نہایت عجلت کے ساتھ بیٹھ کر ایک تحریر منضبط فرمالی، لیکن مباحثہ میں اس تقریر کو پڑھ کر سنانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ حضرت نانوتوی جب شاہجہانپور سے واپس آئے تو خدام کے کہنے سے اسے طبع کرنے کو دے دیا، حضرت مولانا فخر الحسن نے اس کے مضامین کے لحاظ سے اس کا نام حجۃ الاسلام تجویز فرمایا اور شائع کردیا۔ اس تحریر میں آپ نے جن باتوں کا جائزہ لیا ان میں انسان کی تخلیق کا مقصد، توحید، رسالت، عقیدۂ تثلیث کی تردید، ثبوت تقدیر، حدوث عالم، استقبال قبلہ، نماز میں قیام، رکوع، سجدہ کی مصلحت، زکوٰۃ، روزہ حج کی حقیقت، عصمت انبیاء، معجزات، قرآن کی فصاحت و بلاغت، ختم نبوت، قرآن میں نسخ کی وجہ، نبی آخر الزماں کی فضیلت اور آخر میں حلت گوشت کے مسئلہ سے بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ گوشت کھانا انسان کی فطرت ہے۔

انتصار الاسلام

یہ کتاب باضافہ شرح و مطالب مولانا محمد میاں دیوبندی ۹۶ صفحات پر مشتمل ہے، مطبع قاسمی دیوبند نے اسے شائع کیا، یہ کتاب وفات سے دو سال قبل ۱۲۹۵ھ میں تصنیف کی گئی، انتصار الاسلام رسالہ کا نام آپ کے شاگرد خاص حضرت مولانا فخر الحسن گنگوہی نے تجویز کیا۔ یہ رسالہ آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی کے ان سوالوں کے جوابات میں لکھا گیا جو انہوں نے اسلام اور مسلمانوں پر لگائے تھے۔ حضرت نانوتوی نے جلسۂ عام میں ان الزامات کی تردید کی اور اعتراضات کے جوابات قلمبند بھی کرادیے۔ اس کتاب میں جن اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے ان میں: ذات باری تعالیٰ، شیطان، جن اور فرشتوں کا وجود، بہشت، دوزخ کا وجود، جنت میں شراب طہور کی حقیقت، احکام خداوندی میں نسخ، مردہ کو دفنانا، روح، عالم برزخ، جانوروں کی حلت و حرمت، توبہ سے گناہ معاف ہونے جیسے مضامین ہیں۔ پنڈت دیانند کے گیارہ اعتراضات تھے، حضرت نانوتوی نے ایک ایک کرکے تمام سوالوں اور الزامات کے جوابات نوٹ کرادیئے اور پھر اسے عوام کے فائدہ کی خاطر شائع کردیا گیا۔

تحفۂ لحمیہ

یہ پندرہ صفحات پر مشتمل رسالہ ہے، مطبع قاسمی دیوبند نے اسے شائع کیا، یہ رسالہ ہندوؤں

کے ایک اعتراض کے رد میں لکھا گیا، اعتراض یہ تھا کہ جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہے اور ظلم ہر ملت ومذہب میں ممنوع ہے۔ حضرت نانوتوی نے اس رسالہ میں ان کے اس اعتراض کا مدلل جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر گوشت خوری اور جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہوتا تو ساری دنیا کے ملکوں میں گوشت خوری عام نہ ہوتی اور دنیا کے اطباء وحکماء ضرور منع کرتے، دنیا میں صرف ایک ہندوستان ہے جس میں ہندو قوم بستی ہے، تنہا وہی اس کو ظلم کہتی ہے، بقیہ دنیا کے تمام ممالک میں اس پر کوئی پابندی نہیں، خود ہندوؤں میں بعض جانوروں کو کھایا جاتا ہے اور بعض کو بطور نذر دیوی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھایا جاتا ہے، اگر تمام جانوروں کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا ظلم ہوتا تو ہندو ایسا کیوں کرتے ہیں۔ دوم یہ کہ اگر جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہے تو ہندو ان کی کھال کے جوتے چپل کیوں پہنتے ہیں۔ سوم یہ کہ اگر جانوروں کو ذبح کرنا ظلم ہے تو ان پر سواری کرنا، بوجھ لادنا، انہیں قید کرنا بھی ظلم ہے، اسی طرح اگر جانوروں کو ذبح کرنا گناہ کبیرہ ہے تو ان کو مارنا پیٹنا ثواب کا کام نہیں۔

جواب ترکی بہ ترکی

۵۹ صفحہ کے اس رسالہ کو مطبع قاسمی دیوبند نے شائع کیا ہے، یہ رسالہ آریہ سماج کے رسالہ ''آریہ سماچار'' میرٹھ کے اٹھائے ہوئے اعتراضات کے جواب میں ہے۔ ان دنوں حضرت نانوتوی کی صحت اس قابل نہیں تھی کہ وہ قلم سے کچھ لکھ سکیں، اس لئے آپ سوالوں کے جواب بتاتے گئے اور آپ کے شاگرد حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھی نے انہیں لکھ کر مضامین کی شکل میں ترتیب دیا۔ الفاظ مولانا میرٹھی کے ہیں لیکن متکلمانہ دلائل، منطقیانہ مقدمات کی ترتیب حضرت نانوتوی کا فیضان علم ہے۔ اس کے بنیادی مباحث میں باری تعالیٰ اس کا وجود اور اس کی صفات، علم، ارادہ، قدرت وغیرہ کی تفصیل ہے پھر مادہ قدیم ہونے کی تردید پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔ آخر کتاب میں قرآن کو کلام اللہ اور دوسری کتب سماویہ کو کتاب اللہ ثابت کیا گیا ہے اور سب سے آخر میں انبیاء کی ضرورت، ان کی حیثیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاتم النبیین ہونے کی دلائل اور خاتمیت کے مفہوم کی مکمل وضاحت کی گئی ہے۔ کتاب اردو میں ہونے کے باوجود چونکہ کلامی مباحث اور منطقیانہ طرز استدلال سے پُر ہے ایک ایک موضوع کے تحت شاخ در شاخ بحثیں ہیں۔ پوری کتاب مسلسل مضمون کی شکل میں ہے، اس میں نہ کہیں ابواب وفصول ہیں اور نہ کہیں فل اسٹاپ اور پیراگراف

وغیرہ، اس لئے عام آدمی کے لئے اس سے استفادہ ممکن نہیں۔ اس لئے اس کتاب کی تسہیل کی ضرورت تھی جسے استاذ دارالعلوم مولانا اشتیاق احمد صاحب نے پوری کردی اور اسے براہین قاسمیہ کے نام سے شائع کیا۔

قبلہ نما

اس کتاب کی ضخامت ۱۰۴ صفحات ہے، کتب خانہ اعزازیہ دیوبند نے اسے شائع کیا۔ یہ کتاب دراصل حضرت نانوتوی کی کتاب انتصار الاسلام کا دوسرا حصہ ہے۔ پنڈت دیانند سرسوتی کے اعتراضات میں ایک یہ تھا کہ مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں اور خود ایک مکان (بیت اللہ) کو سجدہ کرتے ہیں جس میں بہت سے پتھر ہیں۔ یہ کتاب اسی سوال کے جواب میں لکھی گئی۔ اس کتاب میں متکلمانہ انداز میں جواب دیا گیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ استقبال قبلہ اور بت پرستی میں زمین وآسمان کا فرق ہے، اول تو لفظ استقبال قبلہ اور لفظ بت پرستی ہی اس پر شاہد ہے کہ بت پرستی کو توجہ الی الکعبہ کے ساتھ کچھ نسبت نہیں۔ لفظ اول کا مفہوم فقط کعبہ کی طرف منھ ہو اور بت پرستی کا حاصل یہ ہے کہ بت معبود ہوں۔ دوسرے اہل اسلام کے نزدیک کعبہ کی طرف منھ ہونا چاہئے عبادت صرف خدا کی کی جاتی ہے کعبہ کی نہیں، اگر بالفرض وہ پتھر کی دیواریں منہدم ہوجائیں تب بھی نماز اسی کی طرف کو ادا کریں گے، لیکن بت پرستی میں مقصد ان بتوں کو پوجنا ہوتا ہے جو مندروں میں رکھے ہوئے ہیں، اگر مندر سے بتوں کو اٹھا کر کہیں اور رکھ دیں تو پھر بت پرستی کے سارے فرائض وہیں پر ادا ہونے لگتے ہیں مکان اول کو کوئی نہیں پوچھتا۔

اہل اسلام خانہ کعبہ کو بیت اللہ کہتے ہیں اللہ نہیں کہتے اور ظاہر ہے کہ کوئی شخص اگر کسی مکان کی طرف جاتا ہے تو مکین مقصود ہوتا ہے مکان نہیں، اسی پر استقبال قبلہ کو قیاس کرلیجئے۔ بت پرست اپنے بتوں کو خانۂ خدا نہیں بلکہ مہادیو اور گنیش وغیرہ خیال کرتے ہیں، اس لئے بیت اللہ کی طرف کو منھ کرکے نماز ادا کرنا دوسری بات ہے اور بت پرستی اور چیز ہے اور یہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں۔

تقریر دل پذیر

اس کتاب کی ضخامت ۳۲۸ صفحات ہے، مطبع قاسمی دیوبند نے اسے شائع کیا۔ حضرت نانوتوی نے یہ کتاب دعوت اسلام کے نقطہ نظر سے تصنیف کی۔ کتاب میں جن موضوعات پر بحث کی

گئی ہے ان میں وجود باری تعالیٰ، توحید، ابطال تثلیث و اصنام پرستی، انجیل کا محرف ہونا، بندوں کے افعال کا خالق اللہ ہے، نیز حدوث عالم، جنت، دوزخ، ملائکہ وشیاطین کے وجود کو ثابت کیا گیا ہے، مسئلہ تقدیر، آسمانی شرائع میں نسخ کی وجہ، حسن وقبح اعمال، ضرورت نبوت، صفات الٰہی، جزء لایتجزیٰ کی بحث اور قیامت کے متعلق تفصیلی بحث ہے۔

آب حیات

حضرت نانوتوی کی یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ حضرت شیخ الہند نے فرمایا کہ میں نے اسے حضرت نانوتوی سے سبقاً سبقاً پڑھی ہے۔ کتاب کا موضوع حیات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ حضرت نانوتوی کے عہد میں چونکہ شیعی جراثیم ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اس لئے حضرت نانوتوی سے شیعوں کی روایتوں کے متعلق سوالات کئے جاتے تھے، حضرت نانوتوی ان سوالوں کے بڑی تفصیل سے جوابات لکھتے تھے۔ آب حیات لکھنے کا خیال اس وقت پیدا ہوا جب آپ نے ''ہدیۃ الشیعہ'' لکھی جس میں مسئلہ فدک اور خلفاء راشدین پر شیعوں کے الزامات کو موضوع بنایا۔ آپ نے ''آب حیات'' میں یہ ثابت کیا کہ آپ قبر میں حیات ہیں اور چونکہ زندہ شخص کے مال میں وراثت نہیں جاری ہوتی اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوسکتی۔ وراثت کا مسئلہ اس وقت اٹھتا ہے جب مورث وفات پاجائے اور مورث جب تک زندہ ہے مال اس کی ملکیت سے نہیں نکلتا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قبر میں حیات ہیں اور اسی لئے ان کی ازواج مطہرات سے نکاح حرام ہے، لہٰذا آپؐ کے مال میں وراثت نہیں جاری ہوسکتی۔

اس کتاب میں بھی انداز بیان خالص فلسفیانہ اور متکلمانہ ہے اور دلائل شاخ در شاخ پھیلے ہوئے ہیں۔ پوری کتاب مسلسل مضمون کی شکل میں ہے، نہ کہیں ذیلی عنوانات اور نہ یہ پتہ لگتا ہے کہ بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم، کہاں پیراگراف شروع ہوا کہاں ختم، اس لئے مباحث سمجھنے میں انتہائی دشواری پیش آتی ہے۔

توثیق الکلام

یہ ۱۶ر صفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے، اس میں قرأۃ فاتحہ خلف الامام کا مشہور اور مختلف فیہ مسئلہ زیر بحث ہے۔ انداز بحث متکلمانہ ہے۔

مکتوبات

ان مذکورہ بالا کتب و رسائل کے علاوہ آپ کی دوسری تحریروں کا تعلق مکتوبات سے ہے جن میں آپ سے مسائل دریافت کیئے گئے آپ نے ان کا جواب دیا۔ یہ مکتوبات مستقل چھوٹے بڑے مضامین کی حیثیت رکھتے ہیں، مثال کے طور پر دہلی کے ایک بزرگ مولانا جمال الدین علوی نے حضرت نانوتوی سے وحدت الوجود اور سماع موتیٰ کے بارے میں استفسار کیا تھا کہ اس کی نوعیت کیا ہے۔ حضرت نانوتوی نے اس خط کا جواب لکھا جس میں حضرت نانوتوی نے بڑی تفصیل (لگ بھگ ۱۵ صفحات) میں ان دونوں باتوں کا جواب لکھا۔ پھر یہ رسالہ عام لوگوں کے فائدہ کے لئے ۱۲۹۵ھ میں سہارنپور سے شائع بھی ہوگیا اس کا نام ''جمال قاسمی'' رکھا۔

جمال قاسمی کی طرح کم از کم آٹھ مطبوعہ مجموعے موجود ہیں جن کے نام ''مکتوبات قاسمیہ''، ''فیوض قاسمیہ''، ''لطائف قاسمیہ''، ''الحق الصریح''، ''تحذیر الناس''، ''اسرارِ قرآنی'' اور ''فرائد قاسمیہ'' ہیں۔ ان مجموعے یا مکتوبات میں زیارت قبور، نذر لغیر اللہ، مسئلہ علم غیب، سنت و بدعت، شیعوں کا اسلام، اہل بیت پر رونا، شفاعت اہل بیت، فدک کا مسئلہ، یزید کا کفر و ایمان، نفس کی حقیقت، تعداد رکعاتِ تراویح، قرأت فاتحہ خلف الامام اور ان جیسے دوسرے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ ان سوالوں کے نہایت مدلل اور تشفی بخش جوابات دیئے گئے ہیں۔

ان کے علاوہ حضرت نانوتوی کا ایک مکتوب ''تصفیۃ العقائد'' کے نام سے ہے جو ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے، کتب خانہ اعزازیہ دیوبند نے اسے شائع کیا۔ حضرت کا یہ مکتوب سرسید احمد خاں کے عقائد و خیالات کے تعلق سے ہے۔ اس مکتوب کا پس منظر یہ ہے کہ ایک بزرگ جنہیں حضرت نانوتوی نے ''پیر جی'' کے نام سے یاد کیا ہے، ان کی ملاقات حضرت نانوتوی سے انبہٹہ میں ہوئی۔ واضح رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ڈپٹی امداد علی اکبر آبادی اور گورکھپور کے جج علی بخش بدایونی نے سرسید کے خلاف طوفان اٹھا رکھا تھا۔ دونوں کی ملاقات کا موضوع سرسید تھے یہ دونوں بزرگ اس ہنگامے سے خوش نہیں تھے اس لئے گفتگو زیادہ تر سرسید کے بارے میں ہمدردانہ تھی اور چاہ رہے تھے کہ جن عقائد کی نسبت سرسید کی جانب کی جارہی ہے ان سے وہ کنارہ کشی کرلیں اس لئے ان بزرگ یعنی پیر جی نے سرسید کو خط لکھا کہ حضرت نانوتوی آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ سرسید نے اس خط کا جواب

لکھا اور اپنے عقائد کی اس خط میں وضاحت کی جو لگ بھگ ۵ اشقوں میں تھے۔ یہ خط حضرت نانوتوی کے پاس پہنچا، حضرت نانوتوی نے ایک ایک کر کے ان کے عقائد و خیالات کا تفصیلی جواب دیا۔ واضح رہے کہ سرسید کے خط میں جو انہوں نے اپنے عقائد لکھے ہیں وہ بالکل وہی تھے جو اہل اسلام کے ہوتے ہیں۔ حضرت نانوتوی کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرسید کے خیالات سے اچھی طرح واقف تھے، انہوں نے اُنہیں باتوں کے پیش نظر جوابات لکھے۔ آپ نے لکھا کہ کلام خداوندی اور کلام نبوی حقیقت کے خلاف نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی چیز مخالف کلام اللہ اور احادیث صحیحہ ہو تو کلام اللہ اور حدیث نبوی سے اس کی تغلیط کر دیں گے۔ غرض یہ کہ کلام اللہ اور حدیث کو اصل مقرر کر کے دلائل عقلیہ کو اس پر منطبق کریں گے اگر کھینچ کھانچ کر بھی مطابق آجائے فبھا ورنہ قصور عقلی سمجھیں، یہ نہ ہو کہ اپنے خیالات و اوہام کو اصل سمجھیں اور کلام اللہ اور حدیث کو کھینچ تان کر اس پر مطابق کریں...... اس طرح سرسید کے تحریر کردہ پندرہ اصولوں کی تشریح کر کے جہاں جہاں سے کجروی کی راہیں اور گمراہی کے راستے نکل سکتے تھے ان سب کی آپ نے نشاندہی فرمائی۔

خلاصہ

حضرت نانوتوی کی تصنیفات اور مکتوبات پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا انداز بیان بالکل برجستہ اور بے تکلفانہ ہے، اس میں کوئی بناوٹ اور تصنع نہیں اور نہ ہی ان میں دوسروں کی تصانیف سے کوئی استفادہ کیا گیا بلکہ جیسے جو خیال آیا اس کو اسی طرح ضبط کر لیا گیا یا املا کرا دیا، اس پر نظر ثانی کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ چونکہ حضرت نانوتوی کا مشن دشمنان اسلام کے خلاف اسلام کا دفاع تھا اس لئے جہاں تقریر کی ضرورت پیش آئی وہاں تقریر اور جہاں تحریر کی ضرورت پیش آئی وہاں تحریر سے کام لیا۔ تصنیف آپ کا پیشہ نہ تھا بلکہ اسے آپ نے ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

آپ کی اکثر و بیشتر تصانیف اگرچہ اردو میں ہیں تاہم آج عام آدمی کے لئے انھیں سمجھنا مشکل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کی اردو اور سو سال قبل کی اردو میں بڑا فرق ہے اور یہ فرق نہ صرف اردو زبان کے ساتھ ہے بلکہ ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔

آپ کی تحریروں میں خاص بات علم کلام اور اس کی اصطلاحات اور اس کے مخصوص الفاظ کا بہت زیادہ استعمال ہے جو آج کل بالکل ہی متروک ہے جس کی وجہ سے آپ کی کتابوں کو سمجھنا مشکل

معلوم ہوتا ہے۔ آج علم کلام کا زمانہ نہیں۔ اس کے پڑھنے اور سمجھنے والے شاذ و نادر ہی ہیں لیکن اس زمانے میں یہ ایک ناگزیر چیز تھی۔ حضرت نانوتوی خود فرمایا کرتے تھے کہ آج دین کا تحفظ علم معقول کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت کی کتابوں کو سمجھنے میں دشواری کی ایک وجہ علم کلام سے ناواقفیت ہے۔ اس کے علاوہ بعض مرتبہ زیر بحث مسئلہ کی ناقص معلومات بھی عبارت سمجھنے میں پریشانی کا باعث ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر حضرت کا ایک مکتوب مسئلہ وحدت الشہود اور وحدت الوجود سے متعلق ہے، قاری کو جب تک علم کلام کے ساتھ اس مسئلہ کی بنیادی معلومات نہ ہوں اس وقت تک حضرت نانوتوی کی عبارت اور اس کا فن کمال سمجھ ہی میں نہیں آسکتا۔

جہاں تک آج کے دور میں آپ کی تحریروں کی افادیت کی بات ہے حضرت کی کتابیں آج کے عقلی و مادی دور میں جہاں ہر بات کو عقل کی کسوٹی پر جانچا اور پرکھا جاتا ہے، نئی نسل اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے خاص طور پر مفید ہیں جو ہر بات کو عقل کی روشنی میں دیکھنے اور سمجھنے کے عادی ہیں۔ وہیں دوسری طرف آپ کی تحریروں میں بکھرے ہوئے شریعت کے اسرار و حکم خواص کے لئے بھی مفید ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ حضرت کی کتابوں کی تسہیل کر کے عوام کے سامنے لایا جائے تاکہ عام و خاص اس سے مستفید ہوں۔

ماخذ

۱۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی، حیات و کارنامے، مولانا اسیر ادروی، شیخ الہند اکیڈمی، دارالعلوم ۱۹۹۷ء
۲۔ سوانح قاسمی، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی، دارالعلوم دیوبند، ۱۳۷۵ھ
۳۔ تاریخ دیوبند، سید محبوب رضوی، ادارہ تاریخ، دیوبند
۴۔ انتصار الاسلام، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مطبع قاسمی، دیوبند
۵۔ جواب ترکی بترکی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مطبع قاسمی، دیوبند
۶۔ تحفہ لحمیہ، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مطبع قاسمی، دیوبند
۷۔ تقریر دل پذیر، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، مطبع قاسمی، دیوبند
۸۔ تصفیۃ العقائد، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
۹۔ قبلہ نما، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
۱۰۔ حجۃ الاسلام، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، کتب خانہ اعزازیہ، دیوبند
۱۱۔ جمال قاسمی، حضرت مولانا قاسم نانوتوی، بلالی اسٹیم پریس ساڈھورہ، سہارنپور
۱۲۔ تاریخ دعوت و جہاد، عبید اللہ فہد، ہندوستان پبلیکشر، دہلی ۱۹۸۴ء

مولانا عبدالقدوس رومی*

حضرت الامام الشیخ محمد قاسم النانوتوی الصدیقی قدس سرہ کا سلوک واحسان

واقعات وحالات کے آئینہ میں

ملا ہے دفتر تنظیم سے عجب عنوان سلوک حضرتِ قاسم لکھوں عیاں کردں احساں

تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے ذمہ داروں کا فرمان صادر ہوا کہ مجھے حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ سے متعلق مجوزہ تذکار قاسمی (سیمینار) کے لئے حضرت امام موصوف کے ''سلوک واحسان'' پرایک مقالہ تیار کرنا ہے۔

فرمائش پڑھ کر حیرت کی انتہا نہ رہی، بار بار سوچتا رہا کہ ہمارے ان کرم فرماؤں کو احقر سے متعلق یہ خوش فہمی کیسے ہوگئی کہ وہ یہ فرمائش ایک ایسے شخص سے کر بیٹھے جسے کوچہ ''سلوک واحسان'' اور راہ اخلاص وعرفان کی ہوا بھی تو نہیں لگی ہے، اس کی زندگی کا بیشتر حصہ جو آوارہ گردی سے محفوظ رہ سکا تھا وہ ''دیوبند سے بریلی'' تک کی سیاحی میں گزرا پھر کچھ ''تفہیم القرآن'' سمجھنے کی کوشش میں مصروف ہوا ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اب سے تقریباً نصف صدی قبل جب مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب غریق بحر رحمت نے اپنے وطن عزیز فتح پور تال نرجا (اعظم گڑھ) سے ہجرت نہیں فرمائی تھی اسی دور میں حضرت موصوف کی تعلیمات کی اشاعت کے لئے ایک ماہانہ رسالہ ''الاحسان'' نامی الہ آباد سے جاری کیا گیا تھا جس کی ادارت واشاعت کی ذمہ داری احقر کے سر تھی۔

ممکن ہے کہ ہمارے احباب تنظیم کو اسی رسالہ ''الاحسان'' کی نسبت سے کچھ غلط فہمی ہوگئی ہو، اس پرانی سرگذشت کو یہاں دہرانے سے مقصد صرف یہی اظہار حقیقت ہے کہ ذمہ داران تنظیم نے راقم آثم کے لئے جو عنوان تجویز فرمایا ہے اس کا پورا حق ادا کرنا تو بہت دور کی بات ہے اس کا تھوڑا حق

---

* مفتی شہر آگرہ (یوپی)

بھی ادا کر دینا احقر کے بس کی بات نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتی ہے کہ حضرت امام موصوف کی بلند و بالا شخصیت اس درجہ عظیم و عالی مقام تھی کہ حضرت قاری محمد طیب صاحب ؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند سوانح قاسمی کے مقدمہ میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند کی مختصر سوانح قاسمی کا تذکرہ فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''اس مختصر سوانح کا تذکرہ جب حضرت قطب وقت آیۃ من ایات اللہ مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی مجلس میں ہوا تو فرمایا کہ مولانا محمد قاسم کی سوانح مولانا محمد یعقوب کیا لکھ سکتے ہیں؟ دنیا میں اگر ان کی حقیقی سوانح حیات کوئی لکھ سکتا ہے تو وہ صرف میں ہوں، مگر میں کیا کروں آنکھوں سے معذور ہوں''(۱)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے مرتبہ شناس حقیقی حضرت گنگوہی قدس سرہ کے اس صریح وصاف اور واضح اعلان حقیقت کے بعد کس کی ہمت یہ جرأت و جسارت کر سکتی ہے کہ وہ حضرت امام موصوف کی ''سوانح'' نگاری کا ارادہ بھی کرے؟ راقم السطور ایسی جرأت و جسارت اپنے اندر تو پاتا نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ ہی ساتھ یہ اندیشہ و خطرہ بھی دامن گیر ہے کہ اگر حضرات اصحاب تنظیم کے اس ارشاد گرامی کی عدم تعمیل کو بھی احقر کی ناروا ''جسارت'' پر محمول کر لیا گیا تو کیا ہوگا؟ **این المفر من هذا الخطر؟**

ایسی صورت میں اس کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ سے عفو و درگذر کا طالب اور توفیق خیر رفیق کا خواہاں ہوتے ہوئے یوں دعا کی جائے کہ وہ اپنے فضل خاص سے زیردست وقلم اور بساط و طاقت سے باہر اس مضمون کی تکمیل آسان فرمادے اور اسے ملت مسلمہ کے لئے ذریعۂ اصلاح اور خود احقر کے لئے ذخیرۂ آخرت اور وسیلۂ مغفرت بنائے۔ آمین

اس ضروری و مختصر اعتذار آمیز تمہید کے بعد ''مقالۂ مجوزہ'' پیش خدمت کیا جا رہا ہے مگر اس سے پہلے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی ''یک نظری''، ''چند سطری'' سوانح بھی اگر اسی موقع پر دوسری بیش قیمت تحریرات کے ساتھ قلم بند و محفوظ ہو جائیں تو یقیناً ہر لحاظ سے ''برمحل'' ہی قرار پائے گی۔

یہ چند سطری، یک نظری ''سوانح'' احقر راقم السطور کو دیوبند سے شائع ہونے والی ایک

(۱) مقدمہ سوانح قاسمی: مولانا گیلانی ص: ۹ ج ۱۔

کتاب ''مکتوبات اکابر دیوبند'' میں دستیاب ہوئی ہے، اس کتاب کا مقدمہ حضرت مولانا مفتی نسیم احمد امروہوی علیہ الرحمہ نے لکھا ہے اور یہ سوانح اپنے اسی مقدمہ میں درج ذیل تمہید کے ساتھ نقل فرمائی ہے (یہ سوانح حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے بچپن کے ساتھی اور پھر آپ کے مسترشد حضرت شیخ ضیاء الحق عثمانی دیوبندی کی تحریر کردہ ہے جو انہوں نے اپنی ڈائری میں نوٹ فرما رکھی تھی۔ احقر رومی) مفتی امروہوی صاحب فرماتے ہیں:

مولانا ضیاء الحق عثمانی کی ایک ''بیاض'' سے حضرت مولانا نانوتوی کی مجمل ومختصر سوانح عمری پیش کرتا ہوں، واقعی کوزے میں دریا کو بند کیا گیا ہے۔ (وہ سوانح عمری ملاحظہ ہو)

مولانا محمد قاسم صاحب ۱۲۴۸ھ (۱۸۳۲ء) میں پیدا ہوئے، ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ء) میں بمقام دیوبند وفات پائی۔

آپ کی عمر پچاس سال چار ماہ چار یوم ہوئی۔ اور ایک روایت سے پونے اڑتالیس برس کی ہوئی (ناقل سطور احقر رومی عرض کرتا ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی عمر میں اختلاف کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، ایک وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ آپ کی تاریخ ولادت بقید تاریخ و ماہ محفوظ نہ رہ سکی تھی جیسا کہ مختصر سوانح قاسمی یعقوبی سے ظاہر ہوتا ہے، آپ کے تاریخی نام ''خورشید حسین'' کی وجہ سے صرف سن ولادت ہی محفوظ رہا اور دوسری وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ مجموعی عمر کی مدت ''انچاس سال چار ماہ چار یوم'' سن ہجری کے لحاظ سے متعین کی گئی ہے اور پونے اڑتالیس برس کی مدت سن عیسوی کے حساب سے بتائی گئی ہو۔

اور یہ عمر اس تفصیل سے بسر ہوئی (۱) نو سال والدین کے ناز ونعمت میں (۲) آٹھ سال تعلیم وتربیت میں (۳) آٹھ سال آزادی (تجرد) اور ذکر وشغل میں (۴) چوبیس سال ترقی اسلام و رفاہ مسلمین میں (یہ لطیفہ بھی خوب ہے کہ حضرات اہل حق اہل سنت وجماعت کو زبردستی 'وہابی' کا نام دیگران کے لئے جو تاریخی عدد چوبیس تجویز کیا گیا ہے قدرت کی نظر میں حضرت امام قدس سرہ کی یہی چوبیس سالہ خدمات دین واسلام ہندوستان میں اسلام کی ''نشأۃ ثانیہ'' کی بنیاد قرار پا گئیں۔ (رومی)

دنیا میں حضرت مولانا کا مشہور نام محمد قاسم، تاریخی نام ''خورشید حسین'' (۱۲۴۸ھ) تخلص

قاسم کنیت ''ابوالمساکین'' اور عالم ارواح میں شمس الاسلام ـــ اور مولانا مرحوم کے (ان ناموں سے) نامزد ہونے کی تفصیل اس طرح پر ہے:

عرفی (مشہور) نام (محمد قاسم) تو آپ کے باپ دادا سے ملا، تاریخی نام (خورشید حسین) اور تخلص (قاسم) بہ نفس نفیس تجویز فرمایا اور کنیت ''ابوالمساکین'' پیرومرشد حضرت حاجی امداداللہ صاحب چشتی کے حضور سے عطا ہوا اور شمس الاسلام سرکار ''احکم الحاکمین'' سے عنایت ہوا (سرکار احکم الحاکمین کی طرف سے ''شمس الاسلام'' کا لقب عالم ارواح میں دیئے جانے کی کوئی تفصیل تو خود مرتب سوانح مولانا ضیاء الحق عثمانی نے ذکر کی، نہ ہی ناقل سوانح حضرت مفتی نسیم احمد امروہوی نے کوئی ضرورت سمجھی حالانکہ اس کی ضرورت بہرحال تھی۔ احقر رومی)

مورخہ ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء یوم پنجشنبہ بوقت ایک بجے دن کے قبل الظہر ضیق النفس (دمہ) کی بیماری سے انتقال فرمایا (اناللہ وانا الیہ راجعون)

حضرت مولانا ضیاء الحق عثمانی علیہ الرحمہ کی اس یک نظری و چند سطری سوانح تو اوپر ملاحظہ میں آچکی اب انہیں بزرگوار کی مفصل سوانح قاسمی کے مسودہ کا حسرتناک وعبرتناک حشر بھی حضرت موصوف مفتی نسیم احمد امروہوی کی زبانی سن لیجئے، موصوف ؒ نے اس مفصل سوانح کا تذکرہ بھی اپنے اسی مقدمہ مذکور میں فرمایا ہے فرماتے ہیں:

> دفتری صاحب (یعنی نورالحق عثمانی جو مولانا ضیاء الحق عثمانی کے صاحبزادے تھے اور مولانا ضیاء الحق عثمانی حضرت حاجی رفیع الدین صاحب دیوبندی کے داماد تھے) کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ ان کے والد ماجد مولانا ضیاء الحق عثمانی نے حضرت ''قاسم المعارف'' کی مفصل سوانح عمری لکھی تھی احقر نے اس کے مطالعہ کی انتہائی کوشش کی، دفتری صاحب ہی سے معلوم ہوا وہ ان کے کسی عزیز کے پاس ہے، گذشتہ سال (یعنی ۱۳۷۷ھ) انھوں نے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ وہ سوانح عمری دارالعلوم دیوبند کے ایک اعلیٰ ذمہ دار شخص نے لے کر تلف کردی۔[۲] اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس المناک واقعہ کا نہ صرف عبرتناک بلکہ دردناک یہ پہلو خاص طور پر قابل غور ہے کہ آخر اس مفصل سوانح عمری میں ایسی کیا بات تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے ایک اعلیٰ ذمہ دار شخص نے اسے تلف

(۲) مکتوبات اکابر دیوبند ص: ۱۵

کر دینا ہی ضروری سمجھا یا کیا درپردہ اس کی وجہ یہ تو نہیں تھی کہ اس سے چند ہی سال قبل یعنی ۱۳۷۳ھ میں حضرت مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی علیہ الرحمہ کی ''سوانح قاسمی'' دارالعلوم دیوبند کی طرف سے شائع ہو چکی تھی جس کے مصنف حضرت مولانا گیلانی صاحب سوانح قدس سرہ کے نہ تو معاصر تھے نہ ہی مندرج واقعات وحالات کے چشم دید گواہ تھے اور اس کے برخلاف اس تلف شدہ سوانح کے مصنف حضرت امام نانوتوی کے معاصر، بچپن کے ساتھی ہونے کے ساتھ حضرت امام کے مسترشد و مکتوب الیہ بھی رہے تھے جن کے نام حضرت امام نانوتوی کے بعض مکاتیب ''مکتوبات اکابر دیوبند'' کے زیر نظر مجموعہ میں شامل ہیں۔

شبہ ہوتا ہے کہ اس مسودہ کے تلف کرنے میں ممکن ہے کچھ کاروباری جذبہ شامل ہو گیا ہو اور یہ خیال کر لیا گیا ہو کہ اس مسودہ کی اشاعت ہو جانے سے دارالعلوم دیوبند سے شائع ہونے والی سوانح قاسمی (مولانا گیلانی) کی مقبولیت واشاعت متاثر ہو سکتی ہے اس لئے اسے تلف کر دینا ہی بہتر ہے۔

حقیقت حال کا علم تو صرف عالم حقیقی ہی کو ہے محض ظن وتخمین سے کوئی متعین بات کہی بھی نہیں جا سکتی تاہم اس حقیقت کا اظہار تو شاید کسی طرح بھی ناروا اور بیجا نہ ہوگا کہ وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن ایسے اہم مسودہ کا ضیاع ''تاریخ قاسمی'' سے متعلق ناقابل فراموش سانحہ ہے۔

سوانح قاسمی (مصنفہ حضرت مولانا گیلانی) کے مقدمہ میں مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم علیہ الرحمہ نے بھی اس مسودہ کے علاوہ بعض دوسرے چند مسودات سوانح قاسمی کا ذکر فرمایا ہے ان تفصیلات کو نظر میں رکھنے سے اندازہ یہی ہوتا ہے جسے کہا گیا ہے:

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں   می دہد یزداں مرادِ متقیں

چنانچہ حضرت مہتمم صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے مقدمہ میں متعدد سوانح کے مرتب ہونے اور اشاعت سے پہلے ہی تلف وضائع ہونے کی بات کہہ کر یہ نتیجہ اخذ فرمایا ہے کہ:

''متعدد بزرگ سوانح نگاری پر متوجہ ہوئے اور سوانح عمریاں کافی مواد کے ساتھ تفصیلی طور پر مرتب ہوئیں لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا صورت واقعات یہ ہے کہ ''سوانح عمریاں'' مرتب ہوتی رہیں اور کسی مخفی ہاتھ سے سامنے آنے سے پہلے ہی تلف بھی ہوتی رہیں۔ (۳)

(۳) مقدمہ سوانح قاسمی ص: ۹

راقم السطور سے ''سلوک واحسان حضرت الامام النانوتوی قدس سرہ پر مضمون کی فرمائش کی گئی ہے اس لئے احقر نے اپنے لئے سہولت اسی صورت میں سمجھی کہ حضرت موصوف سے متعلق موجود کتب سوانح کو بالاستیعاب ''سلوک واحسان'' کا چشمہ لگا کر دیکھا جائے۔

اسی جہت سے سطور بالا میں حضرت الامام قدس سرہ کی یک نظری و چند سطری سوانح بھی بطور یادگار و تبرک پیش نظر رکھ لی گئی ہے کہ راقم السطور اپنے موضوع سے متعلق معروضات وگذارشات میں حضرت امام قدس سرہ کی اس مختصر و قلیل مدت حیات کو نظر میں رکھتے ہوئے حضرت والا کے ''سلوک وعرفان'' کو زیر بحث لائے، کیونکہ عام مشاہدات وتجربات اس بات پر شاہد ہیں کہ عام طور پر کسی بزرگ شخصیت کا ''سلوک وعرفان'' ان کی ''کہولت ومشیخت'' ہی کی عمر میں جوان ہوتا ہے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت امام قدس سرہ اس دور کہولت ومشیخت تک پہنچنے سے پہلے ہی راہی جنت اور واصل بحق ہوگئے ہیں جس وقت کہ خود حضرت امام عالی مقام کے پیر ومرشد وشیخ طریقت سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ فاروقی تھانوی بہ نفس نفیس بقید حیات مکہ معظمہ میں قیام فرماتھے، نیز حضرت امام موصوف کے استاذ حدیث حضرت شاہ عبدالغنی صاحب مجددی نقشبندی دہلوی مہاجر مدنی بھی مدینہ منورہ طاب ثراہا میں آپ کی وفات سے ایک سال پہلے تک (یعنی ۶ رمحرم ۱۲۹۶ھ تک) بقید حیات فیض رسان خلائق بنے ہوئے تھے۔

ان دو بڑے شیخ المشائخ کے علاوہ اور بھی متعدد شیوخ طریقت آپ کے معاصر موجود تھے اس لئے ہمارے حضرت امام قدس سرہ کے لئے پردۂ خمول وگمنامی میں رہتے ہوئے ''اخفائے حال'' آسان تھا جس سے آپ نے بھرپور فائدہ اٹھایا جیسا کہ اس سلسلہ کی بعض تفصیلات سے ظاہر ہوتا ہے جو آئندہ سطور میں شامل مضمون بھی کی جائیں گی، صرف نمونہ کے طور پر مولانا ضیاء الحق عثمانی کے نام دو خطوط یہاں نقل کئے جاتے ہیں ملاحظہ ہوں:

(۱) برادر عزیز شیخ ضیاء الحق سلمہ اللہ تعالیٰ السلام علیکم

آپ کا عنایت نامہ پہنچا پہلا خط بھی دلی میں یاد پڑتا ہے آیا تھا پر بعض وجہ سے مقصر رہا، اب آپ اپنا جواب لیجئے جیسے لڑکے کھیلتے وقت کسی کو بادشاہ کسی کو وزیر بنالیتے ہیں، ایسی ہی میری پیری سمجھئے، یہی وجہ تھی کہ تم سے ہنسی میں کہہ دیا کرتا تھا کہ ''شیخ بدو! تم مجھ سے مرید ہوجاؤ، جب تم

واقعی مرید ہونے کو تیار ہوئے تو واقعی حال کہنا پڑا۔

ہاں وظیفہ کا کچھ مضایقہ نہیں، نماز پنجگانہ تو باجماعت پڑھتے ہی ہو گے، بعد ہر نماز کے ایک تسبیح اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْم کی اور بعد عشا تین تسبیح یَا حَیُّ یَا قَیُّوم بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ کی پڑھ لیا کرو، عشا کی تسبیحوں کے اول و آخر گیارہ گیارہ بار درود بھی کہہ لیا کرنا اور سوا اس کے اگر جی چاہا کرے تو کلمہ اول اور درود شریف کی جتنی کثرت ہو سکے اتنی بہتر ہے مگر جو وظیفہ پڑھو اس کے پڑھتے وقت یہ سمجھا کرو کہ خدا کے سامنے حاضر ہوں اور زبان دل سے عرض کر رہا ہوں باقی خیریت ہے۔

تمہارے بھتیجے عین الحق و عزیز الحق یہیں ہیں اور تمہارے بڑے بھائی بھی کل سے آئے ہوئے ہیں سب بخیریت ہیں اور سب کو سلام کہتے ہیں چچا صاحب کی خدمت میں آداب عرض کرتے ہیں، اپنی چچی اور بھائی کو میرا بھی سلام کہہ دینا۔ رقیمہ محمد قاسم از نانوتہ صفر ۱۲۹۳ھ (۴)

تعلیق راقم بر نامۂ مذکور

حضرت الامام قدس سرہ کے جواب مذکور سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ شیخ ضیاء الحق موصوف نے اپنے خط میں کیا بات لکھی تھی جس کا جواب دیا جا رہا ہے اندازہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب موصوف نے بھی اپنے خط میں حضرت امام کو "شیخ بدو! تم مجھ سے مرید ہو جاؤ" والی پرانی بات کے حوالہ سے حضرت والا قدس سرہ سے بیعت ہونے کی درخواست کی ہوگی جس کا جواب حضرت قدس سرہ نے کیسے لطیف و پر مذاق انداز میں دیکر اور اس پرانی بات کو بچوں کا کھیل بتا کر ان کی درخواست بیعت کو یوں رفت و گذشت کر دیا جیسے وہ کوئی قابل ذکر بات ہی نہ تھی۔

درخواست بیعت کے ساتھ شیخ صاحب نے حضرت والا قدس سرہ سے کوئی "وظیفہ" بھی دریافت کیا ہوگا، اس درخواست کی پذیرائی ہوگئی اور موصوف کو صرف ایک وظیفہ نہیں بلکہ دو تین وظیفے بتا دیئے گئے۔

جواب سامی قاسمی کا نکتۂ خاص

راقم السطور کی نظر سے ایسے بہت سے خطوط گذرے ہیں جن میں سائل نے کسی بزرگ سے

(۴) مکتوبات اکابر دیوبند ص ۴۷۔

کوئی وظیفہ وعمل دریافت کیا ہے اور ان بزرگ نے دریافت کرنے والے کو جواب میں صرف وظیفہ یا عمل بتادیا ہے اور بس۔

لیکن اس مکتوب قاسمی کا نکتۂ خاص یہ ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ پوچھنے والے کو صرف وظیفہ ہی نہیں بتاتے ہیں بلکہ ساتھ ہی ساتھ غیر رسمی اور بالکل غیر محسوس طور پر سائل کو ''مراقبۂ احسان'' کی بھی تلقین فرمائے جارہے ہیں مگر بالکل ایسے طور پر کہ سائل کو یہ بالکل محسوس نہ ہونے پائے کہ اسے کیسے عجیب انداز میں مراقبہ احسان کی مشق بھی کرائی جارہی ہے:

(۲) عزیزم شیخ ضیاء الحق صاحب سلمکم اللہ تعالیٰ کمترین محمد قاسم بعد سلام مسنون عرض پرداز ہے کہ عشرۂ اول محرم میں آپ کا عنایت نامہ میرے پاس رام پور پہنچا تھا، جواب کا فکر تو اسی روز سے تھا پر وہاں تو بوجہ کثرت آمد ورفت اہل ملاقات اتفاق نہ ہوا۔ وہاں سے آیا تو ایک ہی شب رہنے کا اتفاق ہوا تھا کہ ناگہاں بریلی کے آب ودانہ نے زور کیا تین چار روز ہوئے کہ بدقت تمام وہاں سے آنا ہوا بہت سے خط جمع ہو گئے تھے آج خطوط جواب طلب کے جواب میں دن گزرا آپ کا عنایت نامہ بھی نکالا اور جواب لکھنا شروع کیا۔

عزیز من! نہ میں اس قابل کہ خود کسی کی رہبری کروں، اور نہ اس قابل کہ کسی رہبر کو پہچانوں اور دوسروں کو بتلاؤں؟ البتہ دو چار بزرگوں سے عقیدت ہے ایک تو جناب حاجی امداد اللہ صاحب دوسرے شاہ عبدالغنی صاحب ان کے بعد مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی، ان بزرگوں میں سے جس کی صحبت میسر آجائے غنیمت جانو اور اپنے حصہ کی تفتیش میں نہ رہو، اس قسم کی تفتیش کا دستور اہل سلوک میں نہیں اگر یہ بات ہوتی تو پہلے سالک کو بھی ہوا کرتی، زیادہ بجز امید والتماس دعا اور کیا عرض کروں، اپنے چچا اور بھائی سے میرا اسلام کہنا والسلام۔ ۶ر صفر ۱۲۹۶ھ از نانوتہ (۵)

تعلیق راقم السطور رومی برنامۂ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کا یہ دوسرا مکتوب گرامی بھی ویسی ہی صاف ستھری روزمرہ کی زبان میں ہے کہ خود جواب خط کے الفاظ ہی سے یہ بات منکشف ہو جاتی ہے کہ شیخ ضیاء الحق صاحب

---

(۵) مکتوبات اکابر دیوبند ص ۵۵۔

نے اپنے خط میں حضرت امام قدس سرہ سے کیا بات دریافت کی تھی۔

نامہ گرامی کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ جناب شیخ ضیاء الحق صاحب نے جب دیکھا کہ حضرت امام قدس سرہ نے پیری مریدی کی بات کو بچپن کا ایک کھیل بتا کر بات ٹال دی ہے تو انھوں نے بہت غور و خوض کر کے تقریباً ایک سال بعد یہ دوسرا خط لکھا تھا جس میں انھوں نے حضرت قدس سرہ سے یہ دریافت کیا ہوگا کہ اگر جناب خود مجھے بیعت نہیں فرما رہے ہیں تو پھر مجھے یہ مشورہ ہی دے دیجئے کہ میں کس سے بیعت کروں؟ اور اسی سلسلہ میں شاید انھوں نے یہ سوال بھی کر لیا ہوگا کہ سلوک و طریق میں میرا حصہ کس بزرگ کے ہاں ہے کہ میں اس سے بیعت ہو جاؤں۔

ان دونوں ہی سوالوں کا مختصر جواب حضرت امام قدس سرہ نے یہ دے دیا کہ:

عزیز من! نہ تو میں اس قابل ہوں کہ خود کسی کی رہبری کروں، اور نہ اس قابل کہ کسی رہبر کو پہچانوں اور دوسروں کو بتلاؤں —— ان بزرگوں میں سے جس کی صحبت میسر آجائیں غنیمت جانو اور اپنے حصہ کی تفتیش میں نہ رہو، اس قسم کی تفتیش کا دستور اہل سلوک میں نہیں۔

مکتوب گرامی کے یہی آخری خط کشیدہ فقرے قابل غور و لائق توجہ ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے بالکل غیر ارادی طور پر حضرت امام قدس سرہ کے قلم سے سلوک و عرفان کی ایک بہت بڑی حقیقت لکھوا دی جس سے حضرت امام قدس سرہ کا کمالِ عرفان بھی ظاہر ہو گیا کہ اصل سلوک صرف سلوک ہے جس کی کوئی منزل ہی نہیں ہے:

سلوک راہ بھی ہے اور سلوک منزل بھی — اسی سلوک سے مالک ہوئے ہیں واصل بھی

فراق و وصل چہ خواہی رضائے دوست طلب — کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

حضرت امام قدس سرہ کے یہ دو مکتوب گرامی بطور نمونہ یہاں نقل ہو گئے، اس سلسلہ کے دوسرے مکتوبات انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ پیش خدمت ہوں گے۔

حالات زمانہ و ابنائے زمانہ کو دیکھتے ہوئے طبیعت کا تقاضہ ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک و عرفان پر تفصیلی گفتگو سے پہلے نفس سلوک و تصوف کی اہمیت و ضرورت واضح کر دی جائے جس کی وجہ یہ صورت حال ہے کہ دور حاضر کے مدعیان اسلام کے مختلف حلقوں اور طبقوں کی طرف سے مطلق "سلوک و احسان" اور طریق تصوف و طریقت کا شدت سے انکار کیا جا رہا ہے، اسے

نہ صرف یہ کہ خلاف کتاب وسنت کہا جارہا ہے بلکہ اس سے بھی اور آگے بڑھ کر اس کا رشتہ اہل شرک وبدعات کے مراسم اور اہل ہند کے سنیاس اور جوگ سے جوڑ کر خلاف دین ومذہب صریح ضلال وگمراہی ٹھہرایا جارہا ہے۔

ان حالات کا تقاضہ ہے کہ ہم کسی مخصوص بزرگ شخصیت کے سلوک واحسان کی خصوصی بحث کرنے سے پہلے نفس سلوک واحسان ہی کی ضرورت واہمیت اور اس کے مرتبہ ومقام پر روشنی ڈالتے ہوئے یہ حقیقت واشگاف کردیں کہ کتاب وسنت اور دین وشریعت کی روشنی میں خود اصل سلوک وتصوف کا مقام کیا ہے؟

تصوف وسلوک کے خلاف جو لوگ سرگرم نظر آتے ہیں غور وفکر کے بعد کا تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ لوگ دو طبقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

ایک طبقہ ان لوگوں کا ہے جو کتاب وسنت کی ان تعلیمات ہی سے بے خبر ہیں جن کی رو سے علم فقہ وشریعت کی طرح علم اخلاق وسلوک طریقت بھی فرض قرار پاتا ہے۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جنہوں نے نام نہاد مدعیان تصوف کے خلافِ شرع مراسم طریقت وتصوف کو دیکھ کر سرے سے اصل سلوک وتصوف کو قابل انکار ٹھہرادیا ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ تصوف وطریقت بھی علم دین وشریعت ہی کا ایک اہم حصہ اور جزو لازم ہے۔

مشاہدہ گواہ ہے کہ ہر انسان بالخصوص ہر مسلمان اپنے وجود ظاہری میں دو چیزیں رکھتا ہے اس کا ایک وجود تو اس کے ظاہری جسم وبدن کا وجود ہے اور اس کا دوسرا وجود وہ ہے جسے ہم انسان کے باطن اور قلب وروح سے تعبیر کرتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ جس طرح انسان کامل کے دو رخ ہیں ظاہر و باطن یا قلب وقالب اسی طرح دین کامل کے بھی دو رخ ہیں، شریعت وطریقت یا اعمال جوارح واعمال قلب، اعمال جوارح سے متعلق رخ کو شریعت اور اعمال قلب سے متعلق رخ کو تصوف وطریقت کہتے ہیں، طریقت شریعت کے لئے لازم ہے اس سے مغایر ومتضاد کوئی چیز نہیں ہے جیسا کہ نام نہاد مدعیان تصوف نے مشہور کر رکھا ہے۔

حضرت مصلح الامت شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ نے اپنے رسالہ ''تصوف ونسبت

صوفیہ‘‘ میں حضرت امام مالک رحمہ اللہ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے:

من تصوف ولم يتفقه فقد تزندق ومن تفقه ولم يتصوف فقد تفسق ومن جمع بينهما فقد تحقق.

یعنی جس شخص نے تصوف تو حاصل کیا لیکن فقہ سے نابلد رہا تو سمجھو کہ وہ زندیق و بے دین ہی رہا اور جس شخص نے شریعت وفقہ کو تو حاصل کیا لیکن تصوف نہیں حاصل کیا تو وہ خشک ملا ہی رہا اور جس نے فقہ اور تصوف دونوں کو جمع کیا اور دونوں چیزیں حاصل کیں تو وہ شخص صحیح معنی میں محقق ہو گیا۔

اسی شریعت وطریقت سے متعلق فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے فتاویٰ رشیدیہ سے دو سوالوں کے جوابات کا خلاصہ ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔

جواب اول مختصراً

اس سوال کو بے فائدہ اس قدر طویل لکھا خلاصۂ جواب یہ ہے کہ علم شریعت وعلم طریقت ایک ہی ہے اور شریعت وطریقت بھی ایک ہی ہے جب آدمی کو حکم شریعت معلوم ہوا علم شریعت حاصل ہوا اور جب کنہ اس حکم کی معلوم ہوئی وہ علم طریقت ہوا اور عمل بقدر ادائے فرض وواجب کے بہ تکلف نفس سے کرانا عمل بہ شریعت کہلاتا ہے اور جب اخلاص وحب حق تعالیٰ تہ دل میں ساری ہو گئی اس کو عمل بہ طریقت کہتے ہیں۔

جب تک کشاکش علم وعمل کی ہے شریعت ہے جب طمانینت ہو گئی وہ طریقت ہے، ابتدا اور انتہا کا فرق ہے جس نے اصل شے کے واحد ہونے کو خیال کیا ایک کہا یہ بھی درست ہے اور جس نے اول وآخر کا تفرقہ کیا دو کہہ دیا یہ بھی صحیح ہے مطلب دونوں کا واحد ہے۔

جواب دوم مکمل

یہ دونوں ایک ہیں ظاہر سے عمل کرنا شرع ہے اور جب قلب میں حکم شرع کا داخل ہو کر طبعاً عمل شرع ہونے لگے وہ طریقت ہے۔ دونوں کا حکم قرآن وحدیث سے ہے ادنیٰ درجہ شرع ہے۔ اس کا ہی اعلیٰ درجہ طریقت کہلاتی ہے۔ (۶)

ان معروضات کی روشنی میں یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ یہ تصوف

---

(۶) فتاویٰ رشیدیہ ص ۲۱۶۔ ۲۱۷ درسی کتب خانہ دہلی۔

وطریقت بھی فی الحقیقۃ دین وشریعت اور فقہ احکام ہی کا ایک حصہ ہیں۔

اسی جہت کوملحوظ رکھتے ہوئے حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ سے فقہ کی جو تعریف منقول ہے وہ فقہ ظاہری (شریعت) اور فقہ باطنی (طریقت) دونوں ہی کے لئے جامع سمجھی گئی ہے فرماتے ہیں:

علم الفقہ کی تعریف ہے: مَعْرِفَۃُ النفسِ مَا لَھا وَ مَاعَلیھَا.

یعنی نفس انسانی ہر اس بات سے واقف وباخبر ہو کہ کون کون سے کام اس کے حق میں نافع ومفید ہیں اور کون کون سے کام اس کے حق میں غیر مفید اور ضرر رساں ہیں، اسی واقفیت وآگاہی کو فقہ کہتے ہیں۔

مناسب ہوگا کہ اسی موقع پر ایک نظر علم سلوک وتصوف کی تعریف پر بھی ڈال لی جائے کہ حضرات صوفیہ علم تصوف کی تعریف کیا کرتے ہیں مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب علیہ الرحمہ اپنے رسالہ تصوف ونسبت صوفیہ میں فرماتے ہیں:

غرض تصوف ایک عظیم الشان چیز تھی جس کی تعریف علمائے تصوف نے یہ فرمائی ہے ھُوَ عِلْمٌ تعرف بہ أحوال تزکیۃ النفوس وتصفیۃ الاخلاق وتعمیر الظاھر والباطن لنیل السعادۃ الابدیۃ.

قابل غور اور لائق توجہ نکتہ خاص یہ ہے کہ فقہ وتصوف کی مذکورہ ہر دو تعریفوں کا حاصل ولب لباب ایک ہی ہے اگر کچھ فرق ہے تو وہ صرف مجمل ومفصل کا ہے حضرت امام اعظم سے فقہ کی جو تعریف نقل ہوئی ہے وہ اگرچہ بظاہر بہت مختصر ومجمل ہے لیکن یہ حضرت امام کا کمال بلاغت ہے کہ انہوں نے صرف ایک فقرہ میں وہی بات ادا کردی جو تصوف کی تعریف پر مشتمل تین چار فقروں میں کہی گئی ہے حالانکہ اگر یہاں بھی اختصار کا ارادہ کیا جاتا تو یہ مفصل تعریف ایک ہی جملہ میں سمیٹی جاسکتی تھی اور کہا جاسکتا تھا کہ علم تصوف تعمیر ظاہر وباطن کا نام ہے۔

حکیم الامت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ طریقت اور اصلاح باطن کی ضرورت سے بحث کرتے ہوئے اپنی مشہور ومہتم بالشان تصنیف ''التکشف عن مھمات التصوف'' میں فرماتے ہیں:

اور کون نہیں جانتا کہ بے شمار آیات اور بے انتہا روایات اعمال باطنی اور اخلاق کی اصلاح کی

فرضیت پر دال ہیں، قرآن وحدیث میں زہد وقناعت، تواضع، اخلاص، صبر وشکر، حب الٰہی، رضا بالقدر، توکل وتسلیم وغیرہ ذالک کی فضیلت اوران کی تحصیل کی تاکید اوران کے اضداد حب دنیا، حرص، تکبر، ریا، شہوت، غضب، حسد ونحوہا کی مذمت اوران پر وعید وارد ومذکور ہے۔

پھران کے مامور بہا اور منہی عنہا ہونے میں کیا شبہ رہا اور یہی معنی ہیں اصلاح اعمال باطنی کے، یہی عمل اصلی ہے طریقت میں جس کا فرض ہونا بلا اشتباہ ثابت ہے (۷)

زیرتحریر مضمون ومقالہ چونکہ حضرت الامام النانوتوی قدس سرہ کے سلوک واحسان سے متعلق ہے، مناسب تو یہی تھا کہ اس بحث میں بھی حضرت امام موصوف کی کوئی تحریر تبرکاً شامل مضمون ہوجاتی لیکن اس قلیل البضاعت کو اس میں تو کامیابی نہ ہوسکی البتہ حضرت موصوف کے یار غار پوری عمر کے ساتھی حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی ایک خودنوشت تحریر تذکرۃ الرشید حصہ دوم میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے محفوظ فرمادی ہے استبراکاً وہ تحریر مبارک احقر راقم کی مطلب خیز ترجمانی کے ساتھ یہاں نقل کی جارہی ہے:

علم الصوفية، علم الدين ظاهراً وباطناً وقوة اليقين وهو العلم الاعلىٰ، حالهم اصلاح الاخلاق و دوام الافتقار الى الله تعالىٰ، حقيقة التصوف، التخلق باخلاق الله وسلب الارادة و كون العبد فى رِضاء الله تعالىٰ، اخلاق الصوفية، ما هو خلقه عليه السلام بقوله اِنَّكَ لَعَلىٰ خُلُقٍ عظيم وما ورد به الحديث.

وتفصيل اخلاقهم هكذا، التواضع ضده الكبر، المداراة واحتمال الاذى عن الخلق، المعاملة برفق وخلق حسن وترك غَضَبٍ وغيظ، المواساة والايثار بفرط الشفقة على الخلق وهو تقدم حقوق الخلق على حظوظهٖ، السخاوة، التجاوز والعفو، طلاقة الوجه والبشرة، السهولة ولين الجانب ترك التعسف والتكلف، انفاق بلااقتار و ترك الادخار، التوكل، القناعة بيسر من الدنيٰ، الورع، ترك المراء والجدال والعتب الا بحق ترك الغل والحقد والحسد، ترك المال والجاه، وفاء الوعد، الحلم، الاناءة، التوادد، والتوافق مع الاخوان

---

(۷) التکشف بحوالہ تصوف ونسبت صوفیہ ص ۴۲، از حضرت مصلح الامت علیہ الرحمۃ۔

والعزلة عن الاغيار وشكر المنعم، بذل الجاه للمسلمين.
الصوفي يهذب الظاهر والباطن في الاخلاق والتصوف ادب كله، ادب الحضرة الالهية، الاعراض عما سواه حياءً واجلالاً وهيبةً، اسوء المعاصي حديث النفس وسبب الظلمة.(۸)

حضرات صوفیہ کا علم (یعنی علم تصوف کوئی نیا علم نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت) علم دین ہی ہے جو انسان کے ظاہر و باطن دونوں ہی سے متعلق ہے اور یہ علم تصوف اس علم دین میں قوت یقین کا ذریعہ بنتا ہے اور درحقیقت یہی علم سب سے اعلیٰ ہے اور حضرات صوفیہ کا دائرہ عمل اصلاح اخلاق ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی حاجت مندی کا دائمی اظہار ہے۔

تصوف کی اصل حقیقت اپنے ارادہ کا ترک وسلب ہے اور حق تعالیٰ کے اخلاق سے آراستگی ہے اور یہ کہ بندۂ خدا اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی میں لگا رہے اور صوفیہ کے یہ اخلاق وہی ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کریمہ تھے جسے اللہ تعالیٰ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عظیم کے ذریعہ بیان فرمایا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے اور حضرات صوفیہ کے ان اخلاق کی فہرست ایک نظر میں یوں دیکھی جاسکتی ہے۔

۱۔ تواضع یعنی عاجزی جس کی ضد کبر وتکبر (اپنے کو بڑا سمجھنا) ہے (۲) مدارات (اخلاق و رواداری) (۳) مخلوق سے جو تکلیف پہنچے اسے برداشت کرنا (۴) حسن اخلاق اور نرمی سے معاملہ کرنا (۵) غصہ وغضب نہ کرنا (۶) دلجوئی اور دوسروں کا خیال اپنے سے زیادہ رکھنا یعنی عام لوگوں کے ساتھ نہایت شفقت کا برتاؤ کرنا (۷) سخاوت کرنا (۸) عفو ودرگذر سے کام لینا (۹) لوگوں کے ساتھ کشادہ روئی اور خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنا (۱۰) لوگوں کے ساتھ آسانی ونرمی کا معاملہ کرنا (۱۱) تصنع بناوٹ اور تکلف سے دور رہنا (۱۲) خرچ میں اعتدال کہ تکلیف بھی اٹھائے اور آئندہ محتاجی بھی نہ ہو (۱۳) ذخیرہ اندوزی کا ترک کرنا (۱۴) اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنا (۱۵) تھوڑی دنیا پر قناعت کرنا زیادہ کی ہوس نہ کرنا (۱۶) بحث ومباحثہ اور مقابلہ ومجادلہ سے دور رہنا مگر حق بات کے لئے بحث ومباحثہ کی اجازت ہے (۱۷) بغض، کینہ اور حسد سے دل کو خالی

(۸) تذکرۃ الرشید، ج۲، ص۱۱۔

رکھنا (۱۸) مال وجاہ کی محبت نہ رکھنا (۱۹) وعدہ پورا کرنا (۲۰) بردباری اختیار کرنا (۲۱) اطمینان وسکون سے کام کرنا (جلد بازی نہ کرنا) (۲۲) دوستی وموافقت کے ساتھ رہنا (۲۳) اہل اسلام کے لئے اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرنا۔

مندرجہ فہرست اخلاق کو نظر میں رکھنے کے بعد یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ صوفی اپنے ظاہر وباطن کو درست کرکے اور اسے سنوار کے تہذیب اخلاق کرتا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ تصوف کل کا کل ادب ہے (**طرق العشقِ کلها اداب، ادبوا النفس ایها الاصحاب**) حضرت باری تعالیٰ کا ادب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے حیا کرتے رہو اس کے جلال وہیبت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ماسوا سے اعراض وبے توجہی رکھی جائے، اور سب سے برا گناہ کہ دل ہی دل میں گناہ کی باتیں کرتا ہے یہ حدیث نفس دل کی تاریکی کا سبب ہے **اللهم احفظنا منه.**

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر امام اہل الہند صاحب حجۃ اللہ البالغہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ العزیز کی تفہیمات اِلٰہیہ سے بھی کچھ اقتباس پیش کردیں۔

حضرت شاہ صاحب علیہ الرحمۃ نے اپنی ایک بات اس طرح شروع فرمائی ہے۔

وَمُعْظَمُ مَا دَعَتْ اِلیٰ اِقامته الرسل امور ثلثة. اللہ تعالیٰ کے جملہ انبیاء ورسل نے جس دین کو قائم کرنے کی دعوت دی ہے اس کی اکثر اور اہم اور تعلیمات تین ہیں

پھر حضرت شاہ صاحب نے ان تین امور کی تفصیل وتعیین فرمادی ہے کہ وہ تین امور یہ ہیں:

(۱) تصحیح عقائد (۲) تصحیح اعمال (۳) تصحیح الاخلاق والاحسان۔

اس تعیین کے بعد حضرت شاہ صاحب تیسرے امر اخلاص واحسان پر مفصل بحث وکلام کے بعد آخر میں فرماتے ہیں:

وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بیدہٖ هذا الثالث ادق المقاصد الشرعیة مأخذاً و اعمقها محتداً بالنسبة الی سائر الشرائع بمنزلة الروح من الجسد وبمنزلة المعنی من اللفظ. وتکفل بها الصوفیة رضوان الله علیهم فاهتدوا وهدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادة القصویٰ وحازوا السهم الاعلیٰ[9]

---

(۹) تفہیمات الٰہیہ، ج ۱، ص ۱۳ بحوالہ تصوف ونسبت صوفیہ۔

اس ذات کی قسم کھا کے کہتا ہوں جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ امور ثلثہ میں سے یہ تیسرا امر مقاصد شرعیہ میں سب سے زیادہ باریک ودقیق اور سب سے زیادہ تہ نشین اور عمیق مقصد ہے شریعت کے دوسرے مقاصد اتنے عمیق ودقیق نہیں، یہ بمنزلہ روح ہے جسم کے مقابلہ میں اور لفظ کے پیش نظر یہ معنی کا درجہ رکھتا ہے، اور اس مقصد عمیق ودقیق کو حضرات صوفیہ نے اپنا میدان عمل بنایا، خود بھی ہدایت یاب ہوئے دوسروں کو بھی راہ یاب کیا خود بھی بادۂ عرفان سے سیراب ہوئے دوسروں کو بھی سیراب کیا اور انتہائی سعادت کے مقام پر فائز ہوگئے اور دین کا بڑا حصہ حاصل کرلیا۔

اب تک جن اکابر کی عبارات نقل کی گئیں ان کی حیثیت موضوع زیر بحث میں ان کے صوفی ہونے کی وجہ سے ایک فریق کی سی ہوجاتی ہے اور بعض مجلسی قسم کے انشاء پردازوں نے تو انہیں چنیا بیگم (افیونِ تصوف) سے شغل رکھنے والا بھی کہہ دینے میں کوئی باک محسوس نہیں کیا ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ ہم یہاں ایک مسلم ومشہور صاحب افتاوفقیہ علامہ ابن عابدین شامی کے مقدمۂ شامی سے بھی کچھ اقتباسات نقل کردیں علامہ شامی صاحب درمختار کے قول (وعلم القلب) کے تحت فرماتے ہیں:

ای علم الاخلاق وهو علم یعرف به انواع الفضائل و کیفیة اکتسابها و انواع الرذائل و کیفیة اجتنابها — لما علمت من ان عالم الاخلاص و العجب والحسد والریاء فرض عین ومثلها غیرها من افات النفوس کالکبر والشح والحقد والغش والغضب والعداوة والبغضاء والطمع والبخل والبطر والخیلا والخیانة والمداهنة والاستکبار عن الحق والمکر والمخادعة والقسوة وطول الامل ونحوها مما هو مبین فی ربع المهلکات مِنَ الاحیاء قال فیه وَلَایَنفَكّ عنها بشر فیلزمه ان یتعلم منها ما یریٰ نفسه محتاجاً الیها و ازالتها فرض عین ولا یمکن الا بمعرفة حدودها واسبابها وعلاماتها و علاجها فان من لایعرف الشر یقع فیه.(۱۰)

علامہ شامی علیہ الرحمہ کی مندرجہ بالا عبارت میں بھی تقریباً وہی باتیں کہی گئی ہیں جو اوپر بیان

(۱۰) مقدمہ شامی ص: ۴۳، ج: ۱۔

کی جا چکی ہیں اس وجہ سے اس موقع پر عربی عبارت کا ترجمہ غیر ضروری سمجھ کر نہیں کیا گیا ہے، ان حوالہ جات سے مقصد تو صرف اسی قدر ہے کہ لوگوں کی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ علم اخلاق وتصوف کی ضرورت واہمیت کے قائل صرف مشائخ وصوفیہ ہی نہیں ہیں بلکہ اپنے وقت کے مشہور صاحب مقام فقیہ ومفتی علامہ ابن العابدین شامی بھی اخلاق حسنہ کی تحصیل اور رذائل کا تزکیہ فرض شرعی بتا رہے ہیں۔

الحمد للہ کہ نفس تصوف وسلوک کی فرضیت وضرورت گذشتہ صفحات میں بفضلہ تعالیٰ حضرات مشائخ کبار رحمہم اللہ تعالیٰ کی مستند تحریرات کے اقتباسات کی روشنی میں اطمینان بخش طور پر پیش کردی گئی ہے امید کہ انصاف پسند حضرات کو اس روشنی میں صورت حق نمایاں نظر آجائے گی۔

آئندہ سطور میں حضرت امام حجۃ الاسلام شیخ نانوتوی قدس سرہ کے سیر وسلوک اور عرفان واحسان سے متعلق محدود وناقص معروضات پیش خدمت کی جارہی ہیں خدا کرے ناچیز راقم سطور سے موضوع بحث کا حق کسی بھی درجہ میں ادا ہو جائے وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

مشہور ہے: گاہ باشد کہ کودک ناداں / از غلط بر ہدف زند تیرے

امام الاعلام حجۃ الاسلام حضرت محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کی حیات روحانی واقعات وحالات کے آئینہ میں

احقر راقم السطور نے گذشتہ صفحات میں مولانا ضیاء الحق عثمانی کی مختصر ترین چند سطری ویک نظری سوانح اسی مقصد کے تحت ذکر کی تھی کہ اپنے موضوع پر کچھ لکھتے وقت احقر کے پیش نظر حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی مدت حیات بھی رہے اور پھر اسی مجموعی مدت حیات میں اپنی آنکھوں پر سلوک وعرفان کا چشمہ لگا کر حضرت قدس سرہ کے سلوک وعرفان کا سراغ لگایا جائے۔

حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی عمر ومدت حیات پچاس سال کی بھی پوری نہ تھی، مہینوں اور دنوں کا حساب لگا کر کہا جاسکتا ہے کہ عمر کا پچاسواں سال تھا جبکہ آپ نے دنیائے فانی کو خیر باد کہہ کر عالم آخرت کا سفر فرمالیا۔

احقر نے حضرت امام قدس سرہ کی مجموعی مدت حیات (۴۹ سال) کے لیے تاریخی فقرہ نکالنا چاہا تو ''ایزد آگاہ'' کا فقرہ نکلا اس ''غیبی لطیفہ'' کو ''تفاءل'' کے سوا اور کیا کہا جائے کہ اس کھلی ہوئی

حقیقت پر یہ الہامی فقرہ گواہ ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی ولایت ومعرفت اور خدا شناسی وایزد آگاہی من جانب اللہ مؤید ہے۔

ناظرین کرام سے ایک ضروری واہم جملہ معترضہ عرض کرنے کی معذرت خواہی کرتے ہوئے بات کو آگے بڑھانے سے پہلے کچھ پیچھے لوٹنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

گذشتہ صفحات میں مولانا ضیاء الحق عثمانی کی قلمبند کردہ چند سطری سوانح عمری پیش کی جاچکی ہے، مولانا موصوف نے اپنی اس مختصر سوانح میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی تاریخ ولادت کی گتھی نہایت لطیف انداز میں حل کردی ہے مگر خدا جانے کن وجوہ کی بنا پر (احقر کے محدود علم ومطالعہ کے مطابق) اب تک لوگوں کی نظر میں نہیں آسکی ہے، احقر کو اثنائے ترتیب مقالہ اس طرف توجہ ہوگئی تو مناسب یہی معلوم ہوا کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی تاریخ ولادت سے بحث اگرچہ راقم السطور کے موضوع سے متعلق نہیں ہے تاہم اسے بالکل غیر متعلق بھی نہیں کہا جائے گا اس لئے اس مختصر سوانح کا یہ جزو یہاں ذکر کیا جارہا ہے موصوف نے لکھا ہے:

آپ کی عمر انچاس سال چار ماہ چار یوم ہوئی ظاہر ہے کہ جب مولانا ضیاء الحق صاحب کو حضرت امام قدس سرہ کی تاریخ وفات بھی معلوم ہے جس کے لحاظ سے وہ حضرت قدس سرہ کی مجموعی عمر (بقید سال وماہ ویوم) انچاس سال چار ماہ چار یوم متعین طور پر بتا رہے ہیں تو اس حساب کو نظر میں رکھتے ہوئے ۴ر جمادی الاول ۱۲۹۷ھ سے ۴۹ سال ۴ ماہ، ۴ یوم پہلے کی تاریخ ہجری نکال لی جائے وہی تاریخ حضرت امام کی تاریخ ولادت متعین کی جاسکتی ہے۔

احقر بھی ''امة امية'' ہی کا ایک فرد حقیر ہے حساب کتاب سے واقفیت نہ ہونے کے برابر ہے لیکن جو کچھ حساب بہ آسانی لگایا جاسکا ہے اس کی رو سے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی ولادت آخر ذی الحجہ (۲۹۔یا ۳۰) ۱۲۴۸ھ متعین کی جاسکتی ہے اس لحاظ سے مجموعی عمر وہی بنتی ہے جو مولانا ضیاء الحق عثمانی نے بتائی ہے یعنی انچاس سال چار ماہ چار یوم — الحمد للہ کہ اس طرح حضرت امام کی غیر متعین وغیر فیصل تاریخ ولادت بھی دریافت ہوگئی۔

اب تک حضرت امام قدس سرہ پر جو کتب سوانح لکھی گئی ہیں (حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی سوانح قاسمی سے لے کر مولانا گیلانی کی سوانح قاسمی اور مولانا اسیر ادروی کی مولانا

محمد قاسم: حیات اور کارنامے) ان سب ہی میں حضرت امام کی تاریخ ولادت متعین نہیں کی جاسکی ہے لیکن چونکہ مولانا ضیاء الحق صاحب نے مجموعی مدت عمر اور تاریخ وفات متعین طور پر لکھ دی ہے جس کی وجہ سے مجموعی عمر کا پہلا سرا (تاریخ ولادت) بھی دریافت کیا جاسکتا ہے جو دریافت کر کے اوپر درج کیا گیا ہے۔

اوپر اسی سوانح کی ضمن میں یہ بات بھی احقر لکھ آیا ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کے سلوک واحسان کا سراغ لگانے کے لئے ضرورت پڑے گی کہ حضرت امام کی مجموعی عمر میں سلوک واحسان کے آثار کا جائزہ دقت نظر کے ساتھ لیا جائے۔

اس خیال کے تحت یہ ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ حضرت امام قدس سرہ کے عہد طفولیت کو بھی غور وتوجہ کے ساتھ نظر میں رکھا جائے جسے بالعموم ناز ونعمت کا دور کہہ کر ناقابل توجہ ٹھہرا دیا جاتا ہے۔

ابتداءً احقر کا خیال یہی تھا کہ زیر نظر مقالہ میں ان حضرات شیخین کی بیعت کے تقدم وتاخر کو موضوع بحث نہ بنائے لیکن سوانح قاسمی میں مولانا گیلانی نے اچھی خاصی بحث کرنے کے باوجود بحث کو یونہی ناتمام چھوڑ دیا ہے مجبوراً اس بحث میں شرکت ضروری سمجھی گئی ورنہ واقعہ یہی ہے کہ یہ بحث ایک طرح سے بالکل بے بنیاد اور غیر ضروری ہے، جن حضرات نے مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی تحریر کردہ سوانح بغور پڑھی ہے انہوں نے دیکھا ہے کہ اس کا فیصلہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب اپنی مختصر سوانح میں صاف وصریح الفاظ میں فرما گئے ہیں ملاحظہ ہو فرماتے ہیں:

> آخر حدیث جناب شاہ عبدالغنی مرحوم کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک طے کیا۔ (۱۱)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی یہ سوانح (مصنفہ حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی) حضرت امام قدس سرہ کی وفات کے بعد ہی قریب زمانہ میں لکھی گئی تھی اور جیسا کہ ابھی اوپر نقل کیا گیا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کی معلومات حضرت امام نانوتوی وحضرت امام گنگوہی قدس سرہما کی بیعت وسلوک سے متعلق یہی ہیں، یہ روایت اس لحاظ سے زیادہ اہم اور قابل توجہ واعتنا قرار پاتی ہے کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی حضرت امام نانوتوی کے استاد

---

(۱۱) سوانح عمری از مولانا محمد یعقوب نانوتوی مشمولہ سوانح قاسمی مولانا گیلانی۔ ص: ۲۸۔

زادہ ہیں زمانۂ تعلیم دہلی میں حضرت امام نانوتوی انہیں کے ساتھ اپنے استاد ہی کے مکان پر رہتے تھے دونوں ہر وقت کے ساتھی اور ہمدم وہمساز تھے جس کی وجہ سے ان کی روایت صاحب البیت کی روایت ہونے کی وجہ سے بعد کی دوسری روایت کے مقابلہ میں زیادہ قابل قبول ٹھہرتی ہے۔

پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے متعلق سلوک اور ذکر اذکار وغیرہ کی مشغولی اور اس کی مزید کیفیات وتفصیلات بھی اکثر وبیشتر انہی حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ہی کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہیں۔

ایسی صورت میں کوئی معقول وجہ ہمیں اس بات کے لئے نہیں ملتی کہ ہم حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے ذکر واشغال کی تفصیلات تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی روایات سے لیں اور اہل سلوک وبیعت کے معاملہ کو تذکرۃ الرشید میں منقول روایات کی روشنی میں طے کرنے لگیں جبکہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی اس کے عینی شاہد بھی نہیں ہیں کیوں کہ موصوف کی پیدائش حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی وفات کے ایک سال بعد پانچ رجب ۱۲۹۸ھ کو ہوئی ہے اور حضرت گنگوہی قدس سرہ سے آپ کی بیعت ووابستگی ۱۳۱۶ھ میں ہوئی تھی ابھی بیعت کو صرف سات ہی سال گذرے تھے کہ ۸ یا ۹ جمادی الاخری ۱۳۲۳ھ کو حضرت گنگوہی قدس سرہ کی بھی رحلت ہوگئی تھی۔

اس صورت حال کو نظر میں رکھتے ہوئے سمجھا جاسکتا ہے کہ حضرات شیخین امام نانوتوی و محدث گنگوہی قدس سرہما کی بیعت کی وہ تفصیلات جو خدا جانے کن بنیادوں پر کہیں تذکرۃ الرشید اصل کتاب میں اور کہیں حاشیہ پر مذکور ہوگئی ہیں وہ کسی طرح بھی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی سوانح کی بالکل صریح وصاف اور واضح روایت کے ہم پلہ بھی نہیں کہی جاسکتیں چہ جائے کہ انہیں اس پر ترجیح دی جائے کیوں کہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب علیہ الرحمہ جس زمانے سے متعلق یہ اطلاع دے رہے ہیں کہ:

> اور اسی زمانے میں دونوں صاحبان (حضرت نانوتوی وحضرت گنگوہی) نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا۔ (۱۲)

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ خود حضرت مصنف سوانح اس وقت حضرات شیخین کے ساتھ ہی دہلی میں

---

(۱۲) سوانح عمری از مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص: ۲۸ مشمولہ سوانح قاسمی جلد: اول۔

ان حضرات کے استاذ اور اپنے والد محترم مولانا مملوک العلی صاحب علیہ الرحمہ کے مکان پر مقیم تھے بلکہ اسی زمانے میں عربی کی بعض ابتدائی کتابیں حضرت امام قدس سرہ سے پڑھی بھی تھیں اور حضرت امام نانوتوی نے جب کتب حدیث کا درس دینا شروع کردیا ہے تو موصوف نے حضرت امام نانوتوی سے بخاری و مسلم شریف بھی پڑھی۔

ایسی صورت میں کہ مولانا محمد یعقوب صاحب جو ان حضرات کے اس درجہ قریب رہے ہوں ان کے بارے میں یہ بات سوچی بھی نہیں جاسکتی کہ انھوں نے ان حضرات کی بیعت سے صحیح واقفیت کے بغیر ہی ایسی صاف وصریح اطلاع یوں ہی سپرد قلم کردی ہوگی مگر کیا کہا جائے کہ مولانا عاشق الٰہی کی تذکرۃ الرشید کے حاشیہ پر آئی ہوئی مندرجہ ذیل عبارت نے ایسی صاف بات کو بھی مستقل طور پر ایک موضوع بحث بنادیا ہے، مولانا میرٹھی ص:۴۶ کے حاشیہ پر لکھتے ہیں:

> حضرت مولانا قاسم العلوم گوعقیدت میں حضرت گنگوہی سے مقدم ہیں مگر ابھی تک بیعت نہیں ہوئے تھے، حضرت مولانا کو اعلیٰ حضرت سے بیعت ہونے کی جو کچھ بھی ترغیب دیتے اور حاجی صاحب کے مناقب بیان فرمایا کرتے تھے وہ اسی عقیدت کی بنا پر تھے جو نانوتہ کے ابتدائی تعلق قرابت وزیارت کے وقت سے آپ کو حاصل تھی، مولانا النانوتوی کو اعلیٰ حضرت کے ہاتھ پر بیعت کرانے میں کوشش کا ثواب بھی حضرت مولانا گنگوہی کو حاصل ہوا، چنانچہ حضرت قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت کی تعریفیں کرکر کے ہمیں مرید کرایا اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار کوشش کرکے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا۔ (۱۳)

تذکرۃ الرشید کا مذکورہ بالا حاشیہ پڑھنے کے بعد اسی کتاب کے ص ۴۳ کا یہ حاشیہ بھی ملاحظہ فرمالیا جائے حاشیہ کی عبارت درج ذیل ہے:

> مسجد کی ملاقات کے بعد (مسجد کی یہ ملاقات کب ہوئی تھی بعد میں بتائی جائے گی) حضرت مولانا (گنگوہی) قدس سرہ اعلیٰ حضرت کی جائے قیام یعنی مولوی سراج الدین صاحب کے مکان پر حاضر ہوئے اور زیارت کی۔

اسی ملاقات یا گنگوہ کے کسی دوسرے سفر میں جو حضرت کی چوتھی ملاقات کہلاتی ہے۔ یہ قصہ

---

(۱۳) حاشیہ:۴۶ تذکرۃ الرشید۔

پیش آیا کہ اعلیٰ حضرت نے مولانا (گنگوہی) قدس سرہ سے دریافت فرمایا کہ:

میاں رشید احمد! اللہ کا نام سیکھنے اور کہیں مرید ہونے کی بھی تمنا ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا نے جواب دیا کہ "حضرت! جی تو بہت چاہتا ہے" آپ (حضرت حاجی صاحب) نے دریافت فرمایا کہاں؟ اور کس کی طرف میلان ہے؟ مولانا نے جواب دیا کہ حضرت اب تک جتنا بھی غور و فکر کیا دو حضرات میں سے ایک کا غلام بنوں گا یا حضرت شاہ عبدالغنی صاحب کا اور یا آپ کا، اعلیٰ حضرت مسکرائے اور یہ فرما کر بات کو ٹال دیا کہ ہاں صاحب شاہ عبدالغنی صاحب عالم بھی ہیں۔ شیخ بھی مشہور محدث ہیں۔ علماء تو علماء ہی کی طرف جھکتے ہیں، مجھے کیوں شامل کرتے ہو؟ میں بیچارہ پڑھا نہ لکھا — حضرت مولانا (گنگوہی) قدس سرہ فرماتے تھے کہ اعلیٰ حضرت نے بظاہر تو اپنی طرف سے رغبت کم کی مگر اندر ہی اندر دل کو کھینچ لیا، اس گفتگو کے بعد آپ کا خیال آستانہ امدادیہ کی جانب پختہ ہو گیا جس کا چند روز بعد وقوع ہو گیا۔ (۱۴)

راقم السطور رومی عرض کرتا ہے کہ مذکورہ بالا حاشیہ میں مسجد کی جس ملاقات کا ذکر ہوا ہے اس ملاقات کا ذکر اصل کتاب تذکرۃ الرشید میں ص ۴۲ پر مفصل مذکور ہے وہ تفصیل تو غیر ضروری ہے تاہم اس ملاقات سے متعلق یہ مختصر و ضروری انکشاف اہم اور قابل ذکر ہے کہ تھانہ بھون کی مسجد کی یہ ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب یہ ہر دو حضرات شیخین دہلی میں طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے۔

ایسی صورت میں بظاہر صوفی محمود حسن صاحب سہارنپوری کی منقولہ بالا روایت کو اگر حضرت حاجی صاحب سے حضرت گنگوہی کی تیسری ملاقات قرار دے لیا جائے تو متعدد روایات میں تطبیق کی صورت بھی نکل آتی ہے اور حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کی بیان فرمودہ حقیقت واقعہ بھی ہاتھ سے جانے نہیں پاتی اور واقعہ کی صورت یہ قرار پاتی ہے کہ صوفی محمود حسن صاحب سہارنپوری کی روایت کے مطابق حضرت حاجی صاحب قدس سرہ اور حضرت گنگوہی کے درمیان یہ ملاقات و مکالمہ بیعت سے پہلے اس وقت ہو چکا ہے جب حضرات گنگوہی و نانوتوی دہلی میں طالب علمی کے دور سے گزر رہے تھے، قیام دہلی کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا جس کے نتیجہ میں حضرت گنگوہی کا وہ تردد بین الشیخین ختم ہو گیا جو بوقت مکالمہ ظاہر ہوا تھا اور پھر آپ نے دوسری طرف سے یکسو ہو کر

(۱۴) حاشیہ از صوفی محمود حسن سہارنپوری۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے بیعت کا فیصلہ فرمالیا اور پھر حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے درس حدیث کی تکمیل کے بعد ہے دونوں صاحبان حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے اور سلوک بھی شروع کر دیا۔

اس بیعت کے وقوع میں حضرت مولانا نانوتوی قدس سرہ کے شاکلہ وافتادطبع کے لحاظ سے عین ممکن ہے کہ دونوں صاحبان کی بیعت بالکل ایک ساتھ نہ ہوئی ہو اور حضرت گنگوہی کے ارشاد کے مطابق صورت وہی ہوئی ہو کہ ہر دو حضرات کی بیعت میں فی الجملہ تقدم و تاخر بھی ہوا ہو۔

حضرت نانوتوی قدس سرہ کے خصوصی شاکلہ وافتادطبع پر نظر رکھتے ہوئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس تقدم و تاخر کو میری و پھسڈّی کے چشمہ سے دیکھا جائے کیونکہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کا شاکلہ خصوصی اور حضرت کی افتادطبع کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ وہ ہر ایسی بات سے دور رہنا چاہتے تھے جس میں ادنیٰ شائبۂ شہرت اور داعیۂ نام و نمود پایا جائے۔

حضرت امام نانوتوی کے سوانح کا یہ پہلو کھل کر زیر بحث نہیں آسکا ہے کہ حضرت نے دہلی کے عربک کالج میں پڑھنے کے باوجود سالانہ امتحان کی شرکت سے کیوں گریز کیا تھا؟ وجہ ظاہر ہے کہ امتحان دیتے تو ٹاپ کرتے مگر یہ شہرت وہاں مطلوب ہی کسے تھی؟ اس لئے چپ چاپ کالج چھوڑ دیا اور گھر بیٹھے رہے۔

جن حضرات نے صرف ظاہری طور پر رسم بیعت کی ادائیگی میں تقدیم و تاخیر اور اولیت و ثانویت کو ایک بالکل غیر ضروری موضوع بحث بنا کر ان حضرات شیخین میں تفریق و تفصیل کی صورت پیدا کر دی ہے انہوں نے ان دونوں بزرگوں کے ربط باہم اور مودت و خلوص ہی کو نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے ضمنی طور پر حقیقت بیعت سے بھی اپنی بے خبری بھی ظاہر کر دی ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ حضرات مشائخ طریق بھی بیعت کو مفید و مستحسن ہی قرار دیتے ہیں اسے ضروری و فرض کا درجہ تو کوئی بھی نہیں دیتا ہے۔

بیعت کی یہ حقیقت اگرچہ ان حضرات مشائخ کی تحریرات سے بھی مفہوم ہو جاتی ہے جن کے حوالہ سے تصوف و سلوک کی شرعی حیثیت گذشتہ صفحات میں مفصل و قابل اطمینان حد تک بیان کی جا چکی ہے لیکن یہ بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ بالعموم لوگوں میں خدا جانے کیوں یہ غلط فہمی عام

طور پر پائی جاتی ہے کہ جو لوگ کوچۂ سلوک وتصوف میں قدم رکھنا چاہتے ہیں وہ اصل سلوک یعنی اصلاح باطن کی طرف تو قطعاً توجہ ہی نہیں کرتے، ان کی پہلی اور آخری منزل بیعت اور صرف بیعت ہی ہوتی ہے اور بیعت ہو کر وہ پھر یوں سو جاتے ہیں جیسے گھوڑوں کا سوداگر گھوڑا بیچ کر سوجایا کرتا ہے۔

اگرچہ حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ (جنہیں علمائے عصر نے سلوک وتصوف میں تو بہر حال مجدد مانا ہی ہے) نے بیعت رسمیہ کے معاملہ میں پھیلی ہوئی اور پائی جانے والی اس مشہور عام غلط فہمی کا صاف اور واضح انداز میں ازالہ فرمادیا ہے لیکن مدتوں کی جڑ پکڑی ہوئے غلط فہمی پوری طرح دور نہیں ہوسکی ہے چنانچہ صاحب تذکرۃ الرشید کا ذہن بھی پوری طرح صاف معلوم نہیں ہوتا جنہوں نے بالکل غیر ضروری طور پر یہ بحث چھیڑ دی اور ان ہر دو حضرات شیخین کو طرفین وفریقین کی حیثیت دے کر ان کی بیعت کے تقدم وتاخر کو ایک نزاعی اور قابل فیصلہ مقدمہ بنادیا، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں ہی امام دوسرے وابستگان دار العلوم ومظاہر علوم کے غیر متنازع فیہ متفقہ طور پر امام وسید الطائفہ کی حیثیت رکھتے ہیں یہ حضرات شیخین اپنے مخصوص شاکلہ اور خصوصی افتاد طبع کے لحاظ سے باہم دگر اگرچہ فی الجملہ مختلف بھی ہیں مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کے صحیح معنی میں مقام شناس بھی ہیں ہر دو بزرگ اپنی سلامتِ طبع کے باعث اس جذبۂ معاصرت سے بالکل پاک وصاف تھے جو معاصرت کو منافرت میں تبدیل کردیا کرتا ہے مگر کیا کیا جائے کہ تذکرۃ الرشید کے حاشیہ کی منقولہ بالا عبارت نے اس موضوع بحث کو اس انداز سے پیش کردیا ہے جس سے کچھ ایسا رنگ جھلکتا ہے کہ قاسمی ورشیدی یہ الگ الگ دو گروپ ہیں اور ہر گروپ ہیرو وشپ میں مبتلا ہے اور اس کی پوری کوشش صرف یہ ہے کہ اس کا ہیرو زندگی کے ہر میدان وہر مرحلہ میں اول نمبر پر رہے۔

یہ جذبہ مغرب میں خواہ کتنا ہی پسندیدہ قرار دیا جاتا ہو اسلام میں اس قسم کی ہیرو وشپ نہ صرف یہ کہ بالکل بے قیمت ہے بلکہ انتہائی قابل مذمت ولائق نفرت جذبہ ہے جس کی حوصلہ افزائی کسی طور پر بھی نہیں کی جاسکتی۔

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی اسلامی ادب کے مسلم صاحب قلم ہیں ان کی نکتہ آفرینی ونکتہ سنجی، ژرف نگاہی ودور بینی طبقہ اہل علم میں مسلم ہے لیکن سوانح قاسمی میں وہ اپنی ان نکتہ آفرینیوں کی رو میں بار بار کچھ اس طرح بے قابو ہوکر الجھ جاتے ہیں کہ بعض مقامات پر ایسا گمان ہونے لگتا ہے کہ وہ

اپنی اسی رو میں تضاد بیانی سے صحیح طور پر اپنا دامن بچانے میں ناکام ہوتے جا رہے ہیں، یہاں اس بحث کا موقع نہیں ہے یہ دوسرے مستقل مضمون کا موضوع ہے۔

مولانا گیلانی صاحب نے تذکرۃ الرشید کی زیر تبصرہ بحث سوانح قاسمی جلد اول کے ص: ۲۹۳ سے شروع کی ہے جو تقریباً آٹھ صفحات تک چل کر ص ۳۰۰ پر ختم ہوئی ہے۔ اس طویل سلسلۂ کلام کا ایک اقتباس ذیل میں اپنے تبصرہ کے ساتھ پیش خدمت کیا جا رہا ہے۔

حضرت مولانا گیلانی تذکرۃ الرشید ص ۴۶ پر دیئے ہوئے حاشیہ کی عبارت نقل فرمانے کے بعد فرماتے ہیں:

> ''یہ ایک روایت ہے اور ثقہ، قابل اعتبار راوی کی روایت ہے بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا گویا چشمہ کا سراغ جس نے لگایا تھا باوجود پیاس کے اس وقت تک اپنے تلاش کئے ہوئے پانی کو اس نے استعمال کرنا مناسب نہ خیال کیا جب تک کہ دوست کو نہ دیکھ لیا کہ وہ سیراب ہو چکا ہے''۔ (۱۵)

مولانا گیلانی نے مندرجہ بالا اقتباس میں جو کچھ فرمایا ہے وہ عقلی و منطقی اعتبار سے مخدوش ہے، جن مقدمات پر مولانا نے اپنے نتیجہ کی بنیاد رکھی ہے وہ اپنے ناقص ہونے کی وجہ سے نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے لیکن مولانا نے اپنے مقدمات کے نقص کو نظر انداز کر کے بالکل ہی زبردستی ان سے نتیجہ نکال لیا ہے جسے اہل منطق تحکم ہی کہیں گے۔

مولانا کا یہ ارشاد تو اپنی جگہ پر درست ہے کہ یہ ایک روایت ہے اور ثقہ، قابل اعتبار راوی کی روایت ہے، مگر اس موقع پر مولانا کو اور آگے بڑھنے سے پہلے یہ دوسرا مقدمہ (کبریٰ) بھی ذکر کر دینا چاہئے تھا کہ اس روایت کے علاوہ کوئی دوسری روایت جو اس سے زیادہ قوی ہو موجود بھی نہیں ہے — لیکن مولانا نے یہ بات نہیں کہی اور وہ کہہ بھی کیسے سکتے تھے کہ خود انہیں کے متعین کردہ متن (یعنی سوانح قاسمی از مولانا محمد یعقوب نانوتوی) میں مولانا عاشق الٰہی کی روایت سے کہیں زیادہ وزنی، صحیح و قوی روایت موجود ہے کہ:

---

(۱۵) سوانح قاسمی ج ۱، ص: ۲۹۴۔

''اسی زمانے میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا''۔(۱۶)

پھر مولانا گیلانی کا آگے بڑھ کر یہ فرمانا کہ:

بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا۔

موصوف کا یہ نتیجہ بھی عقلی و منطقی طور پر نا قابل تسلیم ہے یہ انداز استدلال حد درجہ ضعیف و کمزور ہے، اس کو اگر درست مان لیا جائے تو پھر خدا جانے کتنی غلط باتوں کو صحت کی سند دینی پڑ جائے گی۔

عقلی طور پر یہی بات نا قابل تسلیم ہے کہ تذکرۃ الرشید شائع ہو جانے پر اس وقت کے موجود اکابر نے اسے بنظر غائر از راہ تنقید پڑھا بھی ہو بلکہ مشاہدہ و تجربہ کی روشنی میں یہی دوسرا پہلو قابل ترجیح ثابت ہوتا ہے کہ ان بڑے حضرات کی اپنی ذاتی مشغولیات و مصروفیات ہی اس قدر ہوتی ہیں جن میں ایسے کاموں کی گنجائش ہی نہیں ہوتی اس لئے ایسے حضرات سے یہ توقع رکھنا کہ تذکرۃ الرشید کی اشاعت کے بعد انہوں نے بہ نظر غور و تنقید اس کے تمام تر مندرجات حرفاً حرفاً پڑھے ہوں گے بظاہر اسے توقع بے جا ہی کہا جا سکتا ہے۔

اب اسی سلسلۂ بحث کا ایک دوسرا اقتباس اسی سوانح قاسمی کا ملاحظہ ہو۔ مولانا گیلانی فرماتے ہیں:

اور جیسا کہ خاکسار نے عرض کیا بظاہر مولوی عاشق الٰہی صاحب کی اس خبر کے مشتبہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، البتہ ایک چیز اس سلسلہ میں ضرور کھٹکتی ہے اور وہ یہ ہے ——

چند فقروں کے بعد —— مصنف امام ہی کے قلم مبارک سے ایک فقرہ یہ بھی نکل پڑا ہے:

اور اسی زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا (ص:۲۸)

جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ ''طلب حدیث'' ہی کے زمانے میں دونوں صاحبوں کو حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے باضابطہ بیعت ہی کا نہیں بلکہ سلوک باطنی کی تربیت پانے کا شرف حاصل

---

(۱۶) سوانح قاسمی ج:۱،ص:۲۸۔

ہو چکا تھا آگے پیچھے اس فقرے کے جو باتیں لکھی گئی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس وقت تک مولانا مملوک العلی صاحب دونوں حضرات کے استاد فنون زندہ تھے، مصنف امام کے اس بیان کو اور اس کے سابقہ ولاحقہ مضامین کو دیکھتے ہوئے دل میں بعض عجیب قسم کے سوالات پیدا ہوتے ہیں خصوصاً حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی بیعت کے متعلق مولوی عاشق الٰہی صاحب نے جن تفصیلات کو اپنی کتاب میں درج کیا ہے جن سے سمجھ میں آتا ہے کہ عام علوم اور علم حدیث وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد گنگوہ میں آکر جب مولانا گنگوہی نے قیام اختیار فرمایا اور کچھ درس وتدریس اور ''نوشت وخواند'' کے مولویانہ کاروبار میں مشغول ہو چکے تھے تب وہی مولانا شیخ محمد تھانوی کے مناظرہ کا قصہ پیش آیا اور مناظرے کے حیلہ سے تقدیر تھانہ بھون آپ کو حاجی صاحب کے قدموں تک پہنچا دیتی ہے مگر مصنف امام کے فحویٰ کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ طالب العلمی کا زمانہ دونوں بزرگوں کا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ حاجی صاحب سے دونوں مرید ہو گئے اور سلوک میں بھی لگ گئے بظاہر ان دونوں روایتوں میں تطبیق آسان نہیں ہے اور بجائے تطبیق کے ترجیح کا طریقہ اگر اختیار کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ہمارے مصنف امام کی روایت ہر لحاظ سے مولوی عاشق الٰہی صاحب کی روایت کے مقابلہ میں ترجیح کی زیادہ مستحق ہے۔ (۱۷)

یہ سب کچھ لکھنے کے بعد مولانا گیلانی پھر اپنی پرانی گومگو والی کیفیت پر لوٹ گئے ہیں اور پھر تذکرۃ الرشید کی روایت میں انہیں کافی قوت نظر آنے لگتی ہے بلکہ وہ پھر دوبارہ اس غلط استدلال کا سہارا لینے میں بھی تامل نہیں فرماتے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> اس (تذکرۃ الرشید) کے شائع ہونے کے بعد بھی جہاں تک میں جانتا ہوں اس کتاب کے بیانات پر کسی سمت سے تنقیدی صدا چونکہ نہیں اٹھی اس لئے یہ بھی مشکل ہے کہ مولوی عاشق الٰہی صاحب کی تفصیلات میں شک اندازی کی جائے، پس مناسب یہی ہے کہ تطبیق کا طریقہ اختیار کر کے تاویل وتوجیہ کی کوئی راہ نکالی جائے جس کی جہاں تک میرا خیال ہے، کافی گنجائش ہے لیکن اس مسئلہ کا زیادہ تر تعلق حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعۂ بیعت سے ہے نیز غیر ضروری طوالت کا بھی خوف ہے اس لئے تاویل وتوجیہ کے اس کام کو پڑھنے والوں کے ذاتی

---

(۱۷) سوانح قاسمی ج:۱، ص:۲۹۹۔

مذاق کے سپرد کر کے جو کچھ مجھے یہاں عرض کرنا ہے اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں (انشاء اللہ تعالیٰ وبعونہ راقم السطور یہ فریضہ آئندہ سطور میں عنقریب ہی ادا کرنے کی کوشش کرے گا، ابھی تو مولانا گیلانی کی بات پہلے پوری ہو جائے موصوف فرماتے ہیں)

کہنا یہ ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ خواہ جو صورت بھی پیش آئی ہو لیکن اپنے مصنف امام (حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ) کی مذکورہ روایت اور اس کے سابقہ ولاحقہ نقروں کی روشنی میں بہ ہر حال اتنی بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ مولانا مملوک العلی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں کم از کم سیدنا الامام الکبیر ضرور حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے صرف حلقۂ ارادت ہی میں شریک نہیں ہو چکے تھے بلکہ مصنف امام کے الفاظ کا اقتضا یہی ہے کہ باطنی سیر وسلوک کے مشاغل میں بھی حاجی صاحب قبلہ نے آپ کو لگا دیا تھا۔ (۱۸)

تذکرۃ الرشید کی داستان بیعت کی تنقیح وتنقید:

اس مقصد کے تحت یہاں کچھ معروضات پیش خدمت ہوں گی مگر اس سے پہلے اپنے ہی ایک دعویٰ کا ثبوت پیش کر دینا برمحل ہوگا، گذشتہ صفحات میں احقر راقم السطور نے جب حضرت مولانا گیلانی علیہ الرحمہ کے اس انداز استدلال کی صحت میں تامل کا اظہار کیا ہے کہ — بعد کو بھی کسی نے مولوی عاشق الٰہی مرحوم کی اس روایت پر چونکہ تنقید نہیں کی ہے اس لئے یہی سمجھنا چاہئے کہ واقعہ کچھ اسی شکل میں پیش آیا تھا۔

تو احقر نے وہاں لکھا ہے کہ عقلی طور پر یہی بات ناقابل تسلیم ہے کہ تذکرۃ الرشید شائع ہو جانے پر اس وقت کے موجود اکابر نے اسے بہ نظر غائر از راہ تنقید پڑھا بھی ہو بلکہ مشاہدہ وتجربہ کی روشنی میں تو یہی دوسرا پہلو قابل ترجیح ثابت ہوتا ہے کہ ان بڑے حضرات کی اپنی ذاتی مشغولیات ومصروفیات ہی اس قدر ہوتی ہیں جن میں ایسے کاموں کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔

اب اس موقع پر احقر اپنی بات کے ثبوت میں یہ سوال اہل نظر واصحاب انصاف کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہے کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کی ولادت ۱۲۹۸ھ میں ہوئی ہے جبکہ اس سے ایک سال پہلے حضرت امام نانوتوی دار العلوم دیوبند کی تاسیس کے تقریباً

(۱۸) سوانح قاسمی ج۱، ص: ۳۰۰

چودہ سال بعد ۱۲۹۷ھ میں وفات پا چکے تھے اور ان کی وفات کے متصل ہی زمانے میں حضرت امام نانوتوی کی مختصر سوانح عمری حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی تصنیف فرما چکے تھے جن کی وفات بھی جلد ہی یعنی ۱۳۰۵ھ میں ہوگئی تھی۔

اس موقع پر سوال یہ ہے کہ مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے جب حضرت گنگوہی قدس سرہ کی سوانح تذکرۃ الرشید لکھنے کا ارادہ کیا تو اس وقت انہوں نے کیا یہ ضرورت محسوس کی تھی کہ وہ اپنے اس مقصد کے لئے مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تصنیف کردہ سوانح عمری مولانا نانوتوی کا بھی مطالعہ فرمالیں جو ان کے شیخ حضرت گنگوہی کے اصل رفیق وصدیق ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے مرتبہ شناس بھی تھے؟ اندازہ یہی ہوتا ہے کہ مولانا میرٹھی نے مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی تصنیف کردہ سوانح عمری کا مطالعہ یا تو کیا ہی نہیں اور اگر کیا بھی تو بہ نظر غائر نہیں کیا؟ ورنہ مولانا محمد یعقوب صاحب کی مختصر سوانح قاسمی کا یہ انکشاف ان کی نظر سے گزر جانا چاہئے تھا کہ:

> اور اسی زمانہ میں (جس زمانہ میں ان حضرات نے شاہ عبدالغنی صاحب سے تکمیل حدیث کی تھی)
> دونوں صاحبوں نے جناب حضرت قبلہ حاجی امداد اللہ صاحب دام ظلہ سے بیعت کی اور سلوک
> شروع کیا (ص:۲۸)

تذکرۃ الرشید میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کی ''داستان بیعت''، جس طرح قلم بند ہوئی ہے اس سے بالکل عیاں ہے کہ مولانا میرٹھی کے علم میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کا یہ صریح وصاف انکشاف مطلق نہیں تھا ورنہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی ''داستان بیعت'' کے دوران کوئی ایک حاشیہ اس انکشاف کی تردید میں ہونا ضروری تھا کیونکہ یہ انکشاف ایک ایسی شخصیت کے قلم حقیقت رقم سے تھا جو مروجہ پرتکلف انشاء صحافت سے یکسر پاک ہونے کی وجہ سے نظر اندازی کے لائق ہرگز نہ تھا۔

اس تفصیل سے احقر کا مدعا واضح ہو جاتا ہے کہ جب تذکرۃ الرشید کے فاضل مصنف اپنے تذکرہ نگاری کے وقت بھی اس بات کی ضرورت محسوس نہیں فرماتے کہ اپنے شیخ ومرشد کے حقیقی ساتھی حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے متعلق لکھا ہوا وہ تذکرہ بھی دیکھ لیں جو جس طرح حضرت امام نانوتوی کا زمانہ تعلیم وقیام دہلی میں ہمدم ودمساز تھا، اسی طرح اور تقریباً اسی درجہ کا تعلق اسے حضرت

گنگوہی سے بھی حاصل تھا اس لئے کسی کتاب کو سند تصدیق دینے کے لئے یہ حسن ظن کافی نہیں ہے کہ اس کتاب پر کسی جانب سے صدائے تنقید نہیں اٹھی تھی — اس ضروری معروض کے بعد تذکرۃ الرشید کی روایت سے متعلق معروضات پیش خدمت کی جارہی ہیں خدائے تعالیٰ راقم السطور کی مدد فرمائے اور قلم کو حقیقت نگاری کی حد سے باہر نہ ہونے دے۔

معاملہ و مقدمہ کی نوعیت کیا ہے

تذکرۃ الرشید کی مفصل داستان بیعت پر کچھ تنقید و تبصرہ کرنے سے پہلے حقیقت نگاری کا تقاضا یہی ہے کہ نوعیت معاملہ و مقدمہ متعین ہو جائے اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

احقر ہیچمداں کے فہم ناقص کے مطابق معاملہ و مقدمہ کی نوعیت یہ سمجھ میں آتی ہے کہ:

جملہ وابستگان دیوبند کے مسلم و متفق علیہ امام و پیشوا اور بزرگان دین ہیں امام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ اور ان کے رفیق خاص فقیہ النفس محدث عصر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی — ہر دو بزرگوں کی عمر میں چار سال کا فرق ہونے کے باوجود یہ صورت اتفاق بھی نکل آئی کہ تقریباً تمام تر درسیات دونوں ہی بزرگوں نے ایک ساتھ اور ایک ہی استاذ سے پڑھیں اور ایک ساتھ ہی دونوں نے تکمیل درس کی۔

حدیث شریف کی تکمیل حضرت شاہ عبدالغنی صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں ہوئی اور دوسرے علوم وفنون کا بیشتر حصہ مولانا مملوک العلی صاحب اور مفتی صدرالدین صاحب آزردہ دہلوی کی خدمت میں پڑھا تھا اور اسی طالب علمی ہی کے زمانے میں دونوں ہی بزرگ حضرت حاجی امداداللہ صاحب سے بیعت بھی ہو گئے تھے۔ ۱۲۹۷ھ میں حجۃ الاسلام امام نانوتوی قدس سرہ نے انچاس سال چار ماہ چار دن کی عمر میں وفات پائی حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ اس وقت ترپن سال کی عمر میں بقید حیات تھے جو حضرت امام کی وفات کے بعد دارالعلوم کے سرپرست و مربی رہے۔

امام نانوتوی کی وفات کے بعد ہی متصلاً حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر المدرسین دارالعلوم نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی مختصر سوانح عمری تصنیف فرمائی جس میں اصلاً تو حضرت امام نانوتوی کے ضروری احوال نہایت درجہ اختصار کے ساتھ قلم بند فرما دیئے اور ساتھ ہی ساتھ آپ کے صدیق و رفیق حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کی تعلیمی رفاقت کا ذکر بھی کرتے گئے — انہیں تفصیلات

میں یہ واقعہ بھی قلم بند ہوگیا کہ جس زمانے میں ان دونوں بزرگوں نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب سے کتب حدیث کی تعلیم پوری کی ہے اسی زمانے میں ان دونوں ہی بزرگوں نے حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ سے بیعت بھی کی اور سلوک شروع کردیا۔

حضرت امام نانوتوی کی اس مختصر سوانح عمری کی اشاعت کے تقریباً پچیس سال بعد تک حضرت گنگوہی بقید حیات رہے اور ہر دو حضرات کی رفاقت وصداقت کے پیش نظر گمان غالب یہی ہے کہ حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ اگر عذر نابینائی کی وجہ سے یہ سوانح ملاحظہ نہ فرما سکے ہوں گے تو بھی اسے سنا تو ضرور ہوگا اور اگر اس کی کوئی بات حضرت کو خلاف واقعہ لگی ہوگی تو اس پر متنبہ بھی ضرور فرمایا ہوگا— مگر ایسی کوئی بات کہیں منقول نہیں ہے۔

پھر حضرت امام گنگوہی قدس سرہ کی وفات کے چند سال بعد تذکرۃ الرشید (سوانح حضرت گنگوہی قدس سرہ) منظر عام پر آئی اس کتاب میں حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کے ''سلوک وتحصیل طریقت'' کے عنوان سے ص ۴۰ سے ص ۴۹ تک تقریباً دس صفحات میں حضرت حاجی امداداللہ صاحب قدس سرہ سے حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ کی ''روداد بیعت'' قلم بند کی گئی ہے روداد کا بیشتر حصہ تو اصل متن کتاب میں مذکور ہے لیکن بعض بعض مقامات پر چند حاشیوں میں بھی انکشافات واطلاعات درج ہیں۔

تذکرۃ الرشید کے اس عنوان کے تحت حضرت حاجی صاحب قدس سرہ سے حضرت گنگوہی کی بیعت سے متعلق جو تفصیلات مذکور ہیں ان کی وجہ سے ان حضرات کی سیدھی سادی بیعت کا وہ معاملہ جو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ کی تصنیف کردہ سوانح میں غیر اختلافی سمجھا جارہا تھا ایک نہایت درجہ اہم اختلافی مسئلہ کی شکل میں سامنے آگیا لیکن یہ اختلاف روایات شاید ایک عرصہ تک موضوع بحث نہ بن سکا تھا یہاں تک کہ پورا ایک دور اس طرح گزر گیا اور دونوں تذکروں میں دو علیحدہ علیحدہ روایات دبی پڑی رہیں۔

تذکرۃ الرشید کی اشاعت پر تقریباً پچاس سال گزرنے کو تھے کہ ارباب دارالعلوم دیوبند نے حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانی کے ذریعہ سوانح قاسمی تین جلدوں میں مرتب کراکے اسے دارالعلوم دیوبند کی طرف سے ۱۳۷۳ھ میں شائع کردیا۔

حضرت مولانا گیلانی کی نکتہ سنجی ودقیقہ رسی اہل علم واہل قلم میں مسلم ہے، موصوف نے شاید

پہلی بار اپنی مرتبہ سوانح قاسمی میں اس غیر ضروری قضیہ کو ایک ''مقدمہ'' کی صورت میں پیش کیا اور اپنے مخصوص انداز میں اتار چڑھاؤ کے ساتھ کسی فیصلہ ونتیجہ تک پہنچنے کی کوشش کی مگر ایسا لگتا ہے کہ انہیں کامیابی کی صورت نظر نہیں آسکی تو تطبیق وتوجیہ کو پڑھنے والوں کے ذاتی مذاق کے سپرد کر کے آگے بڑھ گئے۔

اب احقر کو اپنے مجوزہ ومفوضہ مقالہ نگاری کے دوران جب اس پیچیدہ مسئلہ کو سمجھنے سمجھانے کی ضرورت پڑی تو احقر کو بھی اس بیل کو منڈھے چڑھانا دشوار نظر آرہا ہے اور بجا طور پر یہ احساس ہو رہا ہے کہ کیا اچھا ہوتا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ مولانا گیلانی ہی کر گئے ہوتے مگر افسوس کہ یہ کام ہو نہ سکا۔

اصل دشواری یہ ہے کہ یہ خالص تاریخی معاملہ ہے جو دو مختلف قسم کی عقیدت مندیوں کے حصار میں جکڑا ہوا ہے اگر تاریخی وروایتی معیار پر اس مقدمہ کا فیصلہ کیا جاتا ہے تو وہ صرف ایک ہی ہوسکتا ہے (جو آئندہ سطور میں پیش خدمت ہوگا) مگر دشواری یہی ہوگی کہ اس فیصلہ میں غیر ضروری وبیجا عقیدت مندی کی قربانی ضرور ہو جائے گی۔

اصولی طور پر مقدمہ کا حل تو یہی ہوسکتا ہے کہ یہ مقدمہ دو علیحدہ علیحدہ ایک دوسرے سے متضاد روایات کا مقدمہ ہے جن میں تطبیق وتوجیہ کی راہ بالکل بند ہے ایسی صورت میں کوئی فیصلہ ہر دو روایات کے ضعف وقوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کیا جانا چاہئے جیسا کہ عموماً کیا جاتا ہے۔

اس اصول کے پیش نظر شاید ہی کوئی صاحب الرائے اہل علم اس فیصلہ سے اختلاف کرے کہ روایت کے ضعف وقوت کی جہت سے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی روایت متعدد وجوہ سے لائق ترجیح اور قابل قبول ہے کہ اس روایت کے راوی حضرت مصنف بذات خود ہیں جو ہر دو بزرگوں کے استاذزادے اور ہر وقت کے رفیق وجلیس بھی ہیں، ان کے استاذ شریک بھائی بھی ہیں اور ان کے پیر بھائی بھی ہیں۔

اس کے برخلاف تذکرۃ الرشید کی داستان بیعت کی روایت میں متعدد اضطرابات ہیں، مولانا عاشق الٰہی صاحب کو صحیح طور پر یہ بات بھی محفوظ نہیں ہے کہ حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کی ملاقاتیں بیعت سے پہلے کتنی ہوئیں اور کہاں اور کب ہوئیں۔

چنانچہ احقر نے تذکرۃ الرشید ص: ۴۳ کے حاشیہ پر منقول ہوئی محمود حسن کی روایت کے ذکر

کے ساتھ اپنا رجحان ذکر کر دیا ہے کہ حضرت حاجی صاحب اور حضرت گنگوہی کے مابین بیعت سے متعلق ایک مکالمہ ان حضرات کی طالب علمی ہی کے دور میں ہو چکا تھا جس نے حضرت گنگوہی کو یکسو کر کے حضرت حاجی صاحب سے وابستہ ہونے کے لیے پوری طرح آمادہ کر دیا تھا جس کا تقاضا یہی ہے کہ آپ اس مکالمہ کے بعد ہی اثنائے طالب علمی میں حضرت حاجی صاحب سے بیعت ہو گئے تھے۔

ایسی صورت میں حضرت حاجی صاحب سے حضرت گنگوہی کی تاخیر بیعت کی کوئی معقول وجہ نہ تو کسی نے بیان کی ہے اور نہ ہی سمجھ میں آتی ہے۔ احقر کو اپنے قصور علم وفہم کا اعتراف ہے اور کسی طرح اپنے چھوٹے منہ سے کوئی بڑی بات کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی ہے، پھر معاملہ بھی ایسا ہے جس سے لوگوں کی عقیدت مندیاں وابستہ ہیں لیکن آیت کریمہ اعدلوا هو اقرب للتقویٰ اور مقولہ حکیمانہ: ''انصاف شیوۂ ایست کہ بالائے طاعت است'' پر عمل کرتے ہوئے احقر نہایت ادب کے ساتھ اس صاف گوئی کی اجازت چاہتے ہوئے واضح الفاظ میں یہ کہنا چاہتا ہے کہ تذکرۃ الرشید کی متنازعہ روایت میں احقر کے نزدیک کچھ خلط ہو گیا ہے اور دو مختلف واقعات کو ایک ہی روایت میں جمع کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے ان حضرات کی بیعت کا سیدھا سادہ معاملہ ''عقدہ لاینحل'' بن کر رہ گیا ہے۔

احقر کے فہم ناقص کے مطابق صورت واقعہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ ان ہر دو حضرات کی بیعت کا زمانہ تو زمانۂ تعلیم ہی میں مانا جائے جیسا کہ ان حضرات کے ہمہ وقتی جلیس و رفیق حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب ارشاد فرما رہے ہیں اور حضرت شیخ محمد صاحب محدث تھانوی علیہ الرحمہ سے مناظرہ کے واقعہ کو واقعۂ بیعت سے جوڑ کر دیکھا جائے۔

اس مرتبہ کی حاضری جو اصلاً بہ نیت مناظرہ ہی تھی لیکن حضرت حاجی صاحب کی ناپسندیدگی کے بعد آپ نے اچانک اصلاح اخلاق اور سلوک طریقت کا فیصلہ فرما لیا اور امروز وفردا پر ٹلتے ٹلتے یہ قیام پورے ایک چلہ تک ممتد ہو گیا جو لوگ حضرت حاجی صاحب سے آپ کی ابتدائی بیعت سے باخبر نہ تھے انہیں یہی اندازہ ہو سکا کہ آپ نے اس موقع پر بیعت کی ہے۔

تذکرۃ الرشید اور اس کے حاشیوں کی روایات کو اگر بعینہ طور پر درست وصحیح مان لیا جاتا ہے تو حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب جن کی مختصر سوانح عمری اور سوانح مخطوطہ وغیرہ کے کتنے ہی مندرجات بے محل ہو جائیں گے جن میں حضرت امام نانوتوی کے وہ مجاہدات وریاضات بڑی تفصیل

سے بیان کئے گئے ہیں جو حضرت امام نے قیام دہلی کے زمانے میں انجام دیئے تھے (جن کا ذکر عنقریب ملاحظہ میں آئے گا)

تذکرۃ الرشید میں اس بحث سے متعلق جو مندرجات ہیں ان میں کا بیشتر حصہ تو مولانا عاشق الٰہی کے ''مدرجات'' کی وجہ سے بڑی حد تک اپنی استنادی حیثیت سے کمزور ہو گیا ہے لیکن ص: ۴۶ کے حاشیہ کا درج ذیل فقرہ حضرت گنگوہی قدس سرہ کی ذات والا صفات تک مرفوع ہو جانے کی وجہ سے پوری طرح مستند ہے کہ:

چنانچہ حضرت قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی محمد قاسم نے اعلیٰ حضرت کی تعریفیں کر کر کے ہمیں مرید کرایا اور بعد میں اعلیٰ حضرت سے اصرار و کوشش کر کے مولوی محمد قاسم صاحب کو ہم نے مرید بنوایا۔ (۱۹)

صاف اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ کلمات حضرت امام گنگوہی کی زبان فیض ترجمان سے نکلے ہوئے ہیں اور یہ بھی اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ کلمات بطور تفنن و مزاح دوستانہ ارشاد فرمائے گئے ہیں ''مُیری'' اور ''پھسڈّی'' والے جذبہ کا کوئی ادنی شائبہ بھی دور دور تک نہیں ہے۔

علاوہ ازیں صرف مذکورہ بالا روایت میں پوری پوری گنجائش اس بات کی موجود ہے کہ اسے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی سوانح عمری والی روایت کے ساتھ جمع کر لیا جائے کہ ان دونوں میں کوئی تضاد بھی نہیں ہے اس کی تفصیل یوں سمجھی جا سکتی ہے کہ ہر دو بزرگوں کی بیعت زمانۂ طالب علمی ہی میں ہو گئی ہو اور ان دونوں کی بیعت میں فی الجملہ تقدم و تاخر بھی ہو گیا تو کسی کو کیا اشکال ہے اوپر یہ بات اشارتاً عرض کر آیا ہوں کہ حضرت امام کے شاکلہ اور افتاد طبع کا تقاضا ہی یہی تھا کہ وہ جس طرح علم و حکمت کا ننگ و نام اپنے لئے پسند نہیں فرماتے تھے تو مرید ہو کر پیر بننے کے امکانات کو کیسے ہنسی خوشی اور جلدی سے گوارا فرما سکتے تھے۔

سوانح قاسمی کا یہ الجھا ہوا معاملہ جو بالکل غیر ضروری طور پر نزاعی موضوع بحث بن گیا تھا، اوپر کی معروضات میں کوشش کی گئی ہے کہ اس کا قابل اطمینان حل نکل آئے۔

خدائے تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے جہاں تک احقر کے فہم ناقص کی رسائی ہے یہی

---

(۱۹) حاشیہ ص: ۴۶ تذکرۃ الرشید

سمجھ میں آتا ہے کہ معروضات بالا میں ہر دو بزرگوں کی بیعت کا معاملہ اور پھر ان میں تقدم وتاخر کی غیر ضروری بحث اطمینان بخش طور پر صاف ہوگئی ہے۔

اس موقع پر احقر کی کوشش یہی رہی ہے کہ اس گتھی کو حل کرنے میں بنیادی اہمیت حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ کی مختصر سوانح قاسمی کو دی جائے کہ اس سوانح کی اہمیت اور اس کی استنادی حیثیت کو تذکرۃ الرشید کی وجہ سے چیلنج بہر حال نہیں کیا جانا چاہئے راقم السطور احقر کو بات کے اسی پہلو پر اصرار ہے اور احقر بڑی حد تک پر امید بھی ہے کہ احقر کا یہ جذبہ واحساس انشاء اللہ تعالیٰ عند اللہ بھی قابل مواخذہ نہ ہوگا۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک کی ابتدا حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی مختصر سوانح کے مطابق تو یہ بتائی جا چکی ہے کہ دہلی کے قیام اور طالب علمی ہی کے زمانے میں حضرت امام نانوتوی وحضرت امام گنگوہی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے بیعت بھی ہو گئے تھے اور اسی وقت سے سلوک بھی شروع فرما دیا تھا— لیکن احقر نے زیر نظر مقالہ کی ترتیب کے دوران جب بہ نظر غائر سوانح قاسمی اور اس سلسلہ کی دوسری تحریرات دیکھیں تو احقر راقم اس نتیجہ پر پہنچا کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے مجموعی حالات پر غور کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگرچہ بادی النظر میں آپ نے متعدد حضرات اساتذہ کی خدمت میں زانوئے ادب بھی تہ کیا اور اگرچہ آپ نے بظاہر حضرت حاجی صاحب سے بیعت بھی کی اور حضرت کی تلقین کے مطابق ذکر واشغال ومجاہدہ وریاضات بھی کئے لیکن ان تمام مصروفیات ومشغولیات کے پس پردہ آپ کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔

راقم السطور نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی تحصیل علم اور آپ کے سلوک طریق کی تفصیلات کو متعدد بار بغور پڑھا تو احقر بھی اسی نتیجہ تک پہنچا ہے جسے مولانا گیلانی صاحب نے سوانح قاسمی میں بار بار دہرایا ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی ذات والا صفات اللہ تعالیٰ کی شان اجتبائی کا ایک خاص مظہر تھی، احقر کو صاف دکھائی دے رہا ہے کہ حضرت امام نانوتوی صرف قاسم العلوم ہی نہ تھے بلکہ اپنے سلوک واحسان کے نتیجہ میں ''جامع العلمین'' اور ''مجمع البحرین'' بھی تھے۔

حضرت امام نانوتوی کے علوم ومعارف اور منازل ومقامات صرف ان کے کسب واکتساب ہی کا نتیجہ نہ تھے بلکہ ان کا بڑا حصہ وہبی ولدنی بھی تھا جو براہ راست من جانب اللہ حضرت والا کے قلب

مبارک پر فائض و وارد ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ جن حضرات نے براہ راست حضرت امام قدس سرہ سے استفادہ کیا ہے ان کی شہادت یہی ہے کہ آپ کی تقریر درس میں جو علوم و معارف بیان ہوتے تھے وہ کسی کتاب سے ماخوذ و منقول نہیں ہوتے تھے۔

حضرت امام قدس سرہ کی تعلیمی زندگی کی تفصیلات کا بیشتر حصہ اگرچہ پردۂ خفا میں ہے کیونکہ آپ کی کتب درسیہ کی خواندگی کا صحیح طور پر پورا تسلسل مختصر سوانح عمری میں بیان نہیں ہوسکا ہے مگر جو کچھ بھی تفصیلات موجود و منقول ہیں انہیں دیکھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ کی درسی کتب کے تسلسل میں جہاں کہیں بھی کچھ خلا محسوس ہوتا ہے اور شبہ ہوتا ہے کہ شاید درمیان کی کوئی درسی کتاب خواندگی سے رہ گئی ہے لیکن مقام حیرت ہے کہ آپ کی علمی صلاحیت و استعداد جس انداز پر سامنے آئی اسے دیکھتے ہوئے صاف دکھائی دیتا ہے کہ درمیان کی کسی درسی کتاب کی ناخواندگی نے حضرت کی تعلیمی استعداد کو کسی طرح بھی تو متاثر نہیں کیا ہے۔

حضرت امام کی ''علمی عبقریت'' کو سمجھنے کے لئے حضرت کی طالب علمی کے دور کی صرف دو مثالیں لائق توجہ و قابل غور ہیں۔

(۱) پہلی مثال تو تعلیم اقلیدس کی ہے کہ عربک کالج دہلی میں جس سال حضرت امام نانوتوی تعلیم کے لئے داخل ہوئے ہیں اسی سال اس کالج کے لئے ایک نیا نصاب تعلیم تجویز ہوا تھا جس میں عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ عصری علوم بھی شامل کر لئے گئے تھے۔

نصاب تعلیم کی اس تبدیلی کے نتیجہ میں حضرت امام نانوتوی کو ریاضی اور اقلیدس بھی وہاں پڑھنا تھی مگر پڑھائی کا یہ مرحلہ کس طرح طے ہوا تھا؟ اسی پہلو کا تذکرہ یہاں مقصود ہے، سوانح قدیم میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی فرماتے ہیں:

> والد مرحوم مولانا مملوک العلی نے مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) سے فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کر لو۔ (۲۰)

(۲) دوسری مثال سوانح قاسمی ص ۲۶۳ پر ارواح ثلثہ کے حوالہ سے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی سابق نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کی مندرجہ ذیل روایت نقل کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

(۲۰) سوانح قاسمی ص: ۲۲۴

علوم عربیہ کے ممتحن مفتی صدرالدین صاحب ہوئے اور مولانا (محمد قاسم) کا ''صدرا'' کا امتحان ان کے پاس گیا، انہوں نے کوئی جگہ پڑھوائی مولانا کے ذہن میں اس کا مطلب نہ تھا کیونکہ وہ جگہ کبھی دیکھی بھالی نہ تھی تو اس پر تقریر کی اور خود جان رہے تھے کہ کتاب کا یہ مقصد نہیں ہے مفتی صاحب نے اس پر اعتراض کئے تو مولانا نے مفتی صاحب کو ان ہی تقریروں میں الجھا لیا لیکن (دل ہی دل میں) اس پر غور کرتے رہے کہ مطلب کیا ہے، بالآخر اک دم ذہن میں عبارت کا صحیح مطلب آ گیا تو فرمایا کہ مفتی صاحب آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ ''یہ بات'' فرمایا کہ لاحول ولاقوۃ اس بات کا جواب تو یہ ہے میں کچھ اور سمجھ رہا تھا، مفتی صاحب نے کہا کہ ہاں! یہی تو پوچھتا تھا۔(۲۱)

تعلیمی زندگی کی یہ دونوں ہی مثالیں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی ''عبقریت'' اور ''فطری علمی مناسبت'' کا ثبوت فراہم کرنے کے لئے کافی ہیں۔

اسی قسم کی متعدد مثالیں حضرت امام نانوتوی کے سوانح وحالات کے درمیان موجود ہیں جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے اس لئے ان تفصیلات کو نظر انداز کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی جارہی ہے۔

حضرت امام نانوتوی کی عبقریت وفطری علمی مناسبت کو دیکھ کر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور جیسا کہ سوانح قاسمی کے مندرج ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سوال پہلے بھی لوگوں کو پیش آچکا تھا ۔مولانا گیلانی ناقل ہیں:

حکیم الامت تھانوی قدس سرہ اپنے استاد مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی ہمارے مصنف امام کے حوالہ سے فرمایا کرتے تھے کہ ان (مولانا محمد یعقوبؒ) سے ایک دن کسی نے پوچھا کہ مولانا (یعنی مولانا محمد قاسم) کو یہ کمالات کس طرح حاصل ہوئے؟ اسی سوال کے جواب میں مولانا محمد یعقوب صاحب نے منجملہ دوسرے اسباب ووجوہ کے یہ بھی فرمایا کہ:

مولانا (محمد قاسم) فطری طور پر معتدل القویٰ اور معتدل المزاج تھے۔(۲۲) مولانا گیلانی اس اقتباس کے بعد فرماتے ہیں جیسا کہ معلوم ہے مولانا محمد یعقوب صاحب باضابطہ فن طب کے ماہر

---

(۲۱) ارواح ثلثہ ص:۱۹۶۔ (۲۲) قصص الاکابر ص ۳۰ بابت جمادی الاولی ۵۷ھ

اور استاذ تھے، مولانا مرحوم کے بچپن کے ساتھی اور رفیق تھے ان کی یہ شہادت کہ فطری طور پر مولانا کے قوئ اور مزاج دونوں معتدل تھے، میرے نزدیک تو صرف یہی ایک فقرہ حضرت نانوتوی کی جسمانی خصوصیات اور ان غیر معمولی خداداد نعمتوں کے ثبوت کے لئے کافی ہے جن سے آپ نوازے گئے تھے۔ (۲۳)

اس سلسلہ میں اپنی کچھ عرض معروض کرنے سے پہلے حضرت مولانا گیلانی کی سوانح قاسمی ہی کے حوالہ سے حضرت حکیم الامہ تھانوی قدس سرہ کا ایک اور ارشاد جو اوپر مذکور ارشاد ہی کا تتمہ تکملہ ہی کہا جاسکتا ہے وہ بھی عرض کر دینا برمحل ہوگا مولانا گیلانی فرماتے ہیں:

اسی موقع پر یعنی آپ کے قوئ اور مزاج کے اعتدال کا ذکر کرتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانوی اپنے بعض مذاکروں میں فرمایا کرتے تھے کہ ان کے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحب یعنی ہمارے ''مصنف امام'' نے یہ بھی کہا کہ اور حسب سنۃ اللہ اعتدال مزاج سے ''نفس کامل'' فائض ہوتا ہے۔ (۲۴)

حضرت حکیم الامت تھانوی کے حوالہ سے اپنے مصنف امام قدس سرہما کا ارشاد گرامی نقل کرنے کے بعد مولانا گیلانی اس کی مزید تشریح اور تائید کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

یہ اس زمانے کے مدرسی فلسفہ یا مشائی علماء کے طریقۂ فکر کی ایک تعبیر ہے، مادے میں جتنی زیادہ بہتر استعداد اور صلاحیت ہوتی ہے، ''واجب اول'' یعنی حق تعالیٰ کی طرف سے فیضان بھی اسی کے مطابق ہوتا ہے، اسی مفہوم کو مذکورہ بالا الفاظ میں ادا کرنے کے لوگ اس زمانے میں عادی تھے، لیکن ایمانی حکمت کی رو سے در حقیقت حضرت نانوتوی کی اجتبائیت (برگزیدۂ حق ہونے) ہی کا ایک معاصرانہ اقرار ہے، ہمارے یہاں جیسا کہ پہلے بھی کہہ چکا ہوں مادے میں قابلیت اور استعداد بھی دادِ حق ہی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ (۲۵)

اسی سوانح قاسمی میں حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے حوالہ سے ایک قصہ لکھا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ:

مولانا محمد یعقوب رحمۃ اللہ علیہ یعنی مصنف امام نے ایک نیا مضمون بیان کیا سننے والوں میں سے

---

(۲۳) سوانح قاسمی ص:۱۵۴۔ (۲۴) ص:۲۵ قصص بحوالہ سوانح قاسمی ج ۱ ص:۱۶۷۔ (۲۵) سوانح قاسمی ص:۱۶۸

کسی نے کہا کہ اس مضمون کو تو مولانا محمد قاسم صاحب نے بھی ایک دفعہ بیان کیا تھا، یہ سن کر مصنف امام نے فرمایا:

جہاں سے ہم کہتے ہیں وہاں ہی سے وہ (مولانا محمد قاسم) بھی فرماتے تھے — جس کا مطلب وہی ہوا کہ سرچشمہ دونوں حضرات کے علوم کا وہی تھا جو تقویٰ کی زندگی سے فطرت میں پھوٹ پڑتا ہے مگر اسی کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ

''مگر اتنا فرق ہے کہ ان کے لئے سمندر کے برابر کھلتا ہے اور ہمارے لئے سوئی کے ناکے کے برابر کھلتا ہے۔'' (۲۶)

حضرت امام نانوتوی کے خداداد علم کی یہ مندرجہ بالا کیفیت سوانح قدیم میں حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ نے خود حضرت امام کے فرمائے ہوئے الفاظ میں یوں نقل فرمائی ہے فرماتے ہیں:

آمد معانی اور مضامین کی ایسی تھی یوں فرماتے تھے کہ بعضے بار حیران ہو جاتا ہوں کہ کیا کیا بیان کروں۔ (۲۷)

اسی سلسلہ میں ''ارواح ثلثہ'' میں منقول حضرت مولانا محمد یعقوب قدس سرہ کا یہ بیان بھی یہاں نقل کر دینا یقیناً برمحل ہوگا کہ:

چھتہ کی مسجد میں کچھ لوگ جمع تھے اسی مجمع میں (حضرت مولانا محمد یعقوب) فرمانے لگے کہ بھائی آج تو صبح کی نماز میں ہم مرجاتے بس کچھ ہی کسر رہ گئی لوگ حیرت سے پوچھنے لگے آخر کیا حادثہ پیش آیا؟ سننے کی بات یہی ہے، جواب میں فرما رہے تھے کہ آج صبح میں سورۂ مزمل پڑھ رہا تھا کہ اچانک علوم کا اتنا عظیم الشان دریا میرے قلب کے اوپر گزرا کہ میں تحمل نہ کر سکا اور قریب تھا کہ میری روح پرواز کر جائے — کہتے تھے کہ وہ تو خیر گزری کہ وہ دریا جیسا اک دم آیا تھا ویسا ہی نکلا چلا گیا اس لئے میں بچ گیا — آگے یہ بھی ارشاد گرامی منقول ہے کہ نماز کے بعد میں نے غور کیا کہ یہ کیا معاملہ تھا تو منکشف ہوا کہ حضرت مولانا نانوتوی ان ساعتوں میں میری طرف میرٹھ میں متوجہ ہوئے تھے، یہ ان کی توجہ کا اثر ہے کہ علوم کے دریا دوسروں کے قلوب پر موجیں مارنے لگیں

(۲۶) ص:۲۹، الہادی جمادی الثانیہ ص: ۲۵۷۔ (۲۷) سوانح قدیم ص: ۳۵ مشمولہ سوانح قاسمی ص ۳۵

اور تحمل دشوار ہو جائے — اسی سلسلہ میں حضرت مصنف امام نے حضرت امام نانوتوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اس کے قلب کی وسعت کا کیا حال ہوگا جس میں وہ علوم سمائے ہوئے ہیں اور وہ کس طرح ان علوم کا تحمل کیے ہوئے ہوگا۔ (۲۸)

سطور بالا میں حضرت امام نانوتوی کی وسعت قلب اور کثرت علوم کی شہادات حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے حوالہ سے نقل کی گئیں جو حضرت امام نانوتوی کے استاد زادہ ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت کے شاگرد بھی تھے، اس لئے ممکن ہے کسی کو ان بیانات وشہادات میں سعادت مند شاگرد کی بیجا عقیدت مندی کا خیال گذرے اس خیال سے آئندہ سطور میں حضرت امام نانوتوی کے حقیقی مقام شناس معاصر فقیہ النفس حضرت محدث گنگوہی کا بھی ایک ارشاد نقل کیا جارہا ہے۔

ملفوظات حکیم الامت کے مجموعہ حسن العزیز ص ۳۸۲ کے حوالہ سے معارف الاکابر (ناشر ادارۂ اسلامیات لاہور) کے ''معارف نانوتوی'' کے تحت حضرت حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ کا ایک ملفوظ نقل کیا گیا ہے جس میں حضرت گنگوہی قدس سرہ نے حضرت امام نانوتوی کو ''شہباز عرش'' فرمایا ہے حکیم الامت نے فرمایا ایک جگہ مولانا محمد قاسم وعظ فرمارہے تھے مولانا گنگوہی بھی شریک تھے ایک بولے کہ خیر وعظ کی مجلس میں بیٹھنے کا ثواب تو ہوگیا، باقی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، اگر مولانا کچھ عام فہم مضامین بیان فرمایا کریں تو کچھ نفع بھی ہو، مولانا گنگوہی سن رہے تھے فرمایا کہ افسوس ہے ''شہباز عرش'' سے درخواست کی جاتی ہے کہ زمین پر اڑے۔

حضرت محدث کبیر مولانا گنگوہی قدس سرہ کا یہ ایک فقرہ جو نہایت بلیغ تشبیہ پر مشتمل ہے حضرت امام نانوتوی کے بلند علمی مقام کو سمجھانے کے لئے بہت کافی ہے، حضرت محدث گنگوہی کے اس ''بلیغ فقرہ'' کی حقیقت حضرت مصنف امام کے بیان فرمائے مندرجہ ذیل واقعہ سے اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے جسے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے حوالہ سے ارواح ثلثہ میں نقل کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے میں نے خود سنا فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں نے

---

(۲۸) سوانح قاسمی ج ۱، ص: ۳۴۔

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی مسئلہ کے متعلق کچھ سوال کیا اس وقت حضرت مولانا چھتے کی مسجد کے چھپر والے حجرہ میں تھے اور کوئی خاص کیفیت طاری تھی مولانا نے اس مسئلہ پر تقریر شروع کی لیکن اس تقریر میں لفظ بھی غیر مانوس تھے اور معانی بھی غیر مانوس جن کو میں قطعاً نہ سمجھ سکا، میں نے عرض کیا کہ کچھ ''نازل'' ہو کر تقریر فرمایئے میں قطعاً نہیں سمجھا، پھر دوبارہ تقریر فرمائی جو اس سے کچھ نازل تھی جس کے لفظ مانوس تھے مگر معانی قطعاً بلند اور غیر مانوس جن کو میں نہ سمجھا تیسری دفعہ میں نے پھر کہا کہ میں نہیں سمجھا کچھ اور نازل ہو کر فرمایئے پھر اس سے اتر کر اور نازل تقریر فرمائی جو کچھ قریب الفہم آگئی تھی مگر پھر بھی نہ سمجھا اور میں نے عرض کیا کہ میں نہیں سمجھا تو فرمایا کہ مولانا پھر کسی وقت پوچھئے گا۔ (۲۹)

گذشتہ صفحات میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی غزارت علم وہبی کی کچھ تفصیلات پیش کردی گئی ہیں اب آئندہ صفحات میں حضرت امام کی طہارت قلب وصفائی باطن پر بھی روشنی ڈالی جائے گی جس سے راقم السطور کا یہ دعویٰ پورے طور پر مبرہن ہوجائے گا کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ صرف قاسم العلوم ہی نہ تھے بلکہ جامع العلمین ومجمع البحرین بھی تھے۔

سوانح قاسمی میں مولانا گیلانی علیہ الرحمہ نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے فطری عالم وسالک ہونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بار بار حضرت والا قدس سرہ کے لئے ''اجتبائی'' اور ''اجتبائیت'' کا فقرہ استعمال کیا ہے مگر وہ اپنی نکتہ آفرینی کی حد سے آگے بڑھ کر بطور جزم اس کو اپنے اذعانی واعتقادی انداز میں پیش کرتے ہوئے جھجک بھی محسوس کرتے نظر آتے ہیں، موصوف کی اس کیفیت کو راقم السطور نے سوانح قاسمی کے صفحات میں بار بار محسوس کیا اور موصوف کی اس کشمکش کی کیفیت کو دیکھ کر احقر کو اصغر کا یہ شعر یاد آتا رہا:

نہ کامیاب ہوا اور نہ رہ گیا محروم بڑا غضب ہے کہ منزل پہ کھو گیا ہوں میں

راقم السطور حضرت امام قدس سرہ کے حالات وسوانح کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد جس نتیجہ تک پہنچ سکا ہے وہ بالکل صاف اور واضح الفاظ میں یوں عرض کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے حضرت امام نانوتوی كُلُّ مولودٍ يُولَدُ على الفطرة کے مکمل اور صحیح مصداق تھے جس کی تائید حضرت مولانا محمد

---

(۲۹) ارواح ثلثہ ص ۱۹۷، سوانح قاسمی ج ۱ ص: ۴۱۴

یعقوب صاحب نانوتوی کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے جو اوپر نقل کیا جا چکا ہے کہ:

مولانا (محمد قاسم) فطری طور پر معتدل القوی اور معتدل المزاج تھے ـــــــ اور حسب سنت اللہ اعتدال مزاج سے ''نفس کامل'' فائض ہوتا ہے۔

معارف الاکابر میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کا یہ ملفوظ مزید تفصیل کے ساتھ مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا:

اس میں کئی چیزوں کو دخل ہے ایک تو مولانا طب کی رو سے معتدل مزاج تھے اس سے اس پر نفس کامل فائض ہوا دوسرے یہ کہ استاد بڑے کامل ملے یعنی مولانا مملوک العلی صاحب جن کا علم وفضل مخفی نہیں تیسرے یہ کہ آپ متقی اعلیٰ درجے کے تھے۔ پھر ان میں استاد کا ادب بہت تھا (اس کی مثال یہ ہے کہ حضرت امام حضرت مولانا ذوالفقار علی صاحب کا بھی نہایت ادب فرماتے تھے صرف اس وجہ سے کہ ان کے بڑے بھائی مولانا مہتاب علی صاحب امام نانوتوی کے استاد تھے اس کے علاوہ یہ وجہ تھی کہ مولانا مملوک العلی صاحب نے اپنی بیماری میں کافیہ کا ایک سبق مولانا ذوالفقار علی صاحب کے ذریعہ پڑھوا دیا تھا پھر پیر بھی بڑے کامل ملے یعنی حضرت حاجی صاحب۔ (۳۰)

اس بنا پر سمجھا جا سکتا ہے کہ تحصیل علوم وفنون اور تحصیل عرفان واحسان کے سلسلہ میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی جو کچھ ''چلت پھرت'' اور ''بھاگ دوڑ'' کے حالات ہمیں حضرت کی سوانح میں ملتے ہیں وہ سب درحقیقت حضرت امام کے ''علم لدنی'' اور ''پیدائشی ولایت'' پر ایک طرح کا پردہ ہیں اور یہ پردے بھی اللہ تعالیٰ نے اس لئے ڈال دیئے ہیں کہ حضرت امام کی سب سے بڑی خواہش دلی یہی تھی کہ وہ گمنام رہیں اور گمنام ہی چلے جائیں:

تو چنیں خواہی خدا خواہد چنیں می دہد یزداں مرادِ متقیں

پھر حضرت امام نانوتوی کی شخصیت پر پڑے ہوئے پردوں میں بھی صورت یہ ہوئی کہ حضرت امام قدس سرہ کا پردہ علم حضرت کے سلوک وعرفان کے لئے بڑا پردہ بن گیا اور حضرات صوفیہ کے مقولہ ''العلم الحجاب الاکبر'' کا مصداق سامنے آ گیا۔

---

(۳۰) معارف الاکابر ص: ۲۳۲۔

حضرات اہل طریق کی تصریحات کے مطابق اگر غور کیا جائے تو سلوک وتصوف کی بنیاد دو چیزوں پر ہے: اخلاص (واحسان) اور تقویٰ۔

تقویٰ کے مفہوم میں اس درجہ وسعت وگنجائش ہے کہ جملہ اوامر ومندوبات کا امتثال اور جملہ نواہی ومکروہات سے اجتناب، یہ دونوں ہی اس کے مفہوم میں داخل ہیں اور جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا حضرت امام کا زہد وتقویٰ ہمارے علمائے اکابر دیوبند میں مسلم اور متفق علیہ ہے اور حضرت کی کتب سوانح میں اس کی مثالیں مذکور ہیں۔ چنانچہ معارف الاکابر میں حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ کے ملفوظات (۳۱) کے حوالہ سے نقل کیا گیا ہے:

فرمایا: بزرگوں نے مشتبہ مال سے بچنے کا بڑا اہتمام کیا ہے، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی ایک شخص نے دعوت کی، کھانا مشتبہ تھا آپ نے اس کی دلجوئی کے لئے کھا تو لیا مگر گھر پر آکر قے کرکے سب نکال دیا۔

اس سے ایک طالب علمانہ شبہ ہوسکتا ہے وہ یہ کہ تناول کا ارتکاب تو ہو ہی چکا تھا جو مذموم ہے، پھر ایسا کرنے سے کیا نفع ہوا؟ جواب یہ ہے کہ ایک فعل تو ہے کھانا وہ تو بے شک واقع ہو چکا مگر دوسری چیز ہے جزو بدن بننا، جزو بدن بننے سے جو ظلمت ہوتی اس سے بچاؤ کیا، جیسا کہ حضرت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بے خبری میں اجرت کہانت کا دودھ پی لیا تھا جس پر کوئی مواخذہ نہ تھا (کہ بے خبری میں کیا تھا) مگر پھر بھی خبر ہونے کے بعد قے کردی، اس کا بھی یہی نفع تھا۔ (۳۲)

حضرت حکیم الامۃ قدس سرہ کے ملفوظات ہی میں یہ ارشاد بھی ہے:

فرمایا مولانا محمد قاسم صاحب جب مدرسہ دیوبند کے دوات قلم سے کوئی خط لکھتے تھے تو روشنائی اور قلم کے استعمال کے عوض میں ایک پیسہ دے دیتے تھے۔ (۳۳)

حضرت امام نانوتوی کے تقویٰ کی مثال میں وہ مشہور واقعہ بھی اسی موقع پر ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے:

خورجہ میں ایک دفعہ کسی نے ایک خوش گلو آدمی کو مجلس مبارک میں لاکر چاہا کہ حافظ کی مشہور غزل

---

(۳۱) الافاضات الیومیہ ج ۲، ص: ۳۰۰۔ (۳۲) معارف الاکابر ص: ۲۴۶۔ (۳۳) الکلام الحسن بحوالہ معارف الاکابر ص: ۲۷۴

— غلام نرگسِ مست تو تاجدارانند — کے مطلع والی سنوائیں حضرت کو اس ارادے کا علم اس وقت ہوا جب خوش گلو آدمی نے شعر الاپنا شروع کیا مگر ایک ہی مصرعہ تک بات پہنچی تھی کہ بیچارہ گھبرا کر رک گیا اور سیدنا الامام الکبیر کی طرف خطاب کرکے کہنے لگا کہ: ''آپ تو مجھے پڑھنے ہی نہیں دیتے''

(حاشیہ پر یہ تفصیل دی گئی ہے) امیر شاہ خاں کہتے ہیں کہ بعد کو ان ہی گانے والے خوش گلو صاحب سے پوچھا گیا کہ آخر تم کو محسوس کیا ہوا؟ جواب میں کہا کہ بھائی صاحب گانے میں آگے پڑھنے کا ارادہ کرتا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زبان پر میرے کسی نے انگلی رکھ دی اور اسے ایسا دبا دیا کہ آگے چل ہی نہیں سکتا۔ (۳۴)

چونکہ خواہش بھی یہی تھی۔ کہا بھی گیا کہ بس ختم کرو تمہاری آواز اچھی ہے، مجلس جب برخاست ہوئی تو جن صاحب نے گانے کی تحریک کی تھی نام ان کا عبداللہ خاں تھا۔ گلاؤٹھی کے رہنے والے تھے، ان ہی سے دیکھا گیا کہ سیدنا الامام الکبیر فرما رہے ہیں اور چیں بہ جبیں ہو کر فرما رہے ہیں کہ:

میرا ایماء معلوم کئے بغیر ایسی فرمائش کی؟ اور آخر میں مولوی عبداللہ سے کہنے لگے کہ میں جس طرح ''صوفیوں'' میں بدنام ہوں، اسی طرح ''مولویت'' کا دھبہ بھی مجھ پر لگا ہوا ہے اس لئے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے (ص: ۱۷۶)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے بلند مقام تقویٰ سے تعلق رکھنے والے اس واقعہ کو نقل کرتے ہوئے راقم السطور کو بڑی شدت سے اس نمایاں تبدیلیٔ احوال کا احساس ہو رہا ہے اور وہ مجبور ہے کہ اگر زیادہ نہیں تو کم از کم دو ایک ہی جملے اس تبدیلیٔ احوال سے متعلق بھی قلم بند کر دے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی یادگار تذکار منانے کا اصل مقصد تو یہی ہے کہ لوگوں کے سامنے حضرت امام کی مکمل حیات کا صحیح نقشہ اپنے اصل خدوخال کے ساتھ آجائے۔

قابل غور اور لائق عبرت ہے کہ بانیٔ دارالعلوم حضرت امام نانوتوی قدس سرہ تو حضرت حافظ شیرازی کی ایک غزل کو بھی لہجہ وراگ اور خوش الحانی کے انداز میں سننے کے صرف یہی نہیں کہ روادار نہیں ہوئے بلکہ اس کے لئے اس کرامت کے اظہار پر بھی مجبور ہو گئے جسے عام حالات میں حضرت

---

(۳۴) ارواح ثلثہ ص: ۱۷۶۔

امام چھپانے ہی کا اہتمام فرمایا کرتے تھے اور آج صورت حال اس سے کس درجہ مختلف ہو چکی ہے کہ اب اسی دارالعلوم دیوبند کے فارغین وفاضلین کی خاصی تعداد ٹی، وی جیسی منکر چیز کو اپنے گھروں میں ساتھ رکھتی اور اس کا جواز ثابت کرنے کے لئے زمین وآسمان اور ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی؟

حضرت امام قدس سرہ کے سلوک کی بحث کا آغاز کرتے ہوئے راقم السطور عرض کر آیا ہے کہ سلوک کی بنیادی چیزیں دو ہیں۔ سطور بالا میں حضرت کے تقویٰ کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے، آئندہ سطور میں حضرت امام قدس سرہ کے اخلاص واحسان کا ذکر کیا جارہا ہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے ان مکاتیب تک راقم السطور کی رسائی آج (۱۹/ جمادی الاولی ۱۴۲۰ھ مطابق یکم ستمبر ۱۹۹۹ء) تک نہیں ہوسکی ہے جو حضرت امام نے اپنے مسترشدین کو لکھے ہیں اس لئے حضرت والا کے سلوک واحسان کی ترجمانی کا حق تو ادا کرنا حد درجہ مشکل ہے، امام موصوف کے ایسے گرامی نامے صرف معدودے چند ہی دستیاب ہوئے جن میں سے دو مکتوب مقالہ زیر نظر کے شروع میں نقل کئے جاچکے ہیں، تین مکتوب گرامی یہاں نقل کئے جارہے ہیں ملاحظہ ہوں:

(۱) مکتوب گرامی بنام شیخ ضیاء الحق عثمانی (خویش حضرت حاجی رفیع الدین صاحب مہتمم اول دارالعلوم دیوبند)

برادر عزیز شیخ ضیاء الحق سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون اینکہ عبادت میں دل نہ لگنا کسی خطا کی سزا ہے، استغفار ولاحول کی کثرت چاہئے، باقی قرض کے لئے کسی عامل سے پوچھئے، مجھ کو "عملیات" میں دخل نہیں، ہاں اس سے پہلے پہلے قرض وکشائش کے لئے حَسْبِیَ اللہ وَنِعْمَ الوکیل اور لاحول ولا قوۃ اِلَّا باللّٰہِ ولا ملجأ مِنَ اللّٰہِ اِلَّا الیہ پانچ پانچ سو بار پڑھ لیا کرو اور اول وآخر درود شریف بھی پڑھ لیا کرو اور پڑھتے وقت یہ دھیان رکھا کرو کہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں اور دل وزبان سے عرض مطلب کررہا ہوں، الراقم محمد قاسم عفی عنہ (۳۵)

(۲) مکتوب گرامی قاسمی بنام مرزا محمد عالم بیگ صاحب

---

(۳۵) مکتوبات اکابر ص: ۵۳۔

سراپا عنایت سلامت! السلام علیکم آج گیارہویں رمضان کو آپ کا عنایت نامہ پہنچا۔ عبادت میں دل نہ لگنا کسی خطا کی سزا ہے۔ استغفار اور لاحول کی کثرت چاہئے، باقی قرض کی ادائیگی کے لئے کسی عامل سے پوچھئے، مجھ کو عملیات میں دخل نہیں، اگر ہو سکے تو جناب مولوی اکبر علی خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر حال عرض کر دو ادائے قرض کے لئے جو کچھ فرمائیں اس کی تعمیل کر و اور کشائش رزق کے لئے جو کچھ ارشاد فرمائیں اس کو یاد رکھو، ہاں اس سے پہلے **حسبی اللہ و نعم الوکیل** اور **لاحول ولا قوۃ الا باللہ ولا ملجأ ولا منجی من اللہ الا الیہ** پانچ پانچ سو بار پڑھ لیا کرو اور اول و آخر گیارہ بار درود شریف بھی پڑھ لیا کرو اور پڑھتے وقت یہ دھیان رکھا کرو کہ میں اپنے اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں اور دل و زبان دونوں سے عرض مطلب کر رہا ہوں۔

مرزا قادر بیگ صاحب مرزا محمد نبی بیگ صاحب کو یاد رہے تو سلام کہہ دینا اور سوائے ان کے اور کوئی احباب میں مل جائے اور یاد آجائے تو ان کو بھی، فقط (۳۶) اس مکتوب پر نام و دستخط اور تاریخ تحریر بھی درج نہیں ہے ناقل رومی)

(۳) سراپا عنایت مرزا محمد عالم بیگ صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ السلام علیکم آج پندرہویں تاریخ (مہینہ مذکور نہیں ہے) جمعہ کو تمہارا خط پہنچا کیفیت حال معلوم ہوئی پچھلے دنوں اثنائے سفر میں بیمار ہو گیا تھا اس مرض سے شفا تو اثنائے راہ ہی میں ہو گئی تھی مگر جب سے کسی نہ کسی قسم کی خلش چلی جاتی ہے، اسی میں کھانسی کی شدت ہو گئی دو تین مہینے اس کی تکلیف رہی اب بفضلہ تعالیٰ اس کو بھی آرام ہے یوں ہی برائے نام باقی ہے انشاء اللہ تعالیٰ وہ بھی رفع ہو جائے گی غرض اب میں اچھا ہوں۔

باقی کمی ہوس دنیا کے لئے یادگاری موت سے بہتر کچھ نہیں، ہو سکے تو ہر روز گھڑی آدھ گھڑی موت کے تصور میں گذار دیا کرو اور اس وقت اس قسم کا خیال رکھا کرو کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جس قدر انبیا ہوئے وہ سب مر گئے (وفات پا گئے) جس قدر بادشاہ اس زمانے سے پہلے ہوئے وہ سب مر گئے، بہ زور دین کوئی چھوٹتا تو انبیا چھوٹتے اور بہ زور دنیا کوئی بچتا تو بادشاہ

(۳۶) ماخوذ از مکتوبات قاسمی نسخہ قدیم۔

بچتے میں نہ الی الذی نہ اولا الذینہ زور دینی نہ زور دنیا میں، بچوں تو کیوں کر؟ پھر اس کے ساتھ قیامت کے حساب و کتاب اور عذاب و ثواب کو سوچا کرو فقط (۴۷) (اس مکتوب پر بھی نام و دستخط درج نہیں ہے۔ ناقل رومی)

تعلیقات

حضرت امام محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے تین مکتوبات اوپر نقل کئے گئے ہیں جن میں سے پہلے دو مکتوب میں حضرت امام والا مقام نے ہر دو مکتوب الیہ کو ''مراقبہ احسانی'' کی تلقین فرمائی ہے اور تیسرے مکتوب میں ہوس دنیا کی کمی کے لئے ''مراقبہ موت و مراقبہ قیامت'' تجویز فرمایا ہے۔

احقر راقم السطور نے اس قسم کے مکتوبات کی روشنی میں یہ اندازہ کیا ہے کہ حضرت امام نانوتوی کی تعلیم و تربیت کا انداز کتاب و سنت کی تعلیمات ہی پر مبنی تھا حضرات صوفیائے کرام کے مابین مروج وظائف و عملیات کی تعلیم و تلقین حضرت کی تعلیمات میں نہیں ملتیں جو شخص بھی حضرت سے اس قسم کے عملیات دریافت کرتا آپ صاف الفاظ میں اپنی لاعلمی ظاہر فرماتے ہوئے تحریر فرمادیتے کہ کسی عامل سے پوچھئے مجھ کو عملیات میں دخل نہیں۔

حضرت امام گرامی کے ان مکتوبات میں اپنے مسترشدین کو ''مراقبۂ احسانی'' کی تلقین و تاکید دیکھ کر احقر کو تو کچھ ایسا لگا کہ حضرت امام قدس سرہ نے اپنے زمانہ طالب علمی میں صرف پڑھنے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا تھا بلکہ جو کچھ پڑھا تھا اسے گنا بھی تھا جیسا کہ حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے اپنی ملاقات کے تذکرہ میں فرمایا ہے کہ:

> ایک بار از راہ شفقت دریافت فرمایا کون سی کتابیں پڑھتے ہو؟ حضرت حکیم الامت پر اس قدر رعب وداب غالب ہوا کہ کتابوں کے نام بھول گئے، پھر مولانا (امام نانوتوی) نے دوسری باتیں شروع کیں تاکہ ہیبت کا اثر کم ہو جائے اور حضرت حکیم الامت کی طبیعت کھل جائے — چنانچہ (کچھ دیر بعد) فرمایا کہ:

ایک ہوتا ہے پڑھنا اور ایک ہوتا ہے گننا، محض پڑھنا کافی نہیں، گننے کی ضرورت ہے، پھر ایک مثال بیان فرمائی کہ ایک حافظ ہدایہ تھے مگر سمجھ کر نہیں پڑھی تھی جنہوں نے سمجھ کر پڑھی تھی کہا کہ ایک مسئلہ

---

(۴۷) ماخوذ از مکتوبات قاسمی قدیم نسخہ۔

ہدایہ میں ہے، حافظ ہدایہ نے انکار کیا کہ یہ مسئلہ ہدایہ میں نہیں ہے میں ہدایہ کا حافظ ہوں مگر جب دوسروں نے کتاب کھول کر عبارت پڑھ کر استنباط کیا تو حافظ ہدایہ حیران رہ گئے اتنا فرما کر حضرت حکیم الامت سے فرمایا کہ یہ فرق ہے پڑھنے اور گننے میں۔ (۳۸)

حضرت امام کے اس ارشاد کی روشنی میں یہی سمجھا جانا چاہئے کہ امام موصوف نے خود بھی اپنے زمانۂ تعلیم میں محض پڑھنے پر اکتفا نہیں فرمایا تھا بلکہ جو کچھ پڑھا تھا اسے پوری طرح گنا بھی تھا اور شاید اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ حدیث جبرئیل میں آئی ہوئی تشریح ''احسان'' کا مراقبہ حضرت کی تعلیم وتربیت کا بنیادی نقطہ اور مرکزی خیال بن گیا اور اپنے ہر مسترشد کو حضرت امام نے اس کی تلقین وتاکید فرمانا ضروری خیال فرمالیا۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے اصلاحی وتربیتی مکاتیب اگرچہ زیادہ نہیں مل سکے ہیں مگر جو چند خطوط دستیاب ہوئے ہیں انہی کے ذریعہ احقر راقم السطور اس نتیجہ تک پہنچ سکا ہے، احقر کو تو صورت حال کچھ اس طور پر سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت امام نانوتوی نے پہلی ہی بار جب حدیث جبرئیل میں ''ماالاحسان'' کا جواب پڑھا ہوگا اسی وقت سے پڑھنے کے دوسرے درجہ ''گننے'' کی بھی تکمیل فرما کر باقاعدہ طور پر عملی مشق بھی شروع فرمادی ہوگی اور پھر نتیجہ یہی ہوا ہوگا کہ یہ ''کیفیت احسانی'' حضرت کا ملکہ راسخہ بن گئی ہوگی۔

سطور بالا میں حدیث جبرئیل میں آئے ہوئے ''ماالاحسان'' کے سوال کا ذکر بار بار آچکا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حدیث شریف میں اس سوال کا جو جواب دیا گیا ہے یعنی اَنْ تَعْبُدَ اللہ کاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَمْ تَکُنْ تَرَاہ فَاِنَّہ یَرَاکَ. (تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ (یہ بات تو بہرحال یقینی ہی ہے کہ) اگر تم اسے نہیں بھی دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں بہرحال دیکھ رہا ہے) حدیث کے اس جواب سے متعلق کچھ ضروری توضیح وتشریح بھی یہاں کردی جائے۔

احقر نے مشکوۃ شریف جب پڑھی تھی تو یاد پڑتا ہے کہ اس حدیث کا مطلب یا تو استاد محترم ہی نے یہ بتایا تھا یا احقر خود کسی غلط فہمی میں حدیث شریف کا یہ مطلب سمجھ بیٹھا تھا کہ اس حدیث میں احسانی مراقبہ کے دو درجے بتائے گئے ہیں۔

---

(۳۸) معارف الاکابر ص: ۲۳۹۔

(۱) مراقبہ احسانی کا پہلا درجہ تو یہ ہے کہ عبادت کرنے والا یہ بات دل میں جمالے کہ میں خدا تعالیٰ کے سامنے حاضر و موجود ہوں اور اسے دیکھ رہا ہوں اس خیال کو دل میں جماتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرے لیکن ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مشاہد ہونے اور منظور الیہ ہونے کا خیال دل میں جمالینا عام حالات میں آسان نہیں ہے اس لئے حدیث شریف کے اگلے فقرے میں مراقبہ احسانی کا دوسرا درجہ بھی بتادیا گیا ہے وہ یہ کہ:

(۲) اگر تم پہلے درجہ کے مطابق خدا تعالیٰ کے حاضر و موجود اور مشاہد و منظور الیہ ہونے کا خیال دل میں نہیں جماسکتے ہو تو پھر یہ بات ہی دل میں جمالو کہ خدا تعالیٰ جو کہ خبیر و بصیر بھی ہے وہ تو مجھ کو دیکھ ہی رہا ہے، میں اس کے معاینہ و مشاہدہ میں تو بہر حال ہوں اس لئے مجھے یہ عبادت اس طور پر ادا کرنی ہے جس طرح خدا تعالیٰ کے سامنے ہونی چاہئے، میں اگرچہ خدا تعالیٰ کو نہیں دیکھ رہا ہوں لیکن وہ تو دیکھ ہی رہا ہے۔

حدیث جبریل میں ''احسان'' کی حقیقت اوپر جو بیان ہوئی ہے، مشکوۃ شریف پڑھنے کے زمانے (یعنی ۱۳۶۴ھ) میں تو احقر یہی سمجھتا رہا تھا لیکن بعد کو کسی وقت تذکرۃ الرشید حصہ اول میں قرآن و حدیث کے بعض مقامات کی تشریحات جو امام ربانی محدث گنگوہی قدس سرہ سے منقول ہوئی ہیں ان میں اس حدیث احسان کی تشریح یوں منقول ہے جو احقر کے فہم ناقص کے مطابق زیادہ قابل قبول ہے۔(۳۹)

(۸) **تَعْبُدَ رَبَّكَ كَانَّكَ تراه فان لم تَكُن تراه فانه يَراك** کی توضیح میں ارشاد فرمایا کہ فا (**فان لم تكن كى فا**) اس جگہ علت کے لئے ہے پس معنی حدیث یوں ہوئے کہ حق تعالیٰ کی ایسی عبادت کرو کہ گویا اس کو دیکھ رہے ہو اس لئے کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھتے (کیونکہ اس کی رویت دنیا میں غیر ممکن ہے) تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔ اور اسی وجہ سے ''**كانك تراه**'' حرف تشبیہ کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ گویا تم اس کو دیکھتے ہو ''**تراه**'' محض نہیں فرمایا کہ حقیقتاً دیکھ ہی رہے ہو، غرض مقصود حدیث میں جملہ ثانیہ ''**فان لم تكن الخ**'' سے بھی جملہ اولیٰ ''**كانك تراه**'' کا ثابت کرنا مقصود ہے نہ کہ تردید و تشقیق جیسا کہ عام شراح سمجھ رہے ہیں اگر تقسیم مراد ہوتی تو یوں ارشاد ہوتا: **فان لم تكن فى درجة كانك**

(۳۹) ملاحظہ ہو تذکرۃ الرشید مطبوعہ قدیم بلالی اسٹیم ساڈھورہ۔

تراه فانه یراك. فلیفهم (۴۰)

چونکہ شیخین علمائے دیوبند حضرت امام گنگوہی اور حضرت امام نانوتوی قدس سرہما نے کتب حدیث حضرت شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے پڑھی تھیں اس لئے بطور ظنِ غالب یہی سمجھا اور کہا جاسکتا ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ بھی حدیث احسان کی تشریح اسی طور پر فرماتے رہے ہوں گے جس طرح اوپر تذکرۃ الرشید سے نقل کی گئی ہے۔

اوپر یہ بات بھی نقل ہو چکی ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ صرف پڑھنے کے قائل نہ تھے بلکہ پڑھنے کے ساتھ گننا بھی ضروری سمجھتے تھے اس لئے حدیث جبرئیل میں جب حضرت امام قدس سرہ کو احسان کی حقیقت دریافت ہوگئی تو پھر حضرت نے اپنی پوری زندگی میں اسے ہر دم اپنے پیش نظر ہی رکھا اور برابر اس کی عملی مشق بھی فرماتے رہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے تین والا نامے جو چند صفحات پہلے نقل کئے جاچکے ہیں ان سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ مراقبۂ احسانی حضرت امام کے لئے ملکہ راسخہ بن گیا تھا اور اسی کا یہ اثر تھا جو اوپر کے نقل شدہ مکاتیب مین دیکھا گیا کہ حضرت امام قدس سرہ نے اپنے ہر مکتوب الیہ کو بھی اسی مراقبۂ احسانی کی تلقین فرما کر اسے بھی اپنے ہی رنگ میں رنگنا چاہا ہے۔

مندرجہ بالا مکاتیب میں سے پہلے کے دو مکاتیب میں تو دونوں صاحبان کو مراقبہ احسانی کی تلقین وہدایت فرمائی گئی ہے اور تیسرے گرامی نامہ میں مرزا محمد عالم بیگ کو ہوس دنیا کی کمی کے لئے ''مراقبہ موت'' و ''مراقبہ قیامت'' کی ہدایت فرمائی ہے کہ حدیث شریف میں موت کے لئے ''ہادم اللذات'' (لذتوں کو ڈھا دینے والا) کا لقب تجویز فرمایا گیا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: أَكْثِروا ذِكْرَ هادِمِ اللَّذَّاتِ ''لذتوں کو ڈھا دینے والی چیز (موت) کا ذکر کثرت سے کیا کرو''۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے متعلق جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے حضرت امام کا سلوک صرف قرآن وحدیث ہی کی تعلیمات پر مبنی تھا چنانچہ حضرت امام کے تجویز کردہ دونوں ہی مراقبے (مراقبۂ احسانی اور مراقبۂ موت) حدیث شریف ہی کے تعلیم فرمودہ مراقبے ہیں۔ مراقبۂ احسان تو حدیث جبرئیل میں بتایا ہوا مشہور مراقبہ ہے جسے حضرات مشائخ صوفیہ نے اپنے طریق کی

(۴۰) تذکرۃ الرشید مطبوعہ بلالی اسٹیم ساڈھورہ ج ۱، ص: ۱۰۴۔

بنیاد ہی قرار دیا ہے اور مراقبۂ موت بھی بعض احادیث میں تعلیم فرمایا گیا ہے۔

چنانچہ مشکوٰۃ شریف میں امام بیہقیؒ کی شعب الایمان سے بروایت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ منقول ہے:

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ان هذه القلوب تصدأ كما يصدأ الحديد اذا اصابه الماء و قيل يَا رَسُولَ اللّٰهِ وما جلاؤها قال كثرة ذكر الموت وتلاوة القران. (مشکوٰۃ شریف، ص:۱۸۹)

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ قلوب انسانی بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں جس طرح لوہا زنگ آلود ہو جاتا ہے جب اس پر پانی کا اثر پڑ جائے تو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ پھر دل کی صفائی (اس کی قلعی) کیسے ہوتی ہے آپ نے فرمایا موت کو بکثرت یاد کرنے سے اور تلاوت قرآن کی کثرت سے قلوب کا تصفیہ ہوتا ہے۔ (مشکوٰۃ شریف ص:۱۸۹)

مشکوٰۃ شریف ہی میں انہیں امام بیہقیؒ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ روایت منقول ہے:

قال تلا رسول الله صلى الله عليه وسلم فَمَنْ يُرِدِاللّٰهُ اَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَح صَدْرَه للاسلام. فقال رَسُوْل الله صلى الله عليه وسلم اَلنُّورُ اذَا دَخَلَ الصدرَ انْفَسَحَ فقيل يَا رَسُولَ اللّٰهِ فهل لِتِلك علم يُعرف به قال نعم التجافى عن دارِ الغرور والإنابة اِلىٰ دار الخلودِ والاستعداد للموتِ قبلَ نُزُوْلِه. (مشکوٰۃ شریف ص:۴۴۶)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: فَمَن يُرِدِاللّٰهُ اَنْ يهديه يشرح صدره للاسلام (اللہ تعالیٰ جس کے لئے ارادہ فرمالیتے ہیں کہ اسے سیدھی راہ لگادیں تو اور اس کے سینہ کو (قبول) اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں) تو آپ نے (آیت تلاوت فرمانے کے بعد) فرمایا کہ نور (حق) جب سینے میں داخل ہو جاتا ہے تو سینہ (قبول حق کے لئے) کھل جاتا ہے تو آپ سے پوچھا گیا کہ کیا اس (شرح صدر) کی کوئی پہچان ہے جس سے یہ بات معلوم ہو سکے (کہ شرح صدر ہو گیا ہے) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں پہچان ہے دنیا سے دوری، آخرت و جنت کی

طرف توجہ اور موت آنے سے پہلے موت کے لئے تیاری (جس کا بہترین طریقہ مراقبۂ موت اور مراقبۂ قیامت ہے)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ نے ایسی ہی احادیث کی روشنی میں مراقبۂ موت ومراقبۂ قیامت کی تعلیم وتلقین اپنے مسترشدین کے لئے تجویز فرمائی ہے۔

مشکوٰۃ شریف کے اسی صفحہ پر اسی حدیث بالا کے ساتھ ایک دوسری حدیث شریف حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس کا مفہوم تو اس حدیث مذکور سے ضرور مختلف ہے لیکن ہمیں حضرت امام نانوتوی کی زندگی میں اس حدیث شریف کی اثر انگیزی نمایاں طور پر نظر آتی ہے اس لئے اس موقع پر اس حدیث شریف کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا:

عن ابی هریرة وابی خلاد ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال اِذَا رَأَیْتُم العَبدَ یُعْطیٰ زهداً فی الدنیا وَقِلَّةَ مَنْطِقٍ فاقتربوا منه فانه یُلقیٰ الحکمة. (البیہقی مشکوٰۃ شریف ص:۴۴۶)

حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابو خلاد رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ جب کوئی ایسا بندۂ خدا دیکھو جسے زہد یعنی دنیا سے بے تعلقی وبے رغبتی دی گئی ہو اور وہ کم گو بھی ہو زیادہ نہ بولتا ہو تو اس کے قریب رہا کرو کیونکہ اسے خدا تعالیٰ کی طرف سے حکمت ودانائی عطا فرمائی جاتی ہے۔

حضرت مصنف امام مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ نے اپنی تصنیف مختصر سوانح عمری حضرت امام نانوتوی میں حضرت امام کی کم سخنی وکم گوئی کا تذکرہ یوں فرمایا ہے:

مولوی صاحب (حضرت امام نانوتوی) کو اول عمر سے اللہ تعالیٰ نے یہ بات عنایت فرمائی تھی کہ اکثر ساکت رہتے اس لئے ہر کسی کو کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا اور باوجود خوش مزاجی وظرافت کے ترش رو مغموم جیسی صورت رکھتے اور ان کے حال سے بھلا ہو یا برا، نہ کسی کو اطلاع ہوتی نہ آپ کہتے۔ (۴۱)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کی زندگی کو اگر دیکھا جائے تو وہ بیہقی کی مذکورہ بالا روایت ہی

(۴۱) سوانح عمری مرقومہ مصنف امام مشمولہ سوانح قاسمی ج۱ص:۳۰۔

کے مطابق نظر آئے گی اور اگر حضرت امام کی تصنیفات اور درسی تقریروں کو دیکھا جائے تو حدیث شریف میں آئے ہوئے فقرہ یلقی الحکمۃ کی سچی بولتی ہوئی تصویر دیکھنے کو مل جائے گی باقی رہا حضرت امام نانوتوی کا مقام زہد وانقطاع عن الدنیا تو حضرت کی زندگی کا یہ پہلو اس درجہ مشہور وزباں زد خلائق ہے کہ ضرورت ذکر و بیان ہی نہیں ہے اور مضمون کی مقدار شاید حد سے بڑھی جارہی ہے اس لئے اس کی شہرت عامہ کو نظر میں رکھتے ہوئے نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک کے دو اہم بنیادی عنصر اخلاص وتقویٰ سے متعلق معروضات گذشتہ صفحات میں مذکور ہوئیں۔

زیر نظر مقالہ کی مجوزہ ذہنی ترتیب کے پیش نظر راقم السطور آئندہ سطور میں مقصد سلوک کی نشاندہی کرنے کے بعد حضرت امام قدس سرہ کی ''منزل رسی'' کا ذکر کر کے اپنا مقالہ ختم کرنا چاہتا ہے۔

حضرات صوفیائے کرام کے حوالے سے گذشتہ صفحات میں سلوک کے دو اہم بنیادی عنصر اخلاص وتقویٰ کا بیان کیا گیا ہے انہیں حضرات کی تعلیمات کی روشنی میں ''مقصدِ سلوک'' اور ''منزل سالک'' کی بھی تعیین تو ہو ہی جانی چاہئے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے جو حالات وواقعات اور سوانح ہم لوگوں تک پہنچ سکے ہیں انہیں نظر میں رکھتے ہوئے حضرت قدس سرہ کا مقصد سلوک بھی بڑی آسانی سے متعین ہو جاتا ہے اور اسی طرح حضرت کی منزل سلوک کا تعین بھی دشوار نہیں رہ جاتا ہے حضرت امام کے واقعات وحالات بتاتے ہیں کہ حضرت کا مقصد سلوک تو کیفیت احسان کا حصول ہی تھا جو مشائخ طریق کے نزدیک بھی متفقہ طور پر مقصد سلوک ہے جسے اصطلاح سلوک میں حصول نسبت کہتے ہیں۔

چنانچہ حکیم الاسلام حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی قدس سرہ اپنی مشہور تصنیف ''القول الجمیل'' میں فرماتے ہیں:

مرجع الطرق كلها الى تحصيل هيأة نفسانية تسمىٰ عندهم بالنسبة لانها انتساب و ارتباط بالله عزَّ وجلَّ و (تسمىٰ) بالسكينة وبالنور وحقيقتها كيفية حَالَّة في النفس الناطقة من باب التشبيه بالملائكة والتطلع اِلىٰ الجبروت۔ (۴۲)

---

(۴۲) القول الجمیل از نسبت صوفیہ ص: ۴۷۔

حضرات مشائخ کے جملہ طرق کا مرجع ومقصد نفس انسانی کی ایک ہیئت خاصہ کا حاصل کرنا ہے جسے مشائخ کے ہاں ''نسبت'' کا نام دیا جاتا ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہ نسبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کا انتساب وارتباط ہے اور اس نسبت کو سکینہ اور نور بھی کہا جاتا ہے جس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ نسبت دراصل ایک خاص قسم کی کیفیت ہے جو نفس ناطقہ میں پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے نفس میں ایک ملکی شان پیدا ہو جاتی ہے اور عالم بالا کا مشاہدہ ہو جاتا ہے اس کے علوم مکشوف ہو جاتے ہیں۔

اور رسالۂ شفاء العلیل (ترجمہ القول الجمیل) میں مزید توضیح یوں فرمائی گئی ہے۔

حضور مع اللہ رنگ برنگ ہے جس کسی کو جس قدر تعلق ومحبت اور کسر نفس (فنا) کی توفیق ہوگی اسی قدر اس میں ''ملکہ قویہ'' حاصل ہوگا اور نسبتیں بے شمار ہیں چنانچہ اشغال قادریہ، چشتیہ اور نقشبندیہ وغیرہ سے غرض اسی نسبت کی تحصیل ہے اور اس پر دوام ومواظبت اور اس کا استغراق ہے تا کہ نفس میں اس مواظبت اور توجہ دائمی سے ملکہ راسخہ پیدا ہو جائے۔ (۴۳)

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے سلوک کو سمجھنے کے لئے مندرجہ ذیل اقتباس کو بھی پیش نظر رکھنا مفید ہوگا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ القول الجمیل میں فرماتے ہیں:

ولاتظنن ان النسبة لا تحصل الا بهذهِ الاشغال بل هذه طِريق لتحصيلها من غير حصر فيها وغالب الرأى عندى ان الصحابة والتابعين كانوا يحصلون السكينة بطرقٍ اخرىٰ فمنها المواظبة علىٰ الصلواتِ والتسبيحات في الخلوة مع المحافظة علىٰ شريطة الخشوع والحضور ومنها المواظبة علىٰ الطهارة وذكر هادم اللذات وما اعده الله للمطيعين له من الثواب وللعاصين له من العذاب فيحصل انفكاك عن اللذات الحسية وانقلاع عنها ومنها المواظبة علىٰ تلاوة الكتاب والتدبر فيه واستماع كلام المواعظ وما فى الحديث من الرقاق.(۴۴)

آپ یہ گمان نہ کریں کہ یہ نسبت ان اشغال کے علاوہ کسی دوسرے طریقہ سے حاصل نہیں ہوتی ہے ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اشغال بھی منجملہ طرق دیگر ایک طریقۂ تحصیل نسبت ہے، میرا غالب گمان

(۴۳) نسبت صوفیہ ص: ۴۷۔ (۴۴) نسبت صوفیہ ص: ۴۸۔

تو یہ ہے کہ حضرات صحابہ وتابعین یہ ''نسبت وسکینت'' دوسرے ہی طریقوں سے حاصل کرتے تھے۔ من جملہ ان کے نماز پنجگانہ کی پابندی اور خلوت میں تسبیحات وغیرہ کا اہتمام اور خشوع وحضور کی شرط لازمی بھی ان میں ملحوظ رہتی تھی اور منجملہ ان کے ہر وقت باطہارت رہنے کی پابندی اور ذکر موت کا اہتمام اور یہ مراقبہ کہ آخرت میں اطاعت گذار بندوں کو کیا کیا اجر وثواب ملے گا اور نافرمانوں کو کیسے کیسے عذاب دیئے جائیں گے اس مراقبہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیاوی اور حسی لذتوں سے طبیعت کو دوری ہوجائے گی اور یہ لذتیں سب چھوٹ جائیں گی اور من جملہ ان کے تلاوت قرآن اور اس میں غور وفکر اور خوف ورقاق کی احادیث کا سننا بھی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی موقع پر (جبکہ مقصد سلوک کی تعیین کی جارہی ہے) حضرت محدث گنگوہی قدس سرہ کی ایک تحریر کا مختصر ضروری اقتباس بھی نقل کردیا جائے فرماتے ہیں:

ہستی مطلق کو ہر دم خیال میں پرورش کرنا اور بلا کیف حاضر وموجود جان کر حیاء وشرم کے ساتھ بندۂ مطیع رہنا، مقصدِ اصلی ہے اور یہی احسان ہے، باقی زوائد

اسی سلسلہ میں آگے چل کر (حضرات صحابہ وتابعین رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا سلوک بیان کرتے ہوئے) فرماتے ہیں:

سنو! کہ سلوک صحابہ وتابعین وتبع تابعین میں تحصیل احسان اور اپنا بندۂ ناچیز بے اختیار ہونا اور من کل الوجوہ محتاج ذات غنی کا اور حضور اس کردگار بے نیاز محسنِ عباد کا ہونا تھا، بندگی در بندگی، عجز در عجز توکل در توکل... ہمت اطاعت وجان ومال کی بازی فی رضاء المولیٰ اس کا ثمرہ تھا، نہ استغراق تھا نہ فنا تھی... متاخرین نے دوسرا راستہ نکالا کہ جس سے ربط حادث بالخالق کی کیفیت معلوم ہوجائے سو بعد مجاہدات معلوم ہوا کہ سب مخلوقات اعلیٰ سے اخس تک اپنے خالق سے مربوط اور اس کے وجود سے موجود ہیں بوحدت وجود یا بوحدت شہود علیٰ خلاف بینہم۔

پس اس ربط کے شہود کا نام جذب رکھا گیا اور انتہاراہ جذب اس نسبت کے انکشاف پر ہے پس جذب کے معنی رجوع السالک الیٰ حقیقۃ الحقائق واصل الاشیاء اور اس میں فنا اپنا اور اپنے علم انانیت کا کردینا مقرر ہوئے۔

اس راہ جذب کو جو حضرات مشائخ نے طے کیا اس کے بیان سے زبان عاجز ہے گویا وہ کمالات

اب کالعنقا ہو گئے جس طرح کوئی سالک مجاہدہ کر کے کوئی مقام طے کرے، ہنوز اس کے آثار کے سوا ان کمالات سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی، ان کا حوصلہ وملکہ ملاء اعلیٰ سے ناشی تھا، اب ملاء اسفل سے بھی پوری مناسبت نہیں...مع ہذا راہ جذب ہے نہ درگاہ (راقم السطور رومی کے فہم ناقص میں اس خط کشیدہ فقرے میں بوقت کتابت کچھ تقدیم وتاخیر ہوگئی ہے فقرہ شاید یوں ہوگا ''مع ہذا جذب راہ ہے نہ درگاہ'' (یعنی جذب طریق و ذریعہ ہے مقصود ومنزل نہیں ہے) بعد طے راہ جذب کے وہی طریقۂ صحابہ کہ ''عبدیت'' کا مقام ہے اختیار کرنا وعبادت وعاجزی کا معاملہ کرنا واجب ہوتا ہے۔(۴۵)

مکتوبات رشیدی کے مندرجہ بالا اقتباس پر مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ صاحب قدس سرہ مزید توضیح فرماتے ہیں:

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے صحابہ کے سلوک کی جو تفصیل بیان فرمائی ہے بہت خوب ہے اس میں کس کو کلام ہوسکتا ہے بلاشبہ حضرات صحابہ کا یہی حال تھا لیکن حضرت نے یہ جو فرمایا کہ وہاں نہ استغراق نہ فنا تھی تو اس کی کچھ توضیح کرتا ہوں وہ یہ کہ یہ صحیح ہے کہ جس نوع کا استغراق اور فنا متاخرین کو حاصل تھا حضرات صحابہ کا فنا اس قسم کا نہ تھا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں وہ حضرات فنا سے عاری تھے، ایسا نہیں تھا ان حضرات نے تو اپنے آپ کو کامل طور پر فنا کر دیا تھا لیکن ان کے فنا میں سکر نہ تھا کہ بالکل ہی مغلوب الحال اور مستغرق ہو جاتے بلکہ ان کا فنا صحو کے ساتھ ساتھ تھا پورے فانی اور پوری طرح باہوش تھے...اور بعد کے لوگوں میں یہ جامعیت نہ تھی بلکہ ان کے فنا میں سکر کا انداز تھا۔(۴۶)

سطور بالا میں اصلاً بیان تو مقصد سلوک کا ہو رہا تھا لیکن مکتوبات رشیدی میں سلسلۂ کلام مقصود سلوک اور منزل سالک تک پہنچ گیا اس لئے آئندہ چند سطور میں مقصود سلوک ومنزل سالک ہی سے متعلق معروضات پیش کی جارہی ہیں۔

حضرات مشائخ طریق وسلوک کی تصریحات سے منزلِ سالک اور مقصود سلوک بھی متعین ہو جاتا ہے کہ مقصود سلوک فنائے انانیت ہے مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کے

(۴۵) مکتوبات رشیدیہ ص:۲۰ بحوالہ نسبت صوفیہ ص:۵۳۔ (۴۶) نسبت صوفیہ ص:۵۴

صاحبزادے حضرت خواجہ محمد معصوم قدس سرہ نے اپنے ایک مکتوب گرامی میں بڑی تفصیل کے ساتھ اس فنا پر گفتگو فرمائی ہے اس مکتوب کی چند سطریں یہاں نقل کی جارہی ہیں فرماتے ہیں:

ایں بزرگواراں (مشائخ صوفیہ) درمحبت حق جل وعلا ازخود واز غیرخود گسستہ اند ودر عشق او از آفاق وانفس گزشتہ ماسوا را درراہ او در باختہ و بادساختہ اند، اگر حاصل دارند اورا دارند اگر واصل اند باو واصل اند، باطن شاں را بہ نہج انقطاع از دون او تعالیٰ روے دادہ است کہ اگر سالہا یاد ماسوا نمایند بیاد شاں نیاید واز انانیت نفس بہ نوعے گذشتہ اند کہ عود کلمہ انا را بر خود شرک می دارند۔ (۴۷)

ان بزرگوں نے حضرت حق جل وعلا کی محبت میں خود اپنے آپ سے بھی اور اپنے غیر سے بھی رشتہ وتعلق قطع کرلیا ہے اور اس کے عشق میں انفس وآفاق سے گزر کر ہر ماسوا کو اس کی راہ میں بازی پر لگادیا ہے اب اگر کچھ ان کو حاصل ہوا ہے تو وہ حق تعالیٰ ہی ہوا ہے اور اگر وہ کسی تک واصل ہوئے ہیں تو اسی حق تعالیٰ تک واصل ہوئے ہیں، ان کا باطن حق تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے اس طرح بے تعلق ہوگیا ہے کہ اب اگر وہ سالہا سال تک ماسوا اللہ کو یاد کرنا بھی چاہیں تو وہ انہیں یاد نہ آئے اور اسی طرح اپنی ''انانیت'' سے اس طرح نکل گئے ہیں کہ اب انہیں اپنی ذات کے لئے کلمہ ''انا'' کا استعمال کرنا بھی شرک معلوم ہوتا ہے۔

اسی مکتوبات معصومیہ میں ایک موقع پر اس غلط فہمی کا بھی ازالہ فرمایا گیا ہے جو آج کل کے بہت سے سالکین بلکہ بعض مشائخ طریقت کی زندگی میں نمایاں طور پر دیکھی جاتی ہے فرماتے ہیں:

مقصود از سیر وسلوک شیخی ومرید گرفتن نیست مقصود ازاں ادائے وظائف بندگی است بے منازعتِ نفس۔ ونیز مقصود نیستی وگمنامی است وزوال رعونت وانانیت امارہ کہ معرفت بداں مربوط است (۴۸)

سیر وسلوک سے یہ مقصود نہیں ہے کہ سالک شیخ بن جائے اور لوگوں کو مرید بنانے لگے بلکہ اس سے مقصود ہے کہ سالک منازعتِ نفس (کشمکش نفس) کے بغیر آسانی کے ساتھ وظیفہ بندگی وعبودیت ادا کرنے لگے اور اس سے مقصود نیستی وگمنامی بھی ہے کہ دل سے رعونت وتکبر اور ''نفس امارہ کی انانیت'' نکل جائے کہ حق تعالیٰ کی معرفت اور حصولِ نسبت اسی فنا ونیستی سے وابستہ ہے (۴۹)

---

(۴۷) مکتوبات معصومیہ: ص۴۸ ج:۳۔ (۴۸) مکتوبات معصومیہ ص:۶۸ بحوالہ نسبت صوفیہ ص:۵۹ (۴۹) مکتوبات معصومیہ بحوالہ نسبت صوفیہ

اسی گمنامی ونیستی کے لئے کسی شاعر کا یہ شعر بھی خوب ہے:

مٹادے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہے　　　　کہ دانہ خاک میں مل کر گلِ گلزار ہوتا ہے

مگر سلوک وطریقت کے لحاظ سے شعر محلِ غور ہے کیونکہ کچھ مرتبہ چاہنا گمنامی ونیستی کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا سوانح قاسمی میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے متعلق حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے کہ:

فانی وہ ہے جسے یہ بھی خبر نہ ہو کہ میں فانی ہوں

راقم سطور اس کی مزید توضیح کر دینا چاہتا ہے مطلب یہ ہے کہ فنا کی حقیقت ہے، کچھ نہ ہونا اور کچھ کے عموم میں احساس فنا بھی ہے لہٰذا یہ احساسِ فنا بھی نہ ہونا چاہئے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے فنا ونیستی کی شہادت حضرت امام کے حقیقی مرتبہ شناس محدث گنگوہی علیہ الرحمہ نے ان الفاظ میں ادا کی ہے کہ:

جس شخص کے قلب میں ایمان کی طرح یہ راسخ ہو چکا ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ ذلیل وخوار کوئی ہستی نہیں ہے۔(۵۰)

اس درجہ کے معتمد وثقہ ائمۂ سلوک وطریق دو بزرگوں کی ایسی وقیع شہادت کے بعد کوئی ضرورت تو باقی نہیں رہ جاتی کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے کامل السلوک ہونے کا کوئی اور ثبوت پیش کیا جائے لیکن ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ حضرت امام قدس سرہ کی زندگی میں اس گمنامی ونیستی اور فنا کی جو جھلکیاں درخشاں ہیں مختصر طور پر کچھ ان کا بھی تذکرہ ہو جائے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے یہ عام شہرت ہے کہ حضرت امام لوگوں کو آسانی سے بیعت نہیں فرماتے تھے مکتوبات معصومیہ کا ایک اقتباس ابھی اوپر نقل ہوا ہے جس میں خواجہ معصوم نے بہت صاف الفاظ میں بات کہہ دی ہے کہ سلوک کا یہ مقصود ہی نہیں ہے کہ سالک شیخ بن کر بیٹھ جائے اور لوگوں کو مرید بنانا شروع کر دے اس لئے حضرت امام نانوتوی (جن کی پوری زندگی اخفاو تستر اور گمنامی وفنا کی کوششوں ہی میں گذری ہے) اس غیر مقصود مقام کو آسانی سے قبول فرما سکتے تھے۔

حضرت امام نانوتوی قدس سرہ سے ثقہ راویوں کے تواتر کے ساتھ اس قسم کے متعدد فقرے

---

(۵۰) سوانح قاسمی ج۱، ص:۴۸۳۔

منقول ہیں جو حضرت کے ''مقام فنا'' کا پتہ دیتے ہیں:

(۱) ایک دن آپ فرماتے تھے کہ اس علم نے خراب کیا ورنہ اپنی وضع کو ایسا خاک میں ملاتا کہ کوئی بھی نہ جانتا۔(۵۱)

حضرت مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہ منقولہ بالا کلمات نقل فرمانے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

(۲) میں کہتا ہوں اس شہرت پر بھی کسی نے کیا جانا جو کمالات تھے وہ کس قدر تھے؟ کیا اس میں سے ظاہر ہوئے آخر سب کو خاک میں ہی ملا دیا اور اپنا کہنا کر دکھایا (حوالہ بالا)

(۳) لوگ جان نہ گئے ہوتے تو ایسا گم ہوتا کہ کوئی بھی نہ پہچانتا کہ قاسم دنیا میں پیدا بھی ہوا تھا۔(۵۲)

(۴) اگر مولویت کی یہ قید نہ ہوتی تو قاسم کی خاک تک کا بھی پتہ نہ چلتا، جانوروں کا بھی گھونسلہ ہوتا ہے میرے لئے تو یہ بھی نہ ہوتا اور کوئی میری ہوا تک نہ پاتا۔(ارواح ثلثہ ص:۱۷۲ الخ قاسمی ص:۴۴۵)

سوانح قاسمی میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے تلمیذ خاص مولانا عبدالعلی سے نقل کیا گیا ہے کہ حضرت امام نے انہیں حکم دیا کہ:

(۵) مجھے اس خلجان سے جس میں (مخلوق کی آمد ورفت کی وجہ سے) بتلا ہو گیا ہوں نکالو... میری عقیدت لوگوں کے دلوں سے نکالو۔

(۶) اگر میں یہ جانتا کہ پڑھ لکھ کر یہ دقتیں پیش آئیں گی (یعنی لوگ میرا پیچھا کریں گے تو) میں نہ لکھتا نہ پڑھتا صرف سیدھی سادی نماز روزے کے مسائل سیکھ لیتا۔(۵۳)

اب آیئے اسی طرح حضرت امام نانوتوی کا مقام فنا حضرت امام کی عملی زندگی میں بھی دیکھئے:

(۱) یہ بات اس درجہ مشہور ہے کہ یہاں بغیر کسی حوالہ کے اس کا ذکر کیا جاسکتا ہے کہ حضرت امام

---

(۵۱) سوانح عمری قدیم مشمولہ سوانح قاسمی ص:۳۱۔(۵۲) قصص الاکابر ص:۱۳ سوانح قاسمی ص:۲۴۹۔(۵۳) سوانح مخطوطہ ص:۳۸، سوانح قاسمی ص:۴۸۵

نانوتوی اخفائے حال کے لئے خود اپنے اسم گرامی اور اپنے وطن مالوف کا نام بتانے میں اخفا سے کام لے لیا کرتے تھے چنانچہ اپنے اصل نام کی جگہ تاریخی نام خورشید حسین بتا دیتے اور اپنے وطن کا نام الہ آباد بتا دیتے (کہ ہر مقام تو اللہ تعالیٰ ہی کا آباد کیا ہوا ہے اسے الہ آباد بھی کہا جا سکتا ہے)

(۲) بعض موقعوں پر اپنے ''تصرف باطن'' کا بھی اخفا فرمایا ہے اس ذیل میں دو تین واقعات قابل ذکر ہیں:

(الف) معارف الاکابر میں حضرت حکیم الامۃ تھانوی علیہ الرحمہ کے مجموعہ ملفوظات ''خیر الافادات'' کے حوالے سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے:

فرمایا: ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کسی مسجد میں چند مریدوں کو توجہ دے رہے تھے اور رات کا وقت تھا چراغ نہ تھا، حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کو اس کی خبر لگی جلدی سے آکر خفیہ طور پر حلقہ میں بیٹھ گئے حضرت نانوتوی کو ''نسبت یعقوبیہ'' کا احساس ہو گیا آپ نے توجہ روک لی۔ مولانا محمد یعقوب صاحب کو اس کا ادراک ہو گیا، خفا ہو کر فرمانے لگے: بنادوان کو غوث وقطب، میں ہی ایک منحوس ہوں جو خار معلوم ہوتا ہے۔ (۵۴)

(ب) خورجہ میں ایک صاحب حاجی محمد اسحٰق نامی تھے، بیچارے ذاکر وشاغل اور پابند صوم وصلوٰۃ سیدھے سادے مسلمان تھے، خود حاجی صاحب مرحوم امیر شاہ خاں صاحب سے کہتے تھے کہ ایک سخت عذاب میں مبتلا ہوں جب کوئی گاڑی نکلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے اوپر چل رہی ہے، جب بیلوں کو سانٹا مارا جاتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ میرے لگتا ہے، جب کتوں میں لڑائی ہوتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ میرے کو کاٹتے ہیں جب چکی چلتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ گیہوں کے بدلہ میں ہی پس رہا ہوں، لڑکے بھاگتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر دوڑ رہے ہیں... آخر میں کہتے تھے کہ میں سخت تکلیف میں مبتلا ہوں اور باہر نہیں نکل سکتا اور نہ چکی کی آواز سن سکتا ہوں، حالت یہ ہو گئی تھی کہ مسجد آنا جانا بھی ان کے لئے دشوار ہو گیا تھا کان میں روئی کے روہڑ ٹھونس کر گھر ہی میں پڑے رہتے تھے۔

امیر شاہ خاں صاحب کے حاجی اسحٰق دوست بھی تھے سیدنا الامام الکبیر سے بیعت کا شرف

(۵۴) معارف الاکابر ص ۲۷۵۔

بھی ان کو حاصل تھا، ان کا حال سن کر خاں صاحب نے فرمایا کہ مناسب ہے کہ اپنے پیر و مرشد (مولانا نانوتوی) کو اپنے حال سے آگاہ کرو، جو حالات گزر رہے تھے لکھ کر امیر شاہ خاں مرحوم کے حوالہ حاجی صاحب نے کیے انہوں نے اپنے سفارشی خط کے ساتھ حضرت والا کی خدمت میں بھیج دیئے، اسی زمانے میں حضرت کا قیام دلی ہی میں تھا جواب میں امیر شاہ خاں صاحب کو حضرت کی طرف سے ہدایت ہوئی کہ حاجی اسحٰق کو میرے پاس یہیں (دہلی) بھیج دو حسب الحکم حاضر ہوئے پھر جیسا کہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ:

مولانا نانوتوی نے کچھ نہیں کیا صرف اوراد و اشغال کے وقت بدل دیئے اور وقت کی صرف اس ہلکی سی تبدیلی کا نتیجہ یہ دیکھا گیا کہ حاجی اسحٰق مرحوم دوسرے ہی دن اچھے ہوگئے۔

جو کچھ کیا گیا اس کو دیکھ کر بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اوقات کی تبدیلی ازالۂ مرض کا سبب بن گئی، لیکن جس قسم کی بیماری میں حاجی صاحب مرحوم مبتلا تھے کیا اس سے صحت یاب ہونے کے لئے اوراد و اشغال کے اوقات کا بدل جانا کافی تھا؟ اس راہ کے ایک محرم اسرار سے سنئے!

حضرت نانوتوی فرماتے ہیں کہ:

احقر کا وجدان ہے کہ مولانا (نانوتوی) نے تصرف فرمایا ہے اور اخفاء تصرف کے لئے اوراد و اشغال کے اوقات بدلے ہیں۔ (۵۵)

حضرت امام نانوتوی کے مقام فنا کا اندازہ کرنے کے لئے حضرت امام قدس سرہ کے مفصل حالات و سوانح نہ ہونے کے باوجود متعدد واقعات مختلف صورتوں سے محفوظ رہ گئے ہیں۔

اسی طرح حضرت امام قدس سرہ کی متعدد کرامات بھی مختلف تذکروں میں موجود ہیں لیکن چونکہ کرامات کا ہونا مشائخ طریق کے نزدیک معیار بزرگی نہیں سمجھا گیا ہے اس لئے ان کو یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اصل کمال حضرت امام نانوتوی کا ان کا یہی ''مقام فنا'' تھا کہ بہت کچھ ہوتے ہوئے بلکہ سب کچھ ہوتے ہوئے حضرت کی پوری کوشش یہی رہی کہ انہیں کچھ نہ سمجھا جائے، اس سلسلہ میں یہ واقعہ بھی قابل ذکر ہے جسے حضرت مصنف امام مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہ نے ذکر فرمایا ہے

(۵۵) ارواح ثلثہ ص: ۱۶۹، سوانح قاسمی: ۳۳۴۔

ملاحظہ ہو قدیم سوانح عمری کا صفحہ ۳۶ فرماتے ہیں:(۵۶)

ایک بار مولوی صاحب نے میرٹھ میں مثنوی مولانا روم پڑھانا شروع کی دو چار شعر ہوتے اور عجیب وغریب بیان ہوتے، ایک صاحب کہ کچھ رنگ باطنی رکھتے تھے سن کر یوں سمجھے کہ یہ (عجیب وغریب مضامین) اثر تبحر علمی کا ہے اور چاہا کہ مولانا کو فیض باطنی دیا جائے، درخواست کی کبھی تنہا ملئے، آپ نے فرمایا کہ مجھے کار چھاپہ خانہ کا اور پڑھانا طلبہ کا رہتا ہے تنہائی کہاں؟ آپ جب چاہیں تشریف لائیں وہ صاحب ایک روز تشریف لائے اور کہا کہ آپ ذرا میری جانب متوجہ ہوں اور خود آنکھ بند کر کے مراقب ہوئے مولانا (محمد قاسم صاحب) سبق پڑھا رہے تھے البتہ موقوف کر دیا مگر آنکھ کھلی اور کبھی قدرے بندان کی طرف متوجہ ہوئے ان کا یہ حال ہوتا تھا کہ کبھی قریب گرنے کے ہو جاتے تھے اور پھر سنبھل بیٹھتے تھے کچھ دیر یہ معاملہ رہا پھر وہ اٹھ کر نیچی نگاہ کئے چلے گئے پھر معذرت کی اور کہنے لگے مولانا مجھے خبر نہ تھی کہ آپ میں یہ جوہر بھی علی الوجہ الاتم موجود ہے۔(۵۷)

راقم السطور کا گمان ہے فیض باطنی پہنچانے والے بزرگ کا یہ قصہ زمانۂ قیام میرٹھ میں اس وقت پیش آیا ہوگا جب حضرت امام نانوتوی سے ایک جماعت مسلم شریف پڑھ رہی تھی (دار العلوم دیوبند کا قیام اس وقت تک نہیں ہوا تھا) مسلم شریف کی جماعت میں حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب بھی شریک تھے، اسی وجہ سے حکایت واقعہ ایسے انداز سے تحریر فرمائی ہے جیسے یہ واقعہ عینی مشاہدہ ہو۔

اسی نوعیت کا یہ دوسرا واقعہ بھی قابل ذکر ہے جو سوانح قاسمی میں ارواح ثلثہ سے نقل کیا گیا ہے جس کے راوی مشہور صاحب روایات حضرت امیر شاہ خاں صاحب ہیں کہ:

نواب مصطفےٰ خاں کی یہ عادت تھی کہ ہمارے اکابر (خانوادہ ولی اللّٰہی) میں سے جب کوئی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو فوراً مراقب ہو کر ان کی نسبت کی ٹوہ میں لگ جاتے تھے، ایک مرتبہ حضرت نانوتوی ان سے ملنے تشریف لے گئے اور نواب صاحب حسب عادت مراقب ہوئے، سر اٹھایا تو ایک صاحب اموجان (نامی) سے خطاب فرمایا کہ میں نے بڑے بڑے لوگ دیکھے لیکن

---

(۵۶) سوانح قاسمی میں بھی یہ واقعہ ص:۳۳۸ پر مذکور ہے نقل روایت میں کچھ حصہ اس کا بھی آ گیا ہے۔

(۵۷) ارواح ثلثہ ص:۱۹۵، سوانح قاسمی ص:۳۳۸۔

مولانا کی نسبت کا تو کہیں پتہ ہی نہیں ہے۔ (۵۸)

ارواح ثلثہ میں یہ حکایت اسی قدر بیان ہوئی ہے پڑھ کر تجسس پیدا ہوتا ہے کہ اصل صورت حال کیا تھی؟ احقر اپنے فہم ناقص سے یہ سمجھ سکا ہے کہ حضرت امام نانوتوی قدس سرہ نے نواب صاحب کو امتحان لینے کا موقع ہی نہیں دیا اور اپنی نسبت کا پوری طرح اخفا فرمالیا کہ انہیں نسبت کا پتہ ہی نہ لگ سکا مذکورہ بالا دو واقعات میں دو مختلف بزرگوں نے حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے نہ صرف صاحبِ نسبت ہونے کی بلکہ صاحب نسبت قویہ ہونے کی شہادت دی ہے، اس کے بعد اب خود حضرت امام کے شیخ طریقت اور پیر مرشد شیخ المشائخ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ کی نہ صرف شہادت بلکہ ''سندِ اعزاز'' قابلِ توجہ اور لائق دید ہے۔

حضرت حاجی صاحب قدس سرہ نے اپنے رسالہ ضیاء القلوب میں ان حضرات شیخین کے لئے یہ سند اعزاز مرحمت فرمائی ہے اصل عبارت فارسی کا ترجمہ ملاحظہ فرمایا جائے، حضرت حاجی صاحب نے اس سند اعزاز کو مبنی بر الہام فرمایا ہے:

جو شخص اس فقیر (حاجی امداد اللہ صاحب) سے محبت، عقیدت اور ارادت رکھتا ہے اسے چاہئے کہ مولوی محمد قاسم اور مولوی رشید احمد صاحب جو کہ تمام ظاہری اور باطنی کمالات کے جامع ہیں، میری طرح بلکہ مجھ سے بڑھ کر شمار کرے، اگرچہ معاملہ برعکس ہے کہ وہ میری جگہ اور میں ان کی جگہ ہوں، ان کی صحبت کو غنیمت سمجھئے کیونکہ ان جیسے آدمی اس زمانے میں نایاب ہیں۔

آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر حق تعالیٰ دریافت کرے گا کہ امداد اللہ کیا لائے؟ تو میں قاسم اور رشید کو پیش کردوں گا کہ یہ لے کر حاضر ہوا ہوں۔ (۵۹)

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب مختصر سوانح قاسمی میں تحریر فرماتے ہیں کہ مولوی محمد قاسم صاحب کو فرمایا تھا کہ ایسے لوگ کبھی پہلے زمانے میں ہوا کرتے تھے اب مدتوں سے نہیں ہوتے... اب اس سفر میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا تھا کہ مولوی (محمد قاسم) صاحب کی تحریر وتقریر کو محفوظ رکھا کرو اور غنیمت جانو۔ (۶۰)

یہ تمام تفصیلات جان لینے کے بعد ناظرین کرام کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ زیر

---

(۵۸) ارواح ثلثہ ص: ۲۷۷، سوانح قاسمی ص: ۳۳۷۔ (۵۹) معارف الاکابر ص ۲۳۵۔ (۶۰) مختصر سوانح مشمولہ سوانح قاسمی ص: ۳۴۔

نظر مضمون میں حضرت امام نانوتوی قدس سرہ کے احسان وسلوک کے تحت بہت کچھ باتیں تو بیان ہوگئیں لیکن حضرت امام کے مجاہدات وریاضات کا مطلق ذکر نہیں آیا؟ کیا حضرت والا کو ان مراحل سے گزرنا نہیں پڑا تھا؟ جواب حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی کی زبانی سنئے جو حضرت امام والا مقام کے زمانۂ بیعت اور زمانۂ ابتدائے سلوک میں حضرت امام کے ساتھ دہلی ہی میں قیام فرما تھے مختصر سوانح قاسمی کے چند متفرق اقتباسات ملاحظہ ہوں:

(الف) مولوی صاحب نے ریاضتیں ایسی کی ہیں کہ کیا کوئی کرے گا، اشغال دشوار جیسے ''حبس دم'' اور ''سہ پایہ'' مدت تک کئے ہیں اور ''بارہ تسبیح'' اور ''ذکر ارّہ'' کا دوام تھا ہی سر کے بال شدت حرارت کے سبب اڑ گئے تھے، حرارت مزاج میں ایسی آگئی تھی کہ کسی صورت سے فرو نہ ہوتی تھی کیونکہ یہ حرارت قلب کی تھی اور اس کے نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوئی، یہی آخر مرض کا باعث ہوئی اور اسی میں آخر انتقال کیا (انا للہ وانا الیہ راجعون) (ص:۲۹)

(ب) مولوی صاحب بھی میرے پاس آرہے، کوٹھے پر ایک جھلنگا پڑا ہوا تھا اس پر پڑے رہتے تھے، روٹی کبھی پکوا لیتے تھے اور کئی کئی وقت تک اسی کو کھا لیتے تھے، میرے پاس آدمی روٹی پکانے والا نوکر تھا، اس کو یہ کہہ رکھا تھا کہ جب مولوی صاحب کھانا کھاویں سالن دے دیا کرو مگر بدقت کبھی اس کے اصرار پر لے لیتے تھے ورنہ وہی روکھا سوکھا ٹکڑا چبا کر پڑے رہتے تھے۔ (۶۱)

حضرت امام کے مجاہدہ وریاضت کی مزید تفصیل سوانح مخطوطہ میں یوں بیان کی گئی ہے:

مگر با ایں ہمہ شان عبودیت آپ (مولانا نانوتوی) پر ایسی غالب تھی کہ آپ مدت تک شغل بارہ تسبیح، حبس دم ذکر ارّہ وغیرہ میں مشغول رہے، چھ چھ سات سات گھنٹے ذکر ارّہ اور حبس دم کرتے تھے۔

جس وقت آپ اس شغل کو کرتے صرف ایک تہ بند بدن پر رکھتے تھے — وہ تہ بند عرق بدن (پسینے) سے ایسا تر ہو جاتا کہ بعد الفراغ اس کو بدن سے علیحدہ کر کے اور نچوڑ کر خشک کرتے تھے۔ (۶۲)

اب اسی موضوع سے متعلق سوانح قاسمی ص ۳۰۴ تا ۳۰۶ کا ایک طویل اقتباس قدرے اختصار کے ساتھ ملاحظہ ہو اس اقتباس میں متن یعقوبی اور شرح گیلانی دونوں ہی کی عبارات نقل ہوں گی۔

---

(۶۱) سوانح قاسمی ص:۲۹۔ (۶۲) سوانح مخطوطہ ص:۱۵) سوانح قاسمی ص:۳۰۳

''متن یعقوبی'' جب احقر اجمیر گیا مولوی صاحب (مولانا محمد قاسم صاحب) اسی مکان (کوچہ چیلان والے) میں رہتے تھے اور دو ایک آدمی اور تھے، اتفاق سے سب متفرق ہو گئے اور مولوی (محمد قاسم) صاحب تنہارہ گئے، مکان مقفل رہتا تھا (ص:۲۹،۳۰)

''شرح گیلانی'' بظاہر دن کو بھی مقفل رہتا تھا اور رات کو بھی مقفل ہی رہتا تھا مگر باہر سے جو مکان دیکھنے والوں کو مقفل نظر آتا تھا دن کو تو نہیں لیکن جب دن ختم ہو جاتا اور رات اپنی تاریکی کے پردے میں دنیا کو چھپا لیتی تھی اسی وقت جیسا کہ مصنف امام ہی کا بیان ہے کہ

(متن یعقوبی) رات کو مولوی صاحب (مولانا نانوتوی) کواڑ اتار کر اندر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے (ص:۳۰)

''شرح گیلانی'' شاید اسی لئے کیا جاتا تھا کہ آنے (جانے) والے راہ گیروں پر بھی اثر قائم رہے کہ کوئی اس مکان میں نہیں رہتا ہے اور تنہائی میں خلل انداز نہ ہو اور اسی کواڑ چڑھائے ہوئے مقفل مکان میں تن تنہا ساری رات گزرتی تھی یا گزاری جاتی تھی پھر بقول مصنف امام ''متن یعقوبی'' اور صبح کو کواڑ اتار کر باہر جاتے تھے اور پھر کواڑ کو درست کر دیتے تھے چند ماہ اسی ''ہو'' کے مکان میں گذرے (ص:۳۰)

''شرح گیلانی'' شاید ''ہو'' کے اسی مکان کا وہ مشہور واقعہ ہے جس کا ذکر خاکسار (مولانا گیلانی) سے براہ راست حضرت مولانا حبیب الرحمان العثمانی سابق مہتمم دار العلوم بھی فرمایا کرتے تھے۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ:

حضرت نانوتوی اپنے بند حجرے میں ذکر میں مشغول تھے تو ہر ضرب کے ساتھ دھماکے کی آواز بھی آتی تھی لوگ مشوش ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے حجرے کے کواڑ اتارے گئے کیونکہ اندر سے زنجیر بند تھی، اندر جاکے دیکھا تو حضرت کے برابر ایک سانپ ہے اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی اپنا سر زمین پر دے مارتا ہے، حضرت گردن اٹھاتے ہیں تو وہ بھی سر اٹھا کر کھڑا ہوتا ہے اور جب حضرت ضرب لگاتے ہیں تو وہ بھی زور سے زمین پر سر پٹکتا ہے، یہ دھماکہ اسی کا تھا لوگوں نے اسے مارا، مار کر باہر لائے لیکن حضرت کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ (۶۳)

---

(۶۳) مکتوب الحفید السعید ۳؍ ذی قعدہ ۱۳۶۸ھ) (سوانح قاسمی ص:۳۰۶۔

راقم السطور کے فہم ناقص میں تو گنجائش اس بات کی بھی ہے کہ وہ سانپ اسی ویران وغیر معمور مکان کا مکین کوئی جن ہی رہا ہو اور حضرت امام قدس سرہ اس کی موجودگی اور اپنے برابر ہی بیٹھے ہوئے ذکر میں شرکت سے باخبر بھی رہے ہوں اور اس کے بے ضرر ہونے کی وجہ سے اس سے تعرض غیر ضروری خیال فرماتے رہے ہوں لیکن یہ اجانب جو اصل صورت حال سے بالکل بے خبر تھے اسے ضرر رساں وموذی سمجھ کر مار ڈالنا ہی ضروری سمجھا ہو اور حضرت نے بھی اخفائے حال واخفائے بزرگی کے پیش نظر اپنے کو بالکل ہی بے خبر ظاہر کرنا ہی مناسب سمجھا ہو۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال.

حضرت امام نانوتوی کی ایک اور خصوصیت

گزشتہ صفحات میں حضرت امام قدس سرہ کے شیخ وپیر مرد کی سند اعزاز کا ذکر ہو چکا ہے لیکن اس سند اعزاز میں حضرت گنگوہی علیہ الرحمہ بھی ان کے شریک ہیں۔

اب حضرت امام نانوتوی کی ایک ایسی خصوصیت کا ذکر کیا جاتا ہے جس میں کوئی دوسرا ان کا شریک وسہیم نہیں ہے حضرت حکیم الامت تھانوی علیہ الرحمہ اپنے اور حضرت امام نانوتوی کے شیخ ومرشد حضرت امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے نقل فرماتے ہیں کہ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں کو جو اصطلاحی عالم نہیں ہوتے ایک لسان عطا فرماتے ہیں چنانچہ حضرت شمس تبریزی کو مولانا رومی لسان عطا ہوئے جنہوں نے حضرت شمس تبریزی کے علوم کو کھول کھول کر بیان فرمادیا اسی طرح مجھ (حضرت حاجی صاحب) کو مولوی محمد قاسم لسان عطا ہوئے ہیں (حضرت حکیم الامت یہ بھی فرماتے تھے کہ)

> مولانا محمد قاسم صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جب میں اپنی تصنیف کو حضرت حاجی صاحب کو سنا دیتا ہوں تب مجھے اس کے مضامین پر اطمینان ہوتا ہے کہ ٹھیک ہے بدون سنائے اطمینان نہیں ہوتا اور ایک بڑی لطیف بات فرماتے تھے کہ ہمارے ذہن میں مبادی پہلے آتے ہیں یعنی مقدمات اول آتے ہیں ان کے تابع نتیجہ ہوتا ہے اور ان حضرات کے ذہن میں نتائج پہلے آجاتے ہیں اس لئے جب سنا لیتا ہوں تو اطمینان ہو جاتا ہے کہ مقاصد تو ٹھیک ہیں، مقدمات چاہے غلط ہوں ان کی کیا ہے انہیں تو خود ٹھیک ٹھاک کر لیں گے، مقاصد تو صحیح ہیں۔ جتنے وہبی علوم بزرگوں کے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں کہ بس ایک سچی بات قلب میں پڑ گئی ان کے منتسبین میں جو اہل علم ہوتے

ہیں وہ یہ کرتے ہیں کہ اس کی تقویت اور تائید دلائل سے بھی کر دیتے ہیں تو ان کے دلائل تابع مقاصد کے ہوتے ہیں بخلاف علمائے رسوم کے ان کے مقاصد تابع دلائل کے ہوتے ہیں۔(۶۴)

مضمون ختم کرتے کرتے حضرت امام نانوتوی کے زمانۂ سلوک کی سرگذشت سے متعلق ایک خاص بات جو اوپر مذکور نہ ہوسکی ہے اس کا ذکر بہت ضروری معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کے ہاں بیعت اور ذکر و شغل کی تعلیم کے بعد قاعدہ تھا کہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے لوگ ان حالات کا تذکرہ کرتے جو ذکر و شغل کے وقت ان کے سامنے پیش آتے تھے مگر خلاف دستور مولانا محمد قاسم نے اپنے کسی حال کا ذکر حاجی صاحب سے نہیں کیا آخر ایک دن خود ہی دریافت فرمایا کہ آپ کچھ نہیں کہتے اپنے پیر کے استفسار پر حضرت تھانوی کا بیان ہے کہ مولانا (محمد قاسم) رونے لگے، پھر بڑے یاس انگیز الفاظ میں فرمانے لگے: کہ اپنا حال کیا بیان کروں۔

جہاں تسبیح لے کے بیٹھا، بس ایک مصیبت ہوتی ہے اس قدر گرانی کہ جیسے سو سومن کے پتھر کسی نے رکھ دیئے۔ زبان و قلب سب بستہ ہو جاتے ہیں...اب یہی سننے کی بات ہے...راہ و رسم منزل سے جو آگاہ تھا یعنی آپ کے شیخ عارف بے ساختہ فرمانے لگے کہ ''مبارک ہو'' مولانا! حق تعالیٰ کے اسم ''علیم'' کے ساتھ آپ کو خصوصی نسبت ہے اور اسی نسبت خصوصی کے یہ آثار ہیں جن کا تجربہ اور مشاہدہ آپ کو کرایا جا رہا ہے اور جیسا کہ حضرت حکیم الامت علیہ الرحمہ سے اس موقع پر نقل کیا گیا ہے کہ حاجی صاحب نے مولانا محمد قاسم کو خطاب کر کے فرمایا کہ: ''یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا''۔ جس کی تشریح حاجی صاحب کے حوالہ سے انہوں نے یہ کی ہے کہ: تم سے (یعنی مولانا محمد قاسم سے) حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے جا کر دین کی خدمت کرو ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دو۔(۶۵)

حضرت امام نانوتوی کے قلب مبارک پر جس فیضان نبوت کی اطلاع حضرت حاجی صاحب نے دی تھی اسی کا یہ اثر تھا جسے سوانح مخطوطہ میں یوں ذکر کیا گیا ہے لکھتے ہیں:

(۶۴) مجموعہ ملفوظات حسن العزیز بحوالہ معارف الاکابر ص:۲۶۴۔(۶۵) سوانح قاسمی ص:۲۵۹

طریقت میں آپ کو وہ قابلیت حاصل تھی کہ شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہی آن واحد میں وہ مقامات سلوک طے ہو گئے جو اکثر سالکوں کو سالہا سال کی محنت شاقہ میں بھی وصول نہیں ہوئے۔(٦٦)

اوپر حضرت امام کی بیعت مرشد کی بحث تفصیل کے ساتھ گزر چکی ہے کہ امام نانوتوی و محدث گنگوہی دونوں ہی حضرات نے طالب علمی ہی کے زمانے میں بیعت کر لی تھی ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت امام نانوتوی کی عمر تقریباً سترہ اٹھارہ ہی سال رہی ہو گی۔

ایسی صورت میں قطب وقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کا یہ ارشاد سوانح مخطوط کی مذکورہ بالا شہادت کو مزید مصدق و موثق اور قابل یقین بنا دیتا ہے کہ:

مولانا محمد قاسم کو کم سنی ہی میں ولایت ہو گئی۔

اب قابل توجہ اور لائق غور بات رہ جاتی ہے کہ حضرت امام نانوتوی نے حضرت شیخ حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہ سے فیضان نبوت کی مبارک باد سن کر اور ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دینے کی ہدایت پا کر کیا کیا؟ کیا آپ نے ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑ دیا؟ مجاہدات و ریاضات ترک کر دیئے؟ سوانح میں مذکور حالات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا بلکہ آپ نے بھی اس فیضان نبوت کے تحت وہی کیا جو خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا تھا اور لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ کا اعلان سن لینے کے بعد بھی اَفَلَا اَكُوْنُ عبداً شكوراً فرما کر حق عبودیت ادا کرتے اور محسن حقیقی کی شکر گذاری فرماتے رہے یہی حضرت امام نانوتوی نے بھی کیا رحمہ اللہ و قدس اللہ سرہ۔

حضرت امام محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ کے سلوک و احسان سے متعلق اپنی بساط اور معلومات کی حد تک جو کچھ الٹا سیدھا لکھا جا سکا وہ پیش ناظرین کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے قبول فرما کر احقر کے لئے ذخیرۂ آخرت اور ذریعۂ نجات بنائے آمین۔

آخر میں ایک حکایت جو اسی موضوع تحریر سے متعلق ہے وہ بھی ملحوظ خاطر رہے تو احقر کے حق میں زیادہ مفید بات ہو گی۔

بزرگوں سے سنا ہے اور بعض کتابوں میں پڑھا بھی ہے لیکن حوالہ مستحضر نہیں ہے اس نقص کے باوجود حکایت قابل سماعت ہے مشہور حکیم و فلسفی شیخ الرئیس بو علی سینا کے زمانے میں ایک مشہور

(٦٦) سوانح قاسمی ص:۳۰۲۔

بزرگ صوفی وشاعر حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر بھی تھے بوعلی سینا ایک دن حضرت شیخ کی زیارت و ملاقات کے لئے ان کی مجلس میں حاضر ہوئے کچھ دیر بیٹھے کچھ گفتگو بھی ہوئی ہوگی پھر چلے آئے۔

بعد میں حضرت شیخ کے اہل مجلس میں سے کسی سے پوچھا کہ حضرت شیخ میرے چلے آنے کے بعد کچھ میرے بارے میں فرمایا تو نہیں تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ فرمایا تھا کہ مردے خوب است ولے اخلاق نہ دارد

بوعلی سینا نے یہ سن کر اخلاق پر پورا ایک رسالہ لکھ ڈالا اور حضرت شیخ کی خدمت میں بھیج دیا، شیخ رسالہ کو ادھر ادھر سے دیکھا اور فرمایا من نگفتہ بودم کہ اخلاق نہ داند گفتہ بودم کہ اخلاق نہ دارد

بوعلی سینا نے جو غلطی کی تھی وہی غلطی راقم السطور سے بھی سرزد ہوگئی ہے کہ اخلاق نہ رکھتے ہوئے اخلاق پر یہ مقالہ سپرد قلم کر دیا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس میں صرف راقم السطور کا قصور نہیں ہے اس کی زیادہ تر ذمہ داری سیمنار کے ذمہ داروں کی ہے۔

☆......☆......☆

مولانا عبدالوحید حیدرآبادی*

ہم نواؤں سے ہم کلامی
مولانا قاسم نانوتوی کی زبانی

آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے دیوبند کی چھتہ مسجد میں انار کے درخت کے نیچے بنا چبوترہ مدینۃ الرسول کی مسجد نبوی میں بنے اصحابِ صفّہ کے چبوترے کے سلسلے کی ایک کڑی بن کر ابھرا تھا، جس میں علم وہدایت کی ایسی شمع روشن کی گئی تھی جو زنگی اور فرنگی ہر دور میں روشنی پھیلاتی رہی۔ اب یہ روشنی کا مینار وسیع وعریض رقبہ پر بلند وبالا عمارتوں کی شکل میں طالبانِ علم دین کے لشکر کی تربیت گاہ بنا ہوا ہے، جہاں کے تربیت یافتہ خدا کے سپاہی سچے اور صحیح عقائد سے لیس، زیور علم اور دینی تعلیمات سے آراستہ دنیا کے چپہ چپہ میں دین الٰہی کی روشنی کو عام کرنے میں سرگرم عمل ہیں۔ آج دنیا جہان میں جو ہزاروں دینی اور اصلاحی درسگاہوں اور جماعتوں کا جال بچھا ہوا ہے وہ اُسی انار کے چھتنار برگد کے سمان بٹی زنجیروں کے بَل اور تانے بانے کی حیثیت رکھتے ہیں جو: واعتصموا بحبل الله کی روشن تعبیر بنے ظلمتِ دہر میں وحدت ورسالت کے نور کو عام کرنے کی مقدور بھر کوشش کر رہے ہیں۔ تبلیغ واصلاح کی کوئی تحریک اور جماعت جھوٹے منہ بھی اس بات کا انکار نہیں کر سکتی کہ وہ اس بحر بیکراں سے ہم کنار اور اس فیض رساں چشمہ سے فیضیاب نہیں۔

امام قاسم نانوتوی کی ذات ہم سب کے لئے ایک مثالی شخصیت کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کا لڑکپن، طالب علمی کا زمانہ، عائلی زندگی، روزی اور روزگار کے مشاکل کا سامنا، خودداری اور عزتِ نفس کی پاسداری، حق وصداقت کا بےباک اظہار، حلال وحرام کی تمیز میں تقویٰ وطہارت کا پاکیزہ معیار ہمارے لئے زندگی کے ہر مرحلہ پر مشعلِ راہ بنا ہوا ہے:

---

* حیدرآباد (اے پی)

دل ہے یہ پتھر نہیں ہے جگ ہنسائی کے لئے　　　　بس یہی کافی ہیں شاید دل ربائی کے لئے

اہل قیافہ وفراست کی شخصیت شناسی کی شریعت میں کوئی شنوائی نہیں، قرائن، دلائل اور شواہد نہیں، مگر بادل کی گرج دیکھ کر پیشین گوئی کرنے والے پر کوئی پابندی بھی نہیں! ورنہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات اور پانسے میں پاؤں دیکھنے کی روایت زمانہ کی آنکھ اور ماں باپ کی آس بن کر زندگی کی دھوپ میں چھاؤں نہ بنتے، یوسفؑ کو بھائیوں نے کیوں اندھے کنوئیں میں دھکا دیا؟ فرعون نے موسیٰ کو کیوں موجوں کے حوالہ کیا؟ نوفل نے چہرہ پر کون سی روشنی دیکھی تھی؟ صحیفے کائنات میں گم ہوئے، آوازیں فضاؤں میں سما گئیں مگر ضائع کچھ نہیں ہوا، یہ سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا جب: **أنطقنا الله الذی أنطق کل شئ** کا عملی مظاہرہ ہوگا۔

مولانا قاسم نانوتویؒ کا بچپن گاؤں دیہات کے مکتب میں ابتدائی تعلیم پانے والے بچوں سے مختلف نہ تھا، صدیوں سے چلی آئی روایت آج بھی گاؤں دیہات میں مکتب اور بچوں کا وہی منظر نامہ پیش کرتی ہے جس کا نقشہ سیرتِ قاسم میں پیش کیا گیا ہے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ گاؤں، قصبوں اور شہروں میں تبدیل ہوتے گئے، مگر اس کے ساتھ چند گھروں کی بستیاں بھی گاؤں بن کر اُبھر گئیں، جن میں اب بھی وہی ریت رائج ہے جو دیوانے چھوڑ گئے، یہیں سے ہر بڑے دینی اور دنیوی اداروں کو ایسے افراد بھی فراہم ہوتے رہے جن پر شہروں کی جگمگاتی اور طلسماتی دنیا خول تو چڑھا دیتی ہے مگر دل کی دنیا نہیں بدل پاتی:

وہی مکتب وہی ملاّ وہی بچوں کی غوغائیں
یہیں پڑتی ہیں بنیادیں، یہیں اٹھتی ہیں دیواریں

مولانا قاسم نانوتوی کی تربیت جس طرح ہوئی تھی وہ بھی اپنے لئے، اپنے بچوں کی تربیت کے لئے، مکاتب ومدارس کے اربابِ نظم ونظارت کے ذمہ داروں کے لئے فکر وعمل کا نہج بجھاتی ہے، بچوں کی ذہنی تربیت کے لئے جس قدر تعلیم وتعلّم کی ضرورت ہے، اسی قدر جسم وجان کے ڈھانچے کو مضبوط رکھنے کے لئے کھیل کود اور بدنی ریاضت کی ضرورت ہے، تاکہ ہماری نسلیں علم وعمل سے آراستہ، اسلامی تربیت کے اولین معلّم کے درسِ اولین: **اقرأ باسم ربك الذی خلق** کی روشنی سے منور ہوکر اسلامی معاشرہ اور اسلامی طرزِ زندگی کے اولین رہنما کے ارشاد: **المومن القوی خیر من**

المؤمن الضعیف کا بہتر مظہر بن کر دنیا میں زندگی گزاریں۔

مکتب کی تعلیم کے ساتھ وہ بچوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہوتے، بازی لے جانے اور پالا مارنے کی پوری کوشش کرتے، اس کے ساتھ آئندہ زندگی کے مسائل اور مشاکل کا سامنا کرنے کے لئے اس عہد کی ضرورت کے مطابق عزت کے پیشہ خطاطی اور جلد سازی کے فن کو بھی سیکھتے رہے۔ بزرگوں کا کہنا بے معنی نہیں ''ہاتھ میں ہنر روزی کا ضامن ہے۔''

آج سینکڑوں پیشوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ بھی ان کو سیکھا جاسکتا ہے تاکہ یہ دور اندیشی ''داشتہ آید بکار'' کے طور پر ضرورت پڑنے پر کام آسکے۔ مولانا قاسم نانوتوی مفلس گھر میں پیدا نہیں ہوئے تھے، پھر بھی طالب علمی کے دور میں خطاطی اور جلد سازی کا فن سیکھتے رہے تاکہ وقتِ ضرورت ہاتھ کی روزی کشکول کی ذلّت سے محفوظ رکھ سکے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ دینی مدارس کے تعلیم یافتہ بھی سرکاری ملازمت کے اہل سمجھے جاتے تھے۔ پہلے اہلیت معیار تھی، اب ڈگری معیار ہے۔ اہلیت کے ساتھ ڈگری ہو تو سونے پر سہاگہ، یہ اپنا اپنا اختیار ہے کہ آدمی ایک آتشہ رہے یا دو آتشہ بن جائے۔

مولانا قاسم نانوتوی نے سرکاری ملازمت بھی کی اور کتابوں کی تصحیح کے پیشہ سے بھی روزگار حاصل کیا اور جب مدرسہ کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اپنی ذات اور اہل وعیال پر دینی تعلیم اور دینی مدرسہ کی ذمہ داری کی اجرت صرف کرنا گوارا نہ کیا۔ تقویٰ وطہارت اور کردار کی پاکیزگی کا یہ وہ معیار ہے جس پر مجھ جیسے جامہ زیب، سرمہ سلائی اور نمائشی شیروانی کے خوگر شاید و باید ہی پورے اتر سکیں، جبکہ مجھے اس کا بھی پورا علم ہے کہ دین کے کسی کام کی اجرت لینا غیر مستحسن ہے، اس کو بدرجۂ مجبوری روا رکھا گیا ہے۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اپنے آپ کو لوگوں کی نظر میں مستحسن بنانے کے لئے غیر مستحسن یافت سے زیبائش مجھے کس زمرہ میں شامل کرتی ہے؟

عائلی زندگی، اپنی ذات اور ذرّیتِ آدم میں اضافہ کے مرحلوں میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ بڑی بوڑھیاں بڑے پتے کی بات کہہ گئیں ''فصل کی پھوٹ فصل میں لوٹ'' آٹے کا خمیر گرم توے پر ہی جوبن دِکھلاتا ہے۔ ہمیں تو یہ سکھایا گیا ہے **من یستطع منکم الباءۃ فلیتزوج** رادھا کے ناچنے کے لئے نو من تیل کا انتظار کرنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ روزے رکھنا اور دھنیے کا پانی پینا تو مجبوری کا نام

جی حضوری ہے۔

دینی تعلیم کا تسلسل کس طرح ہونا چاہئے، اس میں بھی مولانا قاسم نانوتوی کی تربیت ہماری رہنمائی کرتی ہے۔مکتب کی ابجدی تعلیم، ناظرہ قرآن کے بعد حفظ قرآن کا مرحلہ آتا ہے۔نہ معلوم ان کی تربیت میں یہ کڑی، مکتب کی تعلیم کے دوران کیوں کر ادھوری رہ گئی تھی؟ مولوی کو اس وقت اپنی علمی قابلیت میں کمی کا احساس ہوتا ہے جب وہ قرآنی حوالوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو شرعی احکام میں سب سے محکم دلیل کی حیثیت رکھتے ہیں، حافظ قرآن کی عظمت بجا مگر شاید مولانا نانوتوی کو یہ احساس بار بار کچو کے لگاتا تھا کہ وہ شرعی احکام کے حوالوں اور حاضر جوابی میں قرآنی استدلال اَزبر پیش کرنے میں حافظ جیسی روانی نہیں دکھلا سکتے تھے، چنانچہ عائلی زندگی میں بیوی بچوں کی چوں چرا راگنی کے باوجود اٹھائیس سال کی عمر میں انہوں نے پورا قرآن حفظ کرلیا تھا، یہ وہی کرسکتا ہے جس کو اپنی ذات میں کمی اور نقص کا احساس ہوتا ہے اور اس کمی کو دور کرنے کے لئے وہ عزم و حوصلے سے کام لیتا ہے، یقین محکم، عمل پیہم کامیابی کا گُر ہے۔

امام قاسم نانوتوی کی ساری زندگی کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہمیں آئینہ دکھاتی ہے۔اس میں دیکھنے والے کے لئے اپنی ذات کے بے ہنگم کھانچے اور نفس امارہ کے خونچے سب کچھ نظر آجاتے ہیں۔ہم کس کھانچے پر لڑکھڑاتے ہیں اور کس خونچے پر رال ٹپکاتے ہیں۔وہ ایک ایسی ذات تھی جس نے کبھی اپنے وقت کے رئیسوں اور جاگیرداروں کو نظر اٹھا کر نہ دیکھا، ہمیشہ ان سے گریز کیا، زینت و زیبائش سے بے نیاز رہا، سادہ زندگی، سادہ خوراک اور سادہ لباس کو ترجیح دی، غریبوں اور کمزوروں میں گھلا ملا رہتا تھا، نو وارد پوچھتے پھرتے تھے قاسم کون ہے؟

سادہ لوح غریبوں اور کمزور طبقہ کے افراد میں کتنا ایمان اور اخلاص ہوتا ہے۔اس کو بے لوث نظر ہی دیکھ سکتی ہے۔یہی وجہ تھی کہ دارالعلوم نے ماضی قریب تک اس روایت کو برقرار رکھا تھا کہ حکومتی امداد اور مالداروں کی موٹی رقم کے مقابلے میں غریبوں کے خون پسینے کے پیسے کو ترجیح دی جائے، مستقل آمدنی کی کوئی جائیداد نہ بنائی جائے۔کیسے مخلص اور دور اندیش مومن تھے وہ لوگ جن کے عاقبت اندیش فیصلوں نے حکومتی دراندازی اور جائیدادوں کے ضمن میں پیدا ہونے والے خویش پروری اور حرص و ہوس کے جذبات کا سدِ باب کردیا تھا۔سیاست اور ریاست کا مرغوب نظام، شوریٰ کی

بالادستی کے بغیر بے روح جان کی حیثیت رکھتا ہے، ماضی کے تلخ تجربے مجھ سے کیوں یہ کہلواتے ہیں:

تیغ منصف ہو، جہاں دار و رسن ہوں شاہد — بے گناہ کون ہے اس دار میں قاتل کے سوا

شہید حق وحید الزماں کا یہی قصور تھا نا کہ وہ بے باک، بے لوث حق گو مردِ مومن تھا، مولانا نانوتوی کا سچا پیروکار تھا، مولانا حسین احمد مدنی کا مرید تھا اور امام قاسم کے کردار کا شیدائی، اس نے ان کے کردار اور پیغام کو عام کرنے کے لئے ''القاسم'' رسالہ جاری کیا تھا، وہ ارادت اور قیادت کو دو خانوں میں تقسیم کرتے ہوئے: خذ ما صفا و دع ما کدر کا عملی نمونہ تھا۔

میری ہر ادا مجھے منافقت کے دائرے میں کھینچ لے جاتی ہے، میں اپنی ذات پر وہ سب کچھ منطبق نہیں کر پاتا جس کا مجھے درس دیا گیا تھا، شریعت وطریقت کا آئینہ دیکھتا ہوں تو میرے چہرے کے بدنما داغ مجھے منہ چڑاتے ہیں، مگر میں اتنا بے حس ہو گیا ہوں کہ بدنمائی میرے احساس کو چابک لگانے کے بجائے لیت ولعل کی لوریاں سنا کر سلا دیتی ہیں۔ گروہ بندی اور جماعتوں کی تقسیم انا پرستی اور جاہ پرستی کی آماج گاہ بنی ہوئی ہیں، حق وناحق میں جانبداری اور غیر جانبداری وہ منزل ہوتی ہے جہاں سربرآوردہ افراد اور برگزیدہ شخصیتوں کے ایمان وتقویٰ کی کشتی ڈگمگانے لگتی ہے، جس میں مولویانہ تاویلیں اور حیلے بہانے نفس کے بہلاوے اور دوسروں کو چپ کرنے کے پُرفریب غیر حقیقی منطقی قضیے موجبی نتیجے تو پیش کر سکتے ہیں مگر دل کی سالبی خلش کو نہیں مٹا سکتے۔ کیا وقتی مصلحت، مرغ و ماہی کی لذت اور جاہ پرستی کی ہوس لا یخفی علیہ شئ کی آنکھوں میں دھول جھونک سکیں گے۔ نہیں، ہرگز نہیں!

میری یہ سچائیاں جب میری ہی ذات پر منطبق نہیں ہوتیں تو میں کیوں کر دعویٰ پارسائی کر سکتا ہوں، میرے لئے اس کا جواب ''من نہ کردم شما حذر بکنید'' بہت آسان ہے، مگر میں اس تر نوالے سے لذتِ نفس کو آسودگی بخشنے کا قائل نہیں - میں اس کو قابلِ تلافی کوتاہی سمجھتا ہوں، جب تک اس کا احساس زندہ ہے میرے ایمان کی تازگی برقرار ہے، جب یہ برقراری بے قراری میں بدل جائے گی تو مجھ میں اور بل هم اضل میں کیا فرق رہ جائے گا۔ زیاں کا احساس ہی انسان کو ایمان کے دائرہ میں رکھتا ہے۔ میری اس بے ہنگم تحریر کو فلسفیانہ اور مولویانہ موشگافیوں سے بالاتر رکھ کر سمجھنے کی کوشش کریں، یہی میرا مدعا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی مجھ سے زیادہ بہتر انداز میں میرے افکار پیش کر سکے، طوالت سے بچتے ہوئے، اختصار کے ابہام سے گریز کرتے ہوئے ژولیدہ بیانی کے انداز میں کچھ اشارے کر دیئے

ہیں، مقدر اور بر ضرورت حذف کو صرفی نحوی تحلیل کرنے والے سمجھ کر عبارت کا مطلب نکال لیتے ہیں، بین السطور اور حواشی پر نظر رکھنے والے مافی بطن الشاعر کو خوب سمجھتے ہیں۔

انجماد اور جمود کو اسلام نے کبھی مستحسن قرار نہیں دیا، اس نے: سخر لکم ما في السمٰوات وما في الارض اور: واعدّوا لهم مااستطعتم کا درس دے کر ترقی اور باعزت زندگی گزارنے کا گُر بتایا، اس نے خوب سے خوب تر حاصل کرنے کی ہمیشہ ترغیب دی مگر اسلامی تعلیمات کے دائرہ میں رہ کر اس طرح کہ آپ کی ذات اور کردار کو دیکھ کر انسانی معاشرہ کا ہر فرد آپ کو اسلام کا صحیح ترجمان سمجھے۔

ہر عہد کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، ایسے وقت میں دانشوروں اور بزرگوں پر یہ الہامی اور فکری فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر نسخۂ حکمت قوم کو دیں تا کہ بر وقت مرض کا ازالہ ہو سکے۔ ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ چند مصلحت بین موقعہ پرست کسی چڑھتے سورج کے گرد ہالہ ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں جس سے وہ اپنی روشنی کے خول میں بند ہو جاتا ہے، جہاں اس کی اپنی ساری توانائیاں ناتواں ہو کر دستر و دستار کے سنوارنے میں لگ جاتی ہیں۔ ''پھر پیراں نمی پرند مریداں می پرانند'' کا شیطانی غول اس پر چوغ قبا اور شیروانی کا غلاف چڑھا کر کام و دہن کی لذتوں میں مصروف کر کے فکر فردا اور امت مسلمہ کی نیاز سے بے نیاز کر دیتے ہیں اور اس کو ایسے عنکبوتی جال میں جکڑ دیتے ہیں جہاں وہ کیڑوں کی ہی خوراک بن کر رہ جاتا ہے۔

مولانا قاسمؒ نے اپنے گرد ہالہ بندی نہیں ہونے دی تھی جس سے ان کی سرگرمیاں اور توانائیاں برقرار رہیں، وہ ایک ایسے عبوری دور سے گزر رہے تھے جس میں مسلمانوں کا جاہ وجلال ماند پڑنے لگا تھا، فتنے سر اٹھانے لگے تھے، معاشی بدحالی اور جہالت، دین حنیف پر یلغار کر رہی تھیں، ایسے نازک مرحلہ پر انہوں نے حکمتِ عملی اپنائی کہ مقامی اور عوامی دونوں محاذوں پر بیک وقت اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں، مقامی طور پر مدارس اور مکاتب کا جال بچھانا شروع کیا تا کہ آئندہ نسلیں علم دین سے آراستہ اور پیراستہ ہو کر ایمان پر قائم رہ سکیں، چنانچہ دہلی اور اس کے اطراف بلند شہر، مراد آباد، سنبھل، مظفر نگر، ہری دوار، سہارنپور، بجنور، علی گڑھ اور میرٹھ میں دینی مدارس قائم کیے، جن کی شمع سے شمعیں جلتی گئیں اور آج ان کی تعداد دنیا جہان میں ہزاروں سے گزر کر لاکھوں تک پہنچ گئی اور کروڑوں

افراد ان کی روشنی سے فیضیاب ہو رہے ہیں:

مردے آمد و کارے بکرد

دوسرا محاذ انہوں نے عوامی بحث و مناظرہ کا کھولا تھا، حکومت کے چھن جانے کے بعد معاشی پسماندگی اور جہالت کی ظلمت کی آڑ میں عیسائی پادری اور ہندو پنڈت سادہ لوح مسلمانوں کی ایمانی دولت بھی لوٹ لینا چاہتے تھے۔ اس خطرناک صورت حال کو دیکھتے ہوئے انھوں نے پادریوں اور پنڈتوں کو عوامی جلسہ اور اجتماع میں مناظرہ کے لئے للکارا جو اسلام یا اس کے کسی شرعی حکم پر اعتراض یا یاوہ گوئی کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھے تا کہ عوام میں پھیلائی ہوئی افواہوں اور غلط بیانیوں کا اسٹیج پر پردہ فاش ہو جائے۔

ان دونوں محاذوں پر سینہ سپر رہتے ہوئے انہوں نے اپنے علم، تجربے اور مشاہدات کو سفینوں میں انڈیل دیا، درجنوں کتابیں اہل علم اور اہل طلب حضرات کے لئے مشعل نور و ہدایت بنی ہوئی ہیں۔ مولانا وحید الزماںؒ کیرانوی نے اس مرد مجاہد، سالار قافلہ، ایمان و صفا کے عملی پیکر امام قاسم نانوتوی کی تصنیفات اور تالیفات کی از سرِ نو طباعت و اشاعت کا بیڑہ اٹھایا تھا، اپنے ادارہ دار المصنفین سے اکابر کی بہت سی کتابوں کو از سر نو طبع کیا، مرحوم اپنے پروگراموں اور اسکیموں کو پورا کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دیا کرتے تھے، آخری سانس تک بریف کیس، مسودے، قلم اور بڑے نمبر کے دبیز شیشوں کی عینک سرہانے رہی اور یہ کہہ کر جان جاں آفریں کے سپرد کر دی ''اتنی ہی توفیق ملی تھی اتنا ہی کر پایا'' ان کے برادر خورد مولانا عمید الزماں نے ان ادھورے منصوبوں کو پورا کرنے کا بار اٹھایا ہے، جس میں سب سے بڑا منصوبہ مولانا قاسم کے تمام علمی اور ادبی کارناموں کی اشاعت و ترویج ہے۔

آخر اور اخیر میں دل کا بوجھ کم کرنے کی خاطر اپنوں سے، اغیار اور اخیار سے پوچھنا چاہتا ہوں، کیا اسلام میں جمود اور انجماد کی پذیرائی ہے؟ کیا طریقہائے کار کی بہتری کی راہیں مسدود ہو گئی ہیں۔ نہیں، ہرگز نہیں! طریقہائے کار تو کائنات کی نبض تھمنے تک خوب سے خوب تر کو خوش آمدید کہتے رہیں گے۔

اگر انسانی معاشرہ اور اسلامی طرز زندگی اپنے بنیادی ارکان، اقدار اور اصول کے تحفظ کے ساتھ ترقی اور تحسین کے عمل کو قبول کرتا ہے تو ہمیں زمانہ کی رفتار کے ساتھ طریقہائے کار اور حکمت عملی

کوتبدیل کرنا چاہئے۔

مولانا نانوتوی اوران کے رفقائے کار نے اپنے عہد کے حالات کے تحت دینی دعوت واصلاح کے لئے جوحکمت عملی اختیار کی تھی، ان میں ایک مناظروں اورمباحثوں کے ذریعہ باطل فتنہ پردازوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ اور فریب کا پول کھولنا تھا۔ آج بھی اس کی ضرورت ہیمگراس سے زیادہ ضرورت ہے کہ ہرملک کی اپنی زبانوں میں اورعالمی سطح پر انگریزی میں اخبارات، رسائل اور انٹرنیٹ کے ابلاغ وترسیل کے نظام کواپنا کر اسلامی تعلیمات کو عام کیا جائے اورمعترضین کے جواب بھی ان کی زبان اوران کے سکّے میں دیئے جائیں۔آپ کوتعجب ہوگا بابری مسجد کے انہدام سے پہلے انٹرنیٹ اورٹیلیفون لائن کے واسطہ سے نشرواشاعت اور باہمی سوال وجواب کے کمپیوٹری نظام کواستعمال کرکے دنیا بھرمیں رائے عامہ کوہموار کرنے کے لئے فارسی میں لکھی گئی تاریخی کتابوں کے حوالہ سے انگریزی میں بار بار یہ بیان نشر کیا گیا کہ مندرکومسمار کرکے بابری مسجد تعمیر کی گئی تھی، ہم میں سے کسی نے بھی ان حوالوں کی تغلیط اور تردید میں کچھ نہیں لکھا۔اس کے بعد چند دنوں کے اندر منصوبہ بند طریقہ سے چند گھنٹوں میں صدیوں سے قائم آہنی گچ اور چونے سے بنی بلند وبالا ٹیلے پر کھڑی حسین گنبدوں والی مسجد حصار بند پولیس کے محاصرہ میں شہید کردی گئی تھی۔مولویوں کوتو کیا خبر ہوتی، برسوں سے مسجد کے نام پرلیڈری چمکانے والے لیڈروں اورگیدڑوں کوتو شاید یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ انٹرنیٹ کے ذریعہ یہ پروپیگنڈا کیا جارہا تھا۔عنادل آشیانوں اورایوانوں میں لوریاں سنتے رہےاور باغباں نے مسجد پرمیزائل برسادئے۔**أعدوا لهم مااستطعتم** کاحکم عام ہےاور ہرعہد کے لئے توہم کس قدرغافل اور بےعمل ہیں خوداپنا محاسبہ کرسکتے ہیں۔

کیا ہمارے بڑے اداروں اور جماعتوں کے مراکز میں ایسے شعبے ہیں جومولانا نانوتوی کی مناظرے کی روایت کوآگے بڑھاکر مقامی زبانوں میں اپنے علاقہ میں اورعالمی سطح پرترقی یافتہ ذرائع کااستعمال کرکےاسلام اورمسلمانوں کے خلاف زہریلے پروپیگنڈوں کاجواب دیتے ہیں،**ادع الى سبيل ربك بالحكمة** پرعمل کرتے ہوئے **بلغوا عني ولو آية** کافریضہ پورا کررہے ہیں؟

دوسری حکمت عملی مولانا نانوتوی اوران کے رفقائے کار نے یہ اپنائی تھی کہ گاؤں گاؤں شہر شہردینی مدارس قائم کئے جائیں،ان کی آج بھی پہلے سے زیادہ ضرورت ہے،صبح اورشام کے اوقات

میں ہر گاؤں اور شہر کے ہر محلے میں مسجد میں یا اس سے ملحق عمارتوں میں مکتب قائم ہوں، اہل محلہ اور اہل شہر ہی اس کے کفیل ہوں، عملاً اور عملی طور پر اس کو باعثِ عار سمجھا جائے کہ اپنے گاؤں اور شہر کے مدرسوں کے لئے دوسرے گاؤں یا شہر سے چندہ خیرات مانگی جائے۔ ہم جب اپنی ضرورتوں کو پورا کرسکتے ہیں، بیوی بچوں کا پیٹ پال سکتے ہیں تو چند روپے اپنے بچے بچیوں کی تعلیم وتربیت کے لئے نہیں دے سکتے؟

امام نانوتوی نے تصنیف وتالیف، طباعت ونشر کے شعبہ میں بھی ہماری رہنمائی کی، ہمارے بڑے اداروں میں نشرواشاعت کے شعبے تو برائے نام قائم ہیں، ان کی کارکردگی دیکھی جائے تو فرد واحد کی انفرادی جدوجہد سے سامنے آنے والے نتائج کے مقابلے میں ہیچ نظر آتی ہے۔ معاصر دور میں عصری تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے وسائل موجود ہوتے ہوئے بھی یہ برائے نام شعبے صرف چند افراد کی خیراتی روزی روٹی کے کفیل بنے ہوتے ہیں۔ جبکہ ہونا یہ چاہئے تھا کہ مرکزی اداروں میں ملک کی ہر زبان کے ماہر عالم فاضل افراد کی ایک جماعت موجود ہوتی جو قوم اور ملکوں میں پیدا شدہ مسائل، ان کے حل، بنیادی کتابوں اور ان کے ترجمہ کی عالمی سطح پر نشرواشاعت کی ذمہ دار ہوتی۔

درسیات، نقلیات اور عقلیات کے سارے علوم جمود کا شکار ہوکر رہ گئے، منطق کا ناطقہ بند ہے، میبذی کی ارضی حرکت رک گئی اور شمس بازغہ کی روشنی ماند پڑ گئی، طب نبوی اور طب رازی کے تریاق اغیار لے اڑے، خوارزمی کی حساب دانی سے فائدہ اٹھا کر محیر العقول کمپیوٹر بنائے گئے، یہ بھی ایک تفصیل طلب غور وفکر کا موضوع ہے۔

طریقۂ کار کیا ہو، حکمت عملی کیسی اختیار کی جائے، وہ آپ جیسے عہد کے نبض شناس دانشوروں اور علماء کی ذمہ داری ہے جو قوم کا درد اور کچھ کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

یہی امام قاسم کا پیغام ہم نواؤں کے نام ہے جو ہم سے ہم کلام ہے، یہ سیمینار بھی ان کے پیغام اور کام کو عام کرنے کے لئے منعقد کیا گیا، جو قومیں اپنے اسلاف کی تاریخ اور کارناموں کو فراموش کردیتی ہیں وہ اپنی وقعت کھو بیٹھتی ہیں۔ وما علینا الا البلاغ.

تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را — گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

☆☆☆

◄◄ چوتھا باب ►►

اساتذہ ورفقاء

مولانا نور عالم خلیل امینی*

حضرت امام محمد قاسم نانوتویؒ کے اہم اساتذہ

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مبادیِ نوشت وخواند اور ناظرہ قرآن پاک وغیرہ کے مراحل نانوتہ کے مکتب میں طے کیے۔ مکتب کے اساتذہ کا کوئی ذکر نہ سوانح یعقوبی میں ہے اور نہ سوانح گیلانی میں۔ پھر آگے عربی وفارسی کی ابتدائی تعلیم دیوبند میں، شیخ کرامت حسین (جو بعد میں حضرت نانوتویؒ کے خسر ہوئے اور جو دیوبند کے رئیسوں میں تھے) کے مکان پر مولانا مہتاب علی (متوفی ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء) سے پڑھی، جو شیخ الہندؒ کے تایا یعنی ان کے والد مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) کے بڑے بھائی تھے۔ مولانا مہتاب علی قیامِ دارالعلوم کی تحریک میں پیش پیش رہے تھے، قیام دارالعلوم کے لیے پہلا چندہ حاجی سید محمد عابد حسین (متوفی ۱۳۳۱ھ/۱۹۱۲ء) کا تھا اور دوسرا چندہ اِنھی مولانا مہتاب علی صاحب کا تھا[۱] اس سے آگے کی عربی وفارسی کی تعلیم آپ نے اپنے نانا مولوی وجیہ الدین وکیل سہارنپور کی سرپرستی میں مولوی محمد نواز سہارنپوری سے حاصل کی۔

اس کے بعد کی متوسط اور اعلیٰ تعلیم کی منزلیں آپ نے جن علمائے نام دار کے سامنے طے کیں، ان میں سرفہرست استاذ العلماء مولانا مملوک علی (متوفی ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء) مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۷ء) شاہ عبدالغنی مجددی (متوفی ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۸ء) اور مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) کا نام ان کے تذکرہ نگاروں نے لیا ہے۔

ان اکابر میں سے مفتی صدرالدین آزردہؒ کے حوالے سے یہ پتہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ نے ان سے کون سی کتاب یا مضمون پڑھا تھا، باقی تینوں حضرات سے انہوں نے جو کچھ پڑھا تھا اس کی تعیین تذکروں میں موجود ہے۔

بہ ہر صورت ان اکابر اربعہ کا مختصر سا تذکرہ ذیل میں پیش کیا جارہا ہے:

---

* استاذ ادب عربی ورئیس تحریر مجلہ 'الداعی' دارالعلوم دیوبند

مولانا مملوک علی نانوتویؒ

مولانا مملوک علی رحمۃ اللہ علیہ نہ صرف یہ کہ اپنے شاگرد نانوتویؒ کے ہم وطن تھے بلکہ دونوں کے جد اعلیٰ ایک ہی تھے۔ مولانا مملوک علی بن احمد علی بن غلام شرف بن عبداللہ صدیقی ۱۲۰۴ھ/۸۹-۱۷۸۹ء میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے، چالیسویں پشت میں ان کا سلسلۂ نسب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

مولانا مملوک علی کا جو تذکرہ ہمارے پاس موجود مراجع میں ملتا ہے، اس میں ان کی زندگی کے تشفی بخش حالات اور پھر تعلیم کے مراحل کا ذکر نہیں ملتا، البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دہلی میں تعلیم حاصل کی اور متعدد اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا۔ ارواح ثلاثہ میں ہے کہ:

''مولانا مملوک علی نانوتویؒ جب تحصیل علم کے لیے دہلی تشریف لے گئے، تو یہ صورت پیش آئی کہ جس استاذ سے پڑھنا شروع کرتے وہ علوم سے قلتِ مناسبت محسوس کر کے ایک سبق کے بعد دوسرا سبق نہ پڑھاتا تھا۔ اس صورتِ حال سے مولانا سخت ملول اور غم گین تھے۔ ایک روز اِسی پریشانی میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ: ''تحصیل علم کے شوق میں وطن چھوڑ کر آیا ہوں اور کیفیت یہ ہے کہ جس استاذ سے پڑھنا شروع کرتا ہوں وہ ایک سبق کے بعد پڑھانے کا نام نہیں لیتا'' شاہ صاحب نے فرمایا کہ ''اچھا کل آنا'' مولانا اگلے دن حاضر ہوئے، شاہ صاحب نے ہدایۃ النحو کا ایک سبق پڑھا دیا اور فرمایا: ''جاؤ! اب جس استاذ سے پڑھو گے وہ اِنکار نہیں کرے گا۔'' چنانچہ پھر ایسی مناسبت ہوئی اور ایسے چلے کہ بڑے بڑے علماء ان کے شاگرد ہوئے۔''(۲)

حوالۂ بالا سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں:

۱۔ مولانا مملوک علیؒ نے ایک آدھ ہی سبق سہی حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی (متوفی ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۴ء) یعنی حضرت امام شاہ ولی اللہؒ محدث دہلوی (متوفی ۱۱۷۶ھ/۱۷۶۲ء) کے بڑے صاحبزادے سے بھی پڑھا۔ اس طرح اُن کا سلسلۂ تلمذ و اسناد بہت عالی ہو جاتا ہے اور بالآخر تمام

---

(۱) تاریخ دیوبند مؤلفہ سید محبوب رضوی طبع دوم (ص ۲۳۱ و ۲۳۲) نیز حاشیہ تاریخ دارالعلوم دیوبند ج: ۱، ص ۱۵۰۔

(۲) ارواح ثلاثہ، بحوالہ روایات الطیب، حکایت نمبر ۱۸۵، نقل از تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج: ۱، ص ۹۸ (حاشیہ)

علمائے دیوبند وعلمائے ہند کا بھی جنہیں ان سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔

۲۔ مولاناؒ نے ہدایۃ النحو سے قبل کے مراحل گویا اپنے وطن نانوتہ میں طے کر لیے تھے اور ابتدائی تعلیم کے بعد ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے دہلی تشریف لے گئے۔

۳۔ دہلی میں متعدد اساتذہ سے کسب فیض کیا، صرف مولانا رشید الدین خاں صاحب سے ہی نہیں جیسا کہ عموماً مولاناؒ کے تذکرہ نگاروں کی عبارت کے ابہام سے سمجھ میں آتا ہے۔

۴۔ مولانا کو ابتدائے راہ میں، علم سے کچھ زیادہ مناسبت نہ تھی حتی کہ اساتذۂ کرام ان کی قلتِ مناسبت کی وجہ سے ایک سبق سے زیادہ پڑھانے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔

لیکن آپ نے دیکھا کہ شاہ عبدالعزیزؒ کی دعاء وتوجہات اور التفاتِ قلبی نے انہیں ایسا کندن بنادیا کہ بقول سرسید (متوفی ۱۳۱۵ھ/۱۸۹۸ء):

> ''علمِ معقول ومنقول میں استعداد کامل اور کتب درسیہ کا ایسا استحضار ہے کہ اگر فرض کرو کہ ان تمام کتب سے گنجینۂ علم خالی ہو جائے تو اُن کی لوحِ حافظہ سے پھر ان کی نقل ممکن ہے۔ ان سب کمال وفضیلت پر خلق وحلم، احاطۂ تحریر سے فزوں تر ہے۔''(۳)

یقیناً مولانا مملوک علیؒ نے متعدد اصحابِ کمال سے کسبِ علم کیا ہوگا، لیکن انہوں نے حدیث وفقہ کی اعلیٰ تعلیم اور اکثر علوم معقول ومنقول مولانا رشید الدین خاں دہلوی (متوفی ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء) سے حاصل کیے، جو مفتی علی کبیر بنارسی، حضرت شاہ رفیع الدین (متوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷ء) نیز شاہ عبدالعزیز اور شاہ عبدالقادر (متوفی ۱۲۳۰ھ/۱۸۱۴ء) کے خصوصی شاگرد اور ان کے تربیت یافتہ تھے(۴) شاہ رفیع الدین صاحبؒ نے ان کی تعلیم وتربیت پر بیٹے کی طرح خصوصی توجہ کی تھی، ہر وقت

(۳) آثار الصنادید، ج:۲، ص:۱۱۵، مطبوعہ اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۰ء

(۴) سید محبوب رضوی لکھتے ہیں:

''مولانا رشید الدین خاں گو ہر فن میں کامل دست گاہ رکھتے تھے، لیکن علم ہیئت اور ہندسہ میں ان کو خاص مہارت تھی اور اس زمانے میں مشکل سے کوئی شخص ان فنون میں ان کا مقابلہ کرنے کی جرأت کر سکتا تھا۔ مناظرے میں بھی ان کو زبردست کمال حاصل تھا۔ عربی زبان کے بے نظیر ادیب تھے۔ علم وفضل کے ساتھ مولانا رشید الدین صاحب کا زہد وتقویٰ بھی مسلم تھا، قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے، ایک مرتبہ عہدۂ قضا پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ ۱۸۲۵ء میں جب دہلی کا مشہور مدرسہ غازی الدین دہلی کالج میں تبدیل ہو گیا تو اس میں عربی کے صدر مدرس مقرر ہوئے، سو روپے ماہوار مشاہرہ ملتا تھا، فیاض طبع تھے، جو ضرورت مند پہنچ جاتا حتی المقدور اس کی مدد کرتے تھے۔ ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء میں تقریباً ۷۰ سال کی عمر میں انتقال فرمایا'' (تاریخ دار العلوم دیوبند، ←

ان کی اصلاح وترقی کی فکر وسعی رہتی تھی۔(۵)

مولانا مملوک علیؒ کے فیض رسانی کے دائرے، تلامذۂ باکمال کی کثرت اور مستفیدین کے تنوع اور اکثر شاگردوں کے اپنی اپنی جگہ علم وفضل اور قیادت وتحریک کی جوئے رواں کی حیثیت رکھنے پر ایک نظر ڈالی جائے تو یقین کرنا پڑتا ہے کہ اُن کی صلاحیت، مقبولیت، مرجعیت، ہمہ گیر افادیت اور علماء وفضلاء کے سرچشمہ ہونے کی کیفیت میں رب کریم کے خصوصی فیضان اور اس کی حکمت ومشیت کو بطور خاص دخل تھا۔ اللہ پاک نے زوالِ علم وعرفان کے اِس دور آخر میں، جس میں اسلامی شان وشوکت کا چراغ سرزمین ہند پر گل ہورہا تھا، مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے ہاتھوں علم وعمل کے ایسے ایسے آفتاب وماہتاب پیدا کیے جنھوں نے ہندوستان کو اسپین بن جانے سے بچانے کے لیے بروقت اور فعال کوششیں کیں، اسلامی اقدار وثقافت کے بجھتے ہوئے چراغ کی لو پھر سے تیز کردی۔

وہ شب وروز تعلیم وتدریس کے لیے غیر معمولی لگن کے ساتھ اپنے کو وقف کیے رہتے اور طالبانِ علوم ان سے استفادے کے لیے پروانہ وار ان پر ٹوٹتے رہتے۔

مولوی کریم الدین پانی پتی (متوفی ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) مولاناؒ کے تذکرے میں لکھتے ہیں:

> ''گھر اس کا محط الرجالِ طلباء، مدرسہ اس کا مجمع علماء وفضلاء، صدہا شاگرد اس ذات بابرکات سے فیض اٹھا کر اطراف واقطارِ ہندوستان میں فاضل ہوکر گئے، سوا درس دہی طلباء مدرسہ کے، اپنے گھر پر بھی لوگوں کو ہر ایک علم کی کتابیں پڑھاتے ہیں، تمام اوقات گرامی ان کے تعلیم طلباء میں نصف شب تک منقسم ہیں، ان کی خدمت میں صدہا طالب علم اطراف وجوار سے واسطے تعلیم پانے علوم کے حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حسنِ اخلاق سے یہ بعید ہے کہ کسی طالب علم کی خاطر رنجیدہ کریں۔''(٦)

حق یہ ہے کہ اِس آخری دور میں علم وفضل کی بساط بچھانے والی اکثر شخصیتیں آپ ہی کی

← ج:۱،ص:۱۰۰۔۱۰۱ بحوالہ آثار الصنادید)

لیکن حکیم سید عبدالحی حسنی صاحب ''نزہۃ الخواطر'' نے ان کی تاریخ وفات ۱۲۶۳ھ لکھ کر ان کے ساٹھ سال کی عمر میں وفات پاجانے کی تصریح کی ہے۔(ج:۷،ص:۱۹۹)

(۵) تاریخ دار العلوم، ج:۱،ص:۱۰۰

(٦) تذکرۂ فرائد الدہر از مولوی کریم الدین پانی پتی،ص:۴۰۳۔

شاگرد ہیں۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے مشرقی علوم کے احیاء کے ساتھ مغربی علوم کی ترویج کے لیے مدرسہ غازی الدین خاں کا نام، ۱۸۲۵ء میں مدرسہ دہلی کر دیا تھا جو عربک کالج کے نام سے بھی مشہور ہوا، مولانا مملوک علیؒ اس کے صدرالمدرسین تھے، صاحب نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:

''درس وأفاد مدة عمره، وأفنىٰ قواه فى ذلك، حتى ظهر تقدّمه في العلماء، أخذ عنه خلق كثير لا يحصون بحدّ وعدّ، كان فيهم كبار العلماء والأساتذة والمنشؤون للمدارس الكبيرة القائدون للحركة العلميّة الدينية''(۷)

یعنی انہوں نے مدۃ العمر تدریسی خدمت وفائدہ رسانی میں گزارا، اپنی ساری توانائیاں اس کی نذر کردیں، حتی کہ علماء کی صف میں ان کی برتری نمایاں اور مسلم ہوگئی، لاتعداد مخلوق نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا، جن میں بڑے بڑے علماء واساتذہ، بڑے بڑے مدرسوں کے بنیاد گزار اور علمی ودینی تحریک کے قائدین شامل ہیں۔

مولوی کریم الدین پانی پتی لکھتے ہیں:

''نیا مدرسہ عربی (یعنی مدرسہ غازی الدین خاں جس کو انگریزوں نے اپنے انتظام میں لے لیا تھا) ان کی ذات سے مستحکم ہے۔(۸) فارسی اور اردو اور عربی تینوں زبانوں میں کمال رکھتے ہیں۔ ہر ایک علم اور فن سے جو اِن زبانوں میں ہیں، مہارتِ تامہ ان کو حاصل ہے اور جس فن کی کتاب اردو زبان میں، انگریزی زبان سے ترجمہ ہوئی ہیں، اس کے اصل اصول سے بہت جلد ان کا

---

(۷) نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۵۳۴، ط:۱۴۱۳ھ/۱۹۹۲ء۔

(۸) بعض تذکرہ نگاروں جیسے مولانا سید حکیم عبدالحی حسنی (نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۵۳۴) نے لکھا ہے کہ مولانا مملوک علیؒ نے مدرسہ ''دارالبقاء'' میں بھی تدریس کی خدمت انجام دی تھی، اگر ایسا ہے تو یقیناً مولانا نے اس مدرسے میں عربی کالج سے وابستہ ہونے سے پہلے تدریس کی خدمت انجام دی ہوگی؛ اس لیے کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک عربی کالج سے ہی وابستہ رہے اور اسی وابستگی کی حالت میں آپ کا انتقال ہوا۔

مدرسہ دارالبقاء زیر جامع مسجد خود شاہ جہاں نے تعمیر کیا تھا، انگریزوں کے عہد میں سلطنت کی تباہی کے ساتھ مدرسہ بھی برباد ہوگیا تھا، مفتی صدرالدین آزردہ (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) نے اپنے خرچ پر دوبارہ بنوایا، عمارت درست کرائی، درس وتدریس کا اہتمام کیا، اساتذہ وطلبہ کو اپنے پاس سے تنخواہ اور وظیفہ جاری کیا، منتہی طلبہ کو عدالت کے کام سے فارغ ہوکر اسباق خود پڑھاتے تھے اور تعطیل کے دن سب کو لے کر باغات کی سیر کراتے اور لذیذ کھانے کھلاتے تھے (دیکھیے علمائے ہند کا شاندار ماضی مؤلفہ مولانا سید محمد میاں دہلوی متوفی ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء ج:۴، ص:۲۲۲ بحوالہ ''آثار الصنادید'' از سر سید احمد خاں متوفی ۱۳۱۵ھ/۱۹۹۸ء)

ذہن چسپاں ہوجاتا ہے گویا اس فن کو اول سے ہی جانتے ہیں اور جس کار پر مامور ہیں اُن میں کبھی کسی طرح کا حتی الوسع ان سے قصور نہیں ہوا۔ مدرسہ میں ان کی ذاتِ بابرکات سے اتنا فیض ہوا ہے کہ شاید کسی زمانے میں کسی استاذ سے ایسا ہوا ہو۔'' (۹)

تدریس کا ملکہ، طلبہ کو مطمئن کرنے اور تفہیم و القاء کی استعداد بھی لاجواب تھی، ''تذکرۃ الرشید'' میں حضرت گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کا ان کے سلسلے میں یہ ارشاد منقول ہے:

''ابتداءً ہم دہلی میں دوسرے اساتذہ سے پڑھتے تھے؛ لیکن تسکین نہیں ہوتی تھی، کہیں سبق تھوڑا ہوتا تھا، کہیں شبہات کا جواب نہ ملتا تھا۔ مگر جب مولانا مملوک علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے تو اطمینان ہوگیا اور بہت تھوڑے عرصے میں کتابیں ختم کرلیں۔ گویا استاذ نے گھول کر پلادیا۔ اس زمانے میں اچھے اچھے استاذ دہلی میں موجود تھے، مگر ایسے استاذ کہ مطلب پوری طرح ان کے قابو میں ہو اور انواعِ مختلفہ سے تقریر کرکے شاگرد کے ذہن نشین کردیں، ایک ہمارے استاذ مولانا مملوک علی صاحب اور دوسرے ہمارے استاذ مفتی صدرالدین صاحب تھے۔ رحمۃ اللہ علیہما۔'' (۱۰)

حضرت مولانا مملوک علی ایسے استاذ الاساتذہ تھے، جن کے خوانِ علم وفضل سے خوشہ چینی کرنے والوں میں زندگی، قیادت، تحریک، علمی و دینی سرگرمیوں اور تعلیمی و تربیتی جدوجہد کے متنوع میدانوں کے شہ سوار نظر آتے ہیں۔

ان کے ممتاز شاگردوں میں امام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) عالم ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ بن مولانا مملوک علی (متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) مولانا محمد مظہر نانوتویؒ (متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء) مولانا احمد علی سہارنپوریؒ (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) مولانا شیخ محمد تھانوی، مولانا محمد احسن نانوتویؒ (متوفی ۱۳۰۱ھ/۱۸۸۴ء) مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ والد ماجد شیخ الہندؒ (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) مولانا فضل الرحمن دیوبندی عثانی (متوفی ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء) مولانا محمد منیر نانوتویؒ (متوفی

---

(۹) تذکرہ طبقات الشعرائے ہند از مولوی کریم الدین پانی پتی، ص: ۴۶۳

(۱۰) ''تذکرۃ الرشید'' مؤلفہ مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) ص: ۳۰۔۱

۱۳۰۲ھ/۱۸۸۵ء) مولانا جمال الدین مدار المہام سکندر بیگم ملکۂ بھوپال (متوفی ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء) مولوی کریم الدین پانی پتی مؤلف تذکرہ طبقات الشعرائے ہند (متوفی ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء) شمس العلماء ڈاکٹر ضیاء الدین اہل. ایل. ڈی. دہلوی (متوفی ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء) مولانا عالم علی نگینوی مرادآبادی (متوفی ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء) مولوی سمیع اللہ حنفی دہلوی (متوفی ۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء) جنہوں نے ربیع الآخر ۱۲۹۲ھ میں علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی اور سر سید کے شریک کار رہے جس کو سر سید احمد خان نے پھر اپنے خون جگر سے زندگی بھر سینچا(۱۱) اور مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی (متوفی ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء) جیسے حضرات قابل ذکر ہیں؛ لیکن ان کے تذکرہ نگاروں کا یہ جملہ پڑھ چکے ہیں کہ ان سے بے شمار افراد نے شرفِ تلمذ حاصل کیا تھا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ استاذ الکل مولانا مملوک علیؒ کے پاس دیگر تمام علمائے باکمال (جن میں سے بعض کا اوپر نام لیا گیا) از خود پڑھنے کے لیے گئے تھے؛ لیکن ان کے صاحب زادۂ گرامی قدر مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے علاوہ شاید تنہا امام محمد قاسم نانوتویؒ ہی ایسے واحد خوش قسمت تھے جنہیں مولانا مملوک علی خود ہی اپنے ساتھ دہلی لے گئے اور ذکاوت وذہانت کے اس پتلے کو علم وعمل کے میدان کا شہ سوار ہی نہیں بلکہ سپہ سالار بنادیا۔

مولانا محمد یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب ''سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتویؒ میں فرماتے ہیں:

> ''اس زمانے میں (یعنی ۱۲۵۸ھ میں) احقر کے والد مرحوم حج کو تشریف لے گئے، احقر ایک برس کامل وطن رہا۔ حفظِ قرآن شریف پورا ہوگیا تھا؛ مگر صاف نہ تھا، صاف کرتا تھا۔ مولوی صاحب (یعنی امام مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ) سہارنپور سے وطن آئے اور اُن کے نانا کا انتقال اِس سال کے وبائی بخار میں مع بہت سے لوگوں کے ہوگیا تھا۔ اس زمانے میں مولوی صاحب کا ساتھ رہا،...... جب والد مرحوم حج سے تشریف لائے اور وطن آئے، تب مولوی صاحب سے کہا کہ میں تم کو ساتھ لے جاؤں گا۔ بعد از اجازت والدہ کے، دہلی روانہ ہوئے، ذی الحجہ ۱۲۵۹ھ کے آخر میں وطن سے چلے اور دوسری محرم ۱۲۶۰ھ کو دہلی پہنچے، چوتھی کو سبق شروع ہوئے۔

---

(۱۱) دیکھیے کتاب نزہۃ الخواطر، ج:۸، ص:۱۸۶، تذکرہ مولوی سمیع اللہ صاحب نیز دیکھیے ص:۴۰ تذکرہ سر سید احمد خاں صاحب

مولوی صاحب نے کافیہ شروع کیا اور احقر نے میزان اور گلستاں۔ والد مرحوم نے میرے ابواب کا سننا اور تعلیلات کا پوچھنا اُن کے سپرد کر دیا تھا اور ہر جمعہ کی رات کو کہ چھٹی ہوتی تھی، صیغوں کا اور ترکیبوں کا پوچھنا معمول تھا۔'' (۱۲)

مولانا مملوک علیؒ سے حضرت نانوتویؒ نے علوم وفنون کی ضروری کتابیں دہلی کالج میں داخلے سے قبل ہی ان کے مکان واقع کوچہ چیلان میں پڑھ ڈالیں اور کس طرح پڑھیں مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے سنیے:

''...... پھر تو مولوی صاحب ایسا چلے کہ کسی کو ساتھ ہونے کی گنجائش نہ رہی معقول کی مشکل کتابیں: میر زاہد، قاضی مبارک، صدرا، شمس بازغہ، ایسا پڑھا کرتے تھے جیسے حافظ منزل سناتا ہے؛ کہیں کہیں کوئی لفظ فرماتے جاتے اور ترجمہ تک نہ کرتے تھے۔'' (۱۳)

چنانچہ حسبِ توقع استاذ العلماء کے بعض شاگردوں کو اس پر استعجاب ہوا اور خیال ہوا کہ شاید محمد قاسم بلا سمجھے ایسے ہی آگے بڑھتے جاتے ہیں۔

مولانا محمد یعقوبؒ فرماتے ہیں:

''والد مرحوم کے بعض شاگردوں نے کہا بھی کہ حضرت یہ تو سمجھتے نہیں معلوم ہوتے ہیں۔''

اس پر استاذ الکل نے جو کچھ فرمایا وہ جہاں ان کی فراست علمی، تدریسی مہارت اور طلبہ کی نفسیات کی گہری بصیرت کی غماز ہے، وہیں طالبِ علم محمد قاسم کی غیر معمولی ذہانت اور کسب علم کی تعجب خیز خداداد صلاحیت پر بھی دال ہے۔

مولانا محمد یعقوبؒ لکھتے ہیں:

''جناب والد مرحوم نے فرمایا کہ میرے سامنے طالبِ علم بے سمجھے چل نہیں سکتا۔ اور واقعی ان کے سامنے بے سمجھے چلنا مشکل تھا، وہ طرزِ عبارت سے سمجھ لیتے تھے کہ یہ مطلب سمجھا ہوا ہے یا نہیں۔'' (۱۴)

پھر استاذ العلماء نے مولانا محمد قاسم کو دہلی کالج میں داخل کرا دیا جہاں وہ خود صدر الاساتذہ

(۱۲) سوانح عمری مولانا محمد قاسم بقلم مولانا محمد یعقوب بن مولانا مملوک علی نانوتوی، ص: ۵۔۶

(۱۳) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص: ۶، مطبوعہ دیوبند

(۱۴) حوالۂ بالا، ص: ۶

تھے، اس کے بعد بھی ان کی ماورائے کالج اپنے پاس تعلیم جاری رکھی جیسا کہ کالج میں بھی متعلقہ مضامین ان کو پڑھائے ہوں گے۔

مولانا محمد یعقوبؒ تحریر فرماتے ہیں:

''والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے متعرض نہ ہوجیو، میں ان کو پڑھالوں گا اور (مولوی محمد قاسم سے) فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعدِ حساب کی مشق کرلو، چند روز میں چرچا ہوا کہ مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کرلیا۔ از بس کہ یہ واقعہ نہایت تعجب انگیز تھا، طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع کی، یہ کب عاری تھے، ہر بات کا جواب باصواب تھا، آخر منشی ذکاء اللہ چند سوال نئے کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے اور وہ نہایت مشکل سوال تھے؛ ان کے حل کر لینے پر مولانا کی نہایت شہرت ہوئی اور حساب میں کچھ ایسا ہی حال تھا۔''(۱۵)

امام نانوتویؒ نے ہر چند کہ مولانا مملوک علیؒ کے بعد دیگر اساتذۂ کرام سے بھی کسب علم کیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ استعداد سازی اور اساس گزاری کا اصل کام مولانا مملوک علی ہی نے انجام دیا جنہیں خدائے حکیم نے استاذ الجلیل اور معلم العلماء بنا کر پیدا کیا تھا۔

۱۱رذی الحجہ ۱۲۶۷ھ مطابق ۹ر ستمبر ۱۸۵۱ء کو انتقال فرمایا اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے قبرستان واقع مہندیان میں مسجد کے سامنے آسودۂ خواب ہوئے۔

مفتی صدرالدین خاں آزردہ

مفتی صدرالدین خاں آزردہ (متوفی ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء) کے متعلق پیچھے ذکر کیا جاچکا ہے کہ امام نانوتویؒ کے اساتذہ کی فہرست میں آپ کا نام بھی لیا جاتا ہے، لیکن یہ تعیین نہیں کی جاتی کہ آپ نے ان سے کیا پڑھا؟

چونکہ مفتی صاحب مولانا نانوتویؒ کی دہلی کی طالب علمی کے زمانے میں حیات تھے، ان کی عظمت وشہرت، مسلمانوں کے تمام طبقوں میں ان کی مقبولیت اور تمام علم وفن میں ان کے یگانۂ روزگار ہونے کی وجہ سے طالبانِ علوم ان سے کسی طور استفادے کی کوشش ضرور کرتے تھے؛ اِس لیے یہ قرین

(۱۵) سوانح عمری مولانا محمد قاسم نانوتوی، ص:۶-۷، مطبوعہ دیوبند

قیاس بھی ہے کہ امام نانوتویؒ نے بھی ان سے علمی استفادہ ضرور کیا ہوگا۔

اِس قیاس کو تقویت ''تذکرۃ الرشید'' (سوانح امام ربانی مولانا رشید احمد گنگوہیؒ متوفی ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء) کے مصنف مولانا عاشق الٰہی میرٹھی (متوفی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء) کے اس بیان سے ہوتی ہے:

''حضرت گنگوہی فراغت کے کئی سال بعد اپنے اساتذہ سے ملاقات کے لیے دہلی تشریف لے گئے، اسی سلسلے میں حضرت مفتی صدرالدین صاحب صدرالصدور کی خدمت میں بھی حاضری دی؛ کیونکہ آپ نے ان سے بھی بعض کتابیں پڑھی تھیں اور وہ آپ کے اساتذہ میں تھے۔ ملاقات کے دوران مفتی صاحب نے حضرت گنگوہی سے دریافت فرمایا کہ میاں قاسم کیا کرتے ہیں؟ آپ نے بتایا کہ ایک مطبع میں تصحیح کا کام کرتے ہیں، دس بارہ روپے تنخواہ ہے، تو مفتی صاحب نے ران پر ہاتھ مار کر فرمایا: ''قاسم اتنا سستا، اتنا سستا؟!۔''(۱۶)

اس عبارت سے بعض تذکرہ نگاروں نے یہ استدلال کیا ہے کہ حضرت نانوتویؒ سے مفتی صاحب کی اتنی واقفیت اور ان کی علمی قدرومنزلت کی اتنی شناخت جس کا اظہار آپ نے ''قاسم اتنا سستا، اتنا سستا؟'' والے انتہائی استعجاب کے لہجے سے کیا ہے تب ہی ہوسکتی تھی جب امام نانوتویؒ نے ان سے پڑھا ہوگا اور انہوں نے ان کو قریب سے دیکھا اور برتا ہوگا؛ کیونکہ ایک استاذ ہی کو اپنے شاگرد کی حقیقی صلاحیتوں کا علم ہوتا ہے۔

نیز یہ کہ مولانا گنگوہیؒ اور نانوتویؒ دونوں دہلی کی طالب علمی میں یک جان و دو قالب بن گئے تھے اور یہ کیفیت زندگی کے آخری لمحے تک باقی رہی، تو یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ حضرت گنگوہی کوئی کتاب کسی عظیم استاذ سے پڑھیں اور امام نانوتویؒ اس میں ان کے شریک نہ ہوں۔

بہرصورت مفتی صدرالدین صاحب آزردہ کا مختصراً تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے:

مفتی صدرالدین آزردہ اپنے زمانے کے بلاشبہ مجمع الکمالات اور نادرۂ روزگار لوگوں میں تھے، ۱۲۰۴ھ/۱۷۸۹ء میں دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں تعلیم حاصل کی، آپ کے آباء واجداد کشمیری تھے، والد کا نام لطف اللہ تھا۔ معقولات کی تعلیم مولانا فضل امام خیرآبادی (متوفی ۱۲۴۴ھ/۱۸۲۹ء)

---

(۱۶) تذکرۃ الرشید، ص:۳۲

سے حاصل کی جب کہ منقولات یعنی فقہ وحدیث واصول وغیرہ حضرت شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین اور شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے حاصل کیا۔ وہ موسوعی عالم تھے۔ علماء واہل افتاء کے صدر، شعراء کے امیر، ادباء کے امام، بزم تدریس کے صدر نشیں، ہر دل عزیز اور خوبیوں کا مجسمہ تھے۔

مولانا فقیر محمد صاحب جہلمی ثم الدہلوی (متوفی ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۴ء) جو مفتی صاحب کے اخص تلامذہ میں تھے، اپنی مشہور اردو کتاب ''حدائق الحنفیہ فی طبقات المشائخ الحنفیہ'' میں رقم طراز ہیں:

''مفتی صدرالدین خاں صدر الصدور تمام علوم: صرف، نحو، منطق، حکمت، ریاضیات، معانی، بیان، ادب، انشاء، فقہ، حدیث، تفسیر وغیرہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور درس دیتے تھے۔ آباء واجداد آپ کے کشمیر کے اہل بیت علم وصلاح تھے مگر آپ کی ولادت دہلی میں ہوئی، علوم نقلیہ: فقہ، حدیث وغیرہ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور ان کے بھائیوں سے حاصل کیے اور ان کی سندیں لیں اور فنونِ عقلیہ کو مولوی فضل امام خیر آبادی والد مولوی فضل حق سے اخذ کیا اور شیخ (شاہ) محمد اسحاق دہلوی نے بھی آپ کو حدیث کی اجازت لکھ کر دی۔

''آپ بڑے صاحبِ وجاہت وریاضت اور اپنے زمانے میں یگانۂ روزگار اور نادرۂ عصر تھے، ریاستِ درس وتدریس خصوصاً، اِفتائے ممالک محروسہ مغربیہ بلکہ شرقیہ وشمالیہ دہلی اور امتحانِ مدارس وصدارت حکومتِ دیوانی آپ پر منتہی ہوئی۔ بجز شاہِ دہلی کے تمام اعیان واکابر، علماء وفضلاء خاص دہلی اور اس کے نواح کے آپ کے مکان پر حاضر ہوتے تھے۔ طلباء واسطے تحصیل علم اور اہل دنیا واسطے مشورۂ معاملات اور منشی لوگ (انشاء پرداز) بغرضِ اصلاحِ انشاء اور شعراء واسطے مشاعرہ کے آتے تھے۔

''اس اخیر وقت میں ایسا فاضل بایں جمعیت اور قوتِ حافظہ وحسن تحریر ومتانتِ تقریر وفصاحتِ بیان اور بلاغتِ معانی کے صاحبِ مروت واخلاق اور اِحسان دیکھا نہیں گیا۔ طلبہ مدرسۂ دارالبقاء (۱۷) اکثر طعام ولباس وبعضے ماہ وار، جناب سے پاتے اور آپ سے اور دیگر علماء سے

---

(۱۷) پچھلے صفحات میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ مدرسۂ دارالبقاء جامع مسجد کے نیچے شاہ جہاں کا تعمیر کردہ مدرسہ تھا جو زوال سلطنت کے ساتھ برباد ہو گیا تھا، مفتی صدرالدینؒ نے اپنے ذاتی خرچ پر اس کا احیا کیا اور اس کے دیگر مصارف کے کفیل رہے۔ دیکھیے حاشیہ نمبر ۸، دوسرا پیراگراف۔

تحصیل علم کرتے تھے۔"(۱۸)

صاحبِ "نزہۃ الخواطر" لکھتے ہیں:

"وہ (مفتی صدرالدین خاں آزردہ) ہر علم وفن خصوصاً علوم ادبیہ میں نادرۂ عصر تھے۔ کسی بھی علم وفن کے متعلق ان سے رجوع کیا جاتا تو سننے اور دیکھنے والے کو ایسا لگتا کہ اسی فن میں انہیں اختصاص ہے اور اس کو یقین کرنا پڑتا کہ وہ اس فن میں طاق ہیں؛ اسی لیے تم دیکھتے کہ علماء انہیں علم کا بے نظیر پہاڑ تصور کرتے ہیں، شعراء انہیں فنِ شعر کا علم بردار گردانتے ہیں اور امراء ہر معاملے میں ان سے رجوع ہوتے ہیں، اسی کے ساتھ وہ خوش حال اور کشادہ رزق تھے۔"(۱۹)

سر سید احمد خاں بانیِ اے ایم یو کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ نے اپنی مشہور تصنیف "آثار الصنادید" میں مفتی صاحب کا تذکرہ وجد آمیز اور مسرت سے لبریز لب ولہجے میں کیا ہے۔ انہوں نے ان کے تذکرے کا آغاز مشہور مدحیہ شعر سے کیا ہے:

هزار بار بشویم دهن زمشک وگلاب
هنوز نامِ تو گفتن کمال بے ادبیست

اس کے بعد ایک فکر وفلسفے سے لبریز مدحیہ تمہید لکھی ہے، پھر پر شوکت الفاظ اور زرق برق اسلوب میں ان کی اس طرح مدح سرائی کی ہے کہ سطر سطر سے عقیدت مترشح ہے اور بہ خوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مفتی صاحب کی جلالتِ شان، علمی آن بان اور فضل وکمال کے تنوع کا جادو کس طرح سر سید کے قلم کو سرمست کیے دے رہا ہے۔

پھر وہ لکھتے ہیں:

"قلم کو کیا طاقت کہ ان کے اوصافِ حمیدہ سے ایک حرف لکھے اور زبان کو کیا یارا کہ ان کے محامد پسندیدہ سے ایک لفظ کہے۔ قطع نظر اس سے کہ اس زبدۂ جہاں وجہانیاں کی صفات کا اِحصار (احاطہ وشمار) محالات سے اور کمالات کا حصر (اِحاطہ) مرتبۂ متعسرات سے (دشوار گزار چیزوں کے درجے میں) ہے، جس وقت قلم چاہتا ہے کہ کوئی صفت، صفات میں سے لکھے؛ یا زبان ارادہ

(۱۸) حدائق الحنفیہ (نقل از "علمائے ہند کا شاندار ماضی" ج:۴، ص:۲۲۱۔۲۲۲)

(۱۹) نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۲۴۶

کرتی ہے کہ کوئی مدح مدائح میں سے کہے، جو کہ ہر صفتِ قابلیت اوّل لکھنے کی اور مدح لیاقت پہلے بیان کرنے کی رکھتی ہے؛ مدت تک یہی عقدہ بندزبانِ تحریر اور گرہِ لسانِ تقریر رکھتا ہے کہ کون سی صفت سے آغاز اور کون سی مدح سے ابتداء کرے:

مجلس تمام گشت وبپایاں عمر رسید
ماہم چناں در اوّلِ وصفِ تو ماندہ ایم

"بے شائبۂ تکلف و بے آمیزشِ مبالغہ ایسا فاضل اور ایسا کامل کہ جامع فنون شتی اور مجمع علومِ بے منتہا ہو، اب سوا اس سرگروہِ علمائے روزگار کے بساطِ عالم پر جلوہ گر نہیں۔"

مفتی صاحب اعلیٰ درجے کے عالم، مفتی، قاضی ہونے کے ساتھ ساتھ، عربی، اردو اور فارسی نظم ونثر اور فصاحت وبلاغت میں کامل دست گاہ رکھتے تھے۔ سرسید نے ان کی عربی نثر، فارسی نثر اور عربی، فارسی اور اردو (جسے اس وقت ریختہ کہتے تھے) شعر کے نمونے درج کیے ہیں۔

مفتی صاحبؒ "جس طرح متنوع العلم والکمال تھے، اسی طرح متنوع المشاغل بھی تھے، جوان کی کسبی و وہبی صلاحیت کی بھرپور غماز تھیں۔

مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم الدہلویؒ فرماتے ہیں:

"مفتی صاحب نے غالباً زمانۂ اَسارت میں نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ (۲۰) کو ایک خط لکھا تھا جس میں پچھلی زندگی (یعنی ۱۸۵۷ء کی کوششِ انقلاب میں ہندوستانیوں کی ناکامی اور انگریزوں کی کامیابی کے بعد کی زندگی) کے مشاغل کا تذکرہ تھا، ملاحظہ فرمایئے:

"شکر ہے اس پروردگارِ عالم کا جس نے مجھے ایسی دلدل سے کہ ہمہ اس میں غرقاب تھا، نکالا۔ کیسے علائق میں جکڑبند تھا کہ نکلنا اُن سے سوائے اِس صورت کہ جو پیش آئی ممکن نہ تھا۔ مقدماتِ اصلی کا فیصل کرنا؛ منصفوں اور صدر امینوں کے مقدمات کا مرافعہ سننا؛ رجسٹری کے وثائق پر دستخط کرنا، مقدمات کے دوران میں فتوے دینا؛ کمیٹیوں میں حاضر ہونا؛ طلبۂ مدرسۂ سرکاری کا امتحانِ ماہ واری لینا؛ احکام آخر کو اپنے ہاتھ سے لکھنا؛ ہزار بار کاغذات پر دستخط کرنا؛ پھر گھر میں آکر طالب علموں کو پڑھانا اور اطراف وجوانب کے سوالاتِ شرعی کا جواب دینا؛ وہابیوں اور بدعتیوں

(۲۰) تلمیذِ مومن وغالب جن کا دوسرا تخلص حسرتی بھی تھا، متوفی ۱۲۸۶ھ/۱۸۶۹ء

کے جھگڑے میں حکم (ثالث) ہونا؛ مجلس شادی وغمی اور اعراس میں جانا؛ شعروشاعری کی صحبت گرم رکھنا؛ باغات کی سیر اور خواجہ صاحب کی زیارت کو اکثر جانا۔'' (۲۱)

۱۸۵۷ء کے جدوجہد آزادی کی موافقت میں جن علماء نے فتوے دیے ان میں مفتی صاحب پیش پیش تھے، بلکہ وہ انقلابی سرگرمیوں کی راہ نمائی کا فریضہ انجام دیتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ سے دس سال قبل جب رئیس المجاہدین مولانا احمد اللہ شاہ صاحب ؒ (ش ۱۲۷۵ھ/۱۸۵۸ء) دہلی تشریف لائے تھے تو مفتی صاحب نے ہی اپنی دور اندیشی کی بنا پر موصوف کو مشورہ دیا کہ اپنی جدوجہد کا مرکز دہلی کے بجائے آگرہ کو بنائیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور مفتی صاحب کے تعاون سے انہیں آگرہ میں قدم جمانے اور اپنی سرگرمیاں انجام دینے کا موقع ملا۔ (۲۲)

مولانا سید محمد میاں دہلوی ؒ لکھتے ہیں:

''۱۱ر جولائی کو جنرل بخت خاں دہلی پہنچے اور چند روز ہی علمائے دہلی سے اس جدوجہدِ آزادی کی حیثیت مشخص کرانا چاہی، تو یہ بتانا تو مشکل ہے کہ فتوی مرتب کرنے میں حضرت مفتی صاحب کا کہاں تک دخل تھا، البتہ یہ ایک نا قابلِ انکار حقیقت ہے کہ جن بزرگوں نے فتوی پر سب سے پہلے دستخط کیے، اُن میں حضرت مفتی صاحب کا اسم گرامی آج تک زیبِ قرطاس ہے۔'' (۲۳)

اسی لیے ۱۸۵۷ء کی قیامت خیزی کے بعد مفتی صاحب کو باوجودے کہ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے صدر الصدور اور مفتی کے منصب پر فائز تھے انگریزوں کی شدید پکڑ کا سامنا کرنا پڑا، جانِ عزیز تو کسی طرح بچ گئی، لیکن تمام املاک وجائے داد ضبط کر لی گئی، کئی ماہ نظر بند بھی رہنا پڑا۔ مرزا غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''حضرت مولوی صدر الدین صاحب بہت دنوں حوالات میں رہے۔ کورٹ میں مقدمہ پیش ہوا، روبکاریاں ہوئیں، آخر صاحبانِ کورٹ نے جان بخشی کا حکم دیا؛ نوکری موقوف، جائیداد ضبط۔ ناچار خستہ وتباہ حال لاہور گئے، فنانشل کمشنر اور لفٹننٹ گورنر نے از راہِ ترحم نصف جائے داد

---

(۲۱) ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' ج:۴،ص:۲۲۴

(۲۲) حوالہ بالا،ص:۲۲۵

(۲۳) حوالہ بالا،ص:۲۲۸

واگذاشت کی۔ اب نصف جائیداد پر قابض ہیں۔ اپنی حویلی میں رہتے ہیں، اگرچہ یہ امداد (واگذاشت جائیداد کی آمدنی) ان کے گزارے کو کافی ہے؛ اس واسطے کہ ایک آپ اور ایک آپ کی بی بی، بتیس چالیس روپے مہینہ کی آمدنی؛ لیکن امام بخش (صہبائی)(۲۴) کی اولاد ان کی "عترت" (خان دان) ہے، وہ دس بارہ آدمی ہیں، فراغ بالی سے نہیں گزرتی، ضعفِ پیری نے بہت گھیر لیا ہے، عشرۂ ثامنہ کے اواخر میں ہیں، یعنی اسی برس کے قریب عمر ہوگئی۔ خدا سلامت رکھے، بہت غنیمت ہیں۔"(۲۵)

نظر بندی کے بعد رہائی ملی تو مفتی صاحب لاہور چلے گئے، وہاں پنجاب کے چیف کمشنر "لارڈ جان لارنس" کے ذریعے، جو مفتی صاحب کے دہلی میں مہربان رہ چکے تھے، جائے داد کی واگزاری کی کوشش کی، لیکن منقولہ جائے داد کی واپسی ممکن نہ ہوسکی، البتہ غیر منقولہ جائداد واگزار ہوگئی، پھر دہلی واپس آگئے اور بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں قیام کیا اور پھر اپنی حویلی واقع کوچہ چیلان میں خانہ نشین ہوئے اور اپنی حیات کے باقی ایام کو عبادات و وظائف اور تدریس علوم دینیہ میں صرف کیا۔

وفات

زندگی کے آخری سالوں میں ایک دو سال فالج کے مرض میں مبتلا رہے، اور ۸۱ سال کی عمر میں پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ/جون ۱۸۶۸ء میں وفات پائی۔

مولانا فقیر محمد جہلمیؒ یکے از تلامذۂ مفتی صدر الدین آزردہؒ لکھتے ہیں:

"یہ مؤلف بھی ۱۲۷۶ھ (۶۰، ۱۸۵۹ء) میں جب مولانا موصوف بستی حضرت نظام الدین اولیاء میں اقامت گزیں تھے، ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور تیرہ ماہ تک ان کی خدمت میں مشرف رہ کر علوم نقلی و عقلی کا استفادہ کرتا رہا۔ اس وقت مولانا موصوف باوجودے کہ چوہتر (۷۴) سال کے تھے، مگر ذوقِ شعر و سخن میں جوانانِ عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو میں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ آزردہ تخلص تھا اور مقتضا اس کے ہمیشہ فرطِ عشق اور ولولۂ محبت سے آزردہ خاطر، افسردہ خاطر، دیدۂ گریاں، سینہ بریاں رہتے تھے۔ اشعار پڑھنے میں نہایت

---

(۲۴) ش ۱۲۷۳ھ/۱۸۵۷ء (۲۵) غدر کے چند علماء از مفتی انتظام اللہ شہابی متوفی ۱۳۸۹ھ/۱۹۶۹ء (نقل از علمائے ہند کا شاندار ماضی)

دل شگاف آواز، لحن حزیں اور صورت دردانگیز رکھتے تھے، جس نے آپ کی زبان سے سخنِ موزوں سنا ہے وہی اس کی کیفیت جانتا ہے کہ کیا انشاء وشعر تھا یا ایجادِ سحر۔" (۲۶)

مفتی صاحب کا ایک شعر زبان زد خاص و عام ہے:

اے دل! تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اِک جان کا زیاں ہے، سو ایسا زیاں نہیں

شاہ عبدالغنی صاحب مجددیؒ

شاہ عبدالغنی عمری مجددی دہلوی مہاجر، مدنی بن ابوسعید بن صفی القدر (متوفی ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۸ء) امام ربانی مجدد الف ثانی کی اولاد میں تھے۔ شاہ صاحب نے تمام علوم وفنون مرکز علم وثقافتِ اسلامی دہلی میں حاصل کیے، حفظِ قرآن پاک کے بعد صرف ونحو اور تمام عربی علوم مولانا حبیب اللہ دہلوی سے حاصل کیے فقہ وحدیث کی اکثر کتابیں اپنے والد شاہ ابوسعید (متوفی ۱۲۵۰ھ/۱۸۳۴ء) سے پڑھیں جو حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے شاگرد تھے۔ خصوصاً صحاح ستہ نیز مؤطا امام محمد، بخاری شریف حضرت شاہ عبدالعزیز کے نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر مکی (متوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) سے پڑھی۔ جبکہ "مشکاۃ المصابیح" حضرت شاہ مخصوص اللہ بن شاہ رفیع الدین دہلوی سے پڑھی۔ پھر حجاز مقدس میں حدیث کی تمام کتابوں کی سند واجازت شیخ محمد عابد سندی اور شیخ ابوالزاہد اسماعیل بن ادریس رومی ثم المدنی سے حاصل کی۔

حضرت شاہ عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ کی "انجاح الحاجہ" کے نام سے سنن ابن ماجہ پر گراں قدر تعلیقات ہیں۔

۱۲۷۳ھ میں مدینۂ منورہ ہجرت کر گئے اور وہیں مقیم ہوگئے اور وہیں چہار شنبہ ۶ رمحرم ۱۲۹۶ھ میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

علامہ عبدالحی کتانیؒ نے اپنی کتاب "فہرس الفہارس والأثبات" میں شاہ عبدالغنیؒ کے تذکرہ میں لکھا ہے:

"متاخرین کے سلسلوں میں شاہ عبدالغنی کے سلسلۂ حدیث سے طاقتور اور قابل اعتماد کوئی سلسلہ

---

(۲۶) حدائق الحنفیہ، ص: ۴۸۲

نہیں؛ کیونکہ یہ سلسلہ اپنی بلندی کے ساتھ ساتھ اعصار وامصار کے ائمہ اور اہلِ علم وعمل کے ذریعہ مسلسل اور مربوط ہے۔''(۲۷)

حضرت شاہ صاحب، ولی اللّٰہی سلسلے کی براہ راست اور مضبوط کڑی تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں علم حدیث کی یہ مجلس ولی اللّٰہی اور درس گاہِ علوم نبوی اجڑ گئی۔ علم وتقویٰ، دیانت، امانت، اتباعِ سنت میں اپنی مثال آپ تھے، سرسید اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''آثار الصنادید'' میں لکھتے ہیں:

''......اوقات آپ کی ایسی خوب ہے کہ اگلے زمانے کے اچھے اچھے دیندار لوگوں کی بھی شاید ایسی ہوئی ہوگی۔ مسجد میں بیٹھے رہنا اور طریقۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو برتنا دن رات آپ کا کام ہے......اس قدر اتباعِ سنت اختیار کیا ہے کہ اگر آپ کو آسمان وزمین کے رہنے والے محی السنۃ اور قامع البدعہ کہہ کر پکاریں تو بجا ہے۔ ان کے نزدیک سوائے انحراف کمتر حکم شریعت کے سخت سے سخت کوئی مصیبت نہیں، ارتکاب اُس امر خلافِ سنت کا، جس کو ہم کم بخت لوگ بال سے کم جانتے ہیں، ان کے نزدیک امر محال ہے۔ اس تقویٰ اور ورع کو خیال کرو کہ صرف اس خیال سے کہ ہندوستان میں جو طریق بیع وشرا بعض بعض فواکہ وغیرہ کا جاری ہے، وہ از روئے شرع شریعت کے درست نہیں، اُن چیزوں کے مزے سے واقف نہیں...صرف اتباعِ سنت کے لیے ہزار ہا نعمتِ دنیائے دوں پر لات ماری ہے اور گوشہ نشینی اختیار کی ہے، ملاقات اور مکالمات میں ہرگز پیروی سنت کی نہیں چھوڑتے اور ادائے سنت کے ترک سے کسی چیز کو برا نہیں جانتے ہیں۔''(۲۸)

صاحب ''نزہۃ الخواطر'' لکھتے ہیں:

''سچائی ودیانت داری، پاک دامنی وپرہیزگاری، حسن نیت واخلاص، انابت الی اللہ، خوفِ خدا، اس کی عظمت کے استحضار، سنت کی پابندی، دعاء ومناجات، حسنِ اخلاق، مخلوق کو فائدہ پہنچانے اور اس کے ساتھ حسن سلوک کرنے، دنیا اور اس کے اسباب سے کنارہ کشی وغیرہ کے ساتھ ساتھ علم وعمل، زہد وحلم اور بردباری میں امامت انھی پر ختم تھی......عرب وعجم کا ان کی ولایت اور جلالتِ شان پر اتفاق تھا۔''(۲۹)

---

(۲۷) ''العناقید الغالیۃ من الأسانید العالیۃ'' از مولانا محمد عاشق الٰہی برنی مقیم مدینہ منورہ، ص:۳۴-۳۵

(۲۸) آثار الصنادید، مطبوعہ اردو اکادمی دہلی ۱۹۹۰ء، ج:۲، ص:۲۴ (۲۹) نزہۃ الخواطر، ج:۷، ص:۳۲۰-۳۲۱

دیگر سیکڑوں علمائے کرام کے ساتھ ساتھ حضرت نانوتویؒ اور حضرت گنگوہیؒ نے بھی انھی سے حدیث پاک پڑھی اور اس کی سند واجازت حاصل کی۔ البتہ ''سنن ابوداؤد'' حضرت نانوتوی نے مولانا احمد علی محدث سہارنپوری (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۷۹ء) سے پڑھی، جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری

ہندوستان میں احادیث کی کتابوں کو طبع کر کے عام کرنے اور ان پر گراں قدر حواشی لکھ کر علماء وطلبہ پر ناقابل فراموش احسان کرنے کا سہرا آپ ہی کے سر جاتا ہے۔

آپ ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں سہارنپور کے انصاری خاندان میں پیدا ہوئے۔

مولانا احمد علی بن لطف اللہ سہارنپوری (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۰۰ء) نے قرآن پاک میرٹھ میں حفظ کیا اور عربی کی ابتدائی کتابیں سہارنپور میں بانیِ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور مولانا سعادت علی (متوفی ۱۲۸۶ھ) سے پڑھیں جو حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی (ش ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کی جماعت کے مخصوص افراد میں تھے۔ پھر دہلی تشریف لے گئے جہاں استاذ العلماء مولانا مملوک علی نانوتویؒ، مولانا وصی الدین سہارنپوری اور مولانا وجیہ الدین سہارنپوری سے کسب علم کیا جو مولانا عبدالحی بن ہبۃ اللہ بڈھانوی کے شاگرد تھے، حدیث پاک کی تحصیل مکۂ مکرمہ میں حضرت شاہ محمد اسحاق بن محمد افضل دہلوی (متوفی ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء) نبیرہ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ سے کی، سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند میں لکھتے ہیں:

> ''حدیث کی تحصیل مکہ مکرمہ میں حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ سے اس طرح کی کہ روزانہ فجر سے ظہر تک حرم میں بیٹھ کر پہلے احادیث کی نقل کرتے اور ظہر کے بعد عصر تک شاہ صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر نقل کی ہوئی احادیث کی سماعت کرتے تھے۔ حدیث کی تمام کتابیں شاہ صاحب سے اسی طرح پڑھیں۔''(۳۰)

سندِ فراغ حاصل کرنے کے بعد ہندوستان واپس تشریف لائے اور تعلیم وتدریس کے ساتھ ساتھ کتب احادیث کی نشر واشاعت اور تصحیح وتحشیہ میں دل وجان سے لگ گئے، اِس غرض سے ۱۲۶۲ھ/۱۸۴۵ء میں دہلی میں مطبع احمدی قائم فرمایا، جس سے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں جامع ترمذی،

(۳۰) تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج:۱،ص:۱۰۶

۱۲۷۰ھ/۱۸۵۳ء میں صحیح بخاری اور ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں مشکاۃ المصابیح انتہائی اہتمام کے ساتھ شائع فرمائی۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد یہ مطبع میرٹھ منتقل ہو گیا۔

تحصیل علم کے بعد حضرت نانوتویؒ نے ذریعۂ معاش کے طور پر مولانا احمد علیؒ کے اِسی مطبع احمدی دہلی میں تصحیح کتب کا کام اختیار کیا اور مولانا احمد علی صاحب کے حکم پر صحیح بخاری کے آخر کے پانچ چھ سپاروں کے حواشی بھی لکھے۔

چونکہ حضرت نانوتوی نئے نئے فارغ التحصیل تھے؛ اس لیے بعض لوگوں کو مولانا احمد علی صاحب کے اس اقدام پر اعتراض ہوا کہ انہوں نے ایک نوعمر عالم کو اتنے بڑے کام کی ذمہ داری سپرد کر دی تو مولانا احمد علیؒ نے فرمایا کہ میں نے سوچ سمجھ کر ان کے سپرد کیا ہے، میں ایسا نادان نہیں کہ بلا سوچے سمجھے اتنا بڑا اقدم اٹھالوں۔

مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ فرماتے ہیں:

> ''جناب مولوی احمد علی سہارنپوری نے تحشیہ اور تصحیح بخاری شریف کے پانچ چھ سپارے جو آخر کے باقی تھے مولوی صاحب کے سپرد کیا، مولانا صاحب نے اس کو ایسا لکھا ہے کہ اب دیکھنے والے دیکھیں کہ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس زمانے میں بعض لوگوں نے کہ مولوی صاحب کے کمال سے آگاہ نہ تھے، جناب مولوی احمد علی صاحب کو بہ طور اعتراض کہا تھا کہ آپ نے یہ کیا کام کیا کہ آخر کتاب کو ایک نئے آدمی کے سپرد کیا؟! اس پر مولوی احمد علی صاحب نے فرمایا تھا کہ ''میں ایسا نادان نہیں ہوں کہ بدون سمجھے بوجھے ایسا کروں'' اور پھر مولوی صاحب کا تحشیہ ان لوگوں کو دکھلایا، جب لوگوں نے جانا اور وہ جگہ بخاری میں سب جگہ سے مشکل ہے، علی الخصوص تائید مذہب حنفیہ کا، جو اول سے التزام ہے اور اس جگہ پر امام بخاری نے اعتراض مذہب حنفیہ پر کیے ہیں اور ان کے جواب لکھنے، معلوم ہے کتنے مشکل ہیں؟! اب جس کا جی چاہے اس جگہ کو دیکھ اور سمجھ لے کہ کیسا حاشیہ لکھا ہے اور اس حاشیہ میں یہ بھی التزام تھا کہ کوئی بات بے سند کتاب کے، محض اپنے فہم سے نہ لکھی جائے۔''(۳۱)

(۳۱) سوانح مولانا قاسم بقلم مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مطبوعہ دیوبند، ص: ۷-۸

حضرت نانوتوی نے کب مطبع میں کام شروع کیا، کب تحشیہ کا کام کیا اور کب ابوداؤد شریف پڑھی؟

مولانا محمد یعقوب نانوتوی کی لکھی ہوئی سوانح سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء سے قبل حضرت نانوتوی تعلیم سے فارغ ہوگئے تھے اور ذی الحجہ ۱۲۶۷ھ/۱۸۵۱ء کے بعد ایک سال کے قریب ان کا قیام مولانا محمد یعقوب نانوتوی کے مکان واقع کوچہ چیلان ہی میں رہا۔ ۱۲۶۸ھ/۱۸۵۲ء میں مولانا محمد یعقوب صاحب ملازمت کے لیے اجمیر چلے گئے، تو کچھ دن حضرت نانوتوی دہلی میں دوسری جگہوں پر رہے اور اسی زمانے میں تحشیہ کا کام ان کے سپرد ہوا۔ حضرت نانوتویؒ کے رفیقِ درس حضرت گنگوہیؒ کے متعلق یقین کے ساتھ یہ معلوم ہے کہ دہلی میں وہ چار سال تعلیم حاصل کرکے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء میں فارغ ہوکر اپنے وطن گنگوہ لوٹ گئے؛ اس لیے حضرت نانوتوی کا سن فراغت بھی یہی سال ۱۲۶۵ھ ہوسکتا ہے کیوں کہ دونوں حضرات ہم سبق اور ہم استاذ تھے۔

صحیح بخاری پہلی مرتبہ مطبع احمدی سے ۱۲۷۰ھ/۱۸۵۴ء میں چھپی تھی؛ اس لیے ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء ہی وہ زمانہ ہوسکتا ہے، جس میں حضرت نانوتوی نے صحیح بخاری کے پانچ چھ پاروں کی تصحیح اور حاشیہ نگاری کا کام کیا ہوگا۔ گویا اپنی عمر کے ۲۱ ویں سال میں انھوں نے اتنا بڑا کام عربی زبان میں انجام دیا۔ (۳۲)

اور چونکہ حضرت نانوتویؒ نے ابوداؤد شریف مولانا احمد علی محدث سے تصحیح کے تعلق کے بعد ہی پڑھی ہوگی جیسا کہ قرین قیاس ہے؛ اس لیے ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۸ء سے ۱۲۶۹ھ/۱۸۵۳ء تک کے دوران ہی کسی وقت انھوں نے ابوداؤد شریف پڑھی ہوگی:

> ''علمائے مظاہر علوم سہارنپور اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات'' سے معلوم ہوتا ہے کہ محدث سہارنپوری نے ۱۸۵۷ء میں مطبع کو نقصان پہنچنے کے بعد اس کو میرٹھ منتقل کردیا، پھر اس کے بعد میرٹھ کے رئیس شیخ الٰہی بخش کی طرف سے کلکتہ جاکر وہاں تجارت شروع کردی۔ تقریباً دس سال وہاں قیام رہا۔ (۳۳)

---

(۳۲) تاریخ دارالعلوم دیوبند، ج:۱،ص:۱۱۱۔۱۱۲

(۳۳) علمائے مظاہر علوم، ج:۱،ص:۵۵

۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں مستقل قیام کی نیت سے کلکتے سے سہارنپور تشریف لے آئے اور مظاہر علوم کے نائب اہتمام کے عہدہ کی زینت بنے نیز ۱۲۹۴ھ/۱۸۷۷ء میں مظاہر علوم کے صدر المدرسین مولانا محمد مظہر نانوتویؒ (متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۶ء) حج بیت اللہ کو تشریف لے گئے، تو آپ نے نیابت اہتمام کے ساتھ ساتھ صدر المدرسینی کی ذمے داری کو بھی رونق بخشی اور کتبِ حدیث و اصولِ حدیث و تفسیر و فقہ کا درس بھی دیا۔

مظاہر علوم کی تعمیر و ترقی میں، باقاعدہ وابستگی سے قبل سے ہی، محدث سہارنپوریؒ نے حصہ لیا اور ۱۲۹۲ھ کے بعد سے باقاعدہ اور آخر تک اس کی ہر طرح کی ترقی میں کوشاں رہے۔(۳۴)

اسی کے ساتھ مولانا احمد علی محدث زہد و ورع، فروتنی و تواضع اور کسر نفسی میں اپنے اسلاف کی روشن مثال تھے۔ حالاں کہ انھوں نے تجارت کو ذریعۂ معاش بنایا اور تعلیم و تدریس کو کسب معاش کا ذریعہ نہیں بنایا، اس لیے اللہ پاک نے فارغ البالی اور تمول سے نوازا تھا، اس کے باوجود گھر کی ضروریات اور خورد و نوش کا سامان خود ہی بازار سے خرید کر لایا کرتے تھے۔ تقوی کا یہ عالم تھا کہ کوہر کی فروخت جب شروع ہوتی تو آم کھانا چھوڑ دیتے۔ جب خود اپنا باغ خرید لیا تو اس وقت اپنا یہ معمول بھی ترک کر دیا۔(۳۵)

ان کی پرہیزگاری اور احتیاط کا ایک واقعہ ہماری نسل کے تمام علماء و داعیانِ اسلام کے لیے باعث عبرت و موعظت ہے:

> ''جب مظاہر علوم کی قدیم تعمیر کے چندے کے سلسلے میں کلکتے تشریف لے گئے کہ وہاں مولانا کا اکثر قیام رہا ہے اور وہاں کے لوگوں سے وسیع تعلقات تھے، تو مولانا مرحوم نے سفر سے واپسی پر اپنے سفر کے آمد و خرچ کا مفصل حساب مدرسے میں داخل کیا، اس میں ایک جگہ لکھا تھا کہ کلکتے میں فلاں جگہ میں اپنے دوست سے ملنے گیا تھا، اگرچہ وہاں چندہ خوب ہوا؛ لیکن میرے سفر کی نیت دوست سے ملنے کی تھی، چندے کی نہیں تھی؛ اس لیے وہاں کی آمد و رفت کا اتنا کرایہ حساب سے وضع کر لیا جائے۔''(۳۶)

---

(۳۴) حوالۂ بالا، ص: ۵۵-۵۸ (۳۵) حوالۂ بالا، ص: ۵۸

(۳۶) علمائے مظاہر علوم، ج: ۱، ص: ۵۸ بحوالہ ''آپ بیتی'' از شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ، ج: ۱، ص: ۲۱

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ مدرسہ مظاہر علوم کی روداد میں اِس طرح درج ہے:

''مولوی احمد علی صاحب سہارنپور سے بنارس جب نواب صاحب والیِ ٹونک کی خدمت میں تشریف لے گئے، تو مولوی صاحب موصوف نے کانپور سے بنارس تک کا کرایہ لیا اور یہاں سے کانپور کا کرایہ چوں کہ اپنا کام بھی اِس ضمن میں تھا، مدرسے سے نہیں لیا اور جناب نواب صاحب کی طرف سے سوائے چندۂ مدرسہ کے، پندرہ روپے بہ طور دعوتِ خاص مولانا موصوف پیشکش ہوئے تھے، وہ بھی مولانا صاحب نے مدرسے میں داخل کر دیے۔''(۳۷)

دارالعلوم دیوبند چوں کہ ان کے اخلاص پیشہ اور باکمال شاگرد مولانا محمد قاسم نانوتوی کی جدوجہد کا خاص ثمرہ تھا؛ اس لیے اس سے ان کی محبت دو چند تھی۔ دارالعلوم کے نودرے کی مشہور اور سب سے پہلی عمارت ''نودرہ'' کا سنگِ بنیاد حضرت محدث سہارنپوریؒ ہی کا رکھا ہوا ہے۔ دارالعلوم کی روداد بابت ۱۲۹۲ھ میں تحریر ہے:

''اول پتھر بنیاد کا جناب مولانا احمد علی صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے رکھا اور بعدہٗ میں جناب مولانا مولوی قاسم صاحب و مولانا رشید احمد صاحب اور مولانا مولوی محمد مظہر صاحب نے ایک ایک اینٹ رکھی۔''(۳۸)

مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے تلامذہ کی فہرست میں بڑے بڑے باکمال علماء کا نام ہے جن میں سے چند یہ ہیں:

(۱) حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند (متوفی ۱۲۹۷ھ/۱۸۸۰ء) جنہوں نے سنن ابوداؤد شریف ان سے پڑھی تھی۔

(۲) مولانا حافظ سید تجمل حسین صاحب دیسوی بہاری (متوفی ۱۳۴۲ھ/۱۹۲۴ء) انھوں نے محدث سہارنپوری سے ۱۲۹۵ھ میں مدرسہ مظاہر علوم میں بخاری و مسلم شریف پڑھی تھی۔

(۳) مولانا مفتی عبداللہ صاحب ٹونکی (متوفی ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۰ء) نے ۱۲۹۳ھ میں محدث سہارنپوری سے صحاح ستہ وغیرہ پڑھی۔

---

(۳۷) علمائے مظاہر علوم، ج:۱،ص:۵۹، بحوالہ روداد مدرسہ مظاہر علوم بابت ۱۲۹۹ھ،ص:۴

(۳۸) علمائے مظاہر علوم، ج:۱،ص:۵۹، بحوالہ روداد دارالعلوم دیوبند بابت ۱۲۹۲ھ

(۴) مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ (متوفی ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء) انہوں نے محدث سہارنپوری سے وشاہ عبدالغنی مجددی سے صحیح بخاری و جامع ترمذی اور دیگر کتب حدیث پڑھی تھیں۔

(۵) مولانا محمد علی مونگیری بانی ندوۃ العلماء لکھنؤ (متوفی ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء) جنہوں نے ۱۲۹۳ھ میں محدث سہارنپوری سے صحاح ستہ کا مظاہر علوم سہارنپور میں درس لیا۔

(۶) مولانا شاہ محمد سلیمان پھلواری (متوفی ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء) انہوں نے مولانا عبدالحی لکھنوی فرنگی محلی (متوفی ۱۳۰۴ھ/۱۸۸۶ء) اور شیخ نذیر حسین دہلوی (متوفی ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء) کے علاوہ محدث سہارنپوری سے بھی تحصیل علم حدیث کیا تھا۔

(۷) مولانا محمد احسن نانوتوی (متوفی ۱۳۱۲ھ/۱۸۹۵ء) نے علم حدیث کی تکمیل مولانا شاہ عبدالغنی مجددی کے علاوہ محدث سہارنپوری سے بھی کی۔

(۸) مولانا محمد اشرف علی سلطانپوری، ۱۲۹۵ھ میں محدث سہارنپوری سے بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور مؤطا امام محمد پڑھی۔

(۹) مولانا سراج الحق صاحب دیوبندی، آپ نے بھی ۱۲۹۵ھ میں محدث سہارنپوری سے صحاح ستہ کا درس لیا۔

(۱۰) مولانا شاہ ابوالحسن صاحب سہارنپوری (متوفی ۱۳۳۶ھ/۱۹۱۸ء) ۱۲۹۳ھ میں محدث سہارنپوری سے صحاح ستہ پڑھی۔ (۳۹)

وفات

محدث سہارنپوری پر آخری عمر میں فالج کا حملہ ہوا اسی کے ساتھ بخار اور ضعف بھی طاری ہوگیا۔ ایک عرصے تک علیل رہے۔ حضرت نانوتوی عیادت کو تشریف لائے اور ۱۴ روز سہارنپور میں قیام فرمایا۔ آخرکار ۶/ جمادی الاولی ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۷/ اپریل ۱۸۸۰ء شنبہ کے روز یہ محدث جلیل اپنے مولی سے جاملا۔ سہارنپور میں اپنے جدی قبرستان متصل عیدگاہ میں تدفین عمل میں آئی۔ بوقت وفات عمر تقریباً ۷۲ سال تھی کیونکہ آپ کی ولادت ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء کی ہے۔ ''خزانہ خوبی'' ۱۲۹۷ھ آپ کی تاریخ وفات ہے۔

---

(۳۹) علمائے مظاہر علوم، ج:۱، ص:۶۰۔۶۶

مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی*

سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور ان کے نامور رفقاء

دیوبند عنوان ہے ایک علمی، فکری اور انسانیت کی فلاح وتعمیر کی عالمی تحریک کا، نئی صدی میں قدم رکھتے ہوئے ہمیں انیسویں صدی میں برپا ہونے والی اور پروان چڑھنے والی اس تحریک کے پس منظر اور نشیب وفراز کا گہرائی سے جائزہ لینا چاہئے جس کے ایک اہم اور ممتاز رکن سیدنا الامام الکبیر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی علیہ الرحمۃ تھے۔

دنیائے آب وگل میں ان کی زندگی کے لمحات کی گنتی تو پچاس سال(1) سے بھی کم ہے، لیکن ان کے فکر کے چراغوں کی روشنی اور ان کی راہ عمل کے نقوش اور اس کے اثرات ونتائج صدیوں اور قرنوں کے دائروں میں محدود نہیں ہیں:

زمانہ ہو گیا گزرا تھا کوئی بزم انجم سے
غبارِ راہ روشن ہے بشکل کہکشاں اب تک

میر کارواں کے ساتھ اس مقدس کاروانِ فکر وعمل کے نامور اور عالی مقام رفقاء کی خدمات بھی کچھ کم نہیں ہیں، ان کی زندگی کے مختلف گوشے اور ان کی خدمات کی جہتیں آنے والی نسلوں کے لئے جرس کارواں کی طرح مسلسل پیغام ہیں بیداری کا، عمل کا، حرکت کا اور آگے بڑھتے رہنے کا۔

(۱) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (۲) مولانا فضل الرحمن عثمانی دیوبندی (۳) حضرت حاجی سید محمد عابد دیوبندی (۴) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۵) مولانا رشید احمد گنگوہی (۶) مولانا محمد منیر

(۱) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ولادت ۱۲۴۸ھ ۱۸۳۲ء، وفات ۱۲۹۷ھ ۱۸۸۰ء

* دارالسلام اسلامی مرکز دہلی گیٹ، مالیر کوٹلا، پنجاب

نانوتوی (۷) مولانا حافظ ضامن شہید (۸) مولانا رفیع الدین دیوبندی (۹) حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی (۱۰) مولانا ولایت علی (۱۱) مولانا جعفری تھانیسری

کوئی میدان جہاد میں آپ کے ہم رکاب ہے، کوئی درس کا ساتھی ہے اور کوئی مدرسہ عربی کے قائم کرنے میں آپ کے قدم بقدم ہے، کوئی اس تحریک کے آگے بڑھانے میں آپ کے افکار کی ترویج واشاعت میں۔

بات شروع ہوئی ہے ۱۶۰۱ء سے، برطانیہ کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی قافلے نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں مغل بادشاہوں سے برطانیہ کے یہ تاجر رعایتیں حاصل کرتے رہے، اورنگ زیب کے بعد مغل سلطنت جیسے ہی کمزور ہوئی، انگریز سیاست میں دخل اندازی کرنے لگے، تاجر سے تاجداری کی طرف بڑھنے لگے، ایک ایک کر کے ریاستوں کو ہتھیانا شروع کیا۔

- ۱۷۵۷ء میں پلاسی کے میدان میں سراج الدولہ کوشکست دی۔
- ۲۳/ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کے میدان میں شجاع الدولہ انگریزوں کی شاطرانہ چالوں سے ہار گیا۔
- ۱۷۶۵ء میں دہلی کے شاہ عالم ثانی نے بہار، بنگال، اڑیسہ کے دیوانی حقوق ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیدیئے۔
- ٹیپو کے والد سلطان حیدر علی کے بعد جنہوں نے جنگ آزادی کا آغاز کیا تھا، ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت سے میسور کی ریاست کا خاتمہ ہو گیا اور یہ کہئے کہ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضہ کا راستہ صاف ہو گیا۔
- ٹیپو کی شہادت کے ساتھ ہی ۱۸۰۰ء میں میسور کے مضافات کڈپہ، کونور، بلاری، اننت پور، وہار، بیجاپور پر انگریزں کا قبضہ ہو گیا۔
- ۱۸۰۱ء میں نواب اودھ سے دوآبہ اور روہیل کھنڈے کے علاقے لئے اور کرناٹک بھی انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔
- ۱۸۰۲ء میں مرہٹوں کی حکومت ختم کردی گئی۔

- ۱۸۰۳ء میں نواب حیدر آباد باج گذار ہو گئے۔
اسی کے ساتھ ناگپور، آگرہ، بندیل کھنڈ، جے پور، گوالیار ہاتھ سے نکل گئے۔
- دارالسلطنت دہلی میں شاہ عالم ثانی انگریزوں کے پنشن یافتہ تھے۔

انگریزوں کے اقتدار میں کیا کیا ظلم وستم نہیں ہوئے، سب سے زیادہ نشانہ علمائے دین اسلام کو بنایا گیا ۱۶۵۱ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک تین صدیوں پر پھیلی ہوئی علمائے حق کی داستان قربانیوں کی خوں چکاں تاریخ ہے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے سب سے پہلے انگریز حکومت کے خلاف ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا، یہ فتویٰ انقلاب آزادی کی گونج بن کر ہندوستان کی فضاؤں پر چھا گیا، حضرت شاہ عبدالعزیز نے اپنے خاص شاگرد حضرت مولانا سید احمد شہیدؒ کو نواب امیر خاں کے لشکر میں فوجی تربیت کے لئے بھیجا۔ سید احمدؒ سات سال کی فوجی تربیت کے بعد ۱۸۱۶ء میں دہلی واپس آئے، باقاعدہ ایک فوجی دستہ تیار کیا گیا جس میں سید احمد صاحب کے علاوہ مولانا عبدالحی، مولانا اسمٰعیل شہید، مولانا محمد یوسف پھلتی جیسے لوگ شامل تھے، یکم مئی ۱۸۳۱ء سے دس مئی ۱۸۳۱ء تک بالا کوٹ کے میدان میں یہ فوجی دستہ انگریزوں سے برسرِ پیکار ہوا، مولانا سید احمد اور مولانا اسمٰعیل صاحب سمیت تقریباً ساڑھے چار ہزار مسلمان شہید ہو گئے، اس فوجی دستے میں سے سو کے قریب علماء بچ گئے جن میں مولانا جعفر تھانیسری، مولانا ولایت علی، مولانا مملوک علی اور مولانا یحییٰ وغیرہ شامل تھے۔

- ۱۸۵۶ء میں دہلی میں ممتاز علماء کا ایک اجتماع ہوا جس میں مولانا جعفر تھانیسری، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا ولایت علی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، حافظ ضامن شہید جیسے بڑے بڑے علماء شامل تھے، فیصلہ کن جنگ کا فیصلہ ہوا۔
- شاملی ضلع مظفر نگر کے میدان میں انگریز فوجوں کے ساتھ مقابلہ میں حافظ ضامن صاحب نے جام شہادت نوش فرمایا، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سخت زخمی ہو گئے۔
- لاہور کی شاہی مسجد کے پھانسی گھر میں ایک ایک دن میں دو دو سو علماء کو پھانسی دی گئی ۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۷ء تک چودہ ہزار علماء کو تختہ دار پر لٹکایا گیا:

مقام فیض کوئی راہ میں ملا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

ان حالات اور پس منظر کو سامنے رکھئے، وقتی طور پر پسپائی کے باوجود انگریز کی جابر و قاہر حکومت مسلمانوں کے جذبۂ جہاد، علمائے کرام کے حوصلے اور اہل ہند کی حریت فکر کو جڑ سے اکھاڑنے میں ناکام رہی، انگریز خوب سمجھتے تھے کہ یہ شکست و ریخت وقتی طور پر دبا سکتی ہے جڑ سے ختم نہیں کر سکتی اس لئے اس نے ایک اور محاذ کھول دیا، افکار پر غلبہ فکری غلامی جسمانی غلامی سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ کسی قوم کو فکری طور پر غلام بنالیا جائے تو اس کو جسمانی طور پر غلام بنانا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

یہ منظر آج بھی ہمارے سامنے ہے، سیاسی آزادی کے باوجود ہند اور دوسرے بہت سے ممالک کیا ذہنی طور پر پوری طرح آزاد ہیں، کیا آج بھی وہ مغرب کے دماغ سے نہیں سوچتے، مغرب کی آنکھ سے نہیں دیکھتے اور مغرب کے کان سے نہیں سنتے؟

منصوبہ بڑا خطرناک اور اسکیم بڑی بھیانک تھی، دیکھنے میں ہندوستانی اور اندر سے انگلستانی مقابلہ ایسے فاتح سے تھا جو قوت و خود اعتمادی سے لبریز تھا، سامنے ایک ایسی تہذیب تھی جو جدت و نشاط انگیزی اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال تھی اور ہندوستانی مسلمان زخم خوردہ، مضحل اور شکستہ خاطر تھے۔

یہیں سے سیدنا الامام الکبیر اور ان کے رفقاء کی حکمت و عظمت کی تصویر ابھرتی ہے، حکمت عملی یہ طے پاتی ہے کہ مسلح تصادم سے گریز کرتے ہوئے اقدام و دفاع کے لئے ایسے مردان کار تیار کئے جائیں جو دین کی حفاظت و اشاعت، حریت فکر، بیداری، سرگرمی عمل، ہمدردی و اخوت کا پیغام لے کر اٹھیں، ملکی اور عالمی افق جو مغربی فکر و تہذیب سے دھواں دھواں ہو رہا ہے، انگریزی اقتدار جس کے جبر کے نیچے انسانیت کراہ رہی ہے، غلامی کی زنجیر میں جکڑے اذہان و ابدان کو پھر صداقت و عدالت کا سبق پڑھایا جائے اور ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو سہارا دے کر اس طوفان کے مقابلے کے لئے تیار کیا جائے۔ آپ کسی ایسے اسلامی ملک کی مثال دیجئے جس کو مغربی تہذیب اور مغرب کے اقتدار سے واسطہ پڑا ہو اور پھر وہ طوفان سے کشتی نکال کر لے جائے، علمائے ہند نے ہندوستانی مسلمانوں میں دین کی محبت، شریعت کا احترام اور مغربی تہذیب سے مقابلہ کی طاقت اور صلاحیت پیدا کر دی۔

۳/مئی ۱۸۶۶ء کو انار کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے دو محمود اس تحریک کا نقطۂ آغاز تھے۔

جس کے فکری قائد، بانی اور محرک اول سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے دست و بازوان کے نامور رفقا ہیں، اس تحریک کا رنگ علمی وفکری تھا اور جذبۂ عمل جہادی تھا، ایک بڑی طاقت سے ٹکرانے والی آفاقی تحریک جہاد کے ڈانڈے آپ کو کہیں نہ کہیں ۱۸۶۶ء میں انار کے درخت کے نیچے بیٹھے دو محمودوں سے مل جائیں گے۔ کہیں آپ کو ملا محمود کے شاگرد محمود حسن شیخ الہند بن کر ریشمی رومال کی تحریک کی قیادت کرتے نظر آئے گے، کہیں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی صورت میں پادریوں سے ٹکر لیتے ہوئے، کہیں آریہ سماج جیسی تحریکوں سے نبرد آزما الامام الکبیر رحمۃ اللہ علیہ۔

آیئے آپ کی اس تحریک میں ہمسفر آپ کے کچھ نامور رفقاء کا ذکر خیر کرتے ہوئے ان کی خدمات کا ایک ہلکا سا جائزہ تو لیتے ہی چلتے ہیں کہ رفقاء واحباب کی رفعت سے سالار کارواں کی عظمت کا بھی خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔

(۱) مولانا ذوالفقار علی دیوبندی (۱۲۳۷-۱۳۲۲ھ)

مدرسہ اسلامیہ عربیہ دیوبند کے سب سے پہلے صاحب علم محمود حسن دیوبندی شیخ الہند (۱۲۶۸ھ-۱۳۳۹ھ) کے والد محترم مولانا ذوالفقار علی ان تین ابتدائی بانیوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے اس مدرسہ کے آغاز میں پہل کی، انہوں نے مولانا مملوک علی (وفات ۱۲۶۷ھ-۱۸۵۱ء) اور دوسرے علماء سے دہلی کالج میں تعلیم حاصل کی، فراغت کے بعد بریلی کالج میں پروفیسر ہو گئے، ۱۸۵۷ء میں آپ کو میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس مقرر کیا گیا پھر انسپکٹر تعلیمات کے عہدے پر فائز ہوئے، عربی زبان وادب کے بڑے اچھے ادیب تھے۔

آپ کی تصنیفات وتالیفات سے آپ کے علمی مقام کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

(۱)	تسہیل الدراسۃ	اردو شرح دیوان حماسہ
(۲)	تسہیل البیان	اردو شرح دیوان متنبی
(۳)	التعلیقات	علی السبع المعلقات
(۴)	ارشاد	شرح قصید بانت سعاد
(۵)	عطر الوردۃ	شرح قصیدہ بردہ
(۶)	تذکرۃ البلاغت	

(۷) تسہیل الحساب یہ کتاب ۱۸۵۲ء میں بریلی سے چھپی تھی۔

۱۳۰۷ھ میں دارالعلوم دیوبند کا تعارف عربی زبان میں لکھا جس کا نام تھا ''الہدیۃ السنیہ فی ذکرالمدرسۃ الاسلامیہ الدیوبندیہ''۔ عربی زبان وادب میں دستگاہ کے ساتھ مغربی علوم سے بھی واقف تھے۔ پنشن پانے کے بعد آپ کو دیوبند میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا تھا۔ مولانا ذوالفقار علی اور مولانا فضل الرحمن عثمانی دونوں آپس میں خالہ زاد بھائی تھے۔ ۱۵/رجب ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۴ دوشنبہ کے دن ۸۵ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی اور قبرستان قاسمی میں مولانا محمد قاسم نانوتوی کے مشرقی پہلو میں کو دفن کیا گیا۔ مولانا ذوالفقار صاحب کے بائیں جانب اسی قبرستان میں مولانا محمد احسن صدیقی (۲) نانوتوی کی قبر ہے، اس کی نشاندہی مولانا فضل الرحمن کے اس شعر سے ہوتی ہے:

ہاں بخسپ آسودہ ترمابین دو یاران خویش

قاسم بزم مودت، احسن شائستہ خو

یہ قبرستان قاسمی وہی ہے جسے حکیم مشتاق احمد دیوبندی نے وقف کیا تھا، اس کا نام گورغریباں تھا اور یہاں سب سے پہلے تدفین حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی صاحب کی ہوئی تھی۔

مولانا ذوالفقار علی صاحب کے بارے میں فرانس کا مشہور مصنف گارسان دتاسی لکھتا ہے کہ:

''وہ دہلی کالج کے طالب علم تھے، چند سال کے لئے بریلی کالج میں پروفیسر ہوگئے، ۱۸۵۷ء میں وہ میرٹھ میں ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے، مسٹر ٹیلر ان سے واقف تھے، ان کا بیان ہے کہ ذوالفقار علی ذہین اور طباع ہونے کے علاوہ فارسی اور مغربی علوم سے بھی واقف تھے۔ انہوں نے اردو میں تسہیل الحساب کے نام سے ایک کتاب لکھی جو بریلی میں ۱۸۵۲ء میں چھپی۔''

مولانا ذوالفقار علی صاحب کے ان مختصر حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت نانوتوی کے یہ نامور رفیق جو دارالعلوم دیوبند کے تین ابتدائی بانیوں میں سے ایک ہیں، نہ صرف یہ کہ علوم عربیہ پر ماہرانہ دستگاہ رکھتے تھے بلکہ مغربی علوم سے بھی واقف تھے جس کا اعتراف فرانس کے مشہور مصنف گارسان دتاسی نے بھی کیا ہے، اس سے ہم یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے یہ

---

(۲) مولانا محمد احسن صدیقی ۲۲ نے فقہ کی کتاب کنزالدقائق کا عربی زبان میں حاشیہ بھی لکھا تھا۔ یہ حاشیہ ابھی نامکمل تھا کہ مولانا کی وفات ہوگئی اور ان کی وفات کے بعد مولانا حبیب الرحمن عثمانی مہتمم خامس دارالعلوم دیوبند نے اس حاشیے کو مکمل کیا۔

معمار، بدلتے ہوئے حالات ورحجانات سے بے خبر نہ تھے، لیکن اس وقت جس طرح کے نازک حالات تھے اور پیچیدہ قسم کی نفسیاتی کیفیات تھیں، اس کا تقاضہ یہی تھا کہ مغرب کے اقتدار سے براہ راست ٹکرانے کے بجائے مفاہمت کی فضا میں بچے کھچے علمی سرمائے کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے اور آج ہم پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت کے حالات میں جو حکمت عملی اختیار کی گئی وہ کامیاب تھی، جو جنگ ہم میدانِ جنگ میں ہار گئے تھے اس کو ہم نے علم کے میدان میں جیت لیا۔

(۲) مولانا فضل الرحمن عثمانی دیوبندی (۱۲۴۷ھ۔۱۳۲۵ھ)

مولانا فضل الرحمن عثمانی نے بھی دہلی کالج میں اعلیٰ تعلیم مولانا مملوک علی سے حاصل کی تھی دارالعلوم کے تین ابتدائی بانیوں میں سے ایک تھے اور آخر تک اس کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے دارالعلوم کی روداد ۱۳۲۵ھ میں لکھا ہے کہ:

> ''مولانا فضل الرحمن ان مقدس ارکان میں سے تھے جن کے متبرک ہاتھوں سے مدرسے کی ابتدا ہوئی تھی۔ مولانا کی تمام عمر مدرسہ کی خدمت میں گذری، خبر گیری، جاں نثاری اور خیر خواہی میں صرف ہوئی اور ہر حالت میں جدو جہد اور سعی اور جانفشانی کے ساتھ مدرسے کے معاملات میں بدل و جان سرگرم رہے، امورِ مدرسہ میں ہمیشہ احتیاط و دیانتداری، راست بازی اور انجام بینی سے کام لیا۔''

فارسی ادب میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ مولانا اصغر حسین صاحب مدرس دارالعلوم نے ان کا ذکر ''خاقانیٔ ہند'' سے کیا ہے (۳) حکومت ہند کی طرف سے محکمۂ تعلیم کے ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر فائز رہ کر ریٹائر ہوئے۔

دیوبند میں ۱۳۰۱ھ ۱۸۸۳ء میں ایک زبردست پلیگ پھیلا تھا، اس کی تباہ کاریوں کو مولانا نے فارسی زبان میں نظم کیا۔ اس کا تاریخی نام قصہ غمِ دیبن (۱۳۰۱) ہے۔ دیوبند کے حالات میں یہ ایک تاریخی دستاویز ہے۔ مولانا کو مادۂ تاریخ کے نکالنے میں بھی بڑا کمال حاصل تھا۔ دارالعلوم کی رودادوں میں بھی ان کی بہت سی نظمیں اور تاریخی قطعات درج ہیں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے نہایت عقیدت کا تعلق رکھتے تھے، ان کے وصال پر جو آپ نے اشعار کہے اس کا آخری شعر یہ ہے:

(۳) حیات شیخ الہند مولانا میاں اصغر حسین ص:۱۷

وفات سرور عالم کا یہ نمونہ ہے   سرالم سے لکھی فضل نے سنین وفات

۱۲۹۷ء

مولانا فضل الرحمن صاحب کا انتقال اپنے وطن دیوبند میں ۳ رجمادی الاول ۱۳۲۵ھ مطابق ۱۵/ جون ۱۹۰۷ء بروز ہفتہ ہوا۔ ان کا مزار قبرستان قاسمی میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے برابر میں ہے۔ آپ کے مزار پر کوئی کتبہ نہیں ہے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے بیعت بھی تھے۔ مولانا فضل الرحمن صاحب کی اولاد میں تین نام ایسے ہیں جن کو ہندوستان کی دینی اور علمی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکے گی، ایک ان کے بڑے بیٹے مولانا مفتی عزیز الرحمن عثمانی جو کہ دارالعلوم کے سب سے پہلے مفتی ہوئے، دوسرے مولانا حبیب الرحمن عثمانی ۱۳۲۴ھ سے دارالعلوم کی مسند اہتمام پر رونق افروز ہوئے، فہم وفراست، علم وفضیلت میں نہایت ممتاز تھے، دارالعلوم کو مرکزی درسگاہ بنانے میں ان کا کردار نمایاں رہا ہے۔ تیسرے شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی، صحیح مسلم کی عربی شرح فتح الملہم، تفسیر عثمانی اور اس کے علاوہ بہت سی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ حضرت علامہ ان بزرگ علماء میں سے تھے جن کی نظریں ہر دور میں گنی چنی ہوا کرتی ہیں۔ (۴)

حضرت نانوتویؒ کے ان دوسرے نامور رفیق کی زندگی کے حالات سے اور ان کی علمی خدمات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی روشن فکری سے وقت اور حالات پوشیدہ نہیں تھے، ان کے حوصلے جوان تھے کیوں کہ دارالعلوم کے قائم کرنے کے وقت ان کی عمر صرف ۳۵ سال تھی، ایک اہم نکتہ جو ہم سب کے سامنے رہنا چاہئے وہ یہ ہے کہ مغرب کا اقتدار جس اسلامی ملک میں پہونچا وہاں اس نے فکر ونظر کے پیمانے بدل دئے لیکن ہندوستان میں ان علما کی کوششوں سے دین کی محبت، شریعت کا احترام اور اس کے لئے قربانی کی طاقت اور مغربی تہذیب کے مقابلے میں زبردست استقامت اس تحریک نے پیدا کر دی جس سے دین کا سرمایہ تاراج ہونے سے محفوظ رہا اور آج بھی ملت اسلامیہ کی دینی غیرت وحمیت اس حد تک توانا ضرور ہے کہ وہ مسائل کا ادراک بھی رکھتی ہے اور

---

(۴) تاریخ دارالعلوم دیوبند کے مصنف سید محبوب رضوی صاحب لکھتے ہیں کہ: ''حضرت مولانا فضل الرحمن کے اخلاف نے عظیم دینی و علمی خدمات انجام دیں جس کا سلسلہ بحمد اللہ ابھی تک جاری ہے'' (تاریخ دارالعلوم دیوبند جلد اوّل)

مقابلے کی طاقت بھی۔

(۳) حضرت حاجی سید محمد عابد دیوبندی (۱۲۵۰ھ۔۱۳۳۸ھ)

حاجی سید محمد عابد صاحب دیوبند میں ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علوم دینیہ کی تحصیل کے لئے دہلی پہنچے، حاجی صاحب کا رجحان تزکیۂ باطن کی طرف زیادہ رہا، اس سلسلے میں متعدد بزرگوں سے تعلق رہا اور خلافت حاصل کی، حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بھی بیعت کی اجازت حاصل کی، ساٹھ برس تک چھتے کی مسجد میں قیام رہا جہاں سے دارالعلوم کی ابتدا ہوئی تھی۔ حاجی صاحب دارالعلوم کے تین ابتدائی بانیوں میں سے ایک تھے، اس مدرسہ کے لئے سب سے پہلے آپ نے خود بھی تین روپے چندہ دیا اور سفید رومال کی جھولی بنا کر اشراق کے وقت محلہ ابوالبرکات میں چندے کے لئے نکلے اور پہلے دن چندے کی کل رقم تین سو روپے جمع ہوئی حاجی صاحب دارالعلوم کے سب سے پہلے مہتمم بھی تھے، یوم تاسیس ۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ سے لے کر ۱۲۸۴ھ تک مہتمم رہے پھر دوسری بار ۱۲۸۶ھ میں مہتمم بنائے گئے اور ۱۲۸۸ھ تک مہتمم رہے، تیسری مرتبہ ۱۳۱۰ھ میں پھر مہتمم بنائے گئے، مجموعی طور پر دس سال تک اس ذمہ داری کو مختلف ادوار میں ادا فرماتے رہے۔

جامع مسجد کی تعمیر میں آپ کا بڑا حصہ ہے، جمعرات کے دن ۲۷/ذی الحجہ ۱۳۳۸ھ مطابق ۱۹۱۲ء کو وفات ہوئی، آپ کا مزار قبرستان قاسمی سے ذرا آگے ایک بڑے چبوترے پر بنا ہوا ہے، آپ کی سوانح تذکرۃ العابدین میں آپ کے تفصیلی حالات موجود ہیں۔ حضرت حاجی صاحب دارالعلوم کو جامع مسجد میں رکھنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے دارالعلوم میں دالان اور حجرے بھی بنائے گئے تھے، مگر مولانا نانوتویؒ کے سامنے دارالعلوم کا ایک بڑا تصور تھا اور وہ اس کی مستقل تعمیر چاہتے تھے۔ موجودہ دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت نودرے کا سنگ بنیاد ۲/ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ کو رکھا گیا تو مولانا نانوتوی کی درخواست پر اختلاف ختم ہو گیا اور حضرت حاجی صاحب نے سنگ بنیاد میں شرکت فرمائی۔

(۴) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۴۶ھ۔۱۳۲۳ھ)

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کی ولادت گنگوہ ضلع سہارنپور میں ۶/ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ دوشنبہ کے دن ہوئی، ان کے والد کا نام مولانا ہدایت احمد تھا جو اپنے زمانے کے جید عالم تھے، قرآن مجید آپ نے اپنے وطن گنگوہ میں پڑھا، اس کے بعد اپنے ماموں کے ساتھ کرنال چلے گئے، ان سے

فارسی کی کتابیں پڑھیں، عربی صرف ونحو کی کتابیں مولوی محمد بخش صاحب سے پڑھیں ۱۲۶۱ھ میں مولانا مملوک علی صاحب نانوتوی (۵) کے پاس دہلی پہنچے اور ساری کتابیں ان سے مولانا قاسم نانوتویؒ کے ساتھ پڑھیں۔ اس طرح آپ مولانا نانوتوی کے رفیق درس بھی تھے، معقولات کی بعض کتابیں آپ نے مفتی صدر الدین آزردہ (۶) سے بھی پڑھیں، حدیث کی کتابیں آپ نے شاہ عبدالغنی مجددی (۷) سے پڑھیں۔ آپ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے اور ان سے خلافت کی اجازت حاصل کی، تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۲۶۶ھ میں آپ گنگوہ آ گئے اور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے حجرے کو آباد کیا، ذریعہ معاش طبابت تھا۔

مولانا یعقوب صاحب نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ:

"جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولوی محمد قاسم سے اسی زمانے سے ہم سبقی اور دوستی رہی ہے، اخیر میں حدیث جناب شاہ عبدالغنی صاحبؒ کی خدمت میں پڑھی اور اسی زمانے سے دونوں صاحبوں نے حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت کی۔"

۱۸۵۷ء میں خانقاہ قدوسی سے مردانہ وار نکل کر انگریزوں کے خلاف صف آرا ہو گئے اور اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب اور دوسرے رفقاء کے ساتھ شاملی کے معرکہ جہاد میں شامل ہو کر خوب داد وشجاعت دی۔ جب میدان جنگ میں حافظ ضامن صاحب شہید ہو کر گر پڑے تو آپ ان کے نعش اٹھا کر قریب کی مسجد میں لے گئے اور پاس بیٹھ کر قرآن شریف کی تلاوت شروع کر دی۔

معرکۂ شاملی کے بعد گرفتاری کا وارنٹ جاری ہوا اور گرفتار کر کے سہارنپور کی جیل میں بھیج دیا گیا، چھ مہینے جیل میں بند رہے، وہاں بہت سے قیدی آپ کے معتقد ہو گئے اور جیل خانے میں جماعت کے ساتھ نماز ہونے لگی۔

رہائی کے بعد گنگوہ میں آپ نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع فرما دیا، درس کی تقریر ایسی ہوتی تھی کہ ہر آدمی اچھی طرح سمجھ لیتا تھا، آپ کے درس حدیث کی ایک خوبی یہ تھی کہ حدیث کے مضمون کو سن کر اس پر عمل کا شوق پیدا ہو جاتا تھا آپ کے درس ترمذی کی تقریر "الکوکب الدری" کے نام سے شائع ہو چکی ہے جو ترمذی کی نہایت جامع شرح ہے۔ اس کے علاوہ "لامع الدراری" جو کہ

(۵) وفات ۱۲۶۰ھ (۶) متوفی ۱۲۸۵ھ (۷) متوفی ۱۲۹۶ھ

بخاری کے درس کی تقریر ہے وہ بھی چھپ چکی ہے۔ ان دونوں کتابوں کو حضرت مولانا زکریا صاحب (سابق شیخ الحدیث مظاہر العلوم سہارنپور) نے اپنے اضافے کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۱۲۹۷ھ میں حضرت نانوتوی کی وفات کے بعد دارالعلوم دیوبند کے سرپرست ہوئے، فقہ و تصوف کے موضوع پر آپ کی تقریباً چودہ کتابیں ہیں، فتاویٰ رشیدیہ میں آپ کے فتاویٰ آپ کی فقہی بصیرت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں، ۱۳۱۴ھ میں آپ کو مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کا سرپرست بنایا گیا، ۹/ جمادی الثانی ۱۳۲۳ھ (۱۹۰۵ء) اذان جمعہ کے بعد ۷۸ سال کی عمر میں آپ کی وفات ہوئی، گنگوہ کے ایک باغ میں آپ کا مزار مبارک ہے آپ کی سوانح حیات تذکرۃ الرشید (۸) کی دو ضخیم جلدوں میں آپ کے مفصل حالات زندگی موجود ہیں۔ آپ کے شاگردوں اور خلفاء کی ایک طویل فہرست ہے، جن میں بڑے بڑے نامور علماء جیسے مولانا عبدالغفار صاحب (مئو اعظم گڑھ)، مولانا محمد یحییٰ کاندھلوی، مولانا ماجد علی جونپوری جیسی معروف شخصیات شامل ہیں۔

شاملی کی جنگ کے بارے میں سوانح قاسمی جلد دوم میں جو تفصیل ملتی ہے وہ یہ ہے:

''انگریزی فوج شاملی کی جس گڑھی میں پناہ گزیں ہوگئی تھی اس کے صحیح محل وقوع کا اندازہ تو دیکھنے ہی سے ہوسکتا ہے۔ بہر حال کتابوں میں جو کچھ مل سکا ہے اس کی مدد سے نیز براہ راست اس خاکسار نے سیدنا الامام الکبیر کے فرزند سعید مولانا حافظ محمد صاحبؒ سے حیدرآباد میں جو روایت اس سلسلہ میں سنی اس کو بھی پیش نظر رکھ کر تھانہ بھون کی جہادی تحریک کے اس دردناک خاتمہ کی تفصیل عرض کرتا ہوں۔

حافظ صاحب مرحوم نے جن دنوں آپ سلطنت آصفیہ کی عدالت کے رکن بحیثیت مفتی ہونے کے تھے اسی زمانہ میں نواب عبدالباقر مرحوم کی کوٹھی حسین علم میں ایک خانگی مجلس میں بیان فرمایا تھا کہ شاملی کی یہ گڑھی جس میں انگریزی فوج کے سپاہی روپوش ہوئے تھے ایک ایسے کھلے میدان میں واقع تھی کہ گڑھی کے چاروں طرف کوئی ایسی جگہ نہ تھی جسے گڑھی سے باہر والے آڑ بنا سکتے ہوں الّا یہ کہ ایک مختصر سی مسجد اسی سمت میں تھی جس طرف گڑھی کا پھاٹک تھا، محصوروں نے گڑھی کے پھاٹک کو بند کر دیا تھا اور جتھے کا جتھا تھانہ بھون کے مجاہدوں کا جو گڑھی کے باہر والے بے پناہ

(۸) مولانا عاشق الٰہی میرٹھی

میدان میں پتنگوں کی طرح پھیلا ہوا تھا، ان پر بندوقوں سے گڑھے والے انگریزی فوج کے بندوقچی دیوار کی آڑ لے کر مسلسل فائر کرتے چلے جاتے تھے۔ وہ دیوار کے پیچھے محفوظ تھے لیکن اس مختصری مسجد کے سوا جو میدان میں تھی غریب مجاہدوں کو گولیوں سے بچانے والی کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا، جیسا کہ مولانا طیب صاحب نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے کہ انگریزی فوج تحصیل شاملی میں قلعہ بند ہو گئی اور ادھر سے مجاہدوں پر بندوقوں کی باڑھ مارنی شروع کی جس سے سیکڑوں مجاہدین شہید ہو گئے، لے دے کر وہی ایک مسجد تھی اسی میں مجاہدین دم لینے کے لئے آ جاتے۔ مولانا طیب صاحب کی یادداشت میں ہے کہ اس دروازے کے قریب چھپر کی ایک کٹی تھی جو غالباً محافظوں کے سایہ لینے کے لئے بنائی گئی تھی۔

مولوی عاشق الٰہی صاحب کا بیان ہے کہ: ''حافظ ضامنؒ کا حضرت گنگوہی کے زانوں پر سر رکھے رکھے وصال ہو گیا۔''

دیوبندی حلقہ میں تواتر کی حد تک جو روایتیں پہنچی ہوئی ہیں ان کی بنیاد پر اتنی بات بہر حال یقینی ہے کہ یہ چاروں یعنی سیدنا الامام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی، امام ربانی حضرت مولانا رشید گنگوہی، حضرت مولانا حافظ محمد ضامن شہید اور مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی بہ نفس نفیس اس یورش میں عملاً شریک تھے۔

حضرت نانوتویؒ کے اس نامور رفیق کے حالات زندگی سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ کو اپنی تحریک کے آگے بڑھانے میں کیسے جانباز اور وفادار رفقاء میسر آئے کہ وہ اپنی تمام تر جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ اس تحریک کے دست و بازو بنے رہے اور حضرت نانوتویؒ کے طریق فکر و عمل کو پوری طرح سمجھ کر اس کو آگے بڑھاتے رہے، اس کے نتیجے میں انگریز کے مکمل اقتدار اور مغربی تہذیب کی یورش کے باوجود ہندوستان اسپین بننے سے محفوظ رہا، ہم اور ہماری نسلیں سپاس گذار رہیں گی حضرت نانوتویؒ اور ان کے رفقاء کی کہ انہوں نے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر کے اللہ کے دین کی حفاظت کی۔

(۵) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (۱۲۴۹ھ۔۱۳۰۲ھ)

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی ۱۳/ صفر ۱۲۴۹ھ کو نانوتہ میں پیدا ہوئے، آپ کا تاریخی

نام منظور احمد تھا۔ گیارہ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے کے بعد اپنے والد مملوک صاحب کے ساتھ دہلی چلے گئے، وہاں ابتدا سے لے کر انتہا تک تمام علوم وفنون کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ حدیث کی تعلیم کے لئے مولانا شاہ عبدالغنی مجددی کی خدمت میں بھیجے گئے، حدیث کی جو کتاب باقی رہ گئی تھی وہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ سے پڑھی، فراغت کے بعد آپ کا تقرر اجمیر گورنمنٹ کالج میں ہوا۔ اسی زمانے میں آپ کو ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ پیش کیا گیا مگر آپ نے اس کو قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد آپ کو ڈپٹی انسپکٹر کی حیثیت سے سہارنپور بھیج دیا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے بعد آپ نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دیا اور میرٹھ کے ایک چھاپے خانے میں کتابت کی تصحیح کی نوکری کر لی۔ ۱۲۸۳ھ میں دارالعلوم دیوبند قائم ہوا تو مولانا محمد قاسم صاحب کی نظر انتخاب آپ پر پڑی اور اس کی صدارت تدریس پر فائز کئے گئے۔ بحیثیت شیخ الحدیث پوری زندگی درس حدیث دیتے رہے۔ بڑے بڑے مشہور علماء آپ کے تلامذہ میں شامل ہیں جیسے شیخ الہند مولانا محمود حسن، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی وغیرہ۔

مولانا صاحب نسبت بزرگ تھے اور جذب کا غلبہ تھا، آپ نے دو حج کئے۔ شعروشاعری کا بھی ذوق تھا، آپ کا تخلص گمنام تھا۔ آپ کی تصانیف میں سوانح حضرت مولانا محمد قاسم، مکتوب یعقوبی، بیاض یعقوبی شامل ہیں۔ ۳/ ربیع الاول ۱۳۰۲ھ کو اپنے وطن نانوتہ میں وفات پائی اور وہیں اپنے قبرستان کے ایک باغ میں مدفون ہیں۔ ''حیات یعقوب ومملوک'' میں آپ کے تفصیلی حالات درج ہیں۔

مولانا محمد یعقوب صاحب بھی حضرت مولانا قاسم صاحبؒ کی اس علمی تحریک کے دل وجان سے حامی، اس کے خدمتگار اور تاحیات مدد ومعاون رہے ہیں اور حریت فکر وعمل جو تحریک دارالعلوم کی روح ہے اور اقتدار سے غیر وابستگی، مولانا یعقوب صاحب نے ہمیشہ ان اصولوں کی پاسداری کی ہے۔

(۶) مولانا رفیع الدین صاحب عثمانی دیوبندی (۱۲۵۲ھ۔۱۳۰۸ھ)

حضرت مولانا رفیع الدین صاحب عثمانی ۱۹/ رمضان المبارک ۱۲۵۲ھ میں دیوبند میں پیدا

ہوئے، ان کے والد بزرگوار کا نام فرید الدین تھا جن کا مزار دار العلوم کے شمالی دروازہ کے سامنے ہے مولانا رفیع الدین صاحب شاہ عبد الغنی مجددی کے مشہور خلفاء میں سے تھے اور ان کا شمار اولیاء کاملین میں ہوتا تھا، آپ کو دو مرتبہ دار العلوم کا مہتمم بنایا گیا۔ پہلے ۱۲۸۴ھ سے ۱۲۸۴ھ تک اور دوسری مرتبہ ۱۲۸۸ھ میں مستقل مہتمم رہے اور ۱۳۰۶ھ تک یہ خدمت انجام دی، کل مدت اہتمام ۱۹ سال ہے۔ دار العلوم کی سب سے پہلی عمارت نو درہ ۱۲۹۲ھ میں آپ کے سامنے ہی بنی۔ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن کو آپ سے خلافت حاصل ہوئی۔ ۱۳۰۶ء میں ہجرت کے ارادے سے مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور دو سال وہاں قیام کے بعد جمعرات ۱۲/ جمادی الثانی ۱۳۰۸ھ کو صبح کے وقت ۵۶ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کا مزار مدینہ منورہ کے قبرستان جنت البقیع میں حضرت عثمانؓ کے مزار کے قریب ہے، حضرت عثمانؓ کے مزار پر پہلے قبہ بنا ہوا تھا جہاں اس کا پرنالہ گرتا تھا، ٹھیک اس کے نیچے مولانا رفیع الدین صاحب کی قبر ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کے یہ نامور رفقاء جن کو دار العلوم کے اکابر ستہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے حضرت نانوتویؒ کی اس تحریک کے قافلے کے ایسے ساتھی تھے جنہوں نے اپنی تمام خداداد صلاحیتوں کو اس راہ میں وقف کر دیا، اس تحریک کی نوعیت اگر چہ ملکی نظر آتی ہے لیکن درحقیقت یہ ایک عالمی تحریک ہے جس کے سرخیل حضرت نانوتویؒ ہیں۔

پروفیسر بدرالدین الحافظ*

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے مخصوص رفقاء کرام

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے رفقاء کرام کو متعین کرنے کے لئے ہمیں صرف دارالعلوم دیوبند کے بنیادی مقصد اور نصب العین پر نگاہ ڈالنی ہوگی، پھر اس ذیل میں وہ تمام حضرات اپنے کارہائے نمایاں کے ساتھ منظر عام پر آتے چلے جائیں گے جن کو حضرت الامامؒ کے رفقاء خاص ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مگر اس کے ساتھ ٹھیک اسی زمانہ میں جب حضرت الامام تعلیم وتبلیغ میں مصروف تھے دیکھا گیا کہ مشیت ایزدی نے چند ہم خیال ایسے نفوس کو یکجا کر دیا ہے جو اجتماعی تعلیم کا خاص تجربہ رکھتے ہیں اور دینی تعلیم کا ادارہ قائم کرنے کے لئے فکر مند ہیں۔ ان بزرگ ہستیوں میں حاجی سید عابد حسینؒ، حضرت شیخ الہندؒ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علیؒ، مولانا فضل الرحمٰنؒ ان کے علاوہ مسجد چھتہ کی مجلس انس میں جو حضرات، حضرت الامام کے دست وبازو بنے اور تحریک دیوبند کے بنیادی محرک اور معاون ثابت ہوئے ان میں سوانح مخطوطہ کی فہرست کے مطابق دیوان حاجی یٰسین صاحب عرف اللہ دیا، حافظ انوار الحق کلو پیر جی، حاجی ظہور الدین اور حکیم مشتاق صاحب۔ ان کے علاوہ دو ناموں کا اور تذکرہ ملتا ہے شیخ منظور احمد اور منشی نہال صاحب۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجلس اُنس کی ابتدا مسجد چھتہ میں حاجی سید عابد صاحب اور مولانا رفیع الدین صاحب دامت برکاتہم کی رفاقت سے ہوئی اس میں رفتہ رفتہ دیوبند کے مختلف محلوں سے چیدہ اور سربرآوردہ لوگ بھی شامل ہوتے گئے جن سے عہد قدیم کی اس مجلس کی تشکیل عمل میں آئی اور پھر قصبہ کی اصلاح اور نئے محاذ کی زمین ہموار کرنے میں یہی حضرات سیدنا الامام الکبیر کے ہمنوا، ہم خیال اور تحریک کے معاون ثابت ہوئے۔

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ مشیت ایزدی نے اس تحریک کے لئے جن نفوس قدسیہ کو یہاں

---

* جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

یکجا فرمایا تھا ان میں کا ہر شخص اپنی منفرد خصوصیت اور بے نظیر صلاحیت میں کامل تھا جس سے نہ صرف بنیادی کام لیا جانا تھا بلکہ اس سے ایک ایسی نسل کا ظہور ہونے والا تھا جو اس کمزور پودے کو ایک مضبوط اور تناور درخت بنانے میں اہم کردار ثابت ہو اور پھر علم وعرفان کی اس درسگاہ سے دین کے مخلص خدام اور اسلام کے جرأت مند و جانباز سپاہی تیار کئے جائیں، جو اپنی مخلصانہ مساعی کے ذریعہ سفینۂ ملت کو پار لگائیں اور ہر مخالف ہوا اور آندھی کے مقابلہ میں تن من دھن کی بازی لگانے سے دریغ نہ کریں اور اللہ کا فضل اور بانیان دارالعلوم کی پاکیزہ نفسی اور سوز دروں کی یہ برکت ہے کہ دارالعلوم روز اول سے اپنی تاسیس کے ان مقاصد کو پورا کررہا ہے۔ ان نفوس قدسیہ میں حضرت مولانا ذوالفقار علیؒ خود مولانا مملوک علی نانوتویؒ کے شاگرد رشید تھے اور تعلیم کے بعد انسپکٹر آف اسکول کے منصب سے ریٹائر ہوئے پھر اپنے وطن دیوبند کی سکونت اختیار کرلی گویا آپ کے تعلیمی تجربات کی بھی ایک نئے تعلیمی ادارہ کو ضرورت تھی اس لئے آپ کی خدمات دارالعلوم کو حاصل ہوگئیں، پھر یہی نہیں بلکہ آپ کے فرزند جلیل حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندیؒ کے تلامذہ کی کثیر تعداد نے تحریک دیوبند کو بام عروج تک پہونچایا، آپ چالیس سال تک دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رہے اور ۱۹۰۴ء میں بعمر ۸۵ سال وفات پائی اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے پہلو میں جانب مشرق آپ کا مزار مبارک ہے۔

حضرت حاجی سید عابد حسین

اس کے بعد ہم حضرت الامام کے ابتدائی خصوصی رفقاء میں حضرت حاجی سید عابد حسینؒ کا تذکرہ پہلے ضروری سمجھتے ہیں جنھیں دارالعلوم کی بنیادی صورت کے بانی ہونے کا شرف حاصل ہے اور آپ کی باکمال شخصیت کے روحانی فیوض وبرکات کا اس ادارہ کی بنیادوں میں پیوست ہونا بھی لازمی تھا کیونکہ اس طرح کی روحانی تحریکوں کی کامیابی کی حقیقی کلید صرف دماغ نہیں ایسا دل ہوتا ہے جو مرکزی غیبی قوت سے لو لگائے سربسجود کامیابی کی دعائیں کرتا ہو جس طرح غزوہ بدر کے میدان میں صف بندی کرنے کے ساتھ رسول اکرم کی پیشانی مبارک خاک پر پڑی بارگاہ ایزدی میں دست بدعا تھی، کہا جاتا ہے کہ حاجی سید عابد حسینؒ کو عہد طفلی سے باطنی معرفت وسلوک کا شوق تھا اور آپ چشتی طریقہ کے ایک بزرگ میاں جی کریم بخش سے بیعت تھے جو رامپور منہیاران کے رہنے والے تھے اور آپ کو انہی سے خلافت ملی تھی۔ لیکن تاریخ مشائخ چشت میں خلیق نظامی مرحوم نے آپ کو حضرت

حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلفاء میں شمار کیا ہے۔

بہر حال یہ امر مسلم ہے کہ اہل دیو بند کو حضرت حاجی سید عابد حسینؒ سے اس درجہ عقیدت تھی کہ دیو بند کے مسلمانوں میں شاید کوئی بچہ ایسا ہوگا جس کے گلے میں حاجی کا تعویذ نہ ہو، اس کے علاوہ ظاہری تقویٰ اور احکام شریعت کی پابندی میں آپ کا حال یہ تھا کہ ایک مرتبہ لوگوں نے حاجی صاحب کو بہت رنجیدہ دیکھا اور افسردگی کی حالت یہ تھی جیسے کسی کی میت ہوگئی ہو جب بمشکل تمام سبب دریافت کیا تو بہت اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ اٹھائیس سال بعد آج فجر کی جماعت میں تکبیر تحریمہ فوت ہوگئی ہے، گویا ایسے ہی بزرگ ہاتھوں نے اس مقدس پودے کا بیج ڈالا تھا جو آج تک اپنی پوری توانائیوں کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور آپ ہی کے خانوادے کے چشم و چراغ حضرت مولانا سید محمد میاںؒ کی خدمات جامعہ قاسمیہ مدرسہ شاہی مراد آباد، مدرسہ امینیہ دہلی اور جمعیۃ علماء ہند میں تدریسی، تنظیمی اور تصنیفی حیثیت سے ناقابل فراموش اور تاریخ کا روشن باب ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا مشیت ایزدی نے دارالعلوم کے بانیان اور خدام میں چن چن کر ایسے اشخاص کو منتخب کیا تھا جو مختلف النوع صفات وصلاحیت کے حامل ہوں چنانچہ حضرت مولانا رفیع الدین دیو بندؒ بھی اپنی خداداد صلاحیت کی حیثیت سے منفرد حیثیت کے مالک تھے، اگر چہ آپ کی علمی حیثیت تو زیادہ نہ تھی مگر اللہ تعالیٰ نے انتظامی صلاحیت سے خوب نوازا تھا آپ کی پیدائش ۱۸۳۶ء اور وفات ۱۸۹۰ء ہے، آپ حضرت شاہ عبد الغنی مجددی کے مشہور خلفاء میں سے تھے اور آپ کا شمار اپنے زمانہ کے اولیاء کاملین میں تھا، آپ نے دو مرتبہ دارالعلوم کے مہتمم کے فرائض انجام دیئے، دارالعلوم کی بہت سی ابتدائی عمارتیں آپ کے زیر اہتمام تعمیر ہوئیں جو استواری اور حسن تعمیر کا بہترین نمونہ ہیں۔ اس سے متعلق آپ کا ایک واقعہ مشہور ہے کہ ۱۸۷۵ء میں جب دارالعلوم کی سب سے پہلی عمارت نودرہ کی بنیاد کھودنا شروع کی گئی تو آپ نے خواب دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجوزہ مقام پر تشریف رکھتے ہیں اور ان سے خطاب کر کے فرما رہے ہیں کہ یہ احاطہ تو بہت مختصر ہے اور یہ فرما کر خود اپنے عصاء مبارک سے احاطہ وعمارت کا نقشہ کھینچ کر بتلایا کہ ان نشانات پر تعمیر کی جائے۔ مولانا نے صبح اٹھ کر دیکھا تو نشانات موجود تھے، چنانچہ انہی پر بنیاد کھود کر تعمیر شروع کرائی گئی، مولانا مرحوم ۱۸۸۸ء میں ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے گئے اور دو سال بعد ۱۸۹۰ء میں وصال ہوا، جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

حضرت مولانا یعقوب نانوتوی

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی بن مولانا مملوک العلی نانوتوی ۱۸۳۴-۱۸۸۶ء علم معقول ومنقول میں اپنے والد کا نمونہ تھے۔ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ معقولات ومنقولات غرضیکہ فنون میں آپ اپنے دونوں ساتھیوں مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتویؒ سے کم نہ تھے۔ ذکاوت وذہانت اللہ تعالیٰ نے بدرجۂ اتم عطا فرمائی تھی، طلب علم کا بے انتہا شوق تھا(۱) دارالعلوم کے قیام میں آپ ڈپٹی انسپکٹر مدارس کے عہدے پر فائز تھے مگر حضرت الامام مولانا قاسم نانوتویؒ کے طلب کرنے پر سرکاری ملازمت چھوڑ کر دیوبند چلے آئے اور ایک قلیل سی رقم پر دارالعلوم میں صدر مدرس مقرر کیے گئے اور دارالعلوم کے سب سے پہلے شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ نے ۱۸۶۷ء سے ۱۸۸۶ء کے درمیان ۱۹ سال تک تدریس کے فرائض انجام دیئے، اسی مدت میں ایک سو اکیاون طلباء نے آپ سے علوم نبویہ کی تحصیل کی جن میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی جیسے مشاہیر اور یگانہ عصر علماء کرام شامل ہیں۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ دارالعلوم کی صدارت تدریس پر سب سے پہلے حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہ فائز ہوئے جو اپنی جامعیت علوم ظاہرہ وباطنہ کے سبب شاہ عبدالعزیز ثانی تسلیم کیے جاتے تھے، آپ کی وفات باون سال کی عمر میں نانوتہ ضلع سہارنپور میں ہوئی۔ (۲)

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی

حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ بھی دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں سے ایک تھے آپ نے دہلی میں مولانا مملوک علی نانوتوی سے تعلیم حاصل کی تھی آپ فارسی اور اردو کے ایک بلند پایہ اور اعلیٰ درجہ کے شاعر تھے مادہ تاریخ نکالنے میں آپ کو بڑا کمال حاصل تھا، اللہ تعالیٰ نے مولانا موصوف کو صالح اور اعلیٰ صلاحیتوں کی حامل اولاد سے نوازا تھا، آپ کے لائق اور صالح بیٹوں میں مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد عثمانی مشہور مفسر قرآن پاک اور صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند شامل ہیں، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی، مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ کے پوتے تھے۔ حق یہ ہے کہ حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب اور

---

(۱) مفتی عزیز الرحمٰن، تذکرۂ مشائخ دیوبند مطبوعہ کراچی ص: ۱۷۰۔

(۲) قاری محمد طیبؒ تاریخ دارالعلوم دیوبند کراچی پاکستان ۱۹۷۲ء ص: ۹۸۔

آپ کی اولاد نے دارالعلوم دیوبند کی عظیم خدمات انجام دی ہیں اور دینی وملی خدمات کا سلسلہ اب بھی آپ کے اخلاف میں جاری ہے۔ آپ کی وفات ۱۹۰۷ء میں ہوئی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۲۴۲ھ ۱۳۲۳ھ) حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے ہم سبق رفقاء میں سے ہیں۔ آپ کو اکابر دارالعلوم سے گہرا تعلق رہا ہے، بعض طلباء دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوکر گنگوہ حاضر ہوتے اور حضرت گنگوہی کے درس حدیث میں شریک ہوکر استفادہ کرتے تھے اس لئے اکابر دارالعلوم اور رفقاء کرام کے ساتھ آپ کا تذکرہ ضروری ہے اور ویسے بھی ابتدائی تعلیم کے بعد جب ۱۲۶۱ھ میں آپ دہلی پہونچے تو مولانا مملوک علی نانوتوی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور یہیں سے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ سے تعلق قائم ہوا جو ساری عمر بدستور رہا۔ (۳)

آپ کے بارے میں حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی تحریر فرماتے ہیں کہ مولانا مملوک کی حجاز سے واپسی ایسے وقت میں ہوئی کہ رخصت کے دن پورے ہو چکے تھے اس لئے وطن نہ آسکے سیدھے دہلی پہونچے اور جب سالانہ تعطیل ماہ ذی الحجہ میں ہوئی تو وطن نانوتہ تشریف لائے اور واپسی میں مولانا قاسم نانوتویؒ کو بھی پڑھانے کی غرض سے ساتھ دہلی لے گئے اور پھر استاذ الکل مولانا مملوک علی کی خدمت میں ہر دو شمس وقمر یعنی مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی کو ایک زمانہ میں مدت تک یہاں حاضر رہنے اور نخلستان علم کی خوشہ چینی کا اتفاق رہا، مگر دونوں کی آمد میں ایک سال کا فرق ہے اس لئے کہ حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ تو ۱۲۶۰ھ میں دہلی تشریف لے آئے تھے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ۱۲۶۱ھ میں دہلی پہونچے۔ (۴)

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے سوانح قاسمی میں لکھا ہے کہ دونوں جناب مولوی رشید احمد صاحب گنگوہی اور مولوی محمد قاسم سے اسی زمانہ میں ہم سبقی اور دوستی رہی ہے آخر میں حدیث جناب شاہ عبدالغنی کی خدمت میں پڑھی اور اس زمانہ میں دونوں صاحبوں نے جناب قبلہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب سے بیعت کی اور سلوک شروع کیا۔ (۵)

---

(۳) سید محبوب رضوی تاریخ دارالعلوم دیوبند ج اول ص: ۱۲۷۔ (۴) مولانا عاشق الٰہی میرٹھی، تذکرۃ الرشید ج اول ص: ۲۷۔

(۵) تاریخ دارالعلوم دیوبند ج اول سید محبوب رضوی ص: ۱۲۷۔

اب اگرچہ ہمارے موضوع کے مطابق تقریباً حضرت الامام کے تمام رفقاء کرام کا مختصر تذکرہ آچکا ہے مگر یہ ذکر تشنہ اور داستان ناتمام رہے گی اگر اس کا اختتام استاذ الاساتذہ اور اس تحریک کے مخزن و منبع حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے ذکر سے نہ ہو۔

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ

حضرت حاجی صاحبؒ ۱۲۳۲ھ میں تھانہ بھون میں پیدا ہوئے، آپ کو اللہ تعالی نے ہزاروں انمول خوبیوں سے نوازا تھا، آپ انیسویں صدی کی تین عظیم الشان تحریکوں کا منبع و مخرج تھے۔ ان میں ایک تو مسلمانوں کی دینی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے جو تحریک انیسویں صدی میں شروع ہوئی جس نے بالآخر دیوبندی تحریک کی شکل اختیار کی یہ حضرت حاجی صاحب ہی کے خلفاء اور مریدین کے پرخلوص جدوجہد کا نتیجہ تھی، ان میں مولانا رشید احمد گنگوہی (متوفی ۱۳۲۳ھ) مولانا محمد قاسم نانوتوی (متوفی ۱۲۹۷ھ) مولانا محمد یعقوب نانوتوی (متوفی ۱۸۸۶ء) اور حضرت حاجی محمد عابد صاحبؒ (متوفی ۱۹۱۲ء) ان کے خلفاء تھے۔ پھر شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ مولانا محمد قاسم کے جانشیں تھے اور انہی بزرگوں کی کوششوں سے دینی تعلیم کا چرچا ہوا۔

۲۔ باطنی اصلاح و تربیت کے لئے انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں دو بزرگوں کی کوششیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایک حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جو حضرت حاجی صاحب کے اجل خلیفہ تھے آپ نے نصف صدی سے زیادہ ایک پرانے قصبہ تھانہ بھون کی کہنہ مسجد کے گوشہ میں بیٹھ کر مسلمانوں کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اصلاح کا کام کیا دوسرے بزرگ عالم مولانا محمد الیاسؒ کی تبلیغی تحریک کو جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ آج دنیا کے سامنے ہے۔ اور مولانا محمد الیاس صاحب بھی مولانا رشید احمد گنگوہی کے مرید تھے گویا یہ بھی حضرت حاجی صاحب کے فیوض روحانی کا ایک پرتو تھا جس کی تحریک آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں قبول عام حاصل کر چکی ہے۔

۳۔ انیسویں صدی کی تیسری تحریک آزادئ وطن کی تھی اس سلسلہ میں خود حضرت حاجی صاحب اور ان کے متوسلین و منسلکین نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ ہندوستان کی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ (۶)

---

(۶) پروفیسر خلیق احمد نظامی، تاریخ مشائخ چشت، ندوۃ المصنفین دہلی ص: ۲۳۴۔

پروفیسر اختر الواسع*

دیو بند اور علی گڑھ کا رشتہ

مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سید احمد خاں کے تعلقات کی روشنی میں

علی گڑھ اور دیو بند، برّ صغیر کی تاریخ میں مسلم حرکت وفکر کی دو علامتیں ہیں۔ یہ علامتیں جدید اور قدیم، دنیا و دین اور مسٹر و مولوی کی مترادف بن گئی یا بنادی گئی ہیں۔ علی گڑھ اور دیو بند ـــــ دو مختلف دبستانِ فکر ہیں اور دو جداگانہ تحریکیں بھی۔ دونوں میں بظاہر بڑی دوری ہے لیکن افسوس کہ ان دونوں میں جو مماثلتیں ہیں ان کے ساتھ نہ تو ہمدردی سے کام لیا گیا اور نہ ہی کما حقہ ان پر توجہ دی گئی۔ کیا یہ بات صحیح نہیں کہ یہ دونوں تحریکیں ایک ہی واقعے کا الگ الگ ردعمل تھیں۔ یعنی ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی ناکامی نے سرسید اور مولانا محمد قاسم نانوتوی، دونوں کے دلوں میں مسلمانوں کی عظمتِ گم گشتہ کی بازیافت اور ان کے لئے ایک باعزت وغیرت وخودداری کی حامل زندگی گزارنے کے مواقع اور طریقوں کی فراہمی کے لیے ہر ممکن جدوجہد کے جذباتِ صادق کو موجزن کر دیا تھا اور دونوں نے ''تعلیم'' ہی کا اس کے لیے انتخاب کیا، ایک نے مدرسۃ العلوم کی بنیاد ڈال کر تو دوسرے نے دارالعلوم کی تاسیس کے ذریعے۔ کیا اس حقیقت سے صرف نظر کیا جاسکتا ہے کہ دونوں اداروں کے بانی ولی اللٰہی مکتبِ فکر کے پروردہ تھے اور دونوں نے مولوی مملوک علی ہی کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا تھا۔

ایک بڑی مماثلت جو دونوں تحریکون یا اداروں کے بانیوں میں تھی وہ ان کا ''امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم'' کے لیے دردمندی اور اخلاص کے ساتھ اس کی زبوں حالی کا احساس تھا۔ دینی حمیت اور ملّی غیرت بھی دونوں کے یہاں قدرِ مشترک تھی، جس کے ثبوت میں سرسید کی تصنیف ''خطبات احمدیہ'' اور مولانا قاسم نانوتوی کے عیسائی مشنریوں سے ہونے والے مناظروں کی روئدادیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ملّی غیرت کے مظاہر کا آئینہ دار سرسید کا آگرہ دربار سے وہ واک آؤٹ تھا کہ جس کا سبب یہ تھا کہ ''دربار میں ہندستانیوں وانگریزوں کی کرسیاں برابر کے درجہ پر نہ تھیں'' اور حضرت نانوتوی کا ملکۂ وکٹوریہ کے جشن اقتدار کے وقت دہلی سے صرف اس لیے چلے آنا تھا کہ ''انگریزوں کی شوکت

* اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی-۲۵

دیکھی نہیں جاتی تھی۔"

یہ بھی ایک تاریخی صداقت ہے جو بڑی چونکا دینے والی ہے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کے موقع پر لال قلعہ میں شاہانِ تیموریہ کی آخری یادگار اور مغلیہ سلطنت کے ٹمٹماتے چراغ سے صرف سر سید ہی مایوس نہ تھے بلکہ مولانا نانوتوی اور ان کے رفقاء کو بھی اس کا یقین تھا کہ باغی افواج کے مرکز اطاعت بہادر شاہ ظفر میں اب کوئی دم باقی نہیں رہا ہے، اسی لیے مجاہدین کی یہ جماعت انقلابیوں کی اس ٹولی سے الگ الگ رہی اور اپنے لیے اطاعت کا مرکز اور قیادت کا محور حضرت امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی ذاتِ اقدس کو بنایا۔

ان تمام مماثلتوں کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ سر سید اور مولانا قاسم نانوتوی کی فکر، معاملہ فہمی اور اندازِ کار میں بڑا فرق تھا۔ دونوں کی منزل ایک تھی، لیکن ان کے راستے اس قدر جداگانہ تھے کہ زمانے کی کوتاہ بیں نگاہوں نے دونوں کی منزل ایک ہونے کے احساس کو بھی دھندلا دیا۔ سر سیّد مولانا محمد قاسم نانوتوی کا کتنا احترام کرتے تھے اس کا اندازہ اس تعزیتی نوٹ سے لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے مولانا نانوتوی کے انتقال پر ۲۴ر اپریل ۱۸۸۰ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے شمارے میں لکھا تھا۔ ان کے الفاظ ہیں:

> "زمانہ بہتوں کو رویا ہے اور آئندہ بہتوں کو روئے گا۔ لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد کوئی اس کا جانشین نظر نہ آئے نہایت رنج و غم کا باعث ہوتا ہے...... اس زمانے میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے، تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم صاحب اس دنیا میں بے مثل شخص تھے۔ ان کا پایہ اس زمانے میں شاید معلوماتِ علمی میں شاہ عبدالعزیز صاحب سے کچھ کم ہو، اِلّا تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا...... درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے۔ اور ایسے شخص کے وجود سے زمانے کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔"

یہاں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دینا مناسب ہوگا کہ مولانا نانوتوی کی کتاب "تصفیۃ العقائد" سر سیّد کے مذہبی استفسارات کا ہی جواب ہے۔

سر سیّد کی طرح مولانا محمد قاسم نانوتوی بھی انگریزی کی اہمیت کو جانتے تھے اور ان کا خیال تھا

کہ مسلمان انگریزی زبان اور علومِ جدیدہ سے بہرہ ور ہوں۔ ۹ رجنوری ۱۸۷۴ء کو دارالعلوم دیوبند کے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا تھا:

''دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلبائے دارالعلوم مدارسِ سرکاری میں جا کر علومِ جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں اس سے بہت اضافہ ہوگا۔''

دوسری طرف سرسیّد بھی مذہبی تعلیم کے پوری طرح قائل تھے اور اسی لیے نہ صرف دینیات کی تعلیم علی گڑھ کے نصاب میں شروع سے لازمی رکھی گئی بلکہ دیوبند ہی کی طرف رہنمائی کے لیے ان کی نظریں بھی اٹھیں۔ سرسیّد تو اس سلسلے میں مولانا قاسم صاحب ہی کی مدد چاہتے تھے، جس کا پتہ اس خط سے چلتا ہے جو انہوں نے اپنے ایک دوست پیر محمد عارف کو لکھا تھا۔ سرسیّد خط میں لکھتے ہیں:

''اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لائیں تو میری سعادت ہے۔ میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔''

گو حضرت نانوتوی تو اس کے لیے آمادہ نہ ہوئے لیکن ایک زمانے تک علی گڑھ کالج کی نظامت دینیات کے منصب پر ان کے داماد مولانا عبداللہ انصاری صاحب فائز رہے، کیوں کہ سرسید علی گڑھ کالج کے پڑھے ہوئے طلباء کے ''دائیں ہاتھ میں فلسفہ، بائیں ہاتھ میں سائنس اور سر پر کلمۂ طیبہ کا تاج'' دیکھنا چاہتے تھے۔ اس طرح معلوم ہوا کہ علی گڑھ اور دیوبند کے بانیوں میں یہ بھی قدرِ مشترک تھی۔ فرق تھا بھی تو صرف ''تقدیم وتاخیر'' کا۔ اب رہا نتائج کا معاملہ تو یہ تو علی گڑھ اور دیوبند کے فرزندوں کی توفیق پر منحصر رہا کہ انہوں نے اپنے اداروں کے بانیوں کے اس جذبے کو کس حد تک سراہا، تسلیم کیا اور عملی جامہ پہنایا۔ بقول کسے بڑھیا نے دیا تو روشن کر دیا تھا، اب کوئی گھر سے ہی نہ نکلا تو اس میں اس کا کیا قصور؟

جہاں تک اس سمت میں کوششوں کا سوال ہے اور علی گڑھ و دیوبند کے درمیان اشتراک کا معاملہ ہے تو ماضی کے اوراق اس کے شاہد ہیں کہ اس کے لیے مخلصانہ کوششیں بھی ہوئیں۔ مثال کے طور پر ۱۷/۱۸/اور ۱۹/اپریل ۱۹۱۰ء کو دیوبند کے جلسۂ دستار بندی میں علی گڑھ کی طرف سے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے شرکت کی اور ۱۸/اپریل کی شام کو انہوں نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کی کہ:

''اگر دارالعلوم دیوبند کے کچھ فارغ التحصیل طلبہ علی گڑھ کو انگریزی اور سائنس کی تکمیل کے واسطے بھیجے جائیں تو کالج کی طرف سے ہر ایسے طالب علم کو پچیس روپے ماہوار وظیفے کی مدد دی جائے گی۔''

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی اس تجویز کی بازگشت ہمیں پورے پچیس سال بعد الحاج مولانا محمد سلیم صاحب مرحوم، مہتمم مدرسہ صولتیہ، مکہ معظمہ کے اس مضمون میں ملتی ہے جو انہوں نے اپنے رسالے ''ندائے حرم'' میں لکھا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہماری موجودہ درسگاہیں دینی ہوں یا دنیوی، اس قسم کے آدمی تیار کر رہی ہیں جو زمانۂ حال کی دینی یا دنیوی ضرورتوں کو مل کر پورا نہیں کر سکتے۔ جو خیال آج ہمارے ذہن میں ہے پچیس سال پیشتر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم کو اس ضرورت کا احساس ہوا تھا۔ اپنے اس خیال کو لے کر وہ علی گڑھ سے دیوبند پہنچے۔ سچے درد اور پورے اخلاص کے ساتھ انہوں نے اس تحریک کی ابتدا کی تھی کہ دارالعلوم دیوبند کے دین اور علی گڑھ کی دنیا کا سنگم ملا دیں''۔

آج جب کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حوالے سے یہ سیمینار ہو رہا ہے اور علی گڑھ کو سوا سو سال نیز دیوبند کو اس سے بھی زیادہ مدت گزر چکی ہے یہ تمنا ہنوز باقی، آرزو تشنۂ تکمیل اور خواب ادھورا ہے کیوں کہ ''دین و دنیا'' کے سچے امتزاج کے نمونے والے مسلمانوں کی آج گزرے ہوئے کل سے زیادہ ضرورت ہے۔ ایسے دانشور جو ''جامِ شریعت'' اور ''سندانِ عشق'' کے حامل ہوں آج کے اس پرآشوب دور میں، جس کو ترقی یافتہ ہونے کا دعویٰ بھی ہے، ہمارے ملی تشخص کی برقراری اور باعزت حیثیت کے حصول کے لیے ناگزیر ہیں۔ آج علوم جدیدہ کے نتیجے میں پیدا شدہ تشکیک اور زمانے کے پیش کئے ہوئے چیلنجوں کا جواب دینے کے لیے ضروری ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند میں وسیع پیمانے پر منصوبہ بند کوشش کے تحت ایک علمی لین دین ہو۔ گریز، خوف اور نفسیاتی کشمکش کو دل و دماغ سے جھٹک کر ہم حوصلہ مندانہ عجز و انکسار، محبت و احترام اور خلوص دل سے علی گڑھ اور دیوبند میں ایک نئے علمی، ثقافتی اور تہذیبی رشتے کا آغاز کریں تا کہ وہ دوری جو ایک صدی سے زیادہ عرصے سے چلی آ رہی ہے اور جس کے مضر نتائج ہم نے اب تک دیکھ لیے ہیں، ختم ہو سکے اور علی گڑھ و دیوبند کے اشتراک سے اکیسویں صدی میں برصغیر کے مسلمان سچے معنوں میں ''خیر امت'' کی تصویر پیش کریں، اللہ کی رسی کو

مضبوطی سے پکڑیں اور ایک ایسے سماج کی تشکیل میں حصہ لے سکیں جہاں دوئی کے بجائے ایکی کا تصور ابھر کر آئے، حریفانہ دوری کی جگہ حلیفانہ یگانگت لے سکے۔

سرسیّد کا علی گڑھ اپنے قیام سے آج تک مولانا نانوتوی کے دیوبند کا مدّاح رہا ہے اور معتقد بھی۔ (اس کے ثبوت میں دینیات فیکلٹی کے وہ مقالے ہیں جو کہ اعلا تحقیقاتی ڈگریوں کے حصول کے لیے پیش کیے گئے ہیں اور جن کا موضوع اکابرین دیوبند کی حیات اور علمی و مذہبی خدمات ہیں) اور جب بھی دیوبند سے کوئی صدائے حق اور نعرۂ حریت بلند ہوا، علی گڑھ نے اپنی بساط بھر اس کا خیر مقدم کیا ہے، گو انگریزوں کی مخالفت اور ان کی غلامی کے طوق سے ملک کو آزاد کرانے کی جو جدوجہد دیوبند کے فرزندوں کو اپنے بانی سے ورثے میں ملی تھی، اس کو اس ادارے کے ممتاز فاضلین نے اپنے پائے استقامت کو جنبش دیے بغیر بھی جاری رکھا۔ لیکن اس جدوجہد میں جدید تعلیم و تربیت کے پروردہ علی گڑھ کے کھلنڈروں نے بھی آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ بس فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہاں شعوری طور پر انگریزی دشمنی گھٹی میں پلائی گئی تھی اور یہاں جدید تعلیم کے نتیجے میں جنم لینے والے افکار و نظریات کا یہ منطقی نتیجہ تھا۔ اور جب شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ، رئیس الاحرار مولانا محمد علی کے ساتھ تحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں علی گڑھ آئے تو انہوں نے اس کا اعلان ان لفظوں میں کیا کہ:

> ''اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غم خوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم، اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔''

ایک بار پھر وقت آواز دے رہا ہے، مولانا محمد قاسم نانوتوی کے دیوبند کو اور پہلے سے زیادہ زور سے پکار رہا ہے کہ وہاں سے پھر کوئی شیخ الہندؒ اٹھے اور علی گڑھ سے اس رشتے کو نئے انداز سے استوار کرے جس کی بنا عملی طور پر ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جمعہ کے دن مولانا محمود حسنؒ کے ہاتھوں پڑی تھی اور سرسیّد کا علی گڑھ ایک بار پھر رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی پیروی کرے۔

کیا ایسا ممکن ہو سکے گا — ؟ بانی دار العلوم، دیوبند مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حوالے سے منعقدہ اس اجتماع کے حوالے سے وقت اور تاریخ دونوں آپ سے، آپ کے جواب کے منتظر ہیں۔

مولانا عقیدت اللہ قاسمی*

حضرت الامام محمد قاسم النانوتوی اور سرسید احمد خاں

حضرت الامام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولوی سید احمد خاں معروف بہ سرسید احمد خاں ایک ہی منبع البحرین حضرت مولانا مملوک علی نانوتوی کے فیض کا پرتو تھے۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود، مذہبی احیاء، تعلیمی ترقی وفروغ، سیاسی ارتقا، تہذیبی وثقافتی وملی نشو ونما اور معاشرتی اصلاح کے یہ دونوں دھارے ایک ہی چشمۂ فیض اور بحر ذخار سے نکل کر بہنے والی دو عظیم نہریں تھیں۔ اگرچہ سرسید احمد خاں کی سوانح، حیات جاوید کے مولف الطاف حسین حالی نے ان کے استادوں میں مولانا مملوک علی کو شامل نہیں کیا ہے لیکن شیخ محمد اکرام آئی سی ایس، برصغیر کی علمی، تہذیبی، ثقافتی اور اسلامی وملی تاریخ تحریکوں اور نمایاں شخصیتوں کے موضوع پر اپنی مایۂ ناز تالیف موج کوثر میں تحریر فرماہیں:

> ''سرسید نے جن بزرگوں سے فیض حاصل کیا ان میں امام الہند شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ مخصوص اللہ، شاہ عبدالعزیز کے جانشین شاہ اسحٰق اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے استاذ ومحسن مولانا مملوک علی نانوتوی کے نام لئے جاتے ہیں''۔ (ص:۸۰)

شیخ محمد اکرام اس مایۂ ناز ومنفرد تالیف میں ایک اور جگہ مولانا مملوک علی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مرحوم دہلی کالج میں مدرس ہوگئے تھے، جن بزرگوں نے ان سے تعلیم حاصل کی تھی ان میں سرسید احمد خاں بانی علی گڑھ کالج، مولانا محمد قاسم بانی دارالعلوم دیوبند، مولانا رشید احمد گنگوہی سرپرست دارالعلوم دیوبند، مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور ان کے اپنے صاحبزادے مولانا محمد یعقوب نانوتوی جیسے صاحب علم وفضل شامل ہیں''۔ (ص:۱۹۴)

ان دونوں بزرگ رہنماؤں نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لئے دو مختلف قسم کے تعلیمی مراکز

---

* ڈاسنہ، ضلع غازی آباد (یوپی)

کی بنیادیں رکھیں۔ اس وقت کے نظام تعلیم کے سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رہے کہ تعلیم سے فارغ ہونے والے کو کوئی ڈگری یا سرٹیفکٹ نہیں دیا جاتا تھا بلکہ اس کے اندر صلاحیت پیدا کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس روایت کے مطابق آج بھی دارالعلوم دیوبند کی سند میں لہ مناسبة في العلوم کے الفاظ لکھے جاتے ہیں یعنی ہمارے یہاں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد اس شخص کے اندر علوم سے مناسبت پیدا ہوگئی ہے۔ اس طرح اس مناسبت، لگاؤ اور صلاحیت وقابلیت کے بل پر اس کو آگے بڑھنے کے لئے رہنمائی کی جاتی اور راستے کھولے جاتے تھے، جس سے الامام مولانا نانوتوی نے علوم دینیہ میں کمال پیدا کیا اور عالم اسلام نے انہیں حجۃ الاسلام تک کا خطاب دیا، جبکہ اسی تعلیم کی بنیاد پر مولوی سید احمد خاں نے اپنے آبائی پیشہ لال قلعہ کی درباری وملازمت کے طور طریقوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت پیدا کی اور پڑھتے پڑھتے انگریزی سرکار کے اعلیٰ عہدوں تک پہونچ گئے، حکومت برطانیہ سے ''سر'' کا خطاب حاصل کیا اور ایسے ایسے اعزازات حاصل کئے جو ان سے پہلے کسی ہندوستانی کو نہیں ملے تھے۔

یہ دونوں ہی عظیم رہنما اس زمانہ میں اس عالم رنگ وبو میں قدم رنجہ ہوئے تھے جب مغلیہ سلطنت زوال، انتشار، بدنظمی اور طوائف الملوکی سے دوچار تھی اور یورپ کی کمپنیاں اس ملک کو اپنے ظلم وستم کے پنجوں میں جکڑ رہی تھیں اور اپنا تسلط جما رہی تھیں۔ اگر چہ ہندوستان پر مسلمانوں کے دور میں شخصی حکومتیں ہوا کرتی تھیں اور جمہوری حکومت کے طرز پر مبنی اداروں کے وجود سے دنیا آشنا نہ تھی لیکن یہ خودمختار سلاطین جو شخصی حکومت کے علم بردار کہے جاتے تھے فی الحقیقت رعایا کی رضامندی کے جویا رہتے تھے، رعایا کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرتے تھے، مطلق العنان بادشاہ آئینی حکمرانی کے جادۂ اعتدال سے باہر نہ ہوتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو بادشاہی سے ناراضی کا جذبہ بغاوت وسرکشی کی صورت میں نمودار ہوتا، ہر روز تخت پلٹتے، ملک میں افراتفری اور طوائف الملوکی عام ہوتی اور وہ اتنے اتنے طویل عرصہ تک حکمرانی نہ کرپاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے آنے سے پہلے ہندوستان ایک متحد ملک نہیں بلکہ ہزاروں ملکوں میں بٹا ہوا اور گھر گھر کے رجواڑوں میں باہم برسرپیکار رہنے والا خطہ تھا۔ اس کو مسلم حکمرانوں نے ہی ایک متحدہ ملک اور سونے کی چڑیا بنایا تھا۔ فرانس کے مشہور سیاح ڈاکٹر برنیئر کے الفاظ میں ''وہ ایسی بے تھاہ خلیج تھا جس میں دنیا بھر کے سونے اور چاندی کا بڑا حصہ ہر طرف

سے آ کر جمع ہوتا اور بمشکل ایک طرف سے نکلتا تھا''۔ مسلمانوں کی حکومت کے عروج کے جاتے رہنے اور دہلی کی حکومت کے پاش پاش ہو جانے کے بعد طوائف الملو کی کے پھیل جانے کے زمانہ میں بھی لارڈ میکالے نے کہا تھا:

''باوجود مرہٹہ لٹیروں کی موجودگی کے مشرقی ممالک میں صوبۂ بنگال باغ ارم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی آبادی بے حد و غایت بڑھی ہوئی تھی، غلہ کی افراط سے دور دراز کے صوبجات پرورش پاتے تھے اور لندن و پیرس کے اعلیٰ خاندانوں کی بیبیاں یہاں کے کرگھوں کے نازک ترین کپڑے پہنتی تھیں۔ دولت کی یہ کیفیت تھی کہ بنگال کے جگت سیٹھوں کا کاروبار انگلستان کے سب سے بڑے بنک آف انگلینڈ کے برابر پھیلا ہوا تھا اور بقول کپتان الگزنڈر ہملٹن سورت کے ایک تاجر عبدالغفور کا سرمایہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے برابر تھا''۔

ان حکمرانوں کی رعایا پروری کا اندازہ اس واقعہ سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ ۱۷۶۸ء میں جب راجپوتانہ میں سخت قحط پڑا تھا اور بہت سے میواتی و مارواڑی اپنا وطن چھوڑ کر روہیل کھنڈ پہونچنے لگے تو اول حافظ الملک والی روہیل کھنڈ نے ان لوگوں کے روز ینے مقرر کئے، اس کے بعد پیلی بھیت کی شہر پناہ کی تعمیر شروع کر کے ان لوگوں کو کام میں لگا دیا اور جب یہ تعمیر ختم ہو جانے پر بھی قحط زدہ لوگوں کی آمد بند نہ ہوئی تو اس شہر پناہ کو گروا کر اسے از سر نو پختہ بنوانا شروع کر دیا۔ حافظ الملک نے روزی روٹی اور عزت نفس کا یہ انتظام ان لوگوں کے لیے کیا تھا جو نہ ان کے ہم مذہب تھے اور نہ ہی رعایا۔ لا اینڈ آرڈر اور امن و قانون کی صورتحال کو انگلستان کے مشہور مقرر ایڈمنسٹر برک کی اس تقریر کی روشنی میں اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے جو انہوں نے برطانیہ کی پارلیمنٹ میں کی تھی:

''ایشیا کا بڑا حصہ مسلم حکمرانوں کے زیر اقتدار ہے اور اسلامی حکومت کے معنی ہی قانونی حکومت کے ہیں۔ عیسائی بادشاہوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کے قانون میں بدرجہا مضبوطیاں ہیں، ان کا اپنے قانون کی نسبت یہ عقیدہ ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ہے اس لئے رعایا سے لے کر بادشاہ تک سب کے سب یکساں طور پر قانون اور مذہب کے پابند ہیں...... قرآن شریف کے قانون کا ایک ایک حرف ظالموں کے خلاف گرج رہا ہے۔ قانون کی شرح کرنے والے علما و قاضیوں کا ایسا طبقہ موجود ہے جو اس کا محافظ قرار دیا گیا ہے اور جو بادشاہ کی ناراضی سے محفوظ ہے کہ جسے بادشاہ

ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ ان کے بادشاہوں تک کو حقیقی اعلیٰ طاقت حاصل نہیں ہے، بلکہ وہاں کی حکومت ایک حد تک جمہوری ہے''۔

اس زمانہ میں مذہبی حقوق کی حفاظت کا نقشہ پنڈت سندر لال صاحب الہ آبادی کے حسب ذیل الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

''اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، اورنگ زیب اور ان کے بعد ان کے تمام جانشینوں کے زمانہ میں ہندو اور مسلم یکساں حیثیت سے رہتے تھے۔ دونوں مذاہب کی مساویانہ توقیر کی جاتی تھی اور مذہب کے لئے کسی کے ساتھ کسی قسم کی جانب داری نہ کی جاتی تھی...... ہر بادشاہ کی طرف سے بے شمار ہندو مندروں کو جاگیریں اور معافیاں دی گئی تھیں۔ آج تک ہندوستان میں متعدد ہندو مندروں کے پجاریوں کے پاس اورنگ زیب کے دستخطی فرمان موجود ہیں جن میں خیرات اور جاگیریں عطا کئے جانے کا تذکرہ ہے''۔ (مضامین بابو سندر لال)

پنڈت سندر لال مزید لکھتے ہیں:

''مسلمانوں نے اپنی زبان عربی اور فارسی چھوڑ کر ہندوستان کی زبان اختیار کی جس کا نام اردو ہے''۔

اس سلسلہ میں مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں:

یہاں ایک ہزار سال کی جدوجہد کے بعد ایک قوم بنی تھی جس کا تمدن، جس کی زبان اور جس کی سیاست ایک ہو رہی تھی اور مسٹر چارلس گرانٹ نے تسلیم کیا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں ہندوؤں کے کیریکٹر میں کوئی تبدیلی نہیں کی بلکہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ (تاریخ التعلیم از سید محمود)

مسلمانوں کے دور حکومت میں ابتداء سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کا انتظام مفت بغیر کسی فیس اور معاوضہ کے کیا جاتا تھا۔ چنانچہ میکس مولر نے اعتراف کیا ہے کہ

''انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدرسے تھے، اس طرح چار سو آدمیوں کے آبادی کے لئے ایک مدرسہ کا اوسط ہوتا تھا''

ایسٹ انڈیا کمپنی کے مخالفانہ طرز عمل کے باوجود ۱۸۵۷ء تک مسلمانوں کی جو کچھ تعلیمی اور

ذہنی حالت رہی اس کا اندازہ بنگال سول سروس کے ایک افسر کی حسب ذیل تحریر سے کیا جا سکتا ہے:

''عزم تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور نسبتاً ہندوان کے سامنے طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی اہلیت زیادہ ہوتی ہے۔ (بغاوت ہند اور ہماری آئندہ پالیسی از بیر نگٹن طامس)

حضرت الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولوی سید احمد خاں نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس کے ساتھ ہی انہیں اپنی اپنی آنکھوں سے وہ دردناک مناظر بھی دیکھنے پڑے جنہوں نے مسلمانوں کو عروج کی بلندیوں سے اٹھا کر زوال کی انتہائی پستیوں میں دھکیل دیا۔ جن کا ایک نقشہ ۱۸۲۳ء میں آنریبل الفنسٹن اور آنریبل ایف وارڈن نے گورنمنٹ کو پیش کردہ اپنی ایک متفقہ یادداشت میں کھینچا:

''انصاف یہ ہے کہ ہم نے دیسیوں کی ذہانت کے چشمے خشک کر دیئے، ہماری فتوحات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس نے نہ صرف ان کی علمی ترقی کی ہمت افزائی کے تمام ذرائع کو ہٹا لیا ہے بلکہ حالت یہ ہے کہ قوم کے اصل علوم کے بھی گم ہو جانے اور پہلے لوگوں کی ذہانت کی پیداوار کے فراموش ہو جانے کا اندیشہ ہے''۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل ص:۱۳۹)

ایک موقع پر لارڈ میکالے نے لکھا تھا:

''کلائیو کسی مسلمان کو بنگال کے محکمۂ انتظامی کا ذمہ دار بنانے کے بہت خلاف تھا''۔

اسی طرح سندربن کے کمشنر نے گورنمنٹ گزٹ میں اعلان ہی کر دیا تھا کہ:

''جو ملازمتیں خالی ہوں ان پر سوائے ہندوؤں کے کسی کا تقرر نہ کیا جائے''۔

مدراس گورنمنٹ نے ۱۸۷۳ء میں تسلیم کیا کہ:

''موجودہ طرز تعلیم کا قالب ہندوؤں کی ضروریات کے مطابق بنایا گیا اور مسلمانوں کو اس بارے میں اس قدر زیادہ گھاٹے میں رکھا گیا کہ اسکولوں میں مسلمان بچوں کی تعداد کم ہونا حیرت انگیز امر نہیں ہے بلکہ ان حالات میں محض ان کا موجود ہونا ہی حیرت انگیز ہے۔'' (تاریخ التعلیم از سید محمود)

ان حالات میں ہمارے یہ دونوں عظیم دردمند رہنما میدان عمل میں آئے مگر دونوں نے الگ

الگ راستے اختیار کئے۔ مولانا قاسم نانوتوی نے اپنے رفقاء کی معیت میں غیر ملکی حکمرانوں سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے انگریزوں کے مقابلہ میں جہاد کیا۔ ہتھیاروں کے ذریعہ جہاد میں ناکام ہوجانے کے بعد قلم اور زبان سے وہ تادم آخر جہاد کرتے رہے۔ انہوں نے دین ومذہب اور تہذیب وثقافت کو اولین درجہ دیا۔ انہوں نے دنیا کو کبھی ایک مردار سے بڑھ کر نہیں سمجھا حالانکہ انہوں نے اس زمانہ کے عیسائی راہبوں اور ہندو سنیاسیوں وساد ھو سنتوں کی طرح دنیا کو بالکل ترک بھی نہیں کیا۔ انہوں نے دنیا میں سے اپنے لئے اتنا تھوڑا حصہ لینے پر اکتفا کیا کہ زندگی اور دنیاداروں کے موجودہ معیار سے ان کی حالت قریب قریب تارکان دنیا ہی کی تھی۔ انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے لئے دارالعلوم دیوبند قائم کیا۔ جہاں ان بزرگوں کی عملی مثال اور تعلیمات کا یہ اثر ہوا کہ دیوبند فقط اہل علم کا مدرسہ نہیں بلکہ اہل اللہ اور تارکان دنیا کی خانقاہ بھی بن گئی۔ اس طریق کار نے دیوبند میں ایک روحانی سربلندی پیدا کردی۔ ظاہر ہے اس حقیقت کو وہ لوگ کیسے قابل قدر گردان سکتے ہیں جو دنیا کی لذتوں ہی کو مقصد حیات تصور کرتے ہیں۔ حضرت الامام حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی کی ہمہ جہت شخصیت کے بے شمار پہلوؤں کو سیمینار کے بیش بہا مقالات میں حضرات گرامی بخوبی ملاحظہ فرمارہے ہیں۔ اس لئے بخوف طوالت حجۃ الاسلام کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو دوسرے مقالہ نگاروں پر چھوڑتے ہوئے بغرض موازنہ وتقابلی مطالعہ سرسید کے حالات کو قدرے تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہے۔

سرسید احمد خاں کا مادی ترقی کے متعلق جو نقطۂ نظر تھا وہ اظہر من الشمس ہے، اس مقصد کے لئے سرسید کو تقلید مغرب سے بھی کوئی عار نہ تھی۔ سرسید کے بزرگوں کا ہمیشہ شاہی دربار سے واسطہ رہا۔ وہاں سے انہیں برابر خطاب، منصب اور خلعتوں سے نوازا جاتا رہتا تھا، ان کے والد میر متقی کو اکبر شاہ کے ساتھ شاہزادگی کے زمانہ سے نہایت خلوص اور خصوصیت کا لگاؤ تھا، ان کا رسوخ دربار میں بہت زیادہ تھا، انہیں قلعہ سے تنخواہ ملتی تھی۔ اپنے والد کے انتقال کے وقت ۱۸۳۸ء میں سرسید کی عمر بائیس سال تھی، اس وقت انہیں نوکری کا خیال پیدا ہوا، انہوں نے اپنے خالو مولوی خلیل اللہ خاں سے جو اس وقت دلی میں صدر امین تھے کچہری کی کارروائیوں کے طریقے سیکھے۔ انہوں نے چند ماہ بعد اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کردیا۔ کچھ دن بعد سر ایسبرٹ ہملٹن کمشنر آگرہ کے دفتر میں نائب منشی ہوگئے۔

انہوں نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی کا ایک خلاصہ تیار کیا جسے کمشنر صاحب نے گورنمنٹ میں پیش کر کے سرسید کے لئے عہدہ منصفی کی سفارش کردی۔ سرسید نے عہدہ منصفی کے لئے قواعد کا امتحان دیا اور مین پوری کے منصف بن گئے۔ بہادر شاہ ظفر نے انہیں حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش پر ان کے خاندانی خطاب سے بھی آگے ''جوادالدولہ سید احمد خاں عارف جنگ'' کے خطاب سے نوازا۔ بحیثیت منصف دہلی تبادلہ ہو جانے پر خارج وقت میں عمارات دہلی کی تحقیق کے بعد ضخیم شاہکار آثار الصنادید ترتیب دیا۔ جس کی بنیاد پر انہیں گریٹ برٹن آئرلینڈ ایشیاٹک سوسائٹی نے زیر سرپرستی ہر موسٹ اکسلنٹ مجسٹی وکٹوریہ سوسائٹی کا آنریری ممبر نامزد کیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے وقت وہ ضلع بجنور میں صدر امین کے عہدہ پر تھے، وہاں انہوں نے نہایت تحقیق، کاوش اور محنت کے ساتھ ضلع بجنور کی تاریخ لکھی۔ آئین اکبری اور تاریخ فیروز شاہی کی تحقیق و تصحیح کی۔ انہوں نے ہندوستان کی قوموں کے لئے فیصلہ اور انقلاب انگیز معرکہ ۱۸۵۷ء میں یورپین حاکموں کا ساتھ دیا۔ گورنمنٹ کی وفاداری اور خیر خواہی میں بھرپور طریقہ سے سرگرم رہے۔ تاریخ سرکشی بجنور لکھی۔ مراد آباد پہونچے تو وہاں ایک فارسی مدرسہ قائم کیا۔ رسالہ اسباب بغاوت ہند ترتیب دیا، اسے اردو اور انگریزی میں شائع کیا۔ اسی سلسلہ میں سرکار کو ہندوستانیوں کو انگریزی زبان میں تعلیم دینے کا مشورہ دیا۔ رسائل موسوم بہ لائل محمڈنز آف انڈیا ترتیب دے کر شائع کئے جن کی تحقیق اور چھان بین سے ایسی شہادتیں بہم پہونچائیں کہ گورنمنٹ برطانیہ کی خیر خواہی میں جاں بازی اور جاں نثاری کے جس قدر کام مسلمانوں سے ظہور میں آئے وہ تمام ملک میں کسی سے نہیں آئے۔ ۱۸۶۰ء میں جب اضلاع شمال مغرب میں عام قحط پڑا تھا سرسید مراد آباد میں صدر الصدور تھے۔ انہیں ضلع کے قحط کا انتظام سپرد کیا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے جو حسن انتظام کا مظاہرہ کیا اس سے تمام ہندوستان میں نہایت عزت اور نیک نامی حاصل ہوئی۔ انہوں نے بائبل کی تفسیر تبیین الکلام لکھنے اور قرآن و حدیث سے اس کی تطبیق کرنے کا کام شروع کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہاں تک ممکن ہو مطابقت ثابت کی جائے۔ ان کا تبادلہ غازی پور ہوا تو وہاں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اس میں انگریزی، اردو، عربی، فارسی اور سنسکرت پانچ زبانوں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ یہاں انہوں نے سائنٹفک سوسائٹی بھی قائم کی جس کا مقصد انگریزی

کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرانا تھا۔ علی گڑھ تبادلہ ہونے پر سوسائٹی کا تمام سامان اور اسٹاف اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے۔ ایک وسیع عمارت اس کے لئے بنوالی۔ یہاں سے وہ عہدۂ جج اسمال کاز کورٹ پر ترقی پا کر بنارس چلے گئے۔ مسلمانوں کے اندر مغربی تعلیم کی اشاعت اور ان کے انگریزوں سے میل جول کے منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے ولایت کا سفر کیا، پورے سترہ مہینے لندن میں قیام کیا، بہت سے پروگراموں میں شرکت کی اور بہت سے عمائدین سے ملاقاتیں کیں، بہت سی جگہوں پر ان کی عزت افزائی کی گئی، سی ایس آئی کا خطاب اور تمغہ ملا، سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد میں اسلام کی حقیقت اور بانی اسلام کے کیرکٹر کے خلاف دانستہ یا نادانستہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا ازالہ کرنے کے لئے خطبات احمدیہ ترتیب دے کر شائع کرائی۔ ہندوستان واپسی پر رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا، جس کے ایڈیٹر اور منیجر وہ خود ہی تھے۔ سر سید نے ۳۵ سالہ سرکاری ملازمت کے فرائض کے علاوہ تصنیف وتالیف اور ترویج علوم کے میدان میں اپنی عظمت کا سکہ جما دیا۔ انہوں نے تفسیر قرآن کی سات جلدیں اور کئی دوسرے مذہبی رسائل بھی لکھے۔ کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان، مسلمانوں کی تعلیم سے دوری کے اسباب کا پتہ لگانے کی غرض سے تشکیل دی اور کمیٹی کی طرف سے ایک کالج کے قیام کی تجویز ہونے مجوزہ کالج کے لئے کمیٹی خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین بنائی۔ آخر سر سید کے ابتدا سے شریک کار، دست راست اور سکریٹری سب کمیٹی مولوی سمیع اللہ سب جج علی گڑھ نے اپنی کوٹھی میں مدرسۃ العلوم قائم کیا، جبکہ سر سید احمد خاں بنارس میں سب جج تھے، وہ بعد میں جولائی ۱۸۷۶ء میں ملازمت سے پنشن پا کر علی گڑھ آ کر مقیم ہوئے۔ اسی مدرسہ کو انہوں نے اینگلو محمڈن اورینٹل کالج میں بدلا جو ان کے انتقال ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء کے بائیس سال بعد جنوری ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی بنا۔ اس طرح سر سید کی پوری زندگی سراپا حرکت، عمل اور جدوجہد کا نام ہے۔

سر سید احمد خاں کی زندگی کے ایک ایک پل کا عمل یقیناً لائق صد ہزار تحسین اور آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، مگر قوم ان میں سے اکثر کارناموں سے بے خبر ہے اور انہیں صرف مسلم یونیورسٹی کے بانی کی حیثیت سے ہی جانتی ہے۔ یقیناً خود یہ کارنامہ بھی تاریخ کا انتہائی درخشاں باب ہے، مگر انتہائی افسوسناک امر یہ ہے کہ سر سید کے حوالہ سے ایک بہت ہی غلط اور بے بنیاد بات انتہائی

شدت اور پوری قوت کے ساتھ پھیلائی جاتی ہے۔ ’’الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں‘‘ کے عنوان سے لکھے جانے والے مقالہ کے لئے یہ بحث بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کا مقصد ایک انتہائی لغو جھوٹ کی پول کھولنا اور حقیقت سے پردہ اٹھانا ہے۔

بعض لوگوں کا من پسند مشغلہ یہ شور مچانا ہوگیا ہے کہ ’’مولویوں نے انگریزی تعلیم کے خلاف فتوی دے کر مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے محروم کردیا۔ جس کی وجہ سے مسلمان دنیوی ترقی کے میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے۔ بعض مسلم دانشور یہ رٹ لگاتے رہتے ہیں کہ قدامت پرست مولویوں نے سرسید کی انگریزی تعلیم کی تحریک کی مخالفت کی جو ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے تھے اور انگریزی سرکار اور انگریزی تعلیم کے مخالف تھے، ان مولویوں نے انگریزوں کے خلاف نفرت پھیلائی، انگریزی تعلیم حاصل کرنے اور اسکولوں و کالجوں میں جانے کے خلاف کفر کے فتوے لگائے، مولویوں کی اس عاقبت نااندیشی نے مسلمانوں کو تعلیمی میدان میں کئی سو سال پیچھے چھوڑ دیا، ہماری اس تعلیمی زبوں حالی کے لئے مولویوں کے فتوے ذمہ دار ہیں وغیرہ وغیرہ۔ انگریزی تعلیم کی مخالفت کے اس بے بنیاد فسانہ کو اس زور و شور اور تسلسل کے ساتھ پھیلایا جارہا ہے کہ آج بہت سے لوگ اس جھوٹ کو حقیقت باور کر بیٹھے ہیں حتی کہ آج کل مولویوں کا بھی ایک بڑا طبقہ اس پر یقین کرتا اور اپنے بزرگوں کی رائے سمجھ کر خود انگریزی تعلیم کی مخالفت میں بحث کرنے لگتا ہے، حالانکہ ہمارے اکابر علما نے انگریزی تعلیم کی کبھی مخالفت نہیں کی۔

البتہ یہ حقیقت ہے کہ ایک طبقہ میں چند وجوہ کی بنا پر سرسید احمد خاں کی بہت مخالفت ہوئی اور چونکہ اس مخالفت کے متعلق نہ صرف عوام بلکہ خواص میں بھی زبردست غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ کا سنجیدگی سے جائزہ لینا اور حقائق سے پردہ اٹھانے کے لئے قدرے تفصیل سے بحث کرنا ضروری ہے۔ یہ کہنا کہ علما نے سرسید احمد خاں کی مخالفت اس وجہ سے کی کہ وہ مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنا چاہتے تھے سرسید کی مخالف و موافق تحریروں کی روشنی میں بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس بہتان طرازی کے ذریعہ علماء اسلام کو ایک ایسے جرم میں قابل گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے جس کا سارے فسانہ میں کوئی ذکر نہیں اور جس کا حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء حق نے کبھی بھی انگریزی یا کسی اور زبان کو سیکھنے کی نہ مخالفت کی اور نہ ہی وہ ایسا کر سکتے تھے، ظاہر ہے وہ کسی علم کے حاصل کرنے کی مخالفت کرتے بھی کیسے جبکہ پیغمبر اسلام پہلے ہی فرما چکے تھے "ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔" رسول خدا نے کسی خاص علم کی بھی بات نہیں کہی بلکہ خود اپنے چہیتے صحابی حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو یہودیوں کی زبان عبرانی سریانی سیکھنے کا حکم دیا تھا۔ اتنا ہی نہیں علماء حق نے عملاً یونانیوں کے علوم وفنون، فلسفہ، حکمت، طب، ریاضی، ہیئت، نجوم، کیمیا، الجبرا، جغرافیہ اور طبیعات وغیرہ کو بھی حاصل کیا اور نہ صرف حاصل کیا بلکہ انہیں اس طرح اپنالیا کہ وہ بقراط، سقراط، جالینوس اور ارسطو وافلاطون کے علمی ذخیروں کے مالک، وارث اور امین بن گئے۔ اقلیدس اور بطلیموس کے علوم وفنون کی تحقیقات ان کی زندگیوں کا اوڑھنا بچھونا بن گئیں۔ وہ علوم عربی سانچے میں ڈھل گئے اور عربی زبان میں نئے ادب اور تاریخ کی بنیادیں پڑیں۔ علماء اسلام نے ان علوم کو اس طرح اپنایا کہ آج وہ سب اسلامی علوم وفنون کہلاتے ہیں۔ فارسی جو ایران کے زرتشتوں اور آتش پرستوں ومجوسیوں کی زبان تھی عربی کی طرح ہی اسلامی زبان کہلانے لگی۔

استاذ الاساتذہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ نے بستر مرگ پر دراز ہونے کی حالت میں ۱۶ر صفر ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں مسلم نیشنل یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جو بعد میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے موسوم ہوئی اور علی گڑھ سے دہلی منتقل ہوئی۔ شیخ الہند نے اس کے سنگ بنیاد کی تقریب کے موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا:

> "آپ میں سے جو محقق اور باخبر لوگ ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ میرے بزرگوں نے کسی وقت بھی کسی اجنبی زبان کے سیکھنے اور دوسری قوموں کے علوم وفنون حاصل کرنے پر کفر کا فتوی نہیں دیا۔ ہاں یہ بیشک کہا کہ انگریزی تعلیم کا آخری اثر جو یہ دیکھنے میں آرہا ہے کہ لوگ نصرانیت کے رنگ میں رنگتے جائیں یا ملحدانہ گستاخیوں سے اپنے مذہب والوں کا مذاق اڑائیں اور حکومت وقت کی پرستش کرنے لگیں تو ایسی تعلیم پانے سے تو ایک مسلمان کے لئے جاہل رہنا اچھا ہے۔"

سرسید احمد کے جنم لینے سے بھی بہت پہلے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خلف الرشید شاہ عبدالعزیز سے (جو خود سرسید کے الفاظ میں اس زمانہ میں تمام ہندوستان میں نہایت

نامی مولوی تھے) انگریزی کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے سے متعلق فتوی پوچھا گیا تو جیسا کہ خود سر سید احمد خاں نے اسباب بغاوت ہند ص ۲۰ مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ میں لکھا ہے:

''انہوں نے صاف جواب دیا کہ کالج جانا اور انگریزی زبان سیکھنا بموجب مذہب کے سب درست ہے۔''

ان کا کہنا تھا کہ:

''جاؤ انگریزی کالجوں میں پڑھو اور انگریزی زبان سیکھو۔ شرعاً ہر طرح جائز ہے۔''

فقہ حنفی کے قدیم تعلیمی مرکز، فرنگی محل کے مشہور عالم مولانا عبدالحی نے فتوی دیا کہ:

انگریزی زبان کا لکھنا پڑھنا سیکھنا اگر تشبہ کی غرض سے ہو تو ممنوع ہے اور اگر اس لئے ہو کہ ہم انگریزی میں لکھے ہوئے خطوط پڑھ سکیں اور ان کی کتابوں کے مضامین سے خبردار ہو سکیں تو کوئی حرج نہیں۔''

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس طرح فتوی دیا تھا:

''انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور نقصان دین میں اس سے نہ ہووے (فتاوی رشیدیہ ص ۵۷۴ مطبوعہ درسی کتب خانہ دہلی)

علماء نے روزگار حاصل کرنے اور علم میں اضافہ کے لئے بھی کھل کر انگریزی تعلیم کے جائز ہونے کا فتوی دیا تھا۔ ۱۲۹۰ھ میں دارالعلوم دیوبند کے جلسۂ تقسیم انعامات میں تقریر کرتے ہوئے مولانا محمد قاسم نانوتوی نے عربی مدرسوں سے فارغ ہو کر سرکاری اسکولوں میں داخل ہونے کی خواہش رکھنے والے طلبا کی حوصلہ افزائی ان الفاظ میں فرمائی تھی:

''اگر اس مدرسہ کے طلبا سرکاری مدرسوں میں جا کر جدید علوم حاصل کریں تو یہ بات ان کو کمال کی جانب بڑھانے والی ثابت ہوگی۔ (روئداد دارالعلوم)

جب دارالعلوم دیوبند کے مشہور عالم حضرت شیخ الہند کے شاگرد خاص مولانا عبیداللہ سندھی نے جمعیۃ الانصار قائم کی جس کے جلسوں میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بھی شریک ہوا کرتے تھے دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے درمیان معاہدہ ہوا تھا کہ جو انگریزی تعلیم یافتہ طلبا دین کی تبلیغ کا شوق رکھتے ہوں اور دارالعلوم دیوبند میں آکر اسلامی علوم حاصل کرنا چاہتے ہوں، دارالعلوم ان کی

تعلیم کا خصوصی انتظام کرے گا اسی طرح علی گڑھ کالج ان طلبا کو خصوصی انتظام کے ساتھ انگریزی تعلیم دے گا جو دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہو کر علی گڑھ کالج جائیں گے۔ اس طرح اس معاہدہ کے تحت آج بھی دارالعلوم دیوبند اور دوسرے دینی مدارس کے فارغ طلبا علی گڑھ جا کر مختلف شعبوں اور فیکلٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے اور بہت سی یونیورسٹیوں میں پروفیسر اور اپنے شعبہ کے سربراہ یعنی ڈین آف فیکلٹیز تک بنتے ہیں، جبکہ علی گڑھ یا دوسرے کالجوں و یونیورسٹیوں کے مسلم طلبا کے دلوں میں چونکہ دینی تعلیم کی کوئی قدر و قیمت اور اہمیت پیدا نہیں کی جاتی اس لئے وہ دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے مدرسوں کا رخ نہیں کرتے۔

اس موقع پر یہ سوال ضرور ذہنوں میں پیدا ہوگا کہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومت برطانیہ کے قائم کیے ہوئے کالجوں میں پڑھنے اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کو علما نے جائز قرار دیا تھا تو ایک ایسے مدرسۃ العلوم یا اینگلو محمڈن اورینٹل کالج کی مخالفت کیوں کی گئی جو خود مسلمانوں کا جاری کردہ تھا اور جس میں مذہبی تعلیم کا بھی انتظام تھا؟

یہ تو حقیقت ہے کہ اس کالج کی مخالفت ہوئی اور اس کے بانی سرسید احمد خاں کے خلاف فتوے لگائے گئے۔ اس سلسلہ میں موج کوثر کے مصنف شیخ محمد اکرام آئی سی ایس لکھتے ہیں:

> ''اس معرکہ کو حل کرنے کے لئے ان مضامین اور فتاوی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے جو علی گڑھ کالج اور سرسید احمد خاں کی مخالفت اور ان کی تکفیر کے سلسلہ میں شائع ہوئے، ان کے پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ کالج کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ اس لئے ہوئی کہ اس کی بنا میں سرسید کا ہاتھ تھا جو اپنی کتابوں اور رسالہ تہذیب الاخلاق میں مذہبی اور معاشرتی مسائل سے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جنہیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔''

ان میں سے بعض خیالات کو الطاف حسین حالی نے ان کی سوانح کے طور پر لکھی ہوئی اپنی ضخیم تالیف ''حیات جاوید'' میں بھی جمع کر دیا ہے۔

سرسید احمد خاں کا کہنا تھا:

''طیور منخنقہ یعنی جن پرندوں کو نصاری نے گلا گھونٹ کر ماردیا ہو مسلمانوں کے لئے ان کا کھانا حلال ہے۔ شیطان یا ابلیس کا جو لفظ قرآن میں آیا ہے اس سے کوئی وجود خارج عن الانسان مراد نہیں ہے بلکہ خود انسان کے اندر جو نفس امارہ یا قوت بہیمیہ ہے وہی مراد ہے۔ وضع لباس میں کفار کے ساتھ تشبہ شرعاً ممنوع نہیں ہے۔ اجماع حجت شرعی نہیں ہے۔ قیاس حجت شرعی نہیں ہے۔ اگر چہ ممکن ہے کہ جس طرح انسان سے فروتر مخلوقات موجود ہیں اسی طرح اس سے بالاتر مخلوقات جن کا ہمیں علم نہیں موجود ہوں، لیکن ملائک یا ملائکہ کے جو الفاظ قرآن میں وارد ہوئے ہیں ان سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ کوئی جدا مخلوق انسان سے بالاتر ہے بلکہ خدا تعالیٰ نے جو مختلف قوی اپنی قدرت کاملہ سے مادے میں ودیعت کئے ہیں۔ جیسے پہاڑوں میں صلابت، پانی کا سیلان، درختوں کا نمو، بدن کی قوت جذب و دفع و امثال ذلک انہی کو ملائک یا ملائکہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آدم اور ملائکہ و ابلیس کا جو قصہ قرآن میں بیان ہوا ہے یہ کسی واقعہ کی خبر نہیں ہے بلکہ یہ ایک تمثیل ہے جس کے پیرایہ میں انسان کی فطرت اور اس کے جذبات اور قوت بہیمیہ جو اس میں ودیعت کی گئی ہے اس کی برائی یا دشمنی کو بیان کیا گیا ہے۔ آیت **الذین آتیناهم الکتاب یعرفونه کما یعرفون ابناء هم** (یعنی جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی یعنی اہل کتاب ان کو بالکل اس طرح پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں) میں حضور پیغمبر اسلام مراد نہیں ہیں، جو وصیت وارث کے حق میں کی جائے وہ نافذ ہے، جن لوگوں کو روزہ رکھنا شاق ہے خواہ وہ بوڑھے ہوں خواہ جوان وہ روزہ کے بدلہ فدیہ دے سکتے ہیں۔ پرامیسری نوٹوں پر جو نفع لیا جاتا ہے اس کی حرمت ثابت نہیں ہوتی۔ کسی گورنمنٹ یا کمیٹی کو جو ملک کی ترقی کے لئے روپے قرض لے اس کو سود پر روپیہ دینا یا کسی جماعت کو جو رفاہ عام کے لئے چندہ جمع کرے اس روپیہ کا سود میں لگانا اور اس منافع سے رفاہ عام کا کام کرنا یہ بھی ربا میں داخل نہیں ہے۔ حضرت عیسیٰ کا زندہ آسمان پر اٹھایا جانا ثابت نہیں ہے۔ شہیدوں کی نسبت جو قرآن میں آیا ہے کہ ان کو مردہ نہ سمجھو بلکہ وہ زندہ ہیں اس سے ان کا علو درجات، روحانی خوشی اور دنیا میں قابل تقلید مثال چھوڑنا مراد ہے، نہ یہ کہ وہ درحقیقت زندہ ہیں اور مثل زندوں کے کھاتے ہیں۔ صور کا لفظ جو قرآن میں متعدد بار آیا ہے محض استعارہ ہے فی الواقع کوئی آلہ مراد نہیں ہے۔ خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور اسماء و افعال سے متعلق جو کچھ قرآن یا حدیثوں میں بیان ہوا ہے وہ سب بطریق مجاز، استعارہ و تمثیل کے بیان ہوا

ہے۔اسی طرح معاد کے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے جیسے بعث ونشر، حساب کتاب، میزان، صراط اور جنت ودوزخ وغیرہ وہ سب حقیقت پر نہیں مجاز پر محمول ہیں۔قرآن میں جا بجا قدیم قوموں میں برائیاں اور بداخلاقیاں پھیل جانے کے بعد ان پر طرح طرح کے عذاب نازل ہو جانا بیان ہوا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ درحقیقت ان کے گناہ اور معاصی عذاب نازل ہونے کا باعث ہوئے تھے۔قرآن مجید میں جو جنگ بدر وحنین کے بیان میں فرشتوں کی مدد کا ذکر کیا گیا ہے اس سے ان لڑائیوں میں فرشتوں کا آنا ثابت نہیں ہوتا۔حضرت عیسیٰ کا بن باپ کے پیدا ہونا کسی بات سے ثابت نہیں ہوتا۔قرآن سے جنات کا ایسا وجود جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ہوا اور آگ کے شعلہ سے پیدا ہوئے ہیں اور ان میں مرد وعورت دونوں ہوتے ہیں، جس شکل میں چاہتے ہیں ظاہر ہو سکتے ہیں، آدمی کو نفع یا نقصان پہونچا سکتے ہیں وغیرہ وغیرہ ثابت نہیں ہوتا۔"

سرسید کی لکھی ہوئی تفسیر کے مطالعہ سے ان کے اس طرح کے بہت سے عقائد سامنے آتے ہیں۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

"علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاوی میں بھی کہیں یہ نہیں لکھا کہ "انگریزی کا پڑھنا کفر ہے۔" ان فتاوی مین یہ لکھا ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں اور جو مدرسہ ایسا شخص قائم کرے اس کی اعانت جائز نہیں اس میں اپنی اولاد کو تعلیم دلانا مسلمان کا کام نہیں۔"

مسلمانوں کا روشن مستقبل کے مصنف سید طفیل احمد منگلوری علیگ کا بھی یہی کہنا ہے کہ کوئی اعتراض سرسید کے مخالفین کی طرف سے مطلق انگریزی تعلیم کے متعلق کہیں درج نہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو انگریزی زبان کی تعلیم سے اختلاف نہ تھا بلکہ اس طرز معاشرت سے اختلاف تھا جس کو بقول حالی "سرسید تعلیم سے بھی زیادہ ضروری سمجھتے تھے اور جس سے مسلمان بھڑکتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کے لڑکے انگریزی پڑھنے کے ساتھ ساتھ انگریزی تربیت پاکر اپنی تہذیب اور مذہب سے دور ہو جائیں گے اور ان کے ہاتھ سے نکل جائیں گے"۔

حالی نے لکھا ہے کہ:

''خود سر سید کو جس وقت مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا اسی وقت سے اس بات کی فکر ہوئی کہ جس طرح دنیوی عزت کے لئے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف مائل کرنا ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ ان کو اس تعلیم کے ان مضر نتائج سے جو مذہب کے حق میں پیدا ہوتے نظر آتے ہیں جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے۔ وہ دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں خواہ ہندو ہوں یا مسلمان اور خواہ عیسائی ان کے دل میں مستثنیٰ صورتوں کے سوا عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی، وہ مذہب کی کوئی بات جو بظاہر یا فی الحقیقت عقل یا قانون قدرت کے خلاف ہو اسے تسلیم نہیں کرتے۔ وہ ریاضی اور علوم طبعی کی ممارست سے مذہبی باتوں کا بھی ویسا ہی ثبوت چاہنے لگتے ہیں جیسا کہ ریاضی اور سائنس کے ہر مسئلہ پر ان کو ملتا رہا ہے، ان کے عقیدے نبوت اور معاد بلکہ الوہیت کی طرف سے بھی متزلزل ہو جاتے ہیں اور مذہبی احکام کا استخفاف ان کے دلوں میں بیٹھ جاتا ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ مغربی علوم اور مغربی لٹریچر کی بدولت اکثر ممالک یورپ میں روز بروز دہریت اور الحاد پھیلتا جاتا ہے اور عیسائی مذہب مضمحل ہوتا جاتا ہے، اس لئے ان کو اندیشہ تھا کہ انگریزی تعلیم سے جسے وہ قوم میں پھیلانا چاہتے ہیں کہیں ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں بھی نہ پیدا ہوں جیسے یورپ میں عیسائی مذہب کے حق میں پیدا ہوئے ہیں۔''

اس موقع پر اس امر پر توجہ دلانا بے جا نہ ہوگا کہ عقائد، خیالات اور نظریات کا کسی زبان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور ان باتوں پر زبان کا کوئی اثر نہیں ہوتا، اثر ان مضامین اور عبارتوں کا پڑتا ہے جو کسی بھی زبان میں پڑھے اور پڑھائے جاتے ہیں۔ چنانچہ عربی میں جو آج پوری طرح اسلامی زبان ہے عیسائیت پڑھائی جا سکتی ہے۔ فارسی میں ہندوتو اور اردو میں یہودیت کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ اسی طرح انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں میں اسلام کی تعلیم دی جا سکتی ہے۔ لیکن کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فارغ مسلمانوں نے آج تک درسیات پر توجہ نہیں دی۔ جہاں مسلمانوں نے کچھ کالج کھولے ہیں وہاں بھی صیہونیوں، نصرانیوں اور شنویوں کی اپنے نقطۂ نظر سے تیار کردہ درسیات ہی پڑھائی جاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے آج بھی وہی اثرات سامنے آ رہے ہیں جن پر سر سید، اکبر الہ آبادی اور اقبال نے تشویش کا اظہار کیا تھا۔ سر سید احمد خاں ایسٹ انڈیا کمپنی، حکومت برطانیہ اور مشنریز کی

تعلیمی پالیسیوں کے حوالہ سے بہت سی شکایتیں بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ ''ان تمام باتوں سے مسلمان بہ نسبت ہنود کے بہت زیادہ ناراض تھے، اس کا سبب یہ ہے کہ ہندو اپنے مذہب کے احکام بطور رسم و رواج کے ادا کرتے ہیں نہ کہ بطور احکام مذہب کے، ان کو اپنے مذہب کے احکام اور عقائد کی باتیں جن پر نجات عاقبت کی موافق ان کے مذہب کے منحصر ہے مطلق معلوم نہیں ہیں اور نہ وہ ان کے برتاؤ میں ہیں اس سبب سے وہ مذہب میں نہایت سست ہیں اور بجز ان رسمی باتوں کے اور کھانے پینے کے پرہیز کے اور کسی مذہبی عقیدے میں پختہ اور متعصب نہیں ہیں۔ ان کے سامنے ان کے اس عقیدے کے، جس کو دل میں اعتقاد جانتے ہیں، برخلاف باتیں ہوا کریں ان کو کچھ غصہ یا رنج نہیں آتا برخلاف مسلمانوں کے وہ اپنے مذہب کے عقائد کے بموجب جو باتیں ان کے مذہب میں نجات دلانے والی اور عذاب میں ڈالنے والی ہیں بخوبی جانتے ہیں اور ان احکام کو مذہبی احکام اور خدا کی طرف کے احکام سمجھ کر کرتے ہیں۔ اسی سب سے اپنے مذہب میں پختہ اور متعصب ہیں ان وجوہات سے مسلمان زیادہ تر ناراض ہیں۔'' (اسباب بغاوت ہند)

سید طفیل احمد منگلوری علیگ لکھتے ہیں:

''سب سے زیادہ مخالفت سرسید کی اس وجہ سے ہوئی کہ خود سرسید نے عربی مدارس کی تعلیم پر سخت حملے کئے تھے۔ ان میں سے بعض مدارس تو بہت زیادہ پرانے تھے اور بعض علی گڑھ تحریک شروع ہونے سے کئی سال قبل جاری ہوئے تھے، ان مدارس میں بالعموم غیر مستطیع طلبا پڑھتے تھے جو انگریزی تعلیم کے اخراجات کے متحمل نہ ہو سکتے تھے اور نہ ان مدارس کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ وہ قوم کے بچوں کی انگریزی تعلیم میں مانع یا حارج ہوتی۔ مگر باوجود اس کے سرسید نے اپنی تعلیمی تحریک کی ابتدا میں قدیم عربی مدارس کے خلاف مختلف عنوانات سے لکھا، انہوں نے مسجدوں، کنوؤں، پلوں اور مہمان سراؤں کی تعمیر کے نام سے کئے جانے والے کاموں کا مذاق اڑایا۔ وہ عربی مدارس پر کئے جانے والے اخراجات کو نقش برآب اور نہایت حقیر خصلت قرار دیتے تھے۔ جامع مسجد دہلی کی مرمت اور عربی مدارس کے قیام کی تضحیک کرتے ہوئے ثواب، بہشت، جنت کے حور و غلمان، باغ، میوہ اور نہروں کی امید کو خود غرضی، دھوکہ اور گدھے کا کھایا کھیت پاپ نہ پن جیسے الفاظ استعمال کئے۔ سرسید کی طرف سے اپنے عقائد کی تشہیر و اشاعت اور ان کی اس قسم کی

تحریروں سے مسلمانوں نے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالا کہ جس قسم کی مذہبی تعلیم علی گڑھ میں دی جائے گی وہ سرسید کے ان عقائد کے مطابق ہی ہوگی اور مروجہ مذہبی تعلیم سے مختلف ہوگی، اس لیے ان کی اور بھی زیادہ مخالفت ہوئی اور اس وقت کے علماء اھون البلیتین کے اصول کے پیش نظر اس بات پر راضی تھے کہ سرکاری مدارس کی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم کا انتظام کر دیا جائے اور اس طرح مسلمانوں کو انگریزی پڑھائی جائے۔ چنانچہ مولوی عبدالحق صاحب مفسر دہلوی نے لکھا تھا۔

''مسلمانوں کے لیے جداگانہ کالج بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ لڑکوں کو سرکاری مدارس میں داخل کر کے ان کی مذہبی تعلیم کا انتظام اپنی طرف سے کیا جائے۔ اس پر ردعمل میں سرسید نے ایک مضمون ''قدیم مذہبی تعلیم سے لامذہبیت پیدا ہوگی'' کے عنوان کے تحت اس طرح لکھا:

بڑے بڑے معمم و مشمل قدوسی عالموں نے بہت غور کے ساتھ یہ تجویز کی کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور کتب درسیہ عقائد اور فقہ و اصول و تفسیر و حدیث و علم کلام بھی انگریزی کے ساتھ پڑھائے جائیں تاکہ عقائد مذہبی پختہ و درست رہیں، مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ محققانہ تعلیم مذہبی اصول فقہ واقعیہ پر بلاشبہ مانع نقصان عقائد فقہ اسلامیہ کے ہوگی، مگر تقصیر معاف ہو یہ اندھی تقلیدی تعلیم مذہبی تو مانع نقصان عقائد نہیں ہو سکتی اور یہ کتب درسیہ مذہبیہ تو لامذہبی کا علاج نہیں کر سکتیں بلکہ اگر یہ کتابیں انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے ساتھ پڑھائی جاویں گی تو اور زیادہ لامذہبی اور بداعتقادی پھیلے گی۔

شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''لوگوں کا خیال تھا کہ سرسید اپنے مدرسہ میں ان عقائد کی تبلیغ کریں گے جن کا اظہار وہ اپنے رسائل و کتابوں میں کر رہے تھے اور ان کی تصانیف میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی تھیں جن سے مخالف ہی نہیں بلکہ ان کے موافق بھی بدظن ہو جاتے تھے، ان کے خیالات اور عقائد کو عام مسلمان تفہیم اسلامی کے خلاف اور ملحدانہ سمجھتے تھے، جبکہ سرسید ان پر اصرار کرتے تھے اور انہوں نے اپنے وقت کا بڑا حصہ ان عقائد و خیالات کی تفصیل میں صرف کیا ہے، ایسے میں ان عقائد و خیالات کی مخالفت لازمی تھی۔''

دلچسپ بات یہ ہے کہ آج عام طور سے ہمارے دانشور یہ سمجھتے ہیں کہ سرسید کی مخالفت ان

دقیانوسی علمانے کی جو ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے تھے اور سرکار انگلشیہ کے مخالف تھے جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے حق پسند علمانے سرسید یا کسی اور کی انگریزی تعلیم کی تحریک کی کبھی مخالفت نہیں کی، جن لوگوں نے سرسید کی تعلیم کی تحریک اور مولوی سمیع اللہ کے مدرسۃ العلوم کو اینگلو محمڈن اورینٹل کالج میں بدلنے کی مخالفت کی وہ دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے یا ہندوستان کو دارالحرب قرار دینے والے مولوی نہیں خود سرسید احمد خاں کے طبقہ سے تعلق رکھنے والے مولوی امداد العلی ڈپٹی کلکٹر اور مولوی علی بخش سب جج یعنی سرکار انگلشیہ کے وفادار، نمک خوار اور معزز افسر تھے۔

اصحاب علم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس زمانہ کے تعلیمی نظام اور نصاب سے فارغ ہونے والا ہر شخص مولوی کہلاتا تھا اسی لیے خود سرسید احمد خاں کو بھی مولوی کہا جاتا تھا، کیونکہ انہوں نے بھی دلی کے اسی مدرسہ غازی الدین میں تعلیم حاصل کی تھی جسے نظام الملک آصف جاہ اول کے جدامجد غازی الدین فیروز جنگ اول نے اجمیری گیٹ سے متصل قائم کیا تھا اور جہاں سے ہمارے بہت سے بزرگ علما: مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد یعقوب نانوتوی، مولانا محمد احسن نانوتوی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی، مولانا فضل الرحمٰن دیوبندی وغیرہ نے تعلیم حاصل کی تھی اور جہاں مولانا مملوک علی صدر المدرسین رہے ہیں چنانچہ الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں وغیرہ سب انہی کے شاگرد تھے۔

خود سرسید کے سوانح نگار الطاف حسین حالی نے حیات جاوید میں لکھا ہے کہ:

''ہندوستان میں جس قدر مخالفتیں اطراف وجوانب سے ہوئیں ان کا منبع انہی دونوں صاحبوں کی تحریریں تھیں اور ان کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت مخالف تھے۔ چنانچہ خود سرسید نے اپنے بعض مضامین میں علی گڑھ کے کلکٹر اور صوبہ کے ڈائریکٹر محکمہ تعلیم کو مدرسۃ العلوم کا مخالف قرار دیا ہے۔ ان انگریزوں میں سے بعض کے ساتھ مذکورہ دونوں معزز جج وکلکٹر صاحبان کو خاص تعلق تھا، اس لئے سرسید کی مخالفت کو انہوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سرخروئی کا سمجھا۔''

الغرض سرسید کے عقیدوں اور خیالات کی وجہ سے ہی مدرسۃ العلوم کی شروع میں مخالفت ہوئی تھی، ورنہ علماء حق نے تو ہمیشہ حالات کی نبض پر انتہائی دانش مندی کے ساتھ نظر رکھی ہے۔ یہاں تک کہ جب شدھی تحریک کے علمبرداروں نے اسلام کے خلاف جارحانہ انداز میں رکیک حملوں کا سلسلہ شروع کیا تو اپنے دفاع کے ساتھ ساتھ الزامی اور ترکی بہ ترکی جواب کے لئے علما نے ویدوں کے مطالعہ کا بھی فیصلہ کیا۔ اتنا ہی نہیں ان کی زبان سنسکرت کو سیکھنے کے لئے اپنے یہاں کے تین فارغین کو دارالعلوم کے خرچ اور ذمہ داری پر کلکتہ تک بھیجا جن میں ایک تاریخ دارالعلوم کے مصنف جناب سید محبوب رضوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے۔ اسی طرح جب سرسید نے اینگلو محمڈن اورینٹل کالج میں اپنے مخصوص عقیدوں کی تبلیغ واشاعت نہ کرنے کا یقین دلایا تو علما نے بھی کالج میں تعاون دینا شروع کر دیا۔

خود حیات جاوید میں الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ سرسید نے علما سے التجا کی کہ ''مدرسۃ العلوم کی مذہبی تعلیم جس میں میری مداخلت سے آپ کو اندیشہ ہے اس کا انتظام اور اہتمام آپ اپنے ہاتھوں میں لے لیجئے میں اس میں کسی طرح کی شرکت نہیں چاہتا'' تو اس اپیل پر یہ جواب ملا تھا کہ ''آپ اور آپ کی کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کی امور مذہبی میں مداخلت نہ ہو بلکہ مذہبی تعلیم کے واسطے ایک اور کمیٹی مقرر کی جائے جس کے وہی لوگ ممبر ہوں جن پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہو۔''

مسلمانوں کا روشن مستقبل کے مصنف سید طفیل احمد منگلوری علیگ لکھتے ہیں کہ:

جب مولانا قاسم نانوتوی سے کہا گیا کہ وہ مجوزہ مدرسہ میں دینیات کی تعلیم کا اپنی مرضی سے انتظام کریں تو انہوں نے جواب دیا تھا کہ پہلے سرسید اس مدرسہ کے کاموں سے دستبردار ہو جائیں اس کے بعد ہی مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ اس پر سرسید نے یہ کیا کہ جو کمیٹی دینیات کی بنائی گئی اس کے ممبر خود نہیں ہوئے۔

سرسید کے یہ راستہ اپنانے پر مولانا قاسم نانوتوی کے داماد مولانا عبداللہ انصاری کو ناظم دینیات کے طور پر بھیجا گیا، مولانا عبداللہ کے لیے خود سرسید نے سفارشی خط لکھا تھا، اس خط سے علماء دیوبند کے بارے میں ان کے خیالات ونظریات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے لکھا تھا:

''مولوی عبداللہ فرزند ہیں مولوی انصار علی صاحب کے،نواسے ہیں مولوی مملوک علی صاحب کے اور داماد ہیں مولوی محمد قاسم صاحب کے اور ان کے سب بزرگوں سے مجھے ذاتی واقفیت تھی اور امید ہے کہ ان بزرگوں کی صحبت کے فیض سے مولوی عبداللہ صاحب کی بھی ایسی ہی طبیعت ہے کہ دینی کاموں کو بہ لحاظ دین اور بہ لحاظ اسلام انجام دیں اور اس لحاظ سے میں ان کا مدرسہ میں تشریف لانا اور رہنا باعث خیر و برکت سمجھتا ہوں۔''

مولانا نانوتوی اور سرسید احمد خاں کے درمیان بعض دینی خیالات اور رجحانات کے متعلق بعد المشرقین تھا لیکن ذاتی طور پر دونوں ایک دوسرے کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے اور عقیدت مندی اور محبت کا اظہار کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ان دونوں مخلص اور بے لوث ہمدرد و خیر خواہوں کے مذہبی اختلافات کو خصوصاً آج کل کے دانشوروں نے ایک نیا ہی رنگ دے دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ لوگوں نے سرسید کی مخالفت کی لیکن ان مخالفین کے نام تاریخ کے اوراق میں دفن ہو کر رہ گئے اور ان کے اوپر دھول کی دبیز تہہ جم گئی، جبکہ حالات کی ستم ظریفی کہ چونکہ بار بار یہ بات سامنے آتی رہی کہ ''مولویوں نے سرسید احمد خاں کی مخالفت کی تھی، ایسے میں ہمارے دانشور جب یہ دیکھتے ہیں کہ سرسید کے زمانہ میں مولانا قاسم نانوتوی نے دارالعلوم دیوبند قائم کیا تھا تو فوراً نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ مولانا نانوتوی نے ہی سرسید کی انگریزی تحریک کی مخالفت کی تھی۔

حالانکہ الامام مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید احمد خاں کے آپسی تعلقات کا پتہ خود ان دونوں کی تحریروں سے آسانی سے چل جاتا ہے۔ یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے کو کس نظر سے دیکھتے تھے اس کو سمجھنے کے لئے ان کی آپس میں ہونے والی خط و کتابت بھی مددگار ثابت ہوتی ہے جو ''تصفیۃ العقائد'' کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ سرسید نے اپنے ایک دوست پیر جی منشی محمد عارف کو ایک خط میں لکھا تھا۔

''اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو یہ میری سعادت ہے۔ میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا۔''

اور جواب میں حضرت نانوتوی نے اولاً پیر جی منشی محمد عارف صاحب ہی کو لکھا تھا:

اس میں کچھ شک نہیں کہ سنی سنائی سید صاحب کی اولوالعزمی اور دردمندئ اہل اسلام کا معتقد ہوں اور اس وجہ سے ان کی نسبت اظہار محبت کروں تو بجا ہے، مگر اتنا یا اس سے زیادہ ان کے فساد عقائد کو سن سن کر ان کا شاکی اور ان کی طرف سے رنجیدہ خاطر ہوں۔ مجھ کو ان کی کمال دانش سے یہ امید تھی کہ میرے اس رنج کو ثمرہ محبت سمجھ کر تہہ دل سے اپنے اقوال میں مجھ سے استفسار کریں گے۔

مولانا نانوتوی کو سرسید کس نظر سے دیکھتے تھے اس کا بھرپور اظہار انہوں نے مولانا کی وفات پر لکھے ہوئے اپنے تعزیتی مضمون میں بخوبی کر دیا ہے۔ یہ مضمون سرسید احمد خاں نے اپنے رسالہ تہذیب الاخلاق میں لکھا تھا جو علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۳۰/اپریل ۱۹۸۰ء کے شمارہ میں بھی شائع ہوا تھا۔ اس مضمون سے جہاں مولانا نانوتوی کی بے شمار خوبیوں پر روشنی پڑتی ہے، ان کے علم وعمل، خداترسی، تقوی اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ خود سرسید کی انصاف پسندی اور صاف دلی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ کسی ایسے شخص کی رائے اپنے ایسے معاصر کے بارے میں جو اس کے عقائد نظریات اور رجحانات سے سخت اختلاف رکھتا ہو ظاہر ہے کہ بے لاگ حیثیت ہی کی حامل ہوگی۔ یہ بات تو بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ وہ رائے عقیدت مندی کی مبالغہ آرائی اور تعریف وستائش سے بالکل ہی پاک ہوگی۔

سرسید نے لکھا تھا:

''افسوس ہے کہ جناب ممدوح مولوی محمد قاسم نے ۱۵/اپریل ۱۸۸۰ء کو ضیق النفس کی بیماری میں بمقام دیوبند انتقال فرمایا۔ زمانہ بہتوں کو رویا اور آئندہ بھی بہتوں کو روئے گا لیکن ایسے شخص کے لیے رونا جس کے بعد اس کا کوئی جانشین نظر نہ آئے نہایت رنج اور غم وافسوس کا باعث ہوتا ہے۔

ایک زمانہ تھا کہ دہلی کے علما میں سے بعض لوگ جیسے کہ اپنے علم وفضل اور تقوی وورع میں معروف ومشہور تھے ویسے ہی نیک مزاجی اور سادہ وضعی اور مسکینی میں بے مثل تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بعد جناب مولوی محمد اسحٰق کے کوئی شخص ان کی مثل ان تمام صفات میں پیدا ہونے والا نہیں ہے، مگر مولوی محمد قاسم صاحب نے اپنی کمال نیکی اور دین داری اور تقویٰ وورع اور مسکینی سے ثابت کر دیا کہ اس دلی کی تعلیم وتربیت کی بدولت مولوی محمد اسحٰق کی مثل اور شخص کو بھی خدا نے پیدا کیا ہے بلکہ چند باتوں میں ان سے زیادہ۔

بہت لوگ زندہ ہیں جنہوں نے مولوی محمد قاسم کو نہایت کم عمر میں دلی میں تعلیم پاتے دیکھا ہے انہوں نے جناب مولوی مملوک علی سے تمام کتابیں پڑھی تھیں۔ ابتدا ہی سے آثار تقوی اور ورع اور نیک بختی اور خدا پرستی کے، ان کے اوضاع اور اطوار سے نمایاں تھے اور یہ شعر ان کے حق میں بالکل صادق تھا:

بالائے سرش ز ہوش مندی　　　　می تافت ستارۂ بلندی

زمانۂ تحصیل علم میں جیسے کہ وہ ذہانت اور عالی دماغی اور فہم و فراست میں معروف و مشہور تھے ویسے ہی نیکی اور خدا پرستی میں بھی زبان زد اہل فضل و کمال تھے۔ ان کو جناب مولوی مظفر حسین صاحب کی صحبت نے اتباع سنت پر بہت زیادہ راغب کر دیا تھا اور حاجی امداد اللہ کے فیض صحبت نے ان کے دل کو ایک نہایت اعلیٰ رتبہ کا دل بنا دیا تھا۔ خود بھی پابند شریعت و سنت تھے اور لوگوں کو بھی پابند شریعت و سنت کرنے میں زائد از حد کوشش کرتے تھے، بایں ہمہ عام مسلمانوں کی بھلائی کا بھی ان کو خیال تھا۔ انہی کی کوششوں سے علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے نہایت مفید مدرسہ دیوبند میں قائم ہوا اور نہایت عمدہ مسجد بنائی گئی۔ علاوہ اس کے اور چند مقامات میں بھی ان کی سعی اور کوشش سے مسلمانی مدرسے قائم ہوئے۔ وہ کچھ خواہش پیر و مرشد بننے کی نہیں کرتے تھے لیکن ہندوستان میں اور خصوصاً اضلاع شمال و مغرب میں ہزارہا آدمی ان کے معتقد تھے اور ان کو پیشوا اور مقتدا جانتے تھے۔

مسائل خلافیہ میں بعض لوگ ان سے ناراض تھے اور بعضوں سے وہ ناراض تھے، مگر جہاں تک ہماری سمجھ ہے ہم مولوی محمد قاسم کے کسی فعل کو خواہ کسی سے خوشی کا ہو یا ناخوشی کا کسی طرح ہوا سے نفسانی یا ضد اور عداوت پر محمول نہیں کر سکتے، ان کے تمام کام اور افعال جس قدر کہ تھے بلاشبہ للّٰہیت اور ثواب آخرت کی نظر سے تھے اور جس بات کو وہ حق اور سچ کہتے تھے اس کی پیروی کرتے تھے، ان کا کسی سے ناراض ہونا صرف خدا کے واسطے تھا اور کسی سے خوش ہونا بھی صرف خدا کے واسطے تھا، کسی شخص کو مولوی محمد قاسم اپنے ذاتی تعلقات کے سبب اچھا یا برا نہیں جانتے تھے بلکہ صرف اس خیال سے کہ وہ برے کام کرتا ہے یا بری بات کہتا ہے خدا کے واسطے جانتے تھے، مسئلہ حب للہ اور بغض للہ کا خاص ان کے برتاؤ میں تھا۔ ان کی تمام خصلتیں فرشتوں کی سی خصلتیں تھیں، ہم اپنے دل سے ان کے ساتھ محبت رکھتے تھے اور ایسا شخص جس نے ایسی نیکی سے اپنی

زندگی بسر کی ہو بلاشبہ نہایت محبت کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں سب لوگ تسلیم کرتے ہیں اور شاید وہ لوگ بھی جو ان سے بعض مسائل میں اختلاف کرتے تھے تسلیم کرتے ہوں گے کہ مولوی محمد قاسم اس دنیا میں بے مثل تھے، ان کا پایہ اس زمانہ میں شاید معلومات علمی میں شاہ عبدالعزیز سے کچھ کم ہو الاّ یہ اور تمام باتوں میں ان سے بڑھ کر تھا۔ مسکینی، نیکی اور سادہ مزاجی میں اگر ان کا پایہ مولوی محمد اسحٰق سے بڑھ کر نہ تھا تو کم بھی نہ تھا وہ درحقیقت فرشتہ سیرت اور ملکوتی خصلت کے شخص تھے اور ایسے شخص کے وجود سے زمانہ کا خالی ہو جانا ان لوگوں کے لیے جو ان کے بعد زندہ ہیں نہایت رنج اور افسوس کا باعث ہے۔

افسوس ہے کہ ہماری قوم بہ نسبت اس کے کہ عملی طور پر کوئی کام کرے زبانی عقیدت اور ارادت بہت زیادہ ظاہر کرتی ہے۔ ہماری قوم کے لوگوں کا یہ کام نہیں کہ ایسے شخص کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد صرف چند کلمے حسرت وافسوس کے کہہ کر خاموش ہو جائیں یا چند آنسو آنکھ سے بہا کر یا رومال سے پونچھ کر صاف کر لیں بلکہ ان کا فرض ہے کہ ایسے شخص کی یادگار کو قائم رکھیں۔ دیوبند کا مدرسہ ان کی ایک نہایت عمدہ یادگار ہے اور سب لوگوں کا فرض ہے کہ ایسی کوشش کریں کہ وہ مدرسہ قائم اور مستقل رہے اور اس کے ذریعہ سے تمام قوم کے دل پر ان کی یادگاری کا نقش جما رہے''۔

مقام شکر ہے کہ سرسید کی نصیحتوں پر مولانا نانوتوی کے معتقدین نے مثالی انداز میں عمل کیا اور نہ صرف علوم دینیہ کی تعلیم کے لیے دیوبند میں قائم کیے ہوئے ان کے مدرسہ کو ترقی دے کر ایشیا کی سب سے بڑی دینی درسگاہ ازہر ایشیا دارالعلوم دیوبند بنا دیا بلکہ دیوبند سے نکلنے والے ہر فرد نے ایک نیا دیوبند قائم کرنے کو اپنا مقصد حیات قرار دیا جس سے گاؤں گاؤں اور گلی گلی میں مدرسوں کا جال پھیل گیا ہے۔ علما اور ان کے قائم کردہ دینی مدرسوں کے بارے میں یقیناً بہت سی شکایتیں ہوسکتی ہیں اس کے باوجود اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان مولویوں اور حافظوں کو جو کچھ آتا ہے اور جو کچھ ان کے اختیار میں ہے وہ اس کو انجام دے رہے ہیں۔ ٹیکنالوجی، بائیولوجی، کمپیوٹر، سائنس، کامرس اور دوسرے عصری علوم وہ خود نہیں جانتے، ایسے میں ان سے ان علوم کی تدریس و تعلیم کی توقع رکھنا بہت بڑی نادانی ہے۔

اس کے برعکس سرسید کے نام لیواؤں نے خود ان کے الفاظ میں ''بہ نسبت اس کے کہ عملی طور

پر کوئی کام کرتے زبانی عقیدت اور ارادت بہت ظاہر کی ہے۔'' چنانچہ آج عصری علوم کے میدان میں مسلمانوں کی حالت نہایت خستہ اور پسماندہ ہے، اگر جدید علوم کے ماہرین سرسید احمد خاں سے سچی محبت اور دلی وابستگی رکھتے ہیں تو اس کا تقاضہ یہ ہے کہ سرسید نے جو راستہ دکھایا ہے، جو مشن دیا ہے اس کو اختیار کرتے ہوئے ہر ہر گلی اور ہر ہر محلّہ میں ایسے اسکول اور کالج قائم کئے جائیں جن میں تعلیم حاصل کرنے والے عصری علوم کے مختلف میدانوں میں بلند مقام حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب پر پوری طرح فخر کرتے ہوں، وہ اپنے مذہب کے اصول وفروع، اپنے قومی احساسات اور اسلامی فرائض کو اس طرح اپنائیں کہ وہ سرسید کے دیکھے ہوئے خواب کی سچی تعبیر بن جائیں کہ ان کے ایک ہاتھ میں جدید علوم ہوں، دوسرے ہاتھ میں قرآن کریم ہو اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج ہو۔

اختتامیہ

مولانا عبدالقادر شمس قاسمی*

رپورٹ

الامام محمد قاسم النانوتویؒ سیمینار

۲۰ تا ۲۲؍مئی ۲۰۰۰ء کو نئی دہلی میں انیسویں صدی میں علمی و دینی تحریک برپا کرنے والی عظیم شخصیت، دارالعلوم دیوبند کے بانی حجۃ الاسلام امام محمد قاسم نانوتویؒ کی حیات وخدمات کو اجاگر کرنے اور ان کے افکار ونظریات سے اکیسویں صدی کو مستفید کرنے کے لیے ایک عظیم الشان سہ روزہ سیمینار منعقد ہوا جس میں ملک کے ممتاز علما، مختلف جماعتوں اور تنظیموں کے سربراہان اور ملی قائدین و دانشوران نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ سیمینار کا اہتمام ''تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند'' نے کیا تھا۔

الامام محمد قاسم النانوتویؒ سیمینار کا افتتاحی اجلاس نئی دہلی کے تال کٹورا انڈور اسٹیڈیم میں نہایت شان وشوکت کے ساتھ منعقد ہوا۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے اسٹیڈیم میں طلبا بھی تھے، اساتذہ بھی اور تحریک دیوبند سے والہانہ اور جذباتی وابستگی رکھنے والے ہزاروں فرزندانِ توحید بھی، جو ملک کی مختلف ریاستوں اور اترپردیش کے مختلف اضلاع سے بسوں، کاروں اور ریل گاڑیوں سے آئے تھے۔ ساتھ ہی ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ذرائع ابلاغ کے مختلف شعبوں کے نمائندے کثیر تعداد میں موجود تھے۔ اس باوقار اجلاس کو پر رونق اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے ملک کی ممتاز شخصیتیں اسٹیج پر جلوہ افروز تھیں۔

اجلاس کی صدارت دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن اور بہار واڑیسہ کے امیر شریعت مولانا سید نظام الدین صاحب نے فرمائی جب کہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے شیخ عبدالرحمٰن ناصر العوہلی سفیر سعودی عرب برائے ہند، جلوہ افروز تھے۔ اجلاس کا باضابطہ آغاز دارالعلوم دیوبند کے استاذ وسابق صدر شعبۂ تجوید قاری ابوالحسن اعظمی کی تلاوت قرآن سے ہوا، اس کے بعد مولانا محمد عبداللہ مغیثی (صدر مجلس استقبالیہ) نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ خطبہ استقبالیہ میں مولانا مغیثی نے کہا کہ ''آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل جن حالات میں امام محمد قاسم نانوتوی نے تحریک دیوبند کی بنیاد ڈالی تھی، جس

* سب ایڈیٹر ''عالمی سہارا''

نے احیائے امت اور احیائے اسلام کے ساتھ ساتھ برصغیر ہند کے مسلمانوں کی اسلامی شناخت کو باقی رکھنے میں ایک کلیدی کردار ادا کیا، آثار بتا رہے ہیں کہ ہم پھر کچھ اسی قسم کے تشویش ناک حالات سے دوچار ہونے والے ہیں۔ آج پھر ہماری شریعت، ہماری عبادت گاہیں اور ہمارے مدارس و مکاتب نشانے پر ہیں، حالات کا تقاضا ہے کہ ہم منصوبہ بند طریقے پر درپیش مسائل و خطرات کا مقابلہ کریں اور بانیٔ تحریک دیوبند کے کارناموں کا بھی مطالعہ کریں جنھوں نے ڈیڑھ سو سال پیشتر آج سے زیادہ تشویش ناک حالات و خطرات میں گھرے برصغیر کے مسلمانوں کی کامیاب رہنمائی کی تھی''۔

شیخ عبدالرحمٰن ناصر العوہلی نے اپنے خطاب میں امام محمد قاسم نانوتویؒ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ: انھوں نے اپنے قافلۂ سخت جاں کے جاں نثار ساتھیوں اور تلامذہ کے ساتھ مل کر اس ملک میں اسلامی تشخص کی حفاظت و بقا اور ہندوستانی مسلمانوں کا اپنے ایمان و عقائد سے رشتہ استوار و برقرار رکھنے اور اسلام مخالف رجحانات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے ایسے وقت میں جدوجہد کی جو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک نازک اور مشکل دور تھا۔ انھوں نے کہا کہ اسلام مخالف قوتوں کا مقصد اسلام کی روشن اور صاف شفاف تصویر کو داغدار کرنا ہے، آج اسلام کو تعصب، تشدد اور دہشت گردی سے جوڑنے کی مہم جاری ہے۔ ان حالات میں علما و مفکرین کی ذمہ داریاں مزید بڑھ جاتی ہیں۔

سعودی سفیر کی تقریر کا ترجمہ و خلاصہ نہایت بلیغ و پُر اثر انداز میں مولانا فصیح الدین دہلوی نے پیش کیا۔ وقف دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا محمد سالم قاسمی نے اپنے خطبہ افتتاحیہ میں فرمایا کہ: ۱۳۴ ربرس قبل امام نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کی شکل میں ایک تعلیمی تحریک کی بنیاد رکھی تھی جس کی روشنی آج پورے عالم کو منور کر رہی ہے۔ انھوں نے اپیل کی کہ امام نانوتویؒ کی دینی و تعلیمی تحریک کے نتیجہ میں مدارس و مکاتب کا جو جال نظر آ رہا ہے، اس کا تحفظ اور استحکام آج کی اولین ضرورت ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا محمد سلمان الحسینی ندوی نے اپنی پر جوش تقریر میں کہا کہ: امام محمد قاسم نانوتویؒ دنیا کی وہ عظیم ہستی تھی جس نے ایک صدی کی تعمیر کی ہے اور ایک عہد کو شعور و فکر اور علم و آگہی سے نوازا ہے۔ وقف دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید انظر شاہ

مسعودی کشمیری نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں تحریک دیو بند کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ: حضرت نانوتوی باشعور، وقت شناس اور بابصیرت عالم دین تھے۔ ماہنامہ الفرقان کے مدیر مولانا خلیل الرحمٰن سجاد ندوی نے بھی دور حاضر کے چیلنجوں اور علما کی ذمہ داریوں کے موضوع پر نہایت فکر انگیز خطاب فرمایا۔

صدارتی کلمات پیش کرتے ہوئے مولانا سید نظام الدین نے فرمایا کہ امام محمد قاسم نانوتویؒ نے قانونِ شریعت کے تحفظ اور مسلمانوں کے اندر اسلامی تعلیمات کی روح پیدا کرنے اور تنظیم واتحاد کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے دعوت وتبلیغ اور وعظ ونصیحت کی مجلسیں منعقد کیں، نیز شعائرِ اسلام کے تحفظ اور عیسائی پادریوں کی طرف سے اسلام کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور حملوں کا مومنانہ فراست کے ساتھ مقابلہ کیا۔ موجودہ حالات میں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم امام نانوتوی کے علمی وفکری سرمایے کو نئے انداز واسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کریں۔

افتتاحی اجلاس کو جن ممتاز علما اور دانشوروں نے خطاب کیا ان میں جماعت اسلامی کے نائب صدر مولانا شفیع مونس، جمعیۃ اہل حدیث کے جنرل سکریٹری مولانا عبدالوہاب خلجی، مسلم پرسنل لا بورڈ کے سکریٹری اور خانقاہ رحمانی مونگیر کے سجادہ نشیں مولانا سید محمد ولی رحمانی، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ تفسیر وحدیث مولانا برہان الدین سنبھلی، جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر سراج حسین، موسیٰ رضا، ڈاکٹر سید فاروق احمد، مشہور صحافی جناب شاہد صدیقی، تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے صدر مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جب کہ مولانا وحید الدین خاں، مولانا محمد اخلاق حسین قاسمی دہلوی، مولانا سید احمد ہاشمی، سید شاہد مہدی وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ، مولانا نور عالم خلیل الامینی، مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی، مولانا عمید الزماں کیرانوی، مولانا خالد ندوی ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا سید ساجد میاں، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی دہلوی (دہلی یونیورسٹی)، محمد آصف صدیقی، مولانا فضیل احمد قاسمی، مولانا منظور احمد سابق سکریٹری اردو اکیڈمی بہار واڑیسہ، مولانا سعید احمد قاسمی کشمیری، مولانا معین الدین قاسمی ناندیڑ مہاراشٹر، مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی اورنگ آباد مہاراشٹر، مفتی مجد القدوس خبیب رومی، مولانا عبداللہ الحسنی، مصری سفارت خانہ کے اول سکریٹری ولید المنوفی، افغان سفارت خانہ کے نائب سفیر فضل الرحمٰن فاضل، عراق کے اول سکریٹری محسن ہادی،

لیبیا سفارت خانہ کے صالح محمد الحسنی، ڈاکٹر معین الدین بقائی، کمال فاروقی، مولانا آس محمد گلزار قاسمی، مولانا سید عقیل احمد قاسمی اور مولانا یعقوب مظاہری وغیرہ اجلاس میں موجود تھے۔

تنظیم کے تعارف اور افتتاحی اجلاس کی نظامت کے فرائض تنظیم کے ناظم اعلیٰ ڈاکٹر زین الساجدین قاسمی نے انجام دیئے۔ اخیر میں مولانا عبدالستار سلام قاسمی نے ملک وبیرون ملک سے ان مشاہیر کے پیغامات پڑھ کر سنائے جو اس اجلاس میں زبردست خواہش کے باوجود اپنی مجبوریوں کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔ جن میں جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی (پاکستان)، قاری عبداللہ سلیم (امریکہ)، مولانا عبداللہ کاپودروی (کناڈا)، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن)، مولانا یعقوب اسماعیل منشی (برطانیہ)، مولانا عاشق الٰہی بلند شہری (مدینہ منورہ)، مولانا شمشاد احمد قاسمی (جدہ)، مولانا عبدالرحیم قاسمی (دبئی)، مولانا خلیل الرحمٰن راز (دوحہ قطر) وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اخیر میں تنظیم کے کارگزار ناظم اعلیٰ مولانا محمد مزمل الحق الحسینی نے مندوبین اور حاضرینِ اجلاس کا شکریہ ادا کیا۔

اس سیمینار میں "تحریک مدارس" کے موضوع پر تقریر کرنے کے لیے ملک کے مشہور مفکر وعالم مولانا وحید الدین خاں، صدر اسلامی مرکز دہلی کو خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا گیا تھا، موصوف نے اس موضوع پر نہایت قیمتی مقالہ تیار کیا تھا جس کے بارے میں طے پایا تھا کہ یہ مقالہ افتتاحی اجلاس میں بصورت تقریر پیش کیا جائے گا، مگر بعض وجوہات کی بنا پر یہ مقالہ پیش نہ کیا جاسکا۔

سیمینار کا علمی سیشن نہایت پُرسکون وباوقار ماحول کے اندر جامعہ ہمدرد کے کنونشن سنٹر میں ۲۰ رمئی ۲۰۰۰ء کو بعد نماز مغرب شروع ہوا۔ کنونشن ہال جدید سہولیات اور سامان آرائش سے مرصع تھا، جس کا شمار غالباً دہلی کے سب سے اچھے ہالوں میں ہوتا ہے۔

عصر حاضر میں فکر قاسمی کی اہمیت، امام محمد قاسم نانوتوی کی شخصیت کے امتیازی پہلو اور قاسمی فکر وفلسفہ کی خصوصیات جیسے موضوعات پر بیش قیمت مقالے پیش کیے گئے، مقالہ نگاروں نے امام محمد قاسم نانوتویؒ کو اپنے وقت کا عظیم مجاہد، مصلح امت اور اسلامیان ہند کا مسیحا اور امام قرار دیا اور کہا کہ امام نانوتویؒ بیک وقت میدان جنگ کے سپہ سالار بھی تھے، علم ومعرفت کے علم بردار بھی اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ متکلم اسلام اور مکتب ولی اللہی کے سب سے بڑے ترجمان تھے۔ ممتاز علما نے سیمینار کی پہلی، دوسری اور تیسری نشست میں یہ اپیل کی کہ موجودہ حالات میں جہاں اس بات کی ضرورت

ہے کہ ہم امام نانوتویؒ کے علمی وفکری سرمایے کو نئے انداز واسلوب میں دنیا کے سامنے پیش کریں نیز ان کے نقوش علمی اور افکار ونظریات کی ترویج واشاعت کے لیے سرگرم جدوجہد کی شروعات کریں وہیں اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ برادران قاسمی کی اس تحریک کو مضبوط اور مستحکم بنانے کے لیے ہر ممکن تعاون پیش کریں۔

سیمینار کی پہلی نشست مولانا برہان الدین سنبھلی استاذ تفسیر وحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی صدارت میں منعقد ہوئی جب کہ نظامت کے فرائض مولانا عتیق احمد بستوی نے انجام دیئے۔ اس نشست میں امام نانوتوی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مولانا محمد سالم قاسمی مہتمم دارالعلوم وقف دیوبند، ڈاکٹر بدرالدین الحافظ سابق صدر شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی، مولانا محمد اسلم قاسمی دیوبند، سید ولی حسین جعفری لکچرر جامعہ ہمدرد نئی دہلی نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس نشست میں جناب منظور احمد وائس چانسلر امبیڈکر یونیورسٹی آگرہ نے امام نانوتوی کی شخصیت کو انگریز مصنفین کے حوالے سے نہایت پراثر انداز میں پیش کیا۔ اس موقع پر دیوبند سے آئے ہوئے طارق ابن ثاقب نے امام نانوتوی کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔

دوسری نشست کا آغاز ۲۱ رمئی کو حضرت مولانا محمد سالم قاسمی کی صدارت میں ہوا، نظامت کے فرائض مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے انجام دیئے اور مولانا محمد رضوان القاسمی حیدرآباد، مولانا ندیم الواجدی، مولانا عتیق احمد بستوی لکھنؤ، مولانا برہان الدین سنبھلی لکھنؤ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حیدرآباد نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے، اس نشست سے جناب سراج حسین صاحب وائس چانسلر جامعہ ہمدرد نئی دہلی نے بھی خطاب کیا، اس موقع پر مولانا عبدالعزیز ظفر جنکپوری نے نظم پیش کی۔

تیسری نشست مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی مفتیٔ اعظم پنجاب کی صدارت اور مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی کی نظامت میں منعقد ہوئی، اس نشست میں مولانا اسعد اسرائیلی، مولانا اختر امام عادل اور ڈاکٹر عقیدت اللہ قاسمی نے اپنے اپنے مقالات پڑھ کر حاضرین کو مستفیض کیا، جب کہ مولانا مجد القدوس خبیب رومی نے اپنے والد مفتی عبدالقدوس رومی مفتی شہر آگرہ کا مقالہ پڑھ کر سنایا۔ مولانا اسعد اسرائیلی کا مقالہ بے حد پسند کیا گیا۔ ان حضرات کے علاوہ مولانا معین الدین قاسمی، ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی، ڈاکٹر بصیر احمد خاں، مفتی سلیمان ظفر قاسمی، مولانا عبدالعلی فاروقی، مولانا عبدالحفیظ رحمانی، مولانا

نورالحسن راشد کاندھلوی اور مولانا فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی نے بھی اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ ان کے علاوہ قاری عبداللہ سلیم (امریکہ) کا مقالہ ان کے نواسے مولانا یاسر ندیم، مولانا محمد اسلم قاسمی کا مقالہ ان کے صاحبزادے محمد عاصم قاسمی، مولانا بدرالحسن قاسمی (کویت) کا مقالہ مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی اور مولانا ابوالقاسم نعمانی، رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند کا مقالہ مولانا عبدالقدوس قاسمی نیرانوی نے پیش کیا۔

مقالہ لکھنے والوں میں مولانا عاشق الٰہی بلندشہری (مدینہ منورہ)، مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن راز (دوحہ قطر)، مولانا نور عالم خلیل الامینی دارالعلوم دیوبند، مولانا اسیر ادروی، مولانا ابوبکر غازی پوری، مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی، ڈاکٹر شمس تبریز خاں قاسمی، مولانا محبّ الحق امروہہ وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زبردست خواہش اور کوشش کے باوجود حضرت مولانا مفتی مظفر حسین ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اپنی بعض مجبوریوں کی بنا پر سیمینار میں شریک نہ ہوسکے۔ اسی طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی بھی بیرون ملک میں ناسازیٔ طبع کی وجہ سے سیمینار میں شرکت سے معذور رہے۔ البتہ حضرت قاضی صاحب نے اپنا کلیدی خطبہ شرکائے سیمینار کے لیے ارسال کردیا تھا جو قدرے تاخیر سے موصول ہونے کی بنا پر سیمینار میں پڑھا نہ جاسکا۔

چوتھی نشست کی صدارت مولانا محمد رضوان القاسمی حیدرآباد نے کی اور نظامت کے فرائض مولانا ندیم الواجدی نے انجام دیئے، جب کہ اختتامی اجلاس کی صدارت حضرت مولانا محمد ولی رحمانی سجادہ نشیں خانقاہ رحمانی مونگیر نے کی اس نشست میں بعض بڑے اہم علمی مسئلوں پر بحث ہوئی، جن پر صدر اجلاس نے مؤثر تقریر کرتے ہوئے ایسی وضاحت کی جو سبھوں کے لیے قابل قبول تھی، آخر میں انھوں نے کہا کہ علمی معاملات میں غور وفکر سے کام لیا جائے گا، تو الگ الگ رائیں سامنے آئیں گی، یہ اختلاف آراء کثرت علم اور غور وفکر کی علامت ہے، اختلاف رائے سے گھبرانا نہیں چاہیے، یہ وہ اختلاف ہے، جس کے بارے میں فرمایا گیا: اختلاف امتی رحمة ... یہ اختلاف، نفس کے لیے نہیں، اپنی بات پر لوگوں کو اکٹھا کرنے کے لیے نہیں، مخالفت کے لیے نہیں، بلکہ یہ اختلاف تحقیق وجستجو کے نتیجہ میں حقیقت کی تلاش کی وجہ سے ہوا کرتا ہے، جو رحمت کا سبب ہے۔

حضرت امام نانوتویؒ نے اسی لیے اصلاح نفس اور تربیت نفس کی تعلیم دی، انھوں نے ضبط نفس کا مجاہدہ کیا، تاکہ اختلاف اور مخالفت کی سرحدیں واضح رہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا، خدا کی رضا کے لیے کیا، اس لیے نہ ناکامیوں میں دل شکستہ ہوئے، نہ کامیابیوں پر اترائے، بس خدا کی رضا کے لیے پوری زندگی سرگرم سفر رہے، ان کی سیرت وخدمت کی روح یہی ہے کہ راضی برضا ہوکر جینے کا مزہ دیکھ۔ شاملی کا معرکہ کارزار ہو یا اصلاح معاشرہ کی پر مشقت مہم، اصلاح کتب کی محنت ہو، یا دارالعلوم کے قیام کے صبر آزما مرحلے، تربیت نفس کی بات ہو، یا نونہالان امت کے مستقبل کی تعمیر، مشکل حالات اور صبر آزما لمحات میں وہ کبھی خزاں رسیدہ نظر نہیں آئے، ہمیشہ شجر سایہ دار بنے رہے، انھوں نے جس نسل کو تیار کرنے کی کامیاب کوشش کی، اس کا شعار **باللیل رھبان وبالنھار فرسان** (رات میں عابد اور دن میں مجاہد) ہے، وہ آنے والی نسل کو ماضی کے ان اہل علم، باحمیت اور باکردار، بزرگوں کے طرز پر دیکھنا چاہتے تھے، جن کی تصویر علامہ اقبال نے ان لفظوں میں کھینچی ہے:

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے

بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اختتامی اجلاس میں گراں قدر تجاویز منظور کی گئیں۔ امام نانوتوی کے افکار وعلوم کو مختلف زبان اور نئے اسلوب کا پیرہن دینے اور دیگر اکابر دیوبند کی حیات وخدمات پر اس طرح کے سیمینار منعقد کرنے، ان کے افکار ونظریات پر مشتمل کتابوں کی اشاعت، فضلائے دیوبند کو منظم ومربوط کرنے نیز دعوت وتبلیغ کے لیے ذرائع ابلاغ کا استعمال اور انٹرنیٹ پر ایک ویب سائٹ مخصوص کرنے کی تجویزیں بھی منظور کی گئیں۔ ان تجاویز کے علاوہ امام نانوتوی سے منسوب ہر سال دو ایوارڈ دینے کا اعلان، تنظیم ابنائے قدیم کو وسعت وترقی دینے کے لیے فضلائے دیوبند سے رابطہ کی مہم، اترپردیش مذہبی عمارات بل اور قادیانیوں کے بڑھتے قدم کے خلاف ٹھوس جدوجہد سے متعلق تجاویز منظور کرتے ہوئے عملی جدوجہد کے آغاز کا عزم کیا گیا۔

اس سیمینار کی مناسبت سے جامعہ ہمدرد کی ''حکیم محمد سعید نیشنل لائبریری'' میں تحریک دیوبند سے متعلق کتابوں کی ایک نمائش لگائی گئی جس میں شرکائے سیمینار نے شرکت کی۔ اس موقع پر مولانا محمد رضوان القاسمی حیدرآباد کی ادارت میں نکلنے والے سہ ماہی رسالے ''صفا'' کا خصوصی شمارہ بعنوان

''الامام محمد قاسم النانوتوی حیات اور افکار و آثار'' کی رسم رونمائی مولانا محمد سالم قاسمی کے ہاتھوں عمل میں آئی نیز اعلان کیا گیا کہ جلد ہی ''مکتوبات نانوتوی'' کے نام سے امام نانوتوی علیہ الرحمہ کے غیر مطبوعہ مکاتیب کا مجموعہ شائع کیا جائے گا جسے نور الحسن راشد کاندھلوی نے ترتیب دیا ہے۔

سیمینار کی کامیابی پر سیمینار کے داعیان مولانا محمد افضال الحق جوہر قاسمی، مولانا محمد عبداللہ مغیثی، مولانا عمید الزماں کیرانوی، ڈاکٹر قاضی زین الساجدین قاسمی، ڈاکٹر معین الدین بقائی، ڈاکٹر سید فاروق احمد، مولانا بدر الدین الحافظ، مولانا فرید الزماں کیرانوی، مولانا بدر الزماں قاسمی کیرانوی، مولانا محمد مزمل الحق الحسینی، مولانا محمد رضوان القاسمی، مولانا خالد قاسمی، مولانا اسعد الاعظمی، مولانا عبدالستار سلام قاسمی وغیرہ نے مندوبین کا شکریہ ادا کیا جن کے تعاون واشتراک سے اتنا بڑا اور نتیجہ خیز سیمینار کامیاب ہوسکا۔

مولانا محمد اسرار الحق قاسمی اسسٹنٹ سکریٹری جنرل آل انڈیا ملی کونسل، پروفیسر ضیاء الحسن ندوی، ڈاکٹر شفیق احمد ندوی جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر محسن عثمانی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، ڈاکٹر عبدالحی فاروقی جامعہ ہمدرد، ڈاکٹر رضی احمد کمال جامعہ ملیہ اسلامیہ، راحت محمود چودھری، مولانا عبدالرؤف قاسمی اور چودھری اقبال الدین بھی سیمینار کی مختلف نشستوں میں شریک ہوئے۔

اس عظیم الشان اجلاس کو بحسن وخوبی کامیاب بنانے اور اس کی تیاری میں زبردست تعاون دینے والوں میں حکیم عبدالمعید ہمدرد فاؤنڈیشن، پروفیسر ریاض عمر، منصور عثمانی سکریٹری اردو اکیڈمی، سید عارف میاں، انجم عثمانی (دوردرشن)، سید محمد شکیل، مولانا قاری محمد سلیمان قاسمی، مولانا وارث مظہری، مولانا نوشاد عالم قاسمی، انوار الوفا اعظمی، چودھری محمد رفیق قاسمی، شاہد کمال قاسمی، جناب کوثر علی انجینئر، معصوم مرادآبادی، منور حسن کمال، چودھری اقبال الدین، مولانا افتخار حسین قاسمی مدرسہ امینیہ، مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی، مولانا اشفاق احمد قاسمی (قومی آواز)، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی ذاکر باغ، ڈاکٹر محمد ارشد غازی آباد، مولانا محمد ارشد فاروقی اعظمی، مولانا عبدالسمیع اجراڑہ، عبدالقادر شمس قاسمی اسسٹنٹ ایڈیٹر ماہنامہ ملی اتحاد نئی دہلی، حاجی رفیع الدین جعفر آباد، جناب نظام الدین دہلوی کشمیری گیٹ، مولانا انور علی قاسمی، قاری عبدالرحمٰن عابد وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

منظور شدہ تجاویز اور فیصلے

تجویز (۱)

اس اجتماع کا احساس ہے کہ امام محمد قاسم نانوتویؒ کے افکار اور علوم و معارف ایک قیمتی ورثہ ہیں اور موجودہ حالات کے پس منظر میں ان کی بڑی اہمیت ہے۔ اس لئے فرزندانِ دار العلوم کو خصوصاً اور علمائے دین کو عموماً آپ کی تحریروں کو نئی زبان اور نئے اسلوب کا پیرہن دینے میں آگے آنا چاہئے اور تنظیم ابنائے قدیم کو چاہئے کہ ایسی کوششوں کو مربوط کرے اور اس کے لئے ممکن وسائل فراہم کرے۔

تجویز (۲)

یہ سیمینار تنظیم سے درخواست کرتا ہے کہ امام محمد قاسم نانوتویؒ کی طرح دیگر اکابر دار العلوم دیوبند کی حیات اور خدمات اور افکار و تعلیمات پر بھی ملک کے مختلف علاقوں میں سیمینار منعقد کرائے جائیں تا کہ علماء، ارباب دانش اور عام مسلمان ان کے علوم و افکار سے روشنی حاصل کر کے موجودہ حالات میں اسلام کی دعوت و اشاعت اور حمایت و حفاظت کا فریضہ انجام دے سکیں۔

تجویز (۳)

اس بات کی بھی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ طلبۂ مدارس کے سامنے اکابر دیوبند کا تعارف آئے تا کہ وہ اپنے بزرگوں سے فکری، ذہنی اور روحانی طور پر مربوط رہیں۔ اس کے لئے یہ سیمینار سفارش کرتا ہے کہ اکابر دیوبند کی شخصیات اور ان کے بنیادی افکار و تعلیمات پر مشتمل کتابیں تیار کی جائیں تا کہ دینی مدارس کے طلبا اکابر دیوبند کے روشن کارناموں سے واقف ہو سکیں۔

تجویز (۴)

یہ زمانہ ذرائع ابلاغ کا ہے جس کا بہتر مقاصد کے لئے استعمال وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اجتماع کو احساس ہے کہ دوسری قوموں کی طرح ہم ذرائع ابلاغ سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا پا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ضرورت ہے کہ انٹرنیٹ پر تنظیم ابنائے قدیم ایک خصوصی ویب سائٹ حاصل کرے تا کہ اسلامی دعوت و تبلیغ اور اسلامی علوم و فنون کی اشاعت کے لئے اکابر دار العلوم دیوبند کے کارنامے وسیع طور پر دنیا کے سامنے آسکیں۔ شرکائے اجتماع کو احساس ہے کہ دار العلوم دیوبند نے

گزشتہ ۱۴۴سال کی مدت میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے جو تاریخی خدمات انجام دی ہیں، دنیا ان سے صحیح طور پر واقف نہیں ہے، اس لیے وقت کا تقاضا ہے کہ دنیا کو اس سے واقف کرانے کے لیے ہر ممکن ذرائع کا استعمال کیا جائے۔

تجویز (۵)

اللہ کے فضل و کرم سے تنظیم ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند اپنا علمی سفر جاری رکھے ہوئے ہے، یہ تنظیم اپنے قیام کے روز اول ہی سے اس بات کے لئے جدو جہد کر رہی ہے کہ فضلائے دار العلوم دیوبند میں فکر و عمل کی وحدت کے لیے تمام ممکن طریقے بروئے کار لائے جائیں۔ الامام محمد قاسم النانوتویؒ سیمینار کا انعقاد اسی جذبہ سے کیا گیا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے اس سیمینار نے جمود کی برف پگھلا دی ہے اور فضلائے دار العلوم کے دلوں میں ایک نیا جوش بھر دیا ہے تنظیم ابنائے قدیم اس جوش کو تازہ دم رکھنے اور شوقِ علم کو مہمیز کرنے کے لئے ہر سال ''الامام محمد قاسم النانوتویؒ'' کے اسم گرامی سے منسوب دو ایوارڈ دیئے جانے کی تجویز منظور کرتی ہے۔ جن میں سے ہر ایوارڈ کی مالیت سردست پچاس ہزار روپے ہوگی۔ ساتھ ہی ایک توصیفی سند بھی پیش کی جائے گی۔

ان میں سے ایک ایوارڈ ممتاز فضلائے دار العلوم دیوبند کے لئے مخصوص ہوگا۔ جنہوں نے علوم اسلامیہ کی خدمت اور تصنیف و تحقیق کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے ہوں اور دوسرا ایوارڈ ان حضرات کے لیے ہوگا جو اگرچہ دار العلوم دیوبند کے فاضل نہیں ہوں گے، مگر انہوں نے اسلامیات پر کوئی گراں قدر اور ٹھوس علمی کام کیا ہوگا۔ اور ان کا علمی و تحقیقی کام منظر عام پر آ گیا ہوگا۔ یہ ایوارڈ ایسے اصحاب علم کو بھی دیا جا سکتا ہے جنہوں نے کسی اہم اسلامی موضوع پر کوئی وقیع کام کیا ہو اور اسے اصحاب علم و فضل سے بھرپور تحسین و تائید حاصل ہو، اس سلسلہ میں ایک ایوارڈ کمیٹی بنا دی گئی ہے، جس کے کنوینر تنظیم ابنائے قدیم کے نائب صدر مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد ہوں گے۔

تجویز (۶)

سیمینار کا احساس ہے کہ اس وقت ریاست اتر پردیش نے جو مذہبی عبادت گاہ بل منظور کیا ہے اور جس سے ملتا جلتا قانون راجستھان، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش میں پہلے سے موجود ہے۔

وہ ملک کی جمہوری روایات کا قتل اور شہری حقوق سے متعلق دستور میں دی گئی ضمانتوں سے کھلا ہوا انحراف ہے۔ اس لئے حکومت اتر پردیش اس بل کو واپس لے اور راجستھان، مغربی بنگال اور مدھیہ پردیش کی ریاستیں بھی ان قوانین کو منسوخ کریں۔ یوپی بل کے خلاف مسلم تنظیموں کی طرف سے جو تحریکیں چل رہی ہیں تنظیم ابنائے قدیم ان کی حمایت کرتی ہے۔

تجویز (۷)

شرکائے سیمینار کو اس بات کا احساس ہے کہ گذشتہ چند برسوں سے ہندوستان میں قادیانیوں کی سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ وہ مختلف چھوٹے بڑے شہروں، قصبوں اور گاؤں میں خیراتی اداروں، مدرسوں اور مراکز کھول کر اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ کچھ سادہ لوح مسلمان ان کے دام فریب میں گرفتار بھی ہو رہے ہیں۔ اس غرض سے نئی دہلی کے تغلق آباد علاقے میں ایک بڑا مرکزی دفتر بشکل مسجد تعمیر کیا گیا ہے۔

تنظیم عام مسلمانوں اور مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران کو اس طرف توجہ دلاتی ہے کہ جہاں کہیں بھی وہ اس طرح کی سرگرمیاں دیکھیں، مسلمانوں کو آگاہ کریں اور حکمت و تدبر کے ساتھ ان کا مقابلہ کریں۔

تجویز (۸)

یہ اجتماع خواہش کرتا ہے کہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو مضبوط و مستحکم بنانے کے لئے ریاستی، ضلعی اور علاقائی سطح پر منظم کیا جائے نیز بیرون ملک کے فضلاء کو بھی تنظیم کے تحت منظم کیا جائے تاکہ فضلائے دیوبند باہم مربوط ہوں اور وہ زیادہ ارتباط و انضباط کے ساتھ اپنی دینی، اصلاحی اور فکری خدمات انجام دے سکیں اور تنظیم کی توسیع و ترقی کے لئے مفید و معاون ہو سکیں۔

تجویز (۹)

یہ زمانہ تعلیمی پھیلاؤ اور قوموں کے باہمی اختلاط و تعامل کا زمانہ ہے۔ سیمینار کو احساس ہے کہ عصری ضرورتوں کی تکمیل اور دعوت اسلامی کے کام کو وسیع طور پر انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے اسلامی طلبہ عصری علوم سے بھی کسی حد تک واقف ہوں۔ اس لیے یہ سیمینار سفارش کرتا ہے کہ تعلیم کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے۔

(۱) عمومی دینی تعلیم : جس کی ہر مسلمان کو ضرورت ہے اس کے تحت تمام ضروری مضامین: انگریزی، حساب، جغرافیہ، عربی زبان، فارسی زبان، سائنس، معلوماتِ عامہ اور انشاء وغیرہ کی تعلیم دی جائے۔

(۲) خصوصی دینی تعلیم : یعنی وہ اعلیٰ تعلیم جو ہمارے بڑے مدرسوں میں دی جارہی ہے جس کی ضرورت باقاعدہ ماہر عالم دین بننے کے لیے ہے اس ضرورت کے لیے مروج درس نظامی ضروری ترمیمات کے ساتھ بالکل مناسب ہے۔

تجویز تعزیت:

آج کا یہ سیمینار دل کی گہرائیوں سے ملت کے عظیم محسنین اور ارباب علم وفضل کی جدائی پر اپنے رنج وغم کا اظہار کرتا ہے، شرکاء کو احساس ہے کہ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب، مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند، حکیم عبدالحمیدؒ، حضرت مولانا حنیف ملی، مولانا حکیم زماں حسینیؒ جیسی شخصیات اس دنیا میں بار بار پیدا نہیں ہوتیں۔ ہم تمام حاضرین اپنے ان بزرگوں کو بصمیم قلب خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ملت کے ان محسنین کے ساتھ احسان کا معاملہ فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے۔

تجویز تشکر:

الامام محمد قاسم النانوتویؒ سیمینار کے انعقاد پر ہم اپنے معاونین، مندوبین اور کارکنان کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کرتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو جن حضرات نے جس شکل میں بھی اپنے تعاون سے نوازا ہے، ہم شرکائے اجتماع ان سب کا شکریہ ادا کرتے ہیں خاص طور پر ہم جناب مولانا عبداللہ کاپودروی، مقیم کناڈا، جناب مولانا قاری عبداللہ سلیم، مقیم امریکہ، جناب مولانا شمشاد احمد قاسمی، مقیم جدہ، جناب مولانا عبدالرحیم قاسمی، مقیم دبئ، جناب ڈاکٹر سید فاروق احمد چیرمین ہمالیہ ڈرگس کمپنی، جناب ڈاکٹر معین الدین بقائی، جناب حکیم عبدالمعید متولی ہمدرد وقف، جناب سراج حسین وائس چانسلر ہمدرد یونیورسٹی تغلق آباد وغیرہ حضرات کے ممنون و مشکور ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو جزائے خیر دے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کو اپنے ان تمام محسنین کا سرگرم تعاون آئندہ بھی ملتا رہے گا۔

مولانا وارث مظہری

آئینۂ حیات
امام محمد قاسم نانوتویؒ

نام	:	محمد قاسم، تاریخی نام، خورشید حسین
والد کا نام	:	شیخ اسد علیؒ
سن پیدائش	:	۱۲۴۸ بمطابق ۱۸۳۲ یا ۱۸۳۳ء
وطن	:	قصبہ نانوتہ، ضلع سہارنپور یوپی (نانوتہ دہلی سے تقریباً ۱۶۴ کلومیٹر شمال میں واقع ہے)
تعلیم	:	ابتدائی تعلیم، ناظرہ قرآن اور خوش نویسی وغیرہ نانوتہ کے مکتب میں حاصل کی۔ ابتدائی عربی تعلیم (میزان ومنشعب وغیرہ) دیوبند میں مولوی مہتاب علیؒ کے مکتب میں نیز سہارنپور میں مولوی محمد نوازؒ کے مکتب میں حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کا حصول اور اس کی تکمیل دہلی میں ہوئی۔ (حفظ قرآن ۱۸۶۲ء میں حج کے سفر کے دوران کیا)
فراغت	:	۱۲۶۴ یا ۱۲۶۵ھ
مدت تعلیم	:	۵ یا ۶ سال
اساتذہ	:	مولانا مملوک علی نانوتوی، شاہ عبدالغنی مجددی، مفتی صدر الدین، مولانا احمد علی محدث دہلوی وغیرہ۔
تصوف وسلوک کی تعلیم	:	حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ
مشہور رفقا		مولانا ذوالفقار علی دیوبندیؒ، مولانا فضل الرحمٰن عثمانیؒ دیوبند، حضرت حاجی سید محمد عابد حسین دیوبندیؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ، مولانا رفیع الدین عثمانی دیوبندی وغیرہ۔
مشہور تلامذہ	:	مولانا احمد حسن امروہوی، شیخ الہند محمود حسن دیوبندی، مولانا فخر الحسن گنگوہی، مولانا عبدالعلی میرٹھی، مولانا منصور علی خاں حیدرآبادی وغیرہ۔
ذریعۂ معاش	:	کچھ دنوں دہلی کے کسی سرکاری مدرسے میں ملازمت تدریس تصحیح کتب: (الف) مطبع احمدی - دہلی (تا ۱۸۵۷ء) (ب) مطبع مجتبائی میرٹھ (از: ۱۸۶۱ تا ۱۸۶۸ء) (ج) مطبع ہاشمی (د) مطبع مصطفائی - دہلی

نکاح	:	(بہ عمر تقریباً ۲۱ یا ۲۲ سال، اہلیہ: بنت شیخ کرامت حسین (رئیس کبیر دیوبند)
اولاد	:	(لڑکے) محمد احمد، محمد ہاشم، محمد میاں، (لڑکیاں) اکرام النساء، رقیہ، خدیجہ، مریم، عائشہ (ان کے علاوہ دو اور لڑکیاں بھی ہیں جن کا نام معلوم نہیں)
اصلاح معاشرہ کی کوشش	:	اصلاح افکار وعقائد احیائے عقد بیوگان، لڑکیوں کے حق وراثت کا احیاء دیوبند سے تعزیہ داری کی رسم کا خاتمہ۔ اہل دیوبند سے ترک بدعات پر اقرار نامہ
مناظرے		- ۱۹-۲۰ر مارچ ۱۸۷۶ء کو چاندا پور ضلع شاہ جہاں پور۔ یوپی میں آریہ سماج کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی کے ساتھ مناظرے کیے اور اسے شکست فاش دی نیز عیسائیت کے اہم نمائندوں پادری اسکاٹ، نولس اور جان ٹامس وغیرہ کی طرف سے اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کے ایسے مکمل اور دندان شکن جوابات دیئے کہ حاضرین دم بخود رہ گئے۔ اسی موقع پر پادری نولس نے کہا تھا ''کہ اگر تقریر پر ایمان لایا کرتے تو اس شخص کی تقریر پر ایمان لے آتے''۔ - جولائی ۱۸۷۸ء میں پنڈت دیانند سرسوتی سے مناظرے اور ان کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے حضرت نانوتوی ۱۷ دنوں تک رڑکی میں رہے لیکن پنڈت جی مناظرے پر آمادہ نہ ہوئے اور راہ فرار ڈھونڈی۔ - ۱۸۷۹ء میں پنڈت دیانند سرسوتی میرٹھ پہنچے اور اپنی عادت کے مطابق اسلامی عقائد واحکام پر اعتراضات کئے حضرت نانوتوی نے یہاں ان کا تعاقب کیا لیکن وہ کسی بہانے فرار ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد پنڈت جی پھر میرٹھ پہنچے، مناظرے کی دعوت دی لیکن وہ سامنے نہ آئے۔ - ۸/۷ر مئی ۱۸۷۵ء کو ''میلۂ خدا شناسی'' میں عیسائی پادریوں (نولس وغیرہ) کے سامنے اسلام کی حقانیت اور عیسائیت کے ابطال پر تقریر۔
دفاعی اقدامات	:	جنگ آزادی کی ابتدائی تحریک ۱۸۵۷ء کے زمانے میں شاملی کی جنگ میں شرکت۔
دارالعلوم دیوبند کی تاسیس	:	۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ-۳۰ر مئی ۱۸۶۶ء بروز جمعرات۔
قیام سے پہلے چندہ	:	۲ر ذی قعدہ ۱۲۸۲ بروز جمعہ (چندے کی پہل حاجی سید محمد عابد حسین کے ہاتھوں ہوئی)
دارالعلوم دیوبند کی تعمیر کی سب سے پہلی اپیل	:	تحریری طور پر ۱۲۸۸ھ، اعلان عام کی شکل میں، ۱۹ر ذی قعدہ ۱۲۹۱ بروز جمعہ بموقع جلسۂ تقسیم اسناد وانعامات۔
تاریخ سنگ بنیاد	:	۲ر ذی الحجہ ۱۲۹۲ھ بموقع جلسۂ تقسیم اسناد وانعامات۔

آپؒ کی تحریک پر دارالعلوم کے نہج پر قائم ہونے والے مدارس : منبع العلوم گلاؤٹھی، ضلع بلند شہر یوپی، مدرسہ شاہی، مرادآباد یوپی، مدرسۃ الشرع، سنبھل مرادآباد یوپی ان کے علاوہ مزید دس گیارہ مدارس مظفرنگر، رڑکی، خورجہ، بجنور، علی گڑھ وغیرہ میں قائم ہوئے۔

تصنیفات اور تحریریں : (۱) آب حیات (۲) انتصار الاسلام (۳) تحذیر الناس (۴) تحفۂ لحمیہ (۵) تحشیہ بخاری (آخر کے پانچ چھ پاروں کا) (۶) تصفیۃ العقائد (۷) تفسیر معوذتین (۸) تقریر دل پذیر (۹) توثیق الکلام (۱۰) جواب ترکی بہ ترکی (۱۱) حجۃ الاسلام (۱۲) سنت وبدعت (بشکل مکتوب) (۱۳) فیوض قاسمیہ (مکتوبات کا مجموعہ) (۱۴) قبلہ نما (۱۵) گفتگوئے مذہبی (۱۶) مباحثۂ شاہجہاں پور وغیرہ۔

سفر حج : (۱) ۱۲۷۷ھ-۱۸۶۰ء (۲) ۱۲۸۶ھ-۱۸۷۰ء (۳) ۱۲۹۴ھ-۱۸۷۷ء

وفات : ۴ر جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ ۱۵ر اپریل ۱۸۸۰ء بعد نماز ظہر۔

مدفن : گورغریبان معروف بہ ''مزار قاسمی'' (دیوبند)

☆......☆......☆

اصول ہشتگانہ

حجۃ الاسلام الامام محمد قاسم نانوتویؒ

۱- ''اصل اول یہ ہے کہ تامقدور کارکنانِ مدرسہ کو ہمیشہ تکثیر چندہ پر نظر رہے، آپ کوشش کریں، اوروں سے کرائیں، خیر اندیشانِ مدرسہ کو یہ بات ہمیشہ ملحوظ رہے۔

۲- ابقائے طعام طلبہ بلکہ افزائش طلبہ میں جس طرح ہو سکے خیر اندیشانِ مدرسہ ہمیشہ ساعی رہیں۔

۳- مشیران مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور خوش اسلوبی ہو، اپنی بات کی پچ نہ کی جائے، خدانخواستہ جب اس طرح کی نوبت آئے گی کہ اہلِ مشورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اوروں کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا، القصہ تہہ دل سے بروقت مشورہ اور نیز اس کے پس وپیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے، سخن پروری نہ ہو، اور اس لئے ضروری ہے کہ اہلِ مشورہ اظہار رائے میں کسی وجہ سے متامل نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں، یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھ میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدل وجان قبول کریں گے، اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلبؔ میں اہلِ مشورہ سے مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد وصادر جو علم وعقل رکھتا ہو اور مدرسوں کا خیر اندیش ہو، اور نیز اس وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاقاً کسی وجہ سے اہلِ مشورہ سے مشورے کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہلِ مشورہ کی مقدار متعد بہ سے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر مہتمم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر اہلِ مشورہ معترض ہو سکتا ہے۔

۴- یہ بات بہت ضروری ہے کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خود بین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں، خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔

۵- خواندگی مقررہ اس انداز سے جو پہلے تجویز ہو چکی ہے یا بعد میں کوئی اور انداز مشورہ سے تجویز ہو پوری ہو جایا کرے، ورنہ یہ مدرسہ اول تو خوب آباد نہ ہوگا اور اگر ہوگا تو بے فائدہ ہوگا۔

۶- اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں جب تک یہ مدرسہ انشاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا، اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہو گئی جیسے جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

۷- سرکار کی شرکت اور امراء کی شرکت بھی زیادہ مضر معلوم ہوتی ہے۔

۸- تامقدور ایسے لوگوں کا چندہ زیادہ موجبِ برکت معلوم ہوتا ہے جن کو اپنے چندہ سے امید ناموری نہ ہو، بالجملہ حسن نیت اہل چندہ زیادہ پائیداری کا سامان معلوم ہوتا ہے''۔ (تاریخ دارالعلوم ج ۱ ص: ۱۵۳-۱۵۴)

عکس تحریر حضرت الامام محمد قاسم نانوتویؒ

از: مباحثہ شاہ جہاں پور